فروری۔ مارچ سنہ ۱۹۸۰ء

ہفتہ وار پندار پٹنہ

کی خصوصی پیشکش

سہیل عظیم آبادی نمبر

ایڈیٹر:۔ محمد طاہر علی

معاون ایڈیٹر:۔ عبد الغفار

امتیاز کریم

مرتبین

ممتاز احمد

پروفیسر عبد المغنی

معاونین

انیس الرحمن

شبیر احمد

ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی

منظر کاظمی

قیمت بیس ۲۰ روپیے

خط وکتابت کا پتہ

ہفتہ وار پندار، بھنور پوکھر پارک، پٹنہ ۴ ۸۰۰۰۰۴

پرنٹر پبلشر ولی محمد نے دی آزاد پریس سبزی باغ پٹنہ ۴ سے چھپواکر دفتر ہفتہ وار پندار بھنور پوکھر پٹنہ ۴ سے شائع کیا

حرف چند

سہیل عظیم آبادی کی شخصیت اور فن دونوں متنازعہ فیہ رہے ہیں۔ شخصیت کا یہ وصف اس کے زندہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہوا کرتی ہے۔ زندہ شخصیتیں چھوٹے اور بڑے مسائل میں فیصلے کیا کرتی ہیں اسلئے کہ سفید و سیاہ کے درمیان تفریق انسان کی تنقیدی جبلّت کا نتیجہ ہے۔ جس لمحے فیصلے کی منزل آتی ہے، شخصیت متنازعہ فیہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے سہیل عظیم آبادی کی شخصیت کا متنازعہ فیہ ہونا، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ایک زندہ اور منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ فیصلے چھوٹے ہوں کہ بڑے، اجتماعی پس منظر میں انفرادی بنیاد پر کئے جاتے ہیں۔ فرد کی انفرادیت اس کا سب سے بڑا وصف ہے۔ اس کے بغیر فرد تکمیلِ ذات سے محروم رہ جاتا ہے۔

سہیل عظیم آبادی کی علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جاتا رہے گا لیکن پندار کا یہ خصوصی شمارہ "سہیل عظیم آبادی نمبر" ایک خاص مقصد رکھتا ہے۔ سہیل عظیم آبادی کی شخصیت اور فن کا محض مجموعی اور طائرانہ جائزہ اس کا مقصد نہیں ہے۔ بلکہ سہیل صاحب کی شخصیت و سیرت اور فکر و فن کے اقدار و اوصاف کی تعین سب سے بڑا مقصد ہے۔ دوسرے لفظوں میں سہیل صاحب کے تخلیقی ذہن کی اُن خصوصیتوں کا تجزیہ کرنا مقصود ہے جو دوسرے تمام ادیبوں سے ان کو منفرد بناتی ہیں۔ اور اس تجزیاتی مطالعے کے بعد ان خصوصیتوں کی قدر و قیمت کا تعین بھی جو اُن کی بے نظیریت اور امتیازیت کا سنگِ بنیاد ہیں۔ اس لئے کہ وجود کا حُسن انفرادیت کا رہینِ منت ہے۔ ہم اپنے اس مقصد میں کامیابی اور ناکامیابی کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

البتہ ہمیں ان قلمکاروں، بزرگوں، دوستوں، رفیقوں اور عزیزوں کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے اپنے مخلصانہ تعاون اور مفید مشوروں سے ہمیں اپنے مقصد کی تکمیل میں نوازا ہے۔ چنانچہ ہم بلا تخصیص ان تمام لوگوں کے شکر گزار ہیں۔

ادارہ

فہرست مضامین

"آہ سہیل"

علامہ جمیل مظہری

وہ اک چراغ جو بجھ جائے صبح سے پہلے
اسے شہید سیہ خانۂ وجود کہو
بقول حافظ شیراز مظہری اس کو
تم اک شعلۂ مستعجل نمود کہو

اے ساقی میخانۂ [illegible]
کہ میری عمر کا پیمانہ اب بھی بھر نہ سکا
یہ سانحہ بھی عظیم اور وہ سانحہ بھی عظیم
سہیل مر گیا لیکن جمیل مر نہ سکا

سہیل آہ نیاز بہار و ناز بہار
سہیل آہ سرور وطن غرور وطن
وہ اٹھتے جاتے ہیں تھا جن سے اعتبار اس کا
دھڑک رہا ہے بہت قلب ناصبور وطن

اک انفعال سا ہے اپنی سخت جانی پر
میں اور تیری خبر مرگ آہ آہ سہیل
[illegible] اب اختر اورینوی کے بعد
یہ زندگی ہے بہرحال اب گناہ سہیل

میں یہ گناہ کئے جا رہا ہوں مجبوراً
سسک سسک کے جئے جا رہا ہوں کیا کہئے
خدا کے فضل سے سینہ ہے لالہ زار جمیل
جگر پہ داغ لئے جا رہا ہوں کیا کہئے

بہت دلوں سے مریض دل و جگر تھا سہیل
[illegible] سے لگا تھا گہن غروب ہوا
دماغ گم تھا مگر دل سے یہ صدا آئی
کہ۔ آہ آج سہیل وطن غروب ہوا

۱۴۰۰ھ

سہیل کی نذر

اختر قادری

دل میں بسی ہوتی ہے محبت سہیل کی
آنکھوں میں پھرتی رہتی ہے صورت سہیل کی

پُر خلوص [illegible]
[illegible] ے گی یاد حمیت سہیل کی

مجھ سے اُسے کتنا پیار تھا
[illegible] آباد سے میت سہیل کی

افسانہ ساز خود ہی اب افسانہ ہو گیا
سمجھا کرے زمانہ حقیقت سہیل کی

زینہ بہ زینہ پہونچا وہ بام عروج تک
اللہ! وہ لگن، وہ ریاضت سہیل کی

تحریریں اس کی شہرۂ اہل نظر بنیں
تھی بات بات میں ادبیت سہیل کی

[illegible] سے فطرتاً اُسے دل میں بسا لیا
[illegible] محبت سہیل کی

[illegible] میں نہیں کہ تاج محل اک بنا سکے
آنسو مرے ہیں نذر عقیدت سہیل کی

اختر دیا ہے ساتھ مرا اُس نے اک عمر
مجھ کو رُلاتی ہے فرقت سہیل کی

ظہیر صدیقی

حقیقتاً ایک داستاں تھا

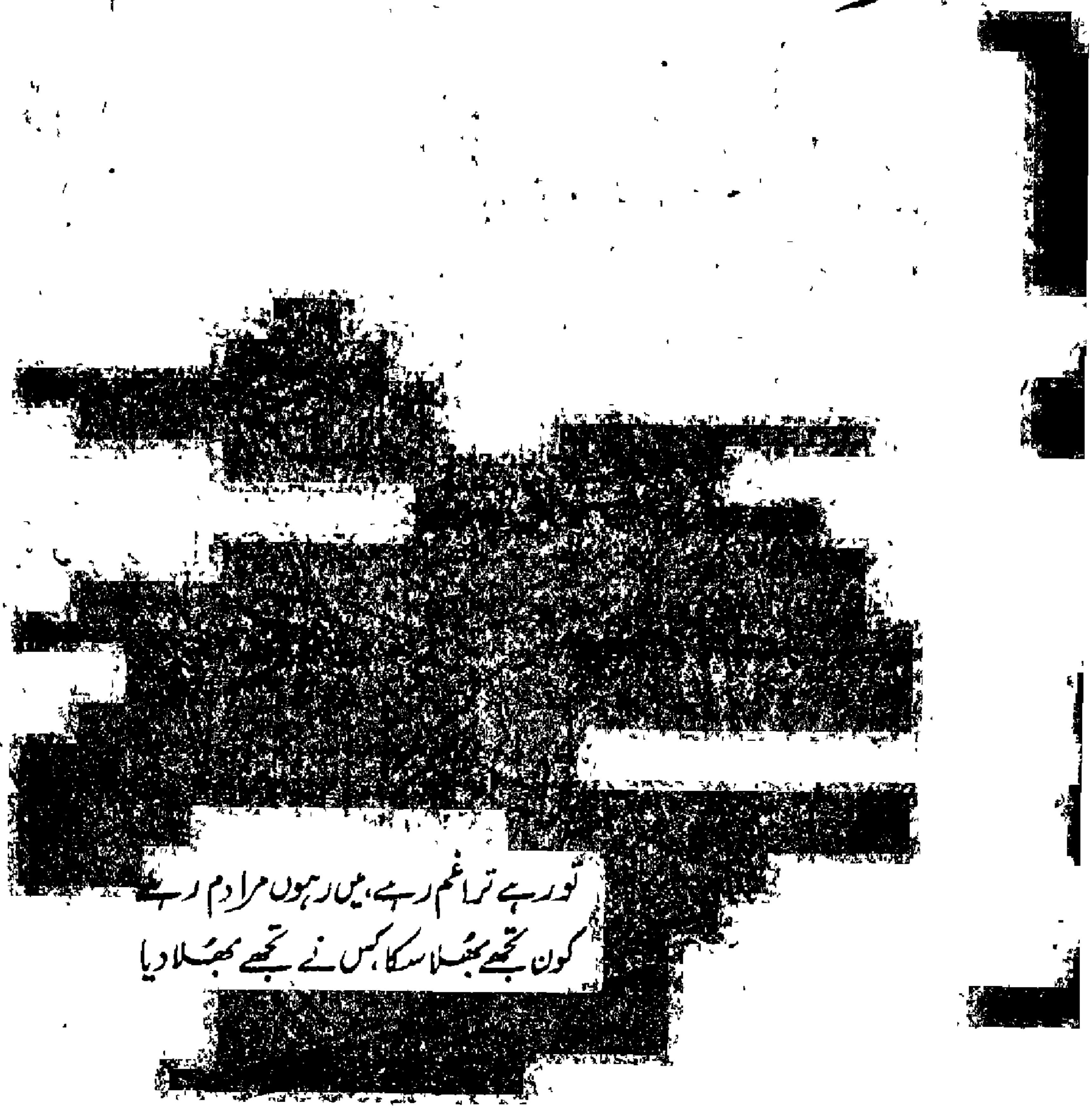
یہ چاہتا ہوں
سیاہ دن سے بھیانک لمحوں کو
(ریڈیو جب سے بند ہوا تھا)
میں بھول جاؤں [illegible]
مگر مرے تنگ و تاریک کمرے کی سونی کرسی
سوال کرتی ہے
[illegible] حسرت سے پوچھتی ہے
کہ وہ قلندر
— جو دل کی وسعت میں آسمان تھا
— تھکے ہوئے بے پناہ لوگوں کے واسطے ایک سائبان تھا
— بظاہر داستان گو تھا، حقیقتاً ایک داستان تھا
— جو بیٹھتا تھا
تو رشکِ نکہت سے ساری تاریک تنگ کمرہ بھی گلستاں تھا
کہاں گیا ہے

ہماری زیبا
(جو سسکیاں ریڈیو کی پہلے ہی سن چکی ہے)

یقین ہے امتحان میں کامیاب ہوگی
سفر پہ جانے سے کچھ ہی پہلے
جو آپ نے اس کی کامیابی پہ
ایک اچھے قلم کا وعدہ کیا تھا
میں نے تسلیاں دیں
کہا کہ میں ان کا وعدہ پورا کروں گا بیٹی
مگر وہ معصوم بول اٹھی
"قلم نہیں
میں قلم نہ لوں گی
سہیل انکل!
سہیل انکل"

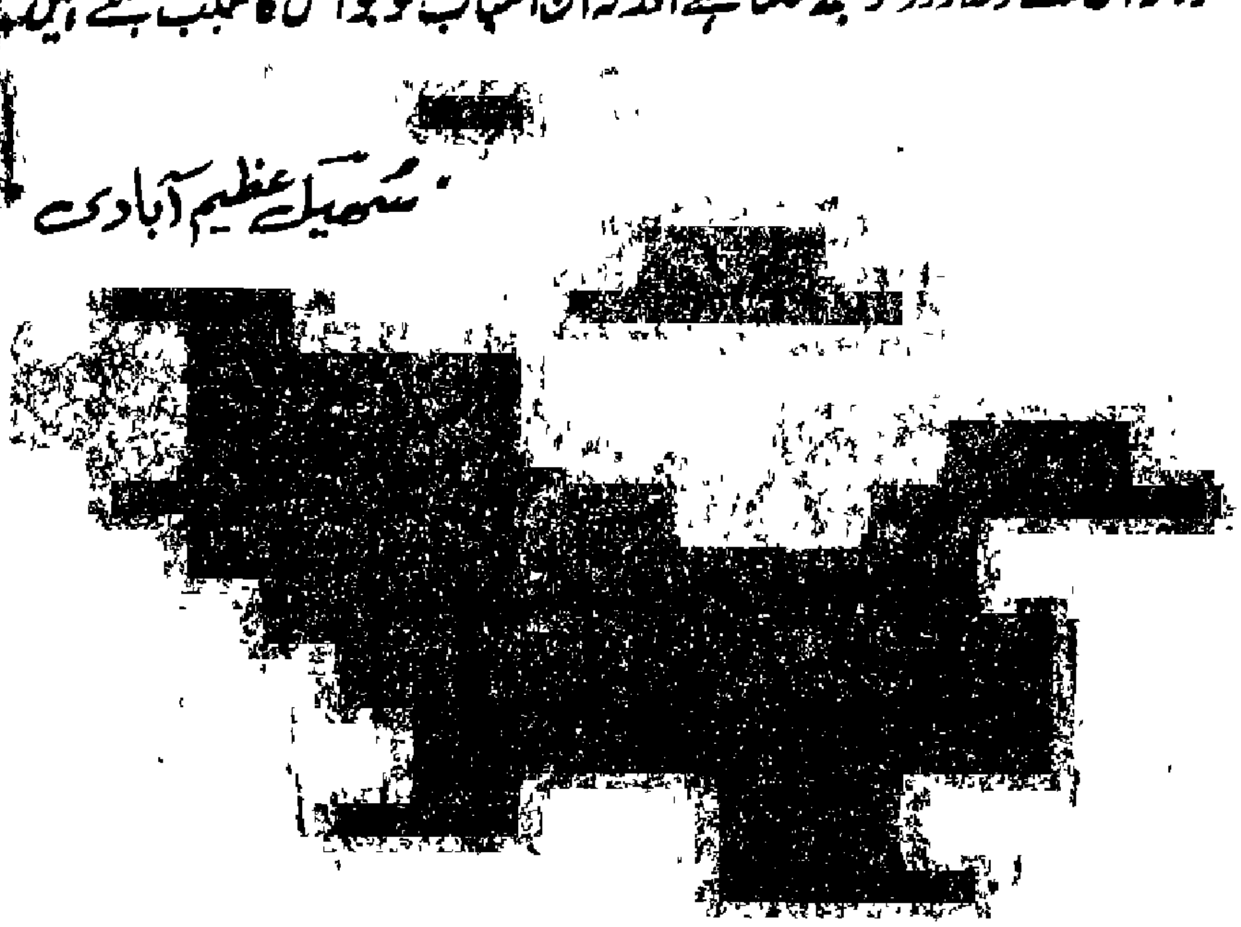
سہیل صاحب!
بتائیے اپنی ضدی بیٹی کے واسطے
وہ "سہیل انکل" کہاں سے لاؤں

تاثرات


تو رہے ترا غم رہے، میں رہوں مرا دم رہے
کون تجھے بھلا سکا، کس نے تجھے بھلا دیا

افسانے زندگی کی تصویر بھی ہیں، تفسیر بھی اور تعبیر بھی۔ افسانہ نگار کی انگلی وقت کی نبض پر ہوتی ہے۔ لیکن یہ صرف اس حال میں ممکن ہے کہ افسانہ نگار کا تعلق اُن لوگوں سے بہت قریبی ہو جن کے بارے میں اور جن کے لئے وہ لکھتا ہے۔ جو افسانہ نگار اپنے تعلقات کو حقیقی کرداروں سے منقطع کر لیتا ہے وہ زندہ رہنے والے کردار کی تخلیق بھی نہیں کر سکتا۔ افسانہ نگاروں کو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ان کی سب سے بڑی ذمہ داری ان عناصر کے خلاف نفرت پیدا کرنا ہے جو انسان کے لئے مضر ہیں۔ اور ان عناصر کو قوت پہونچانا جو انسان کے لئے مفید ہیں۔ لیکن اگر کوئی افسانہ نگار عام انسان سے دور ہو جائے گا تو وہ نہ اُن کے دُکھ درد کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اُن اسباب کو جو اس کا سبب بنتے ہیں۔

سہیل عظیم آبادی



عبدالمغنی

پھر تیرا وقتِ سفر یاد آیا

مجھے مرحوم سہیل عظیم آبادی صاحب کے ساتھ دلّی اور دوسرے مقامات کا سفر کرنے کا اتفاق کئی بار ہوا ہے اور میں نے ہمیشہ انہیں محاورے یا ضرب المثل کے مطابق، یار شاطر، پایا اور بارِ خاطر کبھی نہیں۔ حالانکہ ہم دونوں کی عمر میں کافی فرق تھا، مگر سہیل صاحب تو سدا بہار تھے۔ بلکہ اپنے سے کم عمر کے لوگوں کے ساتھ شاید زیادہ تر و تازہ رہتے تھے۔ پھر ان کے ساتھ رہ کر کم عمر کے لوگوں کو ان کی بزرگی کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ حد درجہ بے تکلف اور خوش طبع تھے۔ کسی علمی و ادبی اجلاس کے موقع پر سہیل صاحب کے ساتھ سفر کرنے میں خاص لطف یہ ملتا تھا کہ وہ اپنے اَن گنت دوستوں کے ساتھ تعارف کرانے میں نہایت فیّاض تھے اور ہمیشہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کی توصیف و تعریف میں قدرے مبالغے سے کام لیتے تھے، اس طرح کہ آپس میں متعارف ہونے والوں کو ایک دوسرے کی خوبیوں کا علم پہلی ہی ملاقات میں ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ سہیل صاحب میرے ساتھ یہ خصوصیت روا رکھتے تھے کہ کسی بھی اجتماعی نمائندگی کے موقع پر وہ مجھے آگے بڑھا دیتے تھے۔

[illegible]ء میں جب آل انڈیا اردو اکیڈمیز کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی تو بحیثیت سکریٹری بہار اردو اکیڈمی سہیل صاحب بہار کے ان ادیبوں کا ایک قافلہ لے کر گئے جو اکیڈمی کی عاملہ کے ارکان تھے اور حسبِ معمول کانفرنس کے تمام اجلاسوں میں انہوں نے مجھے ہی بہار کے وفد کا ترجمان بنایا۔

ہم لوگ دو تین روز لکھنؤ میں رہے۔ کانفرنس کی تمام کارروائیوں میں ہمارا وفد بہت ہی نمایاں طور پر شریک رہا اور کئی اہم امور میں ہمارا موقف فیصلہ کن ثابت ہوا۔ سہیل صاحب اپنے وفد کی اس کارگزاری پر اتنے مسرور ہوئے کہ لکھنؤ سے پٹنہ تک مہینوں کانفرنس کی کامیابیوں کا ذکر ہر اس محفل کرتے رہے جس میں شریک ہوئے۔ لکھنؤ کے قیام کے دوران کانفرنس میں آئے ہوئے اور شہر کے تمام قابلِ ذکر ادیبوں اور شاعروں نیز اردو دوستوں کے درمیان سہیل صاحب اپنے ارکانِ وفد کا زبردست تعارف کراتے رہے۔ اس طرح عظیم آباد، لکھنؤ، دلّی اور حیدرآباد وغیرہ دبستانوں کے مابین سہیل صاحب گویا رابطہ سفارت بنے رہے۔ وہ مختلف مکاتبِ فکر کے نئے اور پرانے دانشوروں کے درمیان یکساں مقبول نظر آئے۔ تقریباً سبھی سے ان کے تعلقات میں بے تکلفی کی جھلک تھی۔

[illegible]ء کے اواخر میں چنڈی گڑھ میں انجمن ترقی اردو ہند کی مجلسِ عام کا اجلاس تھا۔ مجھے اور سہیل صاحب کو اس میں شرکت کرنی تھی۔ کئی روز بلکہ ہفتوں قبل سے ہم اس کا پروگرام بنا رہے تھے۔ اور اس سفر کو بنیاد بنا کر بیک وقت کئی سفر کرنا چاہتے تھے۔ دلّی ہو کر تو چنڈی گڑھ جانا اور وہاں سے آنا ہی تھا، جس میں آتے یا جاتے میرا ان کا ساتھ متوقع تھا۔ انہیں علی گڑھ اور الٰہ آباد بھی جانا تھا اور شروع میں ان کا منصوبہ یہ تھا کہ جاتے ہوئے ہی دونوں جگہوں سے

وہ اکیلے ہو آئیں گے۔ اور پھر دلی سے میرا ان کا ساتھ ہو جائیگا جس کے لئے وہ مجھ سے کئی روز قبل روانہ ہو جائیں گے۔ مگر بعد میں ان کا منصوبہ بدل گیا اور انہوں نے طے کیا کہ ہم لوگ جائیں گے ساتھ اور واپسی میں وہ علی گڑھ اور الہ آباد ہوتے ہوئے پٹنہ لوٹیں گے۔

مجھے بھی خوشی ہوئی کہ ایک بار پھر سہیل صاحب کے ساتھ طویل سفر کرنے کا موقع ملے گا اور شروع ہی سے وہ میرے ساتھ رہیں گے۔ گرچہ بعد میں ان کو اکیلے سفر کرنا پڑے گا۔ اب ہوا یہ کہ جس روز ہم دونوں کو روانہ ہونا تھا لیکایک ٹرین کا ایک ایسا حادثہ کہیں ہو گیا کہ دوسری گاڑیوں کے ساتھ ہماری گاڑی بھی رد ہو گئی۔ اور یہ اس وقت معلوم ہوا کہ جب ہم اسٹیشن پہنچے۔ اس کے بعد دو روز تک ریل اور جہاز کسی کا ٹکٹ ہمیں کوشش کے باوجود نہیں ملا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم لوگ اپنے منصوبے سے بہت دیر کر کے دلی روانہ ہو سکے۔ بہرحال، ہم روانہ ساتھ ہی ہوئے۔ راستے بھر سہیل صاحب معمول کے مطابق ہندوستان بھر کے ادبا و شعراء کے لطائف و ظرائف سناتے رہے اور کچھ اپنے مستقبل کے منصوبوں پر بھی تبادلہ خیال کرتے رہے۔ اس وقت کی جنتا حکومت پر تنقید اور انتخاب کے بعد اندرا کانگریس سے متوقع حکومت سے توقعات کا اظہار بھی ہم دونوں مشترک طور پر کرتے رہے۔ ان توقعات میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اردو زبان و ادب کے ٹھوس تعمیری کاموں کے لئے وہ مواقع پیدا ہوں گے اور سہیل صاحب کوئی خاص دبہ میرے تعاون سے چلائیں گے۔

ہم دونوں دلی ایسے وقت میں پہنچے جب دوسرے ہی روز سے انجمن ترقی اردو ہند کے اجلاس کی کارروائیاں شروع ہونے والی تھیں۔ چنانچہ سہیل صاحب نے تجویز کیا کہ شام سہ پہر ہی میں بس سے چنڈی گڑھ کے لئے روانہ ہو جائیں تاکہ شب میں پہنچ کر وہیں آرام کریں اور راہ میں کچھ حسین مناظر بھی دیکھ سکیں۔ میں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ اور دن بھر دلی میں رہ گیا۔ سہیل صاحب تو بس سے ہی روانہ ہو گئے اور میں رات گئے ٹرین سے روانہ ہو کر صبح سویرے چنڈی گڑھ پہنچا۔ دوسرے مہمانوں کے ساتھ ہم دونوں بھی ایک ہی جگہ ٹھہرائے گئے۔ قیام گاہ پہاڑوں کے دامن میں ایک پر فضا جگہ پر تھی۔ ہمارے بڑے کمرے میں سید صباح الدین عبدالرحمان، سید شہاب الدین دسنوی، عتیق صدیقی، شہباز حسین اور راج بہادر گوڑ صاحبان تھے۔ پھر اجلاس کی نشستوں سے فارغ ہو کر دوسرے ادبا و شعراء بھی ہمارے کمرے میں جمع ہو جاتے تھے۔ اور گرما گرم بحثیں مختلف موضوعات پر ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ شہر میں بعض دعوتوں اور سیروں کے لئے ہم تمام شرکائے اجلاس اجتماعی طور پر ایک ٹورسٹ بس میں گھومتے تھے۔ ان سب مواقع پر سہیل صاحب کی مخصوص سرگوشیاں احباب کے ساتھ حلقہ بہ حلقہ نظر آتیں اور کچھ سنائی دیتیں۔ وہ شاید ایک ہی آدمی تھے، جو مختلف اوقات میں قریب قریب ہر حلقے میں محو گفتگو دکھائی پڑتے۔ یہاں تک کہ مشرق و مغرب کی طنابیں کھینچتے نظر آتے۔ ایک طرف گوپی چند نارنگ کے ساتھ پر خلوص سرگوشی کر رہے ہیں تو دوسری جانب قمر رئیس کے ساتھ۔ مالک رام کے ساتھ بھی محو تکلم ہیں اور راج بہادر گوڑ کے ساتھ بھی۔

ایک اجلاس میں انجمن کے ایک گم شدہ مسودے کا سراغ لگانے کی بات چل رہی تھی اور معلوم ہوا کہ الہ آباد میں کوئی صاحب ہیں جن سے مدد مل سکتی ہے۔ سوال کسی نمائندے کے الہ آباد جانے کا پیدا ہوا۔ سہیل صاحب نے آگے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کیں، حالانکہ انجمن کے دفتر

سے بھی کسی کو بھیجنے کی تجویز آچکی تھی۔ چنانچہ ہم لوگوں نے سہیل صاحب کی خدمات سے بھی فائدہ اٹھانے کی تجویز منظور کی۔ اب ہمارا پروگرام یہ بنا کہ ہم دونوں چند ہی گھنٹوں میں شب میں بذریعہ ٹرین دلّی جائیں گے اور میں تو دوسرے ہی روز پٹنہ لوٹ جاؤں گا۔ مگر سہیل صاحب دو روز دلّی میں رہ کر الٰہ آباد جائیں گے۔ پھر پٹنہ پہنچیں گے۔ چنانچہ اسی پروگرام کے مطابق ہم روانہ ہوئے۔ فرسٹ کلاس کے ایک ڈبّے میں اوپر کی برتھوں پر خواجہ احمد فاروقی صاحب اور سید شہاب الدین دسنوی صاحب اور نیچے کی برتھوں پر میں اور سہیل صاحب تھے۔ چونکہ ہم لوگ رات گئے چلے تھے، اس لئے راہ میں زیادہ بات چیت نہ ہوئی۔ سبھی لوگ اپنے اپنے بستر جاکر سو گئے۔

صبح سویرے جب ٹرین پرانی دلّی پہنچی تو اترنے والوں میں ہم دونوں اور راج بہادر گوڑ ساتھ نکلے اور ریلوے ریسٹوران میں جاکر بیٹھ گئے۔ میں نے چائے کے ساتھ ہلکا سا ناشتہ بھی کیا، سہیل صاحب صرف چائے کے جام پر جام لنڈھاتے رہے، ہم دونوں اپنے معمول کے مطابق سادہ بے دودھ کی چائے پیتے رہے، گوڑ صاحب نے غالباً دودھ لیا۔ سہیل صاحب نے ایک جام ساتھ کے قلی کو بھی دیا، جو ہم دونوں کا سامان مشترک طور پر سنبھالے ہوئے تھا۔ چائے کے دوران ہم لوگ زیادہ تر سیاستِ وقت پر گفتگو کرتے رہے۔ میں اور سہیل صاحب ایک طرف اندرا کانگریس کی فتح کے امکانات پر روشنی ڈال رہے تھے اور واضح کر رہے تھے کہ ملک و قوم کے لئے بر وقت اس سے بہتر کوئی جماعت نہیں۔ گوڑ صاحب دوسری جانب سی پی آئی سے متعلق ہونے کے سبب اندرا کانگریس سے اپنی جماعت کی شکایات کا ذکر کر رہے تھے گرچہ انہیں اعتراف تھا کہ بحالاتِ موجودہ کانگریس کے دوسری جماعتوں سے آگے بڑھ جانے کا قرینہ غالب ہے۔ خاص کر آندھرا پردیش، جس کے دارالسلطنت حیدرآباد سے گوڑ صاحب کا تعلق تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم لوگ اسٹیشن سے باہر نکلے۔ آفتاب طلوع ہو رہا تھا، صحبتِ شب ختم ہو چکی تھی۔ داغِ فراق کی ساعت آچکی تھی۔ ایک سواری پر سہیل صاحب بیٹھ گئے۔ تاکہ اپنی منزل کی طرف یہاں سے روانہ ہوں۔ انہوں نے مجھے الوداع کہی اور میں نے انہیں۔ اس کے چند ہی روز بعد ایک شب یکایک خبر ملی کہ:

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

یہ خبر الٰہ آباد سے آئی۔ دلّی کی صبح سے الٰہ آباد کی شام تک کا افسانہ مجھے معلوم نہیں، میرا ان کا ساتھ تو صبح ہی میں چھوٹ چکا تھا۔ سہیل صاحب نے تنہا صبح سے شام کیسے کی، اس کا صرف تھوڑا سا اندازہ غالب کے اس شعر سے کر سکتا ہوں۔

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

میرا خیال ہے، غالب نے اس شعر میں ایک انسان کے عرصۂ حیات کی تصویر کشی صبح و شام کے دو کناروں سے اسے محدود کر کے کی ہے اور اشارہ کیا ہے کہ یہ پورا عرصہ زندگی کے تمام ہنگاموں کے باوجود "سخت جانی ہائے تنہائی" کا ہے۔ جس سے دنیا میں ہر شخص کو اپنے اپنے طور پر سابقہ درپیش ہے اور میں سوچ رہا ہوں۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

قطعہ

از: ہارون طلعت شمسی

آہ! رخصت ہوئے جہاں سے سہیل
بزمِ شعر و ادب ہوئی سونی
ہے یہ دستور ہی جہاں کا جب
چشم کیوں نم ہے غم میں عصمت کی

غمِ مرگِ سہیل

از عطا کاکوی

قطعہ تاریخ رحلت سہیل عظیم آبادی مرحوم
۱۴۰۰ھ

موت اور وہ بھی عطا اپنے وطن سے باہر
یہ خبر جس نے سنی بول اٹھا، ہائے سہیل،،

جس سے ملتے تھے دل کھول کے وہ ملتے تھے
نہ کسی سے کوئی کد اور نہ دل پر کوئی میل

زندگی سادہ تھی، تھا حلقۂ احباب وسیع
ہند میں چار طرف نام گیا ان کا پھیل

خدمت اردو کی وہ کرتے رہے دل سوزی سے
چرخِ افسانہ نویسی کے تھے تابندہ سہیل

یوں تو ناول بھی کہانی بھی وہ لکھ لیتے تھے
ان کی شہرت ہوئی افسانہ نویسی کے طفیل

دل کو تھی فکر کہ لکھئے کوئی تاریخ وفات
غیب سے آئی یہ آواز کہ پڑھ مقطعِ ذیل

پانچ سال اور عطا کاش وہ زندہ رہتے
ہوتی تاریخ وفات ان کے غمِ مرگِ سہیل،،

۱۳۹۵ھ + ۵ = ۱۴۰۰ھ

سہیل عظیم آبادی — ایک صحافی

کچھ یادیں —— کچھ تاثرات

محمد مرغوب
ایڈیٹر روزنامہ صدائے عام

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اس سہیل کو تو مٹی کھا گئی جو گوشت پوست کا مجموعہ تھے۔ لیکن وہ سہیل جن کی یاد، جن کی تصویر، جن کے خد و خال انسانوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں انہیں یہ زمین اور نہ آسمان ہی مٹا سکتا ہے۔ وہ آج بھی کلیوں کی طرح مسکرا رہے ہیں، پھولوں کی طرح ہنس رہے ہیں۔ جسے بھی ان کی قربت حاصل ہوئی وہ کیسے انہیں بھول سکتا ہے۔ اور ایسے لوگوں کی کمی نہیں۔ یہی تو وجہ تھی کہ جب ان کی وفات کی خبر لوگوں کو ہوئی تو مکان پر سوگواروں کا تانتا بندھ گیا۔ جنازے کے جلوس، نماز اور پھر تدفین میں ہزاروں نے شرکت کی۔ وہ نہ امیر و کبیر تھے اور نہ لیڈر اور وزیر۔ نہ ہی کسی بڑی مذہبی شخصیت کے مالک تھے پھر بھی ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت کے لئے لوگ مسجدوں، مدرسوں، کالجوں اور دفتروں سے جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ یہ ایک انسان ہونے کے ناطے ان کی خوبیاں تھیں جو لوگوں کو اس طرح کھینچ رہی تھیں۔ اور جس میں یہ خوبیاں ہوں وہ کیسے بھلایا جا سکتا ہے۔ وہ خاک میں پنہاں کیسے ہو سکتا ہے۔

ایسے ہی لوگ جب جدا ہوتے ہیں تو دوست و احباب کسی گھڑی کسی پل یہ سوچتے ہیں کہ کیا پھر کبھی اس سے ملنا نصیب ہوگا۔ اسی کے ساتھ ایک اور زندگی جو دائمی ہوگی کی بات ذہن میں آتی ہے اور اس کے ساتھ جنت اور دوزخ بھی سوالیہ نشان بن کر سامنے آتا ہے۔ جنت کتنی اچھی چیز ہے۔ دنیا میں انسان کی تھوڑی سی کوششوں کا یہ کتنا بڑا انعام ہے۔ اور کم از کم میں خود کو اس انعام کا حقدار سمجھتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ واقعی میں نے اس کے لئے کوشش کی ہے یا مستقبل میں ایسا کرنے کا پروگرام ہے بلکہ زیادہ اس لئے کہ ؎

خدا کو تمہارا بتانے والو
خدا رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں

لیکن ان تمام خوش فہمیوں کے درمیان اچانک یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جنت میں ان سبھوں کی صحبت نصیب۔ جن کی مجھ سے دنیا میں بڑی قربت رہی۔ کیا سہیل صاحب وہاں ملیں گے؟ اگر ہاں تو ٹھیک ہے اور نہیں تو پھر یوں چیخ چیخ کر آواز دوں کہ ؎

مری بزم دل سے جانے والو
ٹھہر جاؤ کہ میں بھی آ رہا ہوں

بہتر تو یہی ہے کہ اس کی یاد کو ہی گلے لگائے ہوئے رہا ان

بیٹھا رہوں۔

سہیل عظیم آبادی علم و ادب کی دنیا میں زیادہ ایک افسانہ نگار، ایک ناول نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں لیکن وہ ایک صحافی بھی تھے اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ وہ دل سے صحافی ہی تھے اور مرتے دم تک صحافت کا دامن ان کے ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پایا۔ ممکن ہے میرے اس دعوی پر بہتوں کو حیرت ہو۔ لیکن جو انہیں قریب سے دیکھا کرتے تھے اور ان کے گھر میں بھی کا جانا ہوا کرتا تھا شاید وہ اس کی تائید کریں۔ یہ بھی سچ ہے کہ صحافت سے اپنی دلچسپی کا تذکرہ کم ہی لوگوں سے کیا کرتے تھے۔ چونکہ صحافی کی حیثیت سے ہی میرا اور ان کا تعلق ہوا اس لئے مجھ سے وہ بہت سی باتیں اپنی صحافتی دلچسپی کے متعلق کہہ دیا کرتے تھے۔ ایک بات تھی جسے انہوں نے صیغۂ راز میں رکھنے کی تاکید کی تھی لیکن اب جب کہ وہ نہ رہے تو مجھے یہاں اس کا تذکرہ کرنے میں کچھ پس و پیش نہیں۔

ایک دن باتوں باتوں میں انہوں نے کہا کہ "میں ایک روزنامہ جاری کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اسکیم تیار ہے اور امید ہے رقم کا بندوبست ہو جائے گا جس کے لئے ایک شخص نے آمادگی ظاہر کی ہے" اس کے بعد اس موضوع پر کبھی بات چیت نہیں ہوئی۔ وہ اخبار نہیں نکال سکے اور شاید اس کی تمنا لئے ہوئے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بہرحال ان باتوں سے صحافت سے ان کے گہرے تعلق کا تو پتہ چلتا ہے ان کا اپنا اخبار اور رسالہ نہیں تھا لیکن وہ بیشتر اخبارات اور پرچوں کے لئے لکھا کرتے تھے۔ بعض ہفتہ واروں کے لئے تو وہ اپنے قلمی نام سے پابندی کے ساتھ لکھا کرتے تھے۔

اور صحافت سے ان کا یہ شغف شروع سے ہی تھا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ساتھی نام کا روزنامہ پٹنہ سے اپنی ادارت اور سرکردگی میں نکالا اور خوب نکالا۔ ان کی کوشش تھی کہ اسے زیادہ سے زیادہ اچھا بنایا جائے۔ لیکن وہ زمانہ تھا جب کہ پاکستان کے قیام کو مشکل سے ایک سال ہوا تھا۔ مسلمان، ان کی زبان اور اس سے تعلق رکھنے والی تمام چیزیں شبہہ کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ چنانچہ اشتہارات وغیرہ کی شکل میں حکومت سے تعاون کی توقع رکھنا محال تھا اور بغیر اس کے کوئی اخبار جاری رکھنا اور وہ بھی سر میں سودا یہ سمایا ہو کہ اسے اچھا سے اچھا بنایا جائے ایک بڑا ہی مشکل امر تھا ان کی طبیعت کسی چیز کو کسی طرح گھسیٹ کر چلانا گوارہ نہیں کر سکتی تھی اور آخر کار یہ اخبار "ساتھی" دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔

ایک اخبار ختم ہوا لیکن سہیل صاحب کے اندر بیٹھا ہوا صحافی ختم نہیں ہوا۔ اور بالآخر کئی سال بعد ایک ہفتہ وار اخبار انہوں نے شروع کیا جس کا نام "حال" رکھا گیا۔ اخبارات کا نام رکھنے میں ان کا جواب نہیں تھا۔ وہ چھوٹا سا موٹا اور ہلکا پھلکا ایسا نام پسند کرتے تھے جو اردو داں اور غیر اردو داں غرض کہ سبھوں کی زبان پر بہ آسانی چڑھ سکے۔ یہ ہفتہ وار گٹ اپ، سائز، مضامین، خبروں اور تبصروں ہر لحاظ سے کافی اچھا تھا۔ بہترین کتابت و طباعت اور دو رنگوں کے استعمال سے یہ بڑا پرکشش نظر آتا تھا۔ ظاہر ہے عام ہفتہ وار اخبارات کے مقابلے اس پر کافی زیادہ خرچ بھی ہوتا تھا۔ دوسری طرف ان کی خودداری یہ گوارہ نہیں کر سکتی تھی کہ اشتہارات کے لئے حکام اور مالی معاونت کے لئے دوسروں کے پاس جاتے۔ حالانکہ حلقہ اتنا وسیع تھا اور نیک نامی ایسی تھی کہ جہاں جاتے کچھ نہ کچھ پاتے ہی۔ چنانچہ ہفتہ وار اخبار بھی زیادہ دنوں تک نہیں چلا سکے اور اس کی اشاعت کا سلسلہ منقطع ہوا۔ لیکن اسے دوسرے کے حوالہ کبھی نہیں کیا۔ جب بھی کسی نے ہفتہ وار کو لینے کی خواہش ظاہر کی انہوں نے مسکراتے ہوئے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "بھائی! میں خود اسے پھر جاری کروں گا" اور شاید وہ برابر اس فکر میں لگے رہے۔

لیکن صحافت تو کاروبار اور وہ بھی معیاری کاروبار بن چکی تھی۔ شاید ان جیسے غیور اور خوددار انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ چنانچہ ان کی تمنا دل ہی میں رہ گئی۔

سہیل صاحب سے میری جان پہچان ایک صحافی کی حیثیت سے ہوئی۔ وہ اکثر صدائے عام کے دفتر آیا کرتے تھے۔ مرحوم و مغفور محترم جناب نظیر حیدر ان کے دوستوں میں تھے۔ دونوں میں کھل کر باتیں ہوا کرتی تھیں۔ میں پاس ہی بیٹھا ہوا سنا کرتا تھا۔ ان کی باتیں سننے میں خاص مزہ آتا تھا۔ اس طرح میں سہیل صاحب کو جاننے لگا بات چیت ہوئی اور پھر گیا تھا جہاں ملتے بڑی شفقت سے پیش آتے۔ بعد میں میرا قیام اسی محلے میں ہوا جہاں وہ رہتے تھے۔ اور اکثر سڑک کے کنارے پان کی دکان پر یا راہ چلتے ان سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ وقت رہا تو ساتھ اپنے گھر ضرور لے جایا کرتے تھے اور یہ کہہ کر کہ "چلو، تمہیں فرسٹ کلاس چائے پلائیں"۔ گھر پہنچتے ہی چائے کی فرمائش کی اور تھوڑی دیر میں چائے چلی آتی۔ گرم گرم اور سادی چائے۔ پیتے جاتے تھے اور سادی چائے کی تعریف کرتے جاتے تھے۔ اور چونکہ میں چائے کا عادی نہیں اور زیادہ تر محض فائدے کے لئے پیتا ہوں۔ چنانچہ اپنے یہاں جو ملتی ہے وہ دودھ پانی زیادہ اور چائے کم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس سہیل صاحب کی سادہ چائے۔ چائے سے زیادہ ان کی باتوں میں مزہ آتا تھا۔ آج بھی پان کی اس دکان کے پاس جاتا ہوں تو نگاہ سہیل صاحب کو ڈھونڈتی ہے اور اچانک ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ ان کی سادہ چائے کی خوشبو ہر طرف بکھر رہی ہے۔ دراصل ان کی سادہ چائے کی پیالی خلوص اور پیار کی شیرینی سے بھری ہوتی تھی۔ رات کے وقت جب دفتر سے گھر آتا ہوں تو راستہ میں اکثر ایسا لگتا ہے جیسے کوئی پکار رہا ہو: "مرغوب! آجاؤ رکشہ پر بیٹھ کر چلیں"۔

وہ رات کے گھر واپس ہونے کے عادی تھے اور وہی وقت میرا بھی دفتر سے گھر جانے کا ہوتا تھا۔ چنانچہ اکثر راستہ میں ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ وہ پکارتے تھے اور میں ان کے ساتھ رکشہ پر بیٹھ جاتا تھا اور صحافتی دنیا، اخبارات اور سیاست سے متعلق باتیں شروع ہو جاتی تھیں ——— اب سہیل صاحب کہاں اور راستہ میں ان کی آواز کہاں۔ !!!

منیر سیفی

سہیل عظیم آبادی کی نذر

لبوں پہ جاگ اٹھی غم کی پیاس چاروں طرف
ہیں آنکھیں خشک تو خالی گلاس چاروں طرف

ہر ایک درد کی تلخی وہ پی کے سویا ہے
گھلی ہوئی ہے ہوا میں مٹھاس چاروں طرف

لٹو لٹاتا تھا جو دکھتی رگیں زمانے کی
سفر میں چھوڑ گیا اپنی سانس چاروں طرف

پھر ایک باب کہانی کا ہو گیا رخصت
جہاں میں رہ گیا یہ اقتباس چاروں طرف

قلم نے چھوڑ دیا پھر رفوگری کرنا
کہانیاں ہیں دریدہ لباس چاروں طرف

شجر شجر سے اسی کی کہانیاں سنیئے
پرندہ چھوڑ گیا اپنی باس چاروں طرف

منیرؔ ابھی احساس ڈس رہا ہے مجھے
اگی ہوئی ہے تصور میں گھاس چاروں طرف

شفیع جاوید

سہیل بھائی

مئی سنہ ۱۹۶۱ء۔
تاریخ یاد نہیں آتی۔

میں ان دنوں ایک تازہ نوکری کی ٹریننگ کے سلسلہ میں پٹنہ میں ہی تھا اور گارڈنر روڈ میں رہتا تھا۔ ایک دن دفتر سے لنچ کے لئے آیا تھا کہ گرمیوں کی اس سناٹی دوپہر میں لہراتی ہوئی ایک آواز آئی "شفیع جاوید، بھائی تم کس کوارٹر میں رہتے ہو؟" آواز جانی پہچانی سی ضرور لگی لیکن آواز دینے والے کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ادھر ادھر دیکھ کر میں پھر اپنے معمولات میں مشغول ہوگیا۔ کچھ دیر بعد پھر وہی آواز قدرے دور سے آتی محسوس ہوئی "بھائی شفیع تم کدھر رہتے ہو؟" میں باہر نکل آیا۔ دیکھا کچھ دور ایک رکشہ سامنے کی سڑک پر چلچلاتی دھوپ میں چلا جا رہا تھا اور اسی رکشہ سے بار بار یہ آواز باہر نکل کر گرد و پیش سے ٹکرا رہی تھی۔ میں اس کے پیچھے تیزی سے لپکا کہ رکشہ کہیں دور نہ نکل جائے، ساتھ ہی یہ آواز بھی دیتا گیا کہ میں یہاں ہوں۔ آخر کار رکشہ مڑا اور میں نے دیکھا کہ اس میں سہیل بھائی بار بار اپنے سفید رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھ رہے تھے۔ قریب آئے تو فرمایا "بھائی کیسی اجاڑ جگہ میں رہتے ہو کہ آواز دینے پر کوئی توجہ کیا دے گا، جھانکتا تک نہیں۔ بہت دیر سے میں تمہاری تلاش میں تھا، بس ایک اندازہ پر چل نکلا تھا۔ آج شام کو ریڈیو اسٹیشن آجاؤ۔ تمہاری ریکارڈنگ کرنی ہے، کوئی اچھی سی کہانی لیتے آنا!" اس اچانک افتاد پر حیران اور سہیل بھائی کی پریشانی پر پشیمان بھی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ انھوں نے کہا "بھائی دراصل تمہارا پروگرام بہت پہلے ہی ہونا چاہئے تھا لیکن جانے کیوں اب تک ...." پھر میرا ساتھ ہی واپس ہوا اور انہیں فریزر روڈ پر چھوڑ کر دفتر چلا گیا۔ اسی شام کو ریڈیو کے لئے میری پہلی کہانی "آخری بات" کو سہیل بھائی نے خود ریکارڈ کیا اور اتنی ہمت افزائی کی کہ گویا میرے پاؤں زمین پر نہ رہے۔

آج تقریباً بیسیوں سال بعد جب میں ان پر لکھنے بیٹھا ہوں تو یادوں کے دھندلکے میں یہ واقعہ سب سے نمایاں ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں ایسے لوگ جو نئے لکھنے والوں کو، نوجوانوں کو اپنے پیچھے آنے والوں کو اس طرح گلے لگاتے ہیں، اس طرح ان سے شفقت برتتے ہیں، اس طرح عنایات کرتے ہیں اور اس طرح ہمت افزائی کرتے ہیں۔ یہ محض ایک واقعہ ہی نہیں بلکہ سہیل بھائی کی شخصیت، ان کی محبت اور شرافت کی مکمل تشریح ہے۔ مئی کی اسی شام کو ریکارڈنگ کے بعد وہ مجھے پرنس (فریزر روڈ پر وہ مرحوم مرکز جو پٹنہ کے دانشوروں کے لئے رطل گراں کا گہوارہ ہوا کرتا تھا) میں لے گئے اور اعلیٰ درجہ کی چائے پلائی۔ میں نے اس چائے کے ذائقہ اور فلیور کی تعریف کی تو انھوں نے کہا تھا "ہاں بھائی یہ میری خاص جگہ ہے۔ ذوق آشنا چائے کا مزاج تو غزل کا مزاج ہے کہ ذرا ادنیٰ بیج ہوئی اور بحر سے خارج۔" اچھی چائے کی اتنی اچھی تعریف مجھے آج تک کسی دوسرے سے نہیں مل سکی۔

یاد آتا ہے کہ ۱۹۵۶ء میں جب میں پٹنہ یونیورسٹی کا طالب علم تھا تو سہیل بھائی سے میری پہلی ملاقات پنٹو (ایک اور مرحوم مرکز دانشوری جو کبھی پٹنہ کالج کے سامنے ہوا کرتا تھا اور ابھی چائے کے لئے مقبول تھا) کی میز پر ہوئی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ بلا تکلف ملے تھے اور کھل کر باتیں کی تھیں، کچھ اس طرح کی اجنبیت کا احساس پہلی ملاقات میں ہی زائل ہو گیا تھا۔ یہ سہیل بھائی کا خاصہ تھا کہ بلا فرق، امتیاز ملتے تھے کبھی اپنی دانشوری یا ادبی صلاحیتوں کی برتری کا احساس درمیان آنے نہ دیتے۔ غالباً ان دنوں وہ پٹنہ سے باہر تھے اور آل انڈیا ریڈیو سے منسلک تھے۔

ایک اور یادگار ملاقات غالباً ۱۹۵۸ء میں "صنم" (ماہنامہ) کے دفتر میں ہوئی تھی ("صنم" وہاب اشرفی ترتیب دیا کرتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہاب اشرفی نہ ڈاکٹر تھے اور صدر شعبہ بلکہ ایک سادہ، اچھے اور مخلص دوست ہوا کرتے تھے)۔ پھر "صنم" کا بہار نمبر شائع ہوا۔ اور مجھے سہیل بھائی کے ساتھ اشاعت پذیر ہونے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

وقت تیزی سے آگے نکلتا گیا اور سہیل بھائی پٹنہ کے ریڈیو اسٹیشن پر آ گئے۔ وہ بڑا خوبصورت دور تھا۔ رینو جی اور نرملا ورما جی حیات تھے۔ گوپی جی بھاگل پور سے آ چکے تھے۔ قیوم صاحب دوبارہ پٹنہ نشیں ہو گئے تھے پنٹو، پرنس اور گرینڈ میں بڑی خوبصورت نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ ان دنوں میں دانا پور میں پوسٹیڈ تھا۔ لیکن وہاں سے اکثر آ کر ان کی سنجیدہ لیکن پُرکار صحبتوں میں شامل ہوا کرتا تھا۔

دسمبر ۱۹۶۲ء

میں راجندر نگر کے مکان میں منتقل ہوا تو سہیل بھائی سے اور قریب ہونے کا موقع ملا۔ ان دنوں میرا تعلق ریڈیو سے کچھ زیادہ ہو گیا۔ پھر مظہر امام صاحب بھی آ گئے۔ تو سہیل بھائی کے کمرہ کو میں بڑی خانقاہ اور مظہر امام صاحب کے کمرہ کو چھوٹی خانقاہ کہا کرتا تھا (انہیں دنوں میں نے سبزی باغ کے اس حصہ کو جہاں اردو کے رسالے اور جرائد مخصوص طور سے فروخت ہوتے ہیں اردو بازار کہنا شروع کیا تھا لیکن جانے کیوں وہ چیز چل نہیں سکی)۔ آج میری دونوں خانقاہیں یادوں کے دھندلکوں میں لپٹی ہوئی ہیں۔ اس وقت صرف ان باتوں کی باسی خوشبو میرے گرد و پیش میں ہے جس نے مجھے پیچھے مڑ کر دیکھنے کے لئے مجبور کیا ہے۔

دانا پور کے اپنے دفتر کو جانے اور آنے کے لئے میں موٹر سائیکل استعمال کیا کرتا تھا۔ واپسی میں اکثر میں ریڈیو اسٹیشن پر رک جاتا۔ ایک مرتبہ سہیل بھائی نے ڈرائیو کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے حیرت کے ساتھ کہا۔ "آپ ڈرائیو کر لیں گے؟" انھوں نے ہنس کر جواب دیا "ہاں میاں ہم نے تقریباً دس سال تک موٹر سائیکل چلائی ہے۔" اس وقت انھوں نے رانچی میں بابائے اردو کی مہم کا دور دا دستانی اور ان کی شخصیت کا نیا پہلو میرے سامنے آیا کہ کس جانفشانی سے انھوں نے اردو کا چھوٹا ناگپور کی سنگلاخ زمینوں میں زندہ رکھا، کتنی محنت کی اور کس دیانت داری سے ایک عرصہ تک کام کیا۔ یہ کام تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن موٹر سائیکل کا معاملہ اگر نہ آتا تو شاید میں کبھی بھی سہیل بھائی کی زبانی اتنی اہم مہم کی داخلی تفصیلات کو نہ جان پاتا۔ ہم میں بہت سے ایسے ہیں جو اردو کے لئے اس کے مقابلہ میں بہت چھوٹے کاموں کو بھی فتح کا پرچم بنا کر اپنی کامیابیوں کے محلوں پر نصب کرتے اور دوستوں اور عزیزوں کو احساس کمتری میں مبتلا کرتے ہیں۔ سہیل بھائی کی یہ عظمت تھی کہ بڑے سے بڑے ایثار کو

بھی مشکل سے زبان پر لاتے تھے پھر اکثر ایسا ہوا کہ انھوں نے موٹر سائیکل ڈرائیوری، پر لنس لائے، چلتے چائے اور واپس ریڈیو اسٹیشن چلے گئے۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا "جانتے ہو، موٹر سائیکل میں کار اور سائیکل کی خرابیاں یکجا ہیں۔ یہ خرابیوں کا مجموعہ بے حد خطرناک شئے ہے" میں نے اس وقت ان کے اس جملہ پر سنجیدگی سے قطعی غور نہیں کیا۔ لیکن جب میں حادثہ کا شکار ہوا تو سہیل بھائی کی بات بے اختیار یاد آئی اور میں نے موٹر سائیکل کو آخری سلام کیا۔ اس حادثہ کے سلسلہ میں ایک دوست نے از راہِ ہمدردی دریافت کیا تھا "یہ ایکسیڈنٹ ہوا کیسے بھائی؟" سہیل بھائی موجود تھے، قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا انھوں نے فوراً کہا "حادثہ تو بس حادثہ ہے بھائی۔ اس کی کوئی منطق نہیں ہوتی" یہ جملہ کتنا بلیغ تھا۔ جو حادثوں سے دوچار ہو چکے ہیں وہ ہی اسے سمجھ سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ کسی نشست سے واپس ہوتے ہوئے میں ذرا EXCITED تھا۔ باتوں باتوں میں میں نے کہا "سہیل بھائی میں عجیب واہیات محکمہ میں پھنسا ہوا ہوں، ہر وقت پکڑ دھکڑ، مقدمہ، ضبطی اور تھانہ داری جیسا ماحول ہے۔ تخلیقی کام کا کوئی ماحول نہیں، لکھنے پڑھنے کی کوئی فضا نہیں۔ اگر کچھ دنوں تک اور ایسا ہی چلتا رہا تو داخلی اعتبار سے شاید میں مر جاؤں گا" انھوں نے جواب دیا "نہیں ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ایسے ہی تضاد اور تناؤ کے ماحول میں فنکار زندہ رہتا ہے۔ یہ تو تمہارے لئے بہت اچھا ہے کہ تمہاری تخلیقی صلاحیت اپنی تخلیقات کے لئے موقوف ہیں۔ اور استعمال ہوتی ہیں۔ اگر کسی ایسے شعبہ میں آ جاؤ گے جہاں لکھنے پڑھنے کا کام کرنا پڑے تو تمہاری تخلیقی صلاحیت کا بٹوارہ ہو جائے گا۔ اور تمہارے اپنے لکھنے پڑھنے کی رفتار پر منفی اثر پڑے گا۔ اس لئے کہ انسان کی صلاحیتیں بہرحال محدود ہوتی ہیں" میرا محکمہ تبدیل ہو گیا، مقابلتاً میں اب بہتر تخلیقی ماحول میں ہوں لیکن اب یہ احساس ہوتا ہے کہ سہیل بھائی نے کتنا صحیح کہا تھا۔

زندگی ایک نامیاتی حقیقت ہے اس بات پر ان کا ایمان تھا۔ ادب اور زندگی کے معنوی رشتے کے سہیل بھائی رمز شناس بھی تھے۔ سادگی اور بے تکلفی ان کے کردار کا طرۂ امتیاز اور صاف گوئی ان کی طبیعت تھی۔ میں نے ہمیشہ ان کو بے داغ سفید کرتا اور پائجامہ میں دیکھا ویسی ہی بے داغ ان کی سیرت بھی تھی۔ میری ہر خوشی اور ہر دکھ میں سہیل بھائی شریک رہے۔ سادہ لوح تھے اس لئے کبھی غلط لوگوں نے بھی ان سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن اس سے ان کی عظمت میں کوئی کمی نہیں آتی۔

اس پٹنہ میں لوگ ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے اپنے بعد کی تخلیقی نسل کے نمائندوں کو پھلنے پھولنے نہ دیا، کسی نے ملک سے باہر نکل کر پناہ پایا کسی نے صوبہ بدر ہو کر امان پائی لیکن یکتا تھے سہیل بھائی کہ وہ صحیح معنوں میں ہم سبھوں کے بھائی تھے، پوری ادبی برادری ان کی اپنی تھی اور حتی المقدور وہ ہر عزیز کی مدد کرتے تھے۔ یہاں ایسے بزرگوار بھی گزرے ہیں جنھوں نے اپنے جیتے جی ہی اپنے نام کے خصوصی شمارے شائع کروائے، خود اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر ان شماروں کو فروخت کروایا اور حلقہ بگوشوں سے اپنی بھرپور پبلسیٹی بھی کروائی لیکن آفریں ہے کہ سہیل بھائی نے ہمیشہ ایسی باتوں سے پرہیز کیا۔ کئی موقعوں پر میں نے دیکھا کہ اگر کسی نے ان پر کسی نمبر کی اشاعت کا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے سختی سے منع کیا۔ اگر کسی نے کوئی مضمون یا ریسرچ کی بات کہی تو انھوں نے ہمیشہ جواب دیا "اگر جی چاہے تو میرے مرنے کے بعد یہ سب کرنا" کون جانتا تھا کہ یہ وقت اتنی جلدی آ جائے گا۔ دوسروں کی طرح انھوں نے کبھی کوئی "انجمن امداد باہمی" قائم نہیں کی اور نہ ہی۔

"وہ مری ... تم مرا ......" کو روا رکھا۔ جیسے ... ہنس دلی اور صاف دلی سے ملے، دو ٹوک باتیں کیں، چائے پلائی یا پی لی اور بیگ اٹھاتے ہوئے رخصت ہوئے۔ محفلوں میں ہمیشہ ایک گوشے میں بے حد غیر نمایاں حیثیت کے ساتھ بیٹھتے۔ صدارت سے ہمیشہ پرہیز کرتے اور کچھ بولنے سے حتی الامکان گریز کرتے۔ یہ اس لئے نہیں تھا کہ وہ کوئی رائے نہیں رکھتے تھے بلکہ یہ اس لئے ہوا کرتا تھا کہ وہ اپنی سادگی اور خاکساری کو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتے تھے۔ ان کے ملنے والوں کا ایک بہت ہی بڑا حلقہ تھا۔ مجھے آج بھی اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ کیسے اتنے بڑے حلقہ کو نباہ پاتے تھے۔ میں نے ان کو کبھی اداس یا پژمردہ نہیں دیکھا۔ تبسّم زیرلب، بے داغ سفید کرتا، پان، لیموں کی سادہ چائے، رکشہ اور ہاتھ میں چرمی بیگ ـــ ان کی وضعداری کے وہ پہلو تھے جو آخر دم تک ان کے ساتھ رہے۔ ادب میں مقصدیت کے قائل ضرور تھے اور اس سلسلہ میں اپنی مستقل رائے بھی رکھتے تھے۔ لیکن ان معاصروں یا عزیزوں سے میں نے انہیں کبھی بھی الجھتے ہوئے نہیں پایا جو ادب برائے ادب یا جدیدیت کے علمبردار یا حامی تھے۔ اچھے فن پاروں پر بے اختیار اور کھل کر داد دیتے خواہ وہ کسی کے بھی ہوں۔ یاد آ رہا ہے کہ ایک مرتبہ اچانک میرے دفتر میں آئے اور فرمایا "ذرا جلدی چلو، تم سے ایک فلم پسند کروانا ہے" میں حیران کہ الٰہی ماجرا کیا ہے معلوم ہوا کہ کسی افسانہ کی داد یوں ملنے والی ہے۔ ذہن میں یادوں کا طوفان اٹھ رہا ہے ہر بگولہ مجھے منتشر کر دیتا ہے۔ خیالات کو یکجا کرنا مشکل ہوا جاتا ہے، باتیں گرفت سے باہر نکل جاتی ہیں۔ یادوں کے بگولوں کے درمیان میرا اس وقت جی چاہ رہا ہے کہ میں چیخ کر پوچھوں ـــ

"سہیل بھائی آپ کہاں چلے گئے ؟"

"سہیل بھائی آپ کہاں ہیں ؟"

"سہیل بھائی آپ کیسی جگہ رہتے ہیں کوئی جواب نہیں ملتا ؟"

"سہیل بھائی موت بھی کیا دنیا کا حادثہ ہے کہ جس کی کوئی منطق نہیں !"

لیکن آواز کا رشتہ جو کبھی قائم ہوا تھا وہ تو ٹوٹ چکا ہے۔ خداوند کریم انہیں جوارِ رحمت میں اعلیٰ و ارفع مقام عطا فرمائے۔ آمین !

کسی فن میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ریاضت ضروری ہے۔ جو شخص ریاضت نہیں کر سکتا، وہ کسی فن میں کمال بھی نہیں حاصل کر سکتا۔ یہ مسلمہ افسانہ نگاروں پر بھی عائد ہوتا ہے۔ جو افسانہ نگار اپنے فن میں ریاضت نہیں کرنا چاہتے وہ کبھی باکمال بھی نہیں بن سکتے۔ ایسے افسانہ نگار اگر ایک دو اچھے افسانے لکھ ڈالیں تو اسے محض اتفاق سمجھنا چاہئے، کارنامہ نہیں۔ کارنامہ وہی ہے جو ریاضت کا حاصل ہو۔

"سہیل عظیم آبادی"

سہیل صاحب اور اُن کا آخری خط

ڈاکٹر (سیّد) ارشد
دائرہ، بہار شریف

سہیل عظیم آبادی مرحوم کا نام زمانہ طالب علمی سے ہی سنتا آرہا تھا علی گڑھ کے قیام کے دوران میرے بعض اساتذہ اور ادب کے طالب علم ان کا نام بہت ہی احترام اور عقیدت کے ساتھ لیا کرتے تھے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو افسانہ نگاری پر ایک سیمینار منعقد ہوا تھا۔ اس میں میں بھی شریک تھا۔ اس سیمینار میں سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری پر سیر حاصل بحثیں ہوئی تھیں۔ مجھے اس وقت ایک خیال ہوا کہ بہار کے ادیب اور فنکار ہمارے باہر خراج عقیدت حاصل کر رہا ہے لیکن میری اب تک ان سے ملاقات کی سعادت حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ دل ان سے شوق دیدار کے لئے بیتاب رہا۔ پھر بھی یہ تمنا اس وقت پوری نہیں ہوئی جب تک میں مکمل طور پر بہار شریف منتقل ہو کر ڈاکٹری کو اپنا پیشہ نہیں بنالیا۔ بہار شریف آنے کے بعد میں اردو اور ہندی کی مختلف انجمنوں، محفلوں اور کمیٹیوں سے منسلک ہوا۔ طبابت کے ساتھ اپنے فطری ذوق کی تکمیل کے لئے ادب، اسپورٹس اور سیاست سے بھی وابستہ رہا۔

۱۹۶۷ء میں بہار اردو لائبریری، بہار شریف کی طرف سے آل انڈیا اردو مشاعرہ کا ہونا طے ہوا اور انتظامیہ نے میرے گلے میں چیرمین شپ کی گھنٹی باندھ دی میں اس گھنٹی کو بجا بجا کر باہر بڑے شاعر اور فنکار سے رابطہ قائم کرتا رہا۔ اسی دوران جناب سہیل عظیم آبادی (مرحوم) سے بھی خط و کتابت ہوئی۔ چونکہ سہیل صاحب اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو پٹنہ میں پروڈیوسر کی حیثیت سے تھے اور منظر امام صاحب ڈائرکٹر منظر صاحب سے بڑے ہی دوستانہ تعلقات ہیں۔ سہیل صاحب سے خط و کتابت ہوئی۔ چند ملاقاتیں ہوئیں۔ اس کے بعد تو سہیل صاحب سے اتنا قریب ہو گیا کہ برسوں کا فاصلہ چند ہی ساعت میں طے ہو گیا علی گڑھ سے بہار شریف تک کی وہ تمام دوریاں جن میں ارمان دل نیاز کی تمنا میں مچلا کیا تھا وہ سب اوجھل ہو گئیں۔ مئی ۱۹۶۷ء میں مشاعرہ ہوا اور بڑے دھوم دھام سے ہوا۔ سہیل صاحب کی شرکت نے محفل کی رونق میں اضافہ کر دیا اس مشاعرہ میں پروفیسر اختر اورینوی، جگن ناتھ آزاد اور محترم استاد پروفیسر معین احسن جذبی بھی آئے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ سہیل صاحب کے ان مہمان شعراء اور فنکاروں سے کتنے یارانہ اور بے تکلفانہ تعلقات تھے۔

مہر جسال، مشاورہ کی مدفون نوارات بھر کے لئے تھی۔ اب [illegible] کی یادیں باقی رہ گئی ہے لیکن سہیل صاحب سے [illegible] ہی ہوتا رہا۔ کبھی وہ خود راقم الحروف کے غریب خانہ پر تشریف لاتے، قیام کرتے، مختلف موضوع پر گفتگو ہوتی طرح طرح کے پروگرام بنتے، مستقبل کے لئے اسکیمیں تیار ہوتیں، کبھی میں انھیں [illegible] آتا وہ کرتا اور کبھی وہ مجھے صلاح دیتے۔ غرض کہ ان کی آمد کیا ہوتی — ایک انجمن کی آمد ہوتی — چلے جاتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ پوری انجمن اٹھ گئی۔ میں کچھ دیر کے لئے بجھا بجھا سا رہتا — اور پھر میں تمام یادوں کو الگ کر کے سرجری اور بیماری میں منہمک ہو جاتا — کیونکہ اس پیشہ کا تقاضا یہی ہے۔

مگر طبیعت ان سے دوری پر راضی نہیں رہی اور ان سے قربت حاصل کرنے کے لئے خط و کتابت کا سہارا لیتا رہا۔ سہیل صاحب خط کا جواب دیتے، جب بہت ہی مصروف ملے۔ میری طرف سے اگر تاخیر ہو جاتی تو خفگی کے اظہار سے بھی گریز نہیں کرتے۔ پٹنہ جانے پر اگر مصروفیت سے ان سے ملنے کا موقع نہیں دیا اور انھیں معلوم ہو گیا تو دوسرے ہی روز ڈاک سے شکایت نامہ لکھ بھیجتے۔

سہیل صاحب کے خطوط کیا ہیں — بے تکلفانہ باتیں۔ ان باتوں میں شفقت ہوتی، پیار ہوتا، ادبیت ہوتی، ادب اور روزمرہ کے مسائل پر روشنی ہوتی، صلاح و مشورے ہوتے اور پھر بہت سارے پروگرام جن سے سہیل صاحب کا ذہن کبھی خالی نہیں رہا۔

سہیل صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کے بے شمار خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔ میں انھیں خطوں کو سہیل صاحب سمجھ کر دیکھتا اور پڑھتا ہوں۔ ارادہ ہے کہ ان تمام خطوط کو ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کرا دوں۔

اکتوبر کے آخر ہفتہ میں سہیل صاحب اپنے ایک عزیز کی تقریب [illegible] میں شرکت کے لئے ولیسہ تشریف لے جا رہے تھے ولیسہ بہار [illegible] سے ۹ میل کی دوری پر ہے۔ بہار شریف میں رک گئے، میرے گھر تشریف لائے، میں اس وقت اپنی کلینک میں مریضوں کو دیکھ رہا تھا، مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور بیٹھتے ہی یہ حکم صادر فرمایا کہ سادی چائے پلاؤ۔ خوشی سے سادی چائے کی چند پیالیاں آئیں۔ سہیل صاحب کے ساتھ کچھ اور لوگوں نے بھی چائے پی لیکن سہیل صاحب کو اس چائے سے تشفی نہیں ہوئی۔ کہ انہوں نے کہا کیا کہ بنے ہوٹل کی جا سکے بجائی نہیں۔ ذرا گھر پر قاعدے سے بنوا کر پلاؤ —" ان کا حکم سر آنکھوں پر۔ چائے کا دوسرا دور بھی چلا۔ بہت ہی لطف اندوز ہوئے۔ ہم لوگ جب کھانے کے لئے دستر خوان پر بیٹھے تو کچھ چیزیں ان کی پسند کی بھی تھیں۔ اور کچھ چیزیں ایسی بھی تھیں جو ان کی پسند کی ہونے کے باوجود ان کے لئے مضر تھیں۔ وہ یہی چاہ رہے تھے کہ کوئی چیز چھوٹے نہیں لیکن ان کا بڑھا ہوا دست شوق یہ خیال کر کے رک جاتا کہ وہ Cholalesol Blood کے مریض ہیں۔ دستر خوان پر سہیل صاحب کی [illegible] دیکھنے کے لائق ہوتی۔ مختلف خاکے اور نقشے اسی دستر خوان پر بن جاتے۔ چنانچہ اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوا۔ کبھی یہ کہتے کہ "احوال" ہفتہ وار کا پھر سے اجرا کریں گے، کبھی یہ فرماتے کہ ایک سہ ماہی ادبی جریدہ نکالنے جا رہے ہیں، کبھی میرے جانک کے ترجمے پر تبصرہ کرتے اور یہ کہہ کر ہمت افزائی فرماتے کہ تم نے اچھوتا کام شروع کیا ہے، یہ ادب میں زندہ رکھنے والا کام ہے

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ راجگیر گئے۔ ویرایتن ہسپتال میں مجھے مریضوں کو دیکھنا تھا۔ میں ہفتہ میں ایک روز اعزازی طور پر اس ہسپتال میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔ میں ہسپتال چلا گیا۔ سہیل صاحب برادر عزیز شہاب دائز دی کے ساتھ راجگیر میں سیر و تفریح کرتے رہے۔ پھر رات کو ہم لوگ ساتھ واپس آئے اور سہیل صاحب نے میرے یہاں قیام کیا۔ وہ انجمن بن کر ہم لوگوں کے درمیان چھائے رہے۔ صبح ناشتہ کے بعد ولیسہ رخصت ہو گئے۔ یہی میری ان سے آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد [illegible] میں نے ان کی خدمت میں ایک خط لکھا جس کا جواب [illegible] نومبر ۹۱ء کے خط میں دیا۔ میرے نام سہیل صاحب یہ خط

بھی آخری۔ یہ خط بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ انجمن ترقی اردو کے جلسے میں شرکت اور پھر واپسی کے پروگرام کی باتیں کچھ تفصیلی انداز میں لکھی گئی ہیں۔ یہ وہی سفر ہے جو سفر سہیل صاحب کے لئے سفرِ آخرت ثابت ہوا۔ سہیل صاحب ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے۔ اس لئے یہ خط سہیل صاحب پر ریسرچ کرنے والوں کے لئے اہمیت کا حامل ہے۔ لہٰذا یہ پورا خط بغیر کسی ترمیم و اضافہ کے پیش کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

نور منزل، سلطان گنج۔ پٹنہ ۶

۸، نومبر ۱۹۷۹ء

برادرم۔ محبت

خط ملا۔ بیحد خوشی ہوئی۔ بھائی تم کو دیکھ کر رشک آتا ہے۔ ایک طرف طبابت امراض سے لڑائی، دوسری طرف ادب، تیسری طرف کھیل کود اور چوتھی طرف سیاست ـــــ ہر چیز کے لئے وقت نکالنا بڑا مشکل کام ہے۔ بہرحال مبارکباد۔ اللہ نے آپ کو شوق بھی دیا ہے اور صلاحیت بھی۔

سردست پروگرام اس طرح ہے ـــــ ۱۳، نومبر کی شام کو دہلی جا رہا ہوں۔ وہاں انجمن ترقی اردو کے سلسلے میں بعض دوستوں سے مشورے کرنے ہیں۔ پھر ۱۶ کو دہلی سے چنڈی گڑھ جانا ہے ۱۷ اور ۱۸، نومبر کو انجمن کے سالانہ جلسے ہیں۔ ۲۰، نومبر کو دہلی واپس آؤں گا۔ ایک ذاتی ضرورت ہے۔ ۲۲، کی شام کو دہلی سے روانہ ہو کر ۲۳، کو الہ آباد پہنچوں گا اور دو دن بعد پٹنہ آجاؤں گا۔ میرے ساتھ امرت رائے[1] بھی ہوں گے۔ ایک دن ان کو پٹنہ یونیورسٹی میں تقریر کرنی ہے پھر بہار شریف اور راجگیر کا پروگرام ہے۔ امرت رائے بیحد دلچسپ آدمی ہیں۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آپ جاتک[2] کہانیوں پر بھی بات کر سکیں گے۔

میں الہ آباد سے آپ کو خط لکھ دوں گا کہ کب بہار شریف پہنچنا ہے۔ زیادہ جلسوں کا انتظام مت کیجئے۔ ایک یا دو کا۔ امرت رائے بہت اچھے مقرر ہیں۔ لیکن ساتھ ہی تقریر کرنے سے بھاگتے بھی ہیں۔ ایک زمانے میں انگریزی کے لیکچرر تھے۔ شاید ہر روز تقریر کرنے سے گھبرا کر انھوں نے استعفا دے دیا۔ مذاق کی بات ہے۔ لیکن زیادہ جلسوں کا انتظام نہیں کیجئے وہ تقریر کرنے سے گھبراتے ہیں۔ ایک تو آپ کی طرف سے ہو نزہت کلینک میں اور دوسری اور کہیں۔ اس لئے بھی کہ وہ نالندہ جانا چاہیں گے اور پھر راجگیر بھی۔

آج جموں یونیورسٹی سے دعوت نامہ آیا ہے۔ ۲۹، ۳۰ نومبر اور یکم دسمبر کو یونیورسٹی میں پریم چند کے سلسلے میں تین دن کا سمینار ہے۔ جگن ناتھ آزاد کا اصرار ہے کہ اس میں شرکت کروں لیکن ممکن نہیں دہلی اور چنڈی گڑھ کا لمبا سفر کرنے کے بعد پھر جموں کا سفر کرنا ممکن نہیں۔ دوسرے ان تاریخوں میں پٹنہ میں مصروف رہوں گا جب ناممکن نہیں۔

اور حالات اچھے ہیں۔ لطیف سلمہ[3] باہر گئے ہوئے ہیں۔ آجائیں گے تو آپ کا خط ان کو دکھاؤں گا۔ بے چارہ بے حد مصروف رہتا ہے۔ شاید کل واپس آجائے اس کی مدد کیجئے اور اس کے حق میں دعا کیجئے۔

اور حالات اچھے ہیں۔ خدا کرے آپ اچھے ہوں۔ برادرم مصری اور شہاب کو سلام کہہ دیجئے گا۔

خیر اندیش

سہیل عظیم آبادی

یہ میرے نام سہیل صاحب کا آخری خط ہے۔ اس خط میں دہلی، چنڈی گڑھ اور الہ آباد کے سفر کا پروگرام ہے۔ الہ آباد سے

(بقیہ صفحہ پر)

[1] مشہور افسانہ نگار پریم چند کے صاحبزادے۔ [2] مہاتما گوتم بدھ کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی زبان پالی ہے اس کا میں اردو میں ترجمہ کر رہا ہوں [3] سہیل صاحب کے بڑے صاحبزادے۔



سہیل عظیم آبادی

ایک تاثر

ڈاکٹر حاتم رامپوری
شعبۂ اردو (پی۔ جی) بہار یونیورسٹی

چھوٹے لوگ مرنے کے لیے ہی جیتے ہیں اور بڑے لوگ ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے زندگی بھر مرتے رہتے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی بھی ایک عظیم انسان تھے اس لیے جینے کی آرزو میں زندگی بھر مرتے رہے بلاشبہ صد تحسین ہیں وہ لوگ جو دوسروں کے غموں میں تھوڑی ہی دیر کے لیے شریک ہو جاتے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی اپنی صحافت اور کہانیوں کے وسیلے سے ہمیشہ انسانیت کے دکھوں میں شریک رہے۔ ان کی جھولی میں بیواؤں کی شکستہ چوڑیاں، نادار کسانوں کا کرب، یتیموں کے آنسو، مزدوروں کی تھکن، مظلوموں اور بیکسوں کی بے چارگی کا اثاثہ بھی تو تھا جسے وہ اپنی تحریروں میں اپنے قلب ونظر کے ساتھ معاشرے میں تاحیات لٹاتے رہے۔

اپنی عملی زندگی میں بھی سہیل عظیم آبادی اپنے پرایوں کے دکھ درد میں شامل ہونے کے عادی تھے۔ ہمیشہ دوسروں کو خوشحال دیکھنے کی تمنا میں بجائے خود بدحال رہے، اپنی صحت خراب ہی سہی لیکن ہمیشہ دوسروں کی صحت کا خیال رکھا۔

بحیثیت فنکار سہیل عظیم آبادی ہندوپاک شہرت کے مالک تھے، انھوں نے پریم چند کی فنکارانہ روایات کو آگے بڑھایا۔ یہ پریم چند کے ہم عصر بھی تھے اور ان کی روایت کے آخری محافظ بھی۔ انھوں نے درجنوں افسانے لکھے، ان کے ناول بھی مقبول ہوئے، مختلف جرائد کی ادارت بھی ایک مخصوص انداز میں کی۔ سہیل عظیم آبادی نے ریڈیو پریس سے لیکر صحافت تک کے میدان میں اپنی انفرادیت کے نشانات چھوڑے ہیں۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں دیہاتی زندگی کی خوبصورت عکاسی ملتی ہے۔ سہیل عظیم آبادی ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر تھے اس لیے ان کے فن پاروں میں ترقی پسندی کی جھلکیاں موجود ہیں۔

سہیل عظیم آبادی کی زبان رواں دواں، صاف اور شستہ ہے وہ سیدھے سادے انداز میں ٹیڑھے میڑھے مسائل کی پیشکش میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ فنی سطح پر وہ ایک حد درجہ محتاط فنکار ہیں۔ کہانی لکھتے وقت عجلت پسندی سے گریز کرنا ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی کہانیاں رفتہ رفتہ ارتقا کے مراحل سے

کرتی ہیں اسی لئے ان کا اسلوب اردو افسانہ نگاروں کے درمیان قطعاً جداگانہ اور منفرد ہے۔

اپنے زمانہ طالب علمی میں پہلی بار سہیل صاحب کو اپنے استاد ڈاکٹر اختر اورینوی کی قیام گاہ پر دیکھا تھا لیکن یہ ایسا موقع نہیں آسکا کہ ان سے جان پہچان ہو، کچھ باتیں ہوں بس انھیں دیکھا ساحل سے سمندر کا تماشا دیکھنے کے مترادف تھا۔ انتہائی پرسکون، باوقار — لیکن ذات کی زیریں لہروں اور سمندر کے مدوجزر کا کرب محسوس کرنے کے لئے سمندر میں اترنا ناگزیر ہے۔ سہیل عظیم آبادی سے میری پہلی باضابطہ ملاقات پٹنہ ریڈیو اسٹیشن کے اردو سیکشن میں ہوئی۔ میں نے ان سے باتیں بھی کیں، مصافحہ بھی کیا اور ایسا محسوس ہوا کہ سمندر بے خطر ہے۔

دسمبر ۱۹۷۸ء کی ایک خنک شام میں میرے رفیق کار ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی کے ڈرائنگ روم میں سہیل عظیم آبادی سے اچانک ملاقات ہوئی۔ سہیل صاحب ڈاکٹر ہاشمی اور چند دوسرے احباب سے کچھ باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلام کیا اور سہیل صاحب نے سلسلہ گفتگو ختم کرتے ہوئے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ابھی مصافحہ مکمل بھی نہیں ہو پایا تھا کہ دور اندیش میزبان نے میرا مختصراً تعارف کرایا۔ کرسیاں خالی نہیں تھیں اس لئے میں اسی چوکی پر باادب بیٹھ گیا جس پر آلتی پالتی مارے سہیل صاحب بیٹھے تھے کسی سلسلے سے پرنسپل نول کشور گوڑ صاحب ذکر خیر جاری تھا سہیل صاحب لہک لہک کر اپنے پرنسپل دوست کی صفات حسنہ کا ذکر کر رہے تھے ڈاکٹر ہاشمی نے میرے متعلق مزید کچھ کہنا چاہا لیکن سہیل صاحب نے میرے کندھے پر تھپتھپاتے ہوئے کہا: "ارے بھائی قمر اعظم! میں عالم کو پہلے سے جانتا ہوں۔"

سہیل عظیم آبادی کے لمبے لمبے بال چاندی کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے بعض لٹیں بسا اوقات پیشانی پر جھول پڑتیں تو سہیل صاحب پورے ہاتھوں سے ہٹانے کا کام لیتے ہوئے سنوار دیتے۔ محویت کے عالم میں کشادہ پیشانی کی سلوٹوں میں افسانوی خیالات کی دھندلی جھلک ملتی۔ گھنے سفید بالوں کی سفیدی کمرے کے بلب کی روشنی میں خوب کھل رہی تھی۔ [illegible] کی معمولی سی ایک ادنیٰ چادر قدرے بے ترتیبی کے ساتھ اوڑھے ہوئے تھے۔ وہ مجھ سے میرے تحقیقی مقالے کے متعلق کچھ [illegible] تھے کہ اتنے میں میزبان نے کھانے کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے معدے کی خرابی کا ذکر کرتے ہوئے کہا: "مجھے روٹی بھات کھلا سکو تو لاؤ۔"

سہیل عظیم آبادی کا انداز تخاطب مشفقانہ اور دوستانہ تھا۔ گفتگو دھیمے لہجے میں قدرے ادب کے ٹھہرے انداز میں کرتے تھے۔ انداز گفتگو منطقی اور دلچسپ تھا۔ البتہ اپنے عزیزوں پر اپنے خیالات تھوپنے کے عادی نہ تھے، دوستانہ کہتے تھے اور سب کی سنتے تھے۔ نئی نسل کے لکھنے والوں سے بھی اکثر برابری کا سلوک روا رکھتے تھے۔ ان کی منکسر المزاجی ان کے دیگر تمام رویوں پر حاوی تھی۔

اس کے بعد سہیل صاحب سے متعدد بار ملاقاتیں ہوئیں اور میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سہیل صاحب ایک عظیم فنکار اور ایک عظیم انسان تھے۔ انھوں نے اپنے گلے میں اپنی عزت اور شہرت کا تمغہ کبھی آویزاں نہیں رکھا۔ وہ عملی زندگی کے تمام موڑ پر عام آدمیوں کی طرح نظر آتے تھے یہی ان کی شخصیت کا بانکپن تھا جس کی وجہ سے بلا امتیاز مذہب و ملت وہ زندگی بھر دوستوں کی جھرمٹ میں رہے۔ ادب اور اپنے لوگوں کے درمیان سہیل عظیم آبادی ایک پل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اب یہ پل ٹوٹ چکا ہے۔ کہانیاں لکھتے لکھتے سہیل عظیم آبادی بجائے خود پریوں کے دیس چلے گئے۔ اب ہم انھیں لاکھ پکاریں لیکن وہ ہم سے روٹھ چکے ہیں البتہ ان کی تحریریں ہمارا اثاثہ ہیں اس لئے ہمیں چاہئے کہ ہم انھیں ان کی کہانیوں کے کہرے سے نکال کر باہر لائیں اور الفاظ میں بکھری ہوئی ان کی ریزہ ریزہ شخصیت کو یکجا کرکے ان کی سالم تصویروں کا ایک ایسا البم تیار کریں جس سے ہماری آیندہ نسلیں فیض یاب ہو سکیں۔ ●●

علقمہ شبلی، کلکتہ

سہیل بھائی

سہیل عظیم آبادی کی موت کی خبر علمی و ادبی حلقوں پر بجلی بن کر گری۔ اس کرب کو ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے یکساں طور پر محسوس کیا اور اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ ذہن و دماغ میں یادوں کا ایک سیلاب امنڈ آیا۔

سہیل بھائی خطوط نہایت پابندی سے لکھا کرتے تھے۔ دہلی جانے سے پہلے انہوں نے مجھے ۸ر نومبر ۱۹۷۹ء کو خط میں لکھا۔

"آج اتفاق سے دو رسالے نظر آئے۔ ایچ اور نوخیز دونوں کی مجلس ادارت میں تمہارا نام دیکھ کر خوشی ہوئی خاص کر نوخیز کی مجلس ادارت میں۔ میں تو بچوں میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔

کلکتہ سے ایک بہت اچھا ماہنامہ جاری رہ سکتا ہے۔ اب بھی وہاں اتنے باصلاحیت لوگ موجود ہیں جو متحد ہو جائیں تو باہر سے کسی امداد کی ضرورت نہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اسے باقی رہنا چاہئے۔ گیا ایک چھوٹا سا شہر ہے تین رسالے جاری ہیں۔

اس خبر سے خوشی ہوئی کہ بنگال اردو اکادمی قائم ہو گئی غالب، اقبال، پریم چند اور دوسرے بڑے بڑے ادیبوں کی کتابیں بنگالی زبان میں ترجمہ ہو کر شائع ہونی چاہئیں۔ اور بڑے بنگالی مصنفوں کی کتابوں کے ترجمے اردو میں۔ تیسرے درجے کی اردو کتابوں کی اشاعت سے اعلیٰ ترجمے شائع کرنا ہر لحاظ سے مفید ہوگا۔

۱۳ر نومبر کو دہلی جا رہا ہوں۔ ۱۶ر اور ۱۸ر نومبر کو چند دنگڑھ میں انجمن ترقی اردو کے جلسے ہیں۔ دو دن وہاں رہوں گا۔ پھر دہلی واپس آ جاؤں گا۔ واپسی میں دو دن الٰہ آباد میں اترنے کا پروگرام ہے۔ اگر اکادمی میں فنڈ ہے تو پریم چند پر ایک سیمینار ہونا چاہئے۔ بنگالی زبان کے ادیبوں کو بھی شریک کرنا ضروری ہے۔ اردو اور ہندی کے ادیب تو ہوں گے ہی۔ آٹھ دس مقالے پڑھے جائیں اور کتابی شکل میں شائع ہو جائیں۔ ہم لوگ دہلی میں پریم چند پر ایک انٹرنیشنل سیمینار کر رہے ہیں جس میں یورپ اور ایشیا کے بہت سے ادیب شرکت کریں گے۔ سیمینار مارچ یا اپریل میں ہوگا۔ انشاء اللہ جنوری میں ملاقات ہوگی۔"

خیر اندیش

سہیل عظیم آبادی

سہیل بھائی کو اردو زبان و ادب سے عشق تھا۔ وہ اس کی ترقی اور فروغ کے لئے ہمیشہ کوشش کرتے رہے برسوں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ رہے اور چھوٹا ناگپور کے آدی باسیوں میں اردو کی ترویج و اشاعت کا کام کرتے

رہے۔ کچھ ان کی فطرت اور کچھ مولوی عبدالحق کی صحبت نے ان میں وہ سادگی اور قناعت پسندی پیدا کر دی تھی جو آج سے کچھ دنوں پہلے تک عوامی کام کرنے والوں کے لئے طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ ہمیشہ کھدر پہنا کرتے اور کھانے پینے میں بھی خاص اہتمام نہ تھا۔ ویسے تو انجمن ترقی اردو ہند سے ان کا تعلق بہت ہی پرانا اور گہرا تھا لیکن ملازمت کے دوران دفتری مصروفیتوں کی وجہ سے اس کام کے لئے زیادہ وقت دینا ممکن نہ تھا۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد گذشتہ آٹھ دس سالوں سے انجمن کے کاموں میں نہایت سرگرمی سے حصہ لینے لگے تھے۔ اور اسی سلسلے میں مئی ۱۹۷۳ء میں انہوں نے پہلی بار مجھے خط لکھا۔ وہ انجمن ترقی اردو ہند مغربی بنگال کے حالات جاننا چاہتے تھے اور اسے متحرک بنانے کے خواہاں تھے۔ اس غرض سے وہ یہاں آئے اور مختلف لوگوں سے ملے بھی اور ان سے جو کچھ ہو سکا وہ کیا۔

سہیل بھائی میں کام کرنے کا ایسا لگن تھا کہ جو ذمہ داری لے لیتے تھے اسے احسن طور پر انجام دینے کی کوشش کرتے تھے۔ کچھ دنوں پہلے ان پر قلب کا دورہ پڑا اور ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق کچھ دنوں تو انہوں نے آرام کیا لیکن پھر آہستہ آہستہ اسی پرانے ڈگر پر چلنے لگے۔ کھانے پینے میں احتیاط ضرور تھا لیکن علمی و ادبی کاموں میں پھر پہلے ہی کی طرح لگ گئے۔ دوستوں کی نصائح اور عزیزوں کی درخواست پر مسکرا کر رہ جاتے اور کبھی کبھی کہتے "موت تو وقت ہی پر آئے گی جو کام کرنا ہے اسے کر لینے دیجئے"۔ امراض قلب کے مریضوں کے لئے سفر میں بڑے احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے لیکن وہ اس کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو ہند کے جلسے سے واپسی ہی میں ان پر قلب کا دورہ پڑا اور گھر سے دور اللہ کو پیارے ہو گئے۔

سہیل صاحب کا تعلق ان افسانہ نگاروں سے ہے جنہوں نے جدید افسانے کے پیش رو منشی پریم چند کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ سہیل بھائی صحیح معنوں میں پریم چند کے وارث تھے اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے دیہاتی مسائل اور عام لوگوں کی مشکلات کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ وہ ترقی پسند خیالات رکھتے تھے اور سیکولر دل و دماغ کے مالک تھے۔ انہوں نے اردو افسانے کو وہ توانائی اور زندگی بخشی ہے جس سے ان کا نام اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔

ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "الاؤ" ہے۔ اس کے بعد دوسرا مجموعہ "نئے پرانے" شائع ہوا۔ ادھر چند سالوں میں ان کا ایک ناولٹ "بے جڑ کے پودے" اور افسانوں کا مجموعہ "چار چہرے" شائع ہوئے جن پر اتر پردیش اردو اکادمی اور بہار ہندی ساہتیہ سمیلن نے انعامات دیئے۔ "بے جڑ کے پودے" اردو ناولٹ میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ریڈیو کے لئے انہوں نے بے شمار ڈرامے بھی لکھے۔ گذشتہ سال اپریل میں ان کا ایک ڈرامہ آل انڈیا ریڈیو کلکتہ سے نشر ہوا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ کلکتہ آئے بھی تھے۔ کسے معلوم تھا کہ یہ ان کا کلکتے کا آخری سفر ہوگا۔ جنوری میں پھر آنے والے تھے مگر اس سے پہلے ہی سفر آخرت کو روانہ ہو گئے۔ سہیل صاحب مختلف اخبارات اور رسائل سے بھی وابستہ رہے۔ روزنامہ "ساتھی" کے بانی ایڈیٹر تھے۔ عبدالقیوم انصاری مرحوم کے اشتراک سے پٹنہ سے ماہنامہ "تہذیب" جاری کیا۔ جس نے ایک ادبی مقام بنا لیا تھا لیکن حالات کی ناسازگاری سے اسے بند کر دینا پڑا۔ ہفتہ وار "حال" بھی پٹنہ سے جاری کیا مگر یہ بھی زیادہ دنوں تک نہ چل سکا۔ ان دنوں پھر سنجیدگی سے کہانی لکھنے کی طرف متوجہ تھے جن میں سے کئی شائع بھی ہوئیں۔

سہیل صاحب ایک عرصے تک کلکتہ میں بھی رہ چکے ہیں اور یہاں کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں سے ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ اسی لئے کلکتہ اور مغربی بنگال میں اردو کی رفتار سے دلچسپی رکھتے تھے۔ انجمن ترقی اردو کے علاوہ مغربی بنگال اردو اکادمی کے قیام کی بھی ان کو فکر تھی۔ چنانچہ بنگال کے سابق وزیر اعلیٰ شری سدھارتا شنکر رے سے بھی وہ اس سلسلے میں ملے تھے۔ موجودہ بائیں بازو کی حکومت سے بھی وہ بڑے پر امید تھے اور کہا کرتے تھے کہ اب مغربی بنگال میں اردو والوں کو کام کرنے کا اچھا موقع ملا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہاں اردو والوں کی بے حسی پر افسوس بھی کرتے تھے۔ جب اردو اکادمی کا قیام یہاں ہوا تو انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور پھر اس کے رسمی افتتاح کی خبر سے جو مسرت انہیں ہوئی اس کا اظہار مندرجہ خط میں موجود ہے۔

سہیل صاحب باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے ان میں خشکی اور تنک مزاجی نام کو نہ تھی۔ وہ ہر سطح کے آدمی سے اسی کے انداز میں ملا کرتے تھے۔ وہ بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان اور سنجیدہ لوگوں میں سنجیدہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر محفل کی زینت تھے۔ نوجوان انہیں اپنا دوست اور رہنما سمجھتے تھے سہیل صاحب بھی جہاں تک ممکن تھا ان کی ہمت افزائی کرتے۔ ان کے مسائل کو حل کرتے اور ان کی ہر طرح مدد کرتے۔

شہیل بھائی آج ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ ان کی باتیں، ان کا خلوص، ان کی اپنائیت خون کے آنسو رلا رہی ہے۔ میرے لئے تو ان کی موت ذاتی نقصان ہے۔ کلام حیدری کے الفاظ میں " آج بھی الاؤ جل رہا ہے مگر اس کے اردگرد بیٹھے ہوئے سبھی لوگ خاموش ہیں، کیونکہ ان میں سے سب سے اچھی کہانی کہنے والا اُٹھ گیا ہے "

عورت کا دل

عورت کا دل اتھاہ سمندر ہے جس کی گہرائی کو ناپنا کسی کے بس کا کام نہیں۔ بہت سے فنکاروں نے اس اتھاہ سمندر کی گہرائی میں غوطے لگانے کی کوشش کی ہے اور سالہا سال کی کوششوں کے بعد انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ وہ گہرائی کو ناپ نہیں سکے۔ جتنی گہرائی میں اترتے گئے انہیں یہی اندازہ ہوا کہ اب بھی وہ سطح پر ہی تیر رہے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس گہرائی میں کون کون سے خزانے پوشیدہ ہیں۔

عورت کا دل
وہ پھول ہے جس میں ہزاروں پھولوں کی خوشبو ایک ساتھ ملتی ہے اور بڑے بڑے صاحب نظر کے لئے ان پھولوں کی خوشبو کو پہچاننا ناممکن ہے کہ اس ایک پھول میں کون کون سے پھولوں کی خوشبو ملی ہوتی ہے۔

عورت کا دل
وہ آگ ہے جو کبھی دھیمی رہ کر دلوں کو گرماتی ہے اور کبھی تیز ہو کر دوسروں کو جلاتی ہے اور کبھی خود ہی بجھ کر راکھ کا ڈھیر بن جاتی ہے۔

" شہیل عظیم آبادی "

میرے تاثرات

از

رمز عظیم آبادی

سہیل عظیم آبادی مرحوم جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے قلم کانپ رہا ہے برصغیر ہندو پاکستان میں پریم چند اسکول کے صحیح نمائندہ تھے۔ ان کا فن، ان کا اسلوب جداگانہ اہمیت کا حامل تھا۔ ان کی نگاہ کبھی سطح کے اوپر نہیں رہتی تھی بلکہ وہ حالات کی تہہ اور ذہن تک پہونچ جاتی تھی۔ وہ فنکار جو فن کو عبادت سمجھتا ہے اور فن مقصد حیات کی خدمت۔ ایک اچھا انسان جب ادب میں داخل ہوتا ہے تو ماحول کا کرب اپنا کرب سمجھتا ہے۔ سہیل عظیم آبادی ایک زمیندار خاندان کے فرد تھے مگر انھوں نے عملی زندگی اور ادب میں کوئی تضاد نہیں رکھا۔ "الاؤ" ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے گو وہ ابتدائی کاوش ہے مگر جو پختگی زبان و بیان کا آہنگ ہے اور یہی ماحول کی عکاسی ہے۔ الاؤ پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف خود اس طبقے کا نمائندہ ہے جن کی وہ کہانیاں ہیں۔ سہیل عظیم آبادی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ صرف لفظوں کے طلسم میں قاری کو الجھاتے نہیں بلکہ وہ جو محسوس کرتے تھے اسے عام فہم زبان میں پڑھنے والوں تک پہونچا دیتے تھے۔ یہ خوبی اسی فنکار میں ہوتی ہے جو ماحول کا کرب جھیلتا ہے۔ سہیل عظیم آبادی کی انسان دوستی کا اظہار افسانوں کے علاوہ بھی کرتے ہیں یہی انسان دوستی کا جذبہ ابھرتا ہے صفحہ قرطاس پر بے جھجک پودے، چاہے جس پہ شاہکار کا اضافہ ہوتا ہے میری نظر میں ان کے شہکار جتنے بھی افسانہ نگار ہیں یا تو لفظوں کی بھول بھلیاں میں پھنسے ہوئے ہیں یا صرف ایک تحریک کا پروپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجھک محسوس نہیں ہوتی ہے کہ کرشن چندر جیسا بین الاقوامی شہرت کا ادیب بھی صرف سطح پر رہا ہے۔ کبھی ماحول کی گہرائیوں میں اتر کر حالات کا جائزہ نہیں لیتا۔ کرشن چندر کے جتنے بھی افسانے ہیں ایسا لگتا ہے کہ بند کمرے میں صوفے پر بیٹھ کر لکھے گئے ہوں۔ کرشن چندر کہانی کار کی حیثیت سے کہانی تو سناتے ہیں مگر خود اپنی کہانی کے کسی کردار میں نظر نہیں آتے جس طرح کوئی اپنے دریچے میں بیٹھ کر آنے جانے والوں کا جائزہ لے اور الگ تھلگ رہ کر گزرنے والوں کے حالات لکھا جائے ظاہر ہے کہ وہ اس کرب سے آشنا ہو ہی نہیں سکتا ہے جو اس بھیڑ میں شامل نہ ہو۔ سہیل عظیم آبادی اپنی کہانیوں کے کردار میں نظر آتے ہیں جیسے کہ وہ خود ہی تمام حالات کا کرب، دکھ، بھوک، مایوسی، نامرادی کو جھیلے ہوئے ہیں۔ یہ اس لئے کہ سہیل عظیم آبادی رانچی سے کشمیر تک کچلے ہوئے طبقے کے ساتھ اپنا رابطہ بناتے ہوئے تھے۔

ان کے ملنے والوں میں جہاں کلیم الدین احمد اور اس قبیلے کے لوگ وہاں ایک رکشہ مزدور سے لے کر بیڑی مزدور تک بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں سہیل عظیم آبادی کو جانتا ہوں۔ سہیل عظیم آبادی

کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ نئے شاعروں نئے ادیب نئے افسانہ نگار سہیل کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے اور حتی الامکان عوام میں متعارف کراتے۔ میں اپنی مثال دیتا ہوں کہ جب سہیل عظیم آبادی تہذیب نکال رہے تھے میں نیا نیا عظیم آباد کے شعری ماحول میں داخل ہوا تھا اور کسب معاش کے لئے رکشا چلاتا تھا۔ سہیل عظیم آبادی نے مجھ سے ملاقات ہونے پر شفیع الرحمن شمیم اڈیٹر روشنی کو تاکید کی کہ مجھ سے رکشا کو واپس کرنے میں جب شفیع الرحمن کے ساتھ تہذیب کے دفتر میں ملا تو مجھ سے کلام سنانے کی فرمائش کی میں نے کچھ غزلیں سنائیں سہیل عظیم آبادی نے میری بڑی ہمت بڑھائی اور میں جو احساس کمتری کا شکار رہتا بڑی حد تک انہوں نے اس مرض سے بچا لیا اور تہذیب جیسے رسالے میں اس دور کی غزل شائع کی میری مالی حالت جب بھی خراب ہوئی تو سہیل صاحب نے ایک سچے بہی خواہ کی حیثیت سے امداد فرمائی میرے جیسے بہت سے لوگ ہیں جنہیں سہیل عظیم آبادی تعاون دیا کرتے تھے۔ ایک بڑا انسان، ایک بڑا ادیب۔ ایک اچھا دوست آج موت کی دھند میں کھو گیا مگر ان کی روشن کی ہوئی مشعل ہمیشہ روشنی بکھیرتی رہے گی آنے والی نسلیں سہیل عظیم آبادی کو خراج عقیدت دیتی رہیں گی۔ پریم چند کی انجمن آج بغیر شمع کے اندھیرے میں ڈوب چکی ہے۔ اب کون اس انجمن کو روشن کرے۔ بہار کا یہ عظیم نقصان جس کی تلافی مستقبل قریب میں ممکن نہیں۔ افسانہ نگار تو پیدا ہوتے رہیں گے سہیل عظیم آبادی کے جیسا انسان پیدا ہونا ممکن نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جو کام وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں اگر ارشد الرحمن جو ان کے چھوٹے صاحبزادے ہیں چاہیں تو پورا کر سکتے ہیں۔

"تا زیست رہے مائل افکار سہیل"

جناب سہیل عظیم آبادی کی یاد میں

محمد زبیر ماہتاب سیوانی

قوم و ملت کے تھے غمخوار سہیل
آج دنیا ہے عزادار سہیل
تاریکی میں تھے مطلع انوار سہیل
رندوں کے لیے بادۂ پندار سہیل
اردو کے لیے باعث فخر و نازش
تا زیست رہے مائل افکار سہیل
خلد آشیاں ہو گئے دنیا چھوڑ دی
دامن ہے مرا تار تار سہیل
خدمات ادب نمایاں ان کی
نام آتا ہے زباں پر بار بار سہیل

تم لوٹ کے اب نہ آؤ گے کبھی
جان کر دیں گے ہم نثار سہیل
تحسین کے قابل تھے تمہارے سب کام
گلزار ادب کیلئے تھے بہار سہیل
دیوانۂ تہذیب جدید تھے تم
بکھیر دیں تمہارے بے شمار سہیل
کیوں دے دیا داغ فرقت ہم کو
روتے ہیں آج در و دیوار سہیل
آکاش ادب کے ماہتاب تھے تم
چھا گیا اس پہ اب غبار سہیل

پروفیسر شمیم الدین احمد خاں
صدر شعبۂ اردو و فارسی بی۔ کے رائے کالج، دھنباد

سہیل عظیم آبادی

——— ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

اگر عظیم آباد فخرِ بہار ہے تو سہیل فخر عظیم آباد تھے۔ شاد و ودود، عظیم و کلیم اور اختر و معنی کی اس سرزمین میں ان گنت اور بے شمار گل بوٹے کھلے ہیں اور ان کی خوشبو سے عظیم آباد ہمیشہ معطر رہے گا لیکن ایک خاموش سنجیدگی جو دل کی جان تھی اب اس محفل میں کہاں؟ وہ ایک خاموشی جس پر ہزاروں تکلم فدا ہوتے تھے، کہاں سے لاؤں؟ سہیل سے کوئی جاکر کہے کہ ؎

نہ تکلم، نہ ترنم، نہ تبسم کم کم
حسن سب بھول گیا اپنی ادا تیرے بعد (دانش)

اور اس طرح پریم چند کا آخری پیرو بھی اٹھ گیا — عشق کی انتہا یہ ہے کہ محبوب کے قدموں میں دم توڑ دے۔ سہیل نے کبھی روایتِ عشق سے بغاوت نہیں کی۔ ویسے بھی سہیل باغیانہ ذہن سے دور تھے۔ چاہے وہ ادبی زندگی ہو یا ان کی ذاتی زندگی — وہ زندگی کے لئے ہموار راہوں پہ کنارے کنارے چلتے رہے شاید اسی لئے کبھی ٹھوکر بھی نہیں کھائی۔ اپنے سماج، ماحول اور گرد و پیش کا جتنا گہرا مشاہدہ سہیل نے کیا، کہیں اور نظر نہیں آتا ——

سہیل ایک اچھے انسان تھے، شریف اور بہت نیک۔ ان میں درد دل بھی تھا، پاس وفا بھی اور جذبۂ ایمان بھی، یعنی آدمیت اور انسانیت کی ساری خوبیاں ان میں موجود تھیں۔ ؎

دردِ دل پاسِ وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا (چکبست)

چند لمحے کی گفتگو میں بھی یہ ضرور پوچھتے کہ "وہاں کی ادبی فضا کیسی ہے؟" اگر لوگوں کی بے حسی کا ذکر اور اپنی مایوسی کا اظہار کیا گیا تو حوصلہ افزائی کرتے اور کچھ نہ کچھ کرتے رہنے اور مایوس نہ ہونے کی تلقین کرتے جاتے — چھوٹوں کے ساتھ بھی گفتگو کا ایسا انداز ہوتا کہ "نوجوانی کی ساری رنگینی اور شوخ مزاجی بھی مہذب بنی دست بستہ کھڑی رہتی ہے"

منٹو کے بارے میں عام خیال ہے کہ اس کے ذہن نے مرعوب ہونا نہیں سیکھا تھا۔ لیکن احمد ندیم قاسمی کی شرافت سے اس قدر مرعوب ہوا کہ جب بھی کچھ لکھنے کی کوشش کرتا "شریف" کا لفظ نوک قلم پر آ جاتا — کچھ یہی حالت اور اسی قسم کی الجھن سے سہیل عظیم آبادی پر لکھتے ہوئے مجھے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ شاید سہیل نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ جب لوگ آپ کی شخصیت کے آئینے جھانکیں گے تو انہیں کیا ملے گا بجز "نیک دل، صاف ذہن اور شریف" کے؟ آج زکی انور زندہ ہوتے تو کیا لکھتے، مرزا قمر کی تحریر کے بعد وہی ایک لفظ جس کی زبان سے ادا ہوگا بہت سہل لیکن

زندگی میں برت لینا بہت مشکل۔ اردو اساتذہ کی سالانہ کانفرنس (رانچی) میں نامور ادبا، شعراء سے گفتگو کر رہے ہیں۔ ٹھہرا ہوا لہجہ، اردو کی باتیں، پیشانی پر فکر کی لکیریں، کسی کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں اور کیا لکھوں ؟ بس یہ کہ شریف اور بہت اچھے انسان۔ مولانا آزاد کے مطابق "وہ زندگی کیا ہوئی جس کے دامن خشک کو کوئی غلطی تر نہ کر سکے وہ چال ہی کیا جو لڑکھڑاہٹ سے یکسر معصوم ہو" میں نہیں کہہ سکتا کہ سہیل کے دامن خشک کو کوئی غلطی تر کر سکی تھی یا نہیں۔ لیکن یقین ہے کہ ان کی چال ساری زندگی لڑکھڑاہٹ سے محفوظ اور اعتدال کی راہ پر گامزن رہی — سہیل کی ملاقات سے پہلے تجربات اس شعر کو درست مانتے تھے کہ

مہر و اخلاص و وفا، دوستی و لطف و کرم
یہ وہ الفاظ ہیں جو صرف کتابوں میں ملیں

جب ان سے ملاقات ہوئی تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کہہ رہے ہوں "سچ آپ ہوں، میں ایسا انسان سے مایوس ابھی..." وہ خود بھی مہر و اخلاص و وفا دوستی و لطف و کرم کا پیکر لگے۔ بہ حیثیت افسانہ نگار سہیل کو پریم چند ثانی کہا جا سکتا ہے وہ سائنس کی دنیا، خلاؤں کے سفر اور تخیلاتی ماحول کی تصویر کشی نہیں کرتے بلکہ ہر افسانہ کا موضوع وہی سماج وہی گرد و پیش، وہی پس منظر اور وہی ماحول ہوتا ہے جس میں ہم آپ سانس لیتے ہیں۔

ان کی کہانی "پارک" سیٹھ آتمارام اور ان کی پتنی سرلا دیوی کی کہانی ہے۔ آتمارام اپنی پتنی سرلا دیوی کے ساتھ ہر روز اس پارک میں جاتا جسے اس نے اپنے باپ کی یادگار کے طور پر تعمیر کرایا تھا اور اس پارک کے بیچ میں اپنے بدصورت باپ کی خوبصورت مورتی نصب کرا رکھی تھی — اس پارک میں آتمارام کو بڑا سکون ملتا تھا۔ آتمارام کے دادا بھولا رام صرف ایک دھوتی پہنے اور ایک لوٹا لئے شہر آئے تھے۔ اور پھر جیسے جیسے لوگوں کا خون کم ہوتا گیا بھولا رام کی دولت بڑھتی گئی — اس کے باپ کرپا رام نے ہر اس ذریعہ کو اپنایا جس سے دوسروں کی دولت سے اپنا گھر بھرا جاتا ہے۔ آتمارام جو اب خود بھی ساٹھ کی پیٹ میں تھا، دولت کی فراوانی، ذہنی سکون اور جسمانی عیش سب کچھ میسر تھا اور اب خاندان کی عزت بڑھانے کی فکر ہوتی۔ لیکن ایک دن وہ اپنی پتنی کے ساتھ اپنے تعمیر کردہ پارک میں بیٹھے تھے کہ ایک نوجوان کی آواز کانوں میں پڑی۔

• دوسروں کو لوٹ کر دولت اکٹھا کی اب باپ دادا کے نام پر یادگاریں بنائی جا رہی ہیں...... بھولا رام نے ہمیشہ غریبوں کا خون چوسا تھا، جونک تھا جونک —" اور آتمارام سوچ رہے تھے کہ اتنے خوبصورت پردوں کے بعد بھی لوگوں کو اصل شکل نظر آ جاتی ہے۔" پارک صرف کرپا رام، بھولا رام اور آتمارام کی کہانی نہیں بلکہ ہر اس آدمی کی کہانی ہے جو دولت کے حصول کے لئے غریبوں کے جسم میں جونک بن کر چمٹ جاتا ہے اور آخری قطرہ خون تک چوس لیتا ہے۔

• بدصورت لڑکی "چندرا"، سماج کی اُن ساری لڑکیوں کی نمائندگی کرتی ہے جو سیرت، نیکی، خلوص، جذبہ ہمدردی اور سگھڑاپے کا پیکر ہوتی ہیں لیکن حسن صورت کی کمی ان کی ساری خوبیوں کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔ سماج کی یہ چندرائیں سبھوں کے دکھ درد میں شریک ہوتی ہیں، دوسروں کے غم کو اپنا غم سمجھتی ہیں لیکن ان کے جذبات کو سمجھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ سماج کے سارے مراری بابو چندراؤں کو بہن بنا سکتے ہیں لیکن انہیں قبول کر کے شریک غم و مسرت بنانا گوارا نہیں کر سکتے اور آخر یہ بدصورت لڑکیاں گھٹ گھٹ کر

مرجاتی ہیں اور اپنے ہاتھوں سے اپنے جذبات و احساسات کا گلا گھونٹ دیتی ہیں۔

"ساوتری" سماج کے اس بدنام محلہ کی تاریک گلیوں میں رہنے والی ایک طوائف ہے۔ وہ بدنام محلہ جسے کہیں سوناگاچی اور کہیں دال منڈی کہا جاتا ہے۔ جہاں واقعات و حادثات کی شکار لڑکیاں پناہ پاتی ہیں اور پھر اپنے تقدس اور اپنی پاکیزگی کو پیٹ کی خاطر نیلام کر دیتی ہیں۔ صرف پیٹ کی خاطر ۔۔۔ لیکن ہر ساوتری کے دل کے کسی نہ کسی گوشے میں پُر وقار اور باعزت زندگی کی خواہش ضرور ہوتی ہے لیکن ہمارے سماج کے لوگ ایسی ساوتریوں کو سماج کے نام پر ایک کلنک اور کوڑھ کا داغ کہتے اور رات کے اندھیرے میں ان کے جسم کے نشیب و فراز میں بھٹک جانے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں ۔۔۔ اگر ہمارے سماج میں چند بانکے لاہری پیدا ہو جائیں اور ان کی تاریک زندگی میں روشنی کی چند کرنیں بھی ڈال دیں تو ان ساوتریوں کی زندگی سنور جاتے۔ انہیں اپنا مقام مل جائے۔ اور پھر ہر ساوتری وفا اور پاکیزگی کا پیکر ہوگی۔

اسی طرح سہیل کے افسانوں میں "گرم راکھ" کی بدھیا اور روپا اور "کانچی" کا ملبیشن ایسے کردار ہیں جن سے ہم روز ملتے ہیں، باتیں کرتے ہیں لیکن انہیں پرکھنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے۔ سہیل نے ہمیشہ چلتی پھرتی دنیا کے کردار کو پیش کیا ہے اور پھر یہ کہ ان کے کردار پتھر کو موم بنانے پر تیار کھڑے نظر نہیں آتے یہ سارے کردار ہم آپ میں سے چنے جاتے ہیں۔ جو شعلہ بھی ہیں شبنم بھی، راکھ بھی ہیں چنگاری بھی ۔۔۔ مجھے کہنے دیجئے کہ ہر خیال اور ہر تحریک و رجحان کے لوگوں میں سہیل کو یکساں مقبولیت حاصل تھی ۔۔۔ سہیل کا اسلوب صاف، سادہ اور سہل رہا ہے۔ انہوں نے کبھی مبہم، گنجلک، غیر واضح اور غیر سنجیدہ الفاظ میں گفتگو نہیں کی ۔۔۔ آپ کے پلاٹ میں کوئی جھول نہیں ہوتا ۔۔۔ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ کی ذاتی زندگی کی طرح ادبی زندگی بھی صاف و شفاف تھی ۔۔۔ ایسا آئینہ جس میں کوئی بال نہیں۔ !!!

بیادِ سہیل عظیم آبادی

کہرام مچ رہا ہے، قضا کر گیا ہے وہ
تڑپا گیا ہے سب کو یہ کیا کر گیا ہے وہ
انسان تھا عظیم کہ اپنی حیات میں
انسانیت کا قرض ادا کر گیا ہے وہ

ماحول سوگوار ہے اس بات کی دلیل
جو کام کر گیا ہے، بجا کر گیا ہے وہ
اب اس کی لو سے روشنی لے پائے کوئی
روشن چراغِ نقشِ وفا کر گیا ہے وہ

سیراب وہ حصیرؔ ہوا، میں ہوں تشنہ کام
اس کے خیال اس کے عمل کو مرا سلام

حصیر نوری
محمد پور۔ ڈھاکہ۔ بنگلہ دیش

رضوان احمد خاں (اس۔ پی۔ کالج۔ دمکا)

سہیل صاحب
میری نظر میں

سہیل صاحب سے میری ملاقات یا رسم و راہ ایسی تو نہ تھی جسے دیرینہ کہوں (ایسا ممکن بھی نہ تھا کیونکہ ہم دونوں کے درمیان پوری ایک پیڑھی کا فاصلہ موجود تھا) تاہم اس کی جو نوعیت تھی وہ ایسی بھی نہ تھی جسے "سرراہے" کا لقب دوں۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ سہیل صاحب کی شخصیت اور ان کا مزاج ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ جس سے ملے اسے اپنا بنا لیا ایسا کرنے میں رنگ و نسل، مذہب و عقیدہ یا سماجی و طبقاتی تفرقے ان کی راہ میں کبھی حائل نہ ہوئے۔ وہ جس سے ملتے اپنوں کی طرح ملتے اور پورے خلوص سے ملتے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ عمر یا پوزیشن کا فرق بھی ان کے آڑے نہیں آتا تھا۔ وہ جس طرح اپنے ہم عمر احباب میں ہوتے بالکل اسی طرح نوجوانوں کی محفل میں بھی دیکھے جاتے۔ وہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ بزرگانہ سے زیادہ دوستانہ برتاؤ رکھتے اور اسی ضمن میں اپنی ادبی، سرکاری، ذاتی یا سیاسی شخصیت کو یکسر پس پشت رکھ کر خالص انسانی انداز میں Behave کرتے تھے۔ دوست داری اور دوست نوازی ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ ان کے مسلک میں ملاقات کی نوعیت ہمیشہ خصوصی اور مخلصانہ ہوتی "سرراہے" کی ملاقات سہیل صاحب کے مسلک و مزاج میں کوئی چیز ہی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے احباب کا حلقہ نہایت وسیع تھا اور آج انہوں نے اچانک داغ مفارقت دے کر نہ صرف اپنے صوبے یا ملک میں رہنے والے بلکہ اس کرۂ ارض پر بسنے والے بے شمار افراد کے دلوں کو ملول اور آنکھوں کو پرنم کیا ہے ہر شخص اسی احساس سے دل گرفتہ ہے کہ اس کا ایک مخلص دوست بچھڑ گیا۔ سہیل صاحب کا اخلاق اور ان کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی جو لوگوں کو بے ساختہ اپنی جانب کھینچ لیتی تھی۔

میں پٹنہ میں رہ کر بھی ایک مدت تک ان سے کتراتا رہا صرف اس لئے کہ انہیں جب بھی دیکھتا کچھ نوجوانوں کے گھیرے میں دیکھتا۔ اور یہ صورت دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوتا کہ یہ شخص بھی دوسرے اکثر اشخاص کی طرح حاشیہ برداروں اور خوشامدیوں کو پسند کرتا ہے۔ ایسے ہر شخص سے مجھے کبیدہ خاطری رہی ہے۔ اگرچہ حالات اور وقت کے تھپیڑوں نے بعض اوقات ایسے حضرات کے حلقوں میں بھی کچھ لمحات گزارنے پر مجبور کیا ہے لیکن مجبوری کی بات اور ہے یہاں تو ایسی کوئی بات تھی نہیں اس لئے سہیل صاحب سے قریب ہونے یا اس حلقے میں جو ان کے گرد تھا شامل ہونے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی اور نہ ہی شامل ہوا۔ لیکن کبھی صورت یوں بھی ہو جاتی ہے کہ جس چیز سے جتنا اجتناب کیا جائے وہ اسی شدت سے پیچھا کرتی ہے۔ چنانچہ یہ اتفاق مجھ کو بھی پیش آیا اور ایک دن اچانک خود کو اس حلقے میں گھرا ہوا پایا جس سے ہمیشہ کتراتا تھا ______ ملاقات ہوئی، تعارف ہوا، کچھ رسمی خیر و عافیت کے بعد چھٹکارا ملا لیکن یہ چھٹکارا نہایت عارضی ثابت ہوا کیوں کہ آئندہ جب بھی سامنا ہوا، بچ کر نکلنا مشکل ہو گیا۔ سہیل صاحب (اللہ انہیں کروٹ کروٹ آرام نصیب فرمائے) ہونٹوں پر مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ بلا جھجک آگے بڑھتے، حال پوچھتے، پیٹھ تھپتھپاتے اور یا تو رخصت دیتے یا ہاتھ پکڑ کر کسی چائے خانے کا رخ کرتے۔ ظاہر ہے کہ اس دام شفقت و محبت سے کوئی خود کو کب تک بچا سکتا تھا۔ وہ بھی ایک شہر میں رہ کر! جلد ہی یہ

بات ذہن نشین ہوگئی کہ سہیل صاحب کے گرد حاشیہ برداروں یا خوشامد بیٹھوں کا حلقہ نہیں بلکہ ان گرفتاروں کا حلقہ ہے جو اپنے صیاد سے اس درجہ مانوس ہو چکے ہیں کہ اب قفس سے نکل کر کہیں جانے کا تصور بھی انہیں روح فرسا محسوس ہوتا ہے۔ سہیل صاحب کی شخصیت میں کشش ہی کچھ ایسی تھی۔

میں نے لکھنے لکھانے سے متعلق کبھی کوئی مشورہ ان سے نہیں لیا تھا۔ ایک بار جب وہ بہار اردو اکادمی کے سکریٹری تھے، مجھ سے کہا: "تم تو مضامین لکھتے ہو" زبان وادب کے لئے کوئی مضمون دو نا!" میں نے کہا: ایک مضمون تو ہے لیکن پہلے سے آپ کو دکھانا ہوگا"۔ انہوں نے کسی فرصت کے دن گھر پر طلایا۔ میں وہ مضمون لیکر گیا۔ مجھے جلد ہی اپنے کمرے میں بلالیا۔ وہ کتابوں، رسالوں، خطوط اور مسودوں کے درمیان گھرے بیٹھے تھے، کہا: پہلے چائے پیو اس کے بعد مقالہ سنوں گا" ستینے کی نفیس پیالیاں میں سادہ چائے آئی، ہم دونوں نے پی، پھر اپنا کام شروع ہوا (یہ [illegible] نے یہ مقالہ بیدار صاحب کی فرمائش پر خدا بخش لائبریری کی سیمنار میں پڑھنے کے لئے تحریر کیا تھا جو وقت پر مکمل نہ ہو سکنے کے سبب نہیں پڑھا جاسکا تھا) مقالے کا عنوان تھا "محسن اور ان کے افسانے"۔ سہیل صاحب نے نہایت توجہ سے لفظ بہ لفظ سنا اور تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں، بس اسی طرح دیدو۔ "زبان وادب" میں شائع ہونے والا میرا یہ پہلا مقالہ [illegible] تھا۔

چائے کا ذکر آگیا ہے تو یہ بھی بتاتا چلوں کہ سہیل صاحب کو سادہ چائے زیادہ عزیز تھی۔ مولانا آزاد کی طرح وہ بھی اسے دودھ کی کثافت سے آلودہ کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ پٹنہ میں رحمانیہ کے سامنے چند بک اسٹالز ہیں جہاں اردو کے ادبی رسائل اور کتابیں نیز تازہ بہ تازہ ادبی اطلاعات مل جاتی ہیں چنانچہ ادب کے مریضوں کے لئے اس مقدس مقام کا کم از کم ایک چکر روزانہ لگا لینا راحت روح اور طمانیت قلب وذہن کا سبب ہوتا ہے جو صحت وزندگی کے لئے از بس ضروری ہے۔ ساتھ ہی ایک لطف یہ بھی ہے کہ رحمانیہ میں چائے اچھی ملتی ہے۔ اگرچہ اس مسئلے پر اجماع کا اتفاق نہیں البتہ اکثریت کا ضرور ہے۔ ایک شام وہیں جب سہیل صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے چائے کی پیشکش کی۔ انہوں نے کہا "نہیں، یہاں اچھی چائے نہیں ملتی۔ چائے پینی ہے تو میرے ساتھ چلو۔" میں ساتھ ہولیا۔ وہ سبزی باغ سے نکل کر پچھم جانب ہو لئے۔ میں نے سوچا کسی نفیس ریستوران کا رخ ہوگا مگر نہیں، میوہ فروشوں کے حلقے سے کوئی پچاس ساٹھ قدم آگے جانے پر بائیں جانب عیسائیوں کا پرانا قبرستان ہے جس کا دربان ہی (شاید) گیٹ پر ایک جھونپڑی لگا کر چائے فروخت کرتا ہے۔ سہیل صاحب وہاں پہنچ کر رک گئے۔ ہم دونوں ایک طرف خالی بنچ دیکھ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے چائے بنانے کا حکم دیا، ساتھ ہی کچھ ہدایات بھی۔ چند لمحوں کے بعد چائے آئی جو سادہ تھی اور نہایت ذائقہ دار۔ اس روز انہوں نے بتایا کہ میں سادہ چائے ہی زیادہ پسند کرتا ہوں اور یہ (دکاندار) چائے اچھی [illegible]

[illegible] نے سہیل صاحب کو جب دیکھا اور جانا اس وقت وہ اپنی عمر کی آخری منزل میں پوری طرح داخل ہو چکے تھے ——— میانہ (بلکہ کچھ اور دبتا ہوا) قد، اکہرا جسم، لمبے اور سفید بال، آنکھیں خاصی نمایاں، رکش اور جاندار جن پر عینک بھی ہوا کرتی تھی، باریک ہونٹوں پر پان کی سرخی، آواز بھاری اور بارعب پیشانی فراخ کرے آزاد، چہرہ بشاش یا متوازن، کھدر کا سفید کرتا پائجامہ جس پر صدری کبھی ہوتی، کبھی نہیں ہوتی تھی۔ جاڑے کے موسم میں یا خاص موقعوں پر شیروانی اور ٹوپی کا بھی اضافہ ہوتا۔ بیکار بیٹھے یا لایعنی خوش گپیوں میں وقت ضائع کرنے کو گناہ سمجھتے تھے۔ لکھنے پڑھنے سے جو وقت بچتا اس میں مقامی احباب سے ملنا اور غیر مقامی احباب کو خطوط لکھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ مطالعے سے اس درجہ شغف تھا کہ انہیں قلب کا پہلا دورہ

اور مکمل آرام کے لئے معالجوں کا مشورہ بھی ان شغل سے باز نہ رکھ سکا۔ ایک شام جب عیادت کے لئے ہسپتال گیا تو سرہانے رکھی ہوتی کتابیں، پرچے اور قلم دوات دیکھ کر میں نے کہا کہ آپ بیمار ہیں اور کامل آرام کی ضرورت ہے، پھر یہ ساری کتابیں کیوں یہاں منگا رکھی ہیں؟ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا: "میں کیا کروں، طبیعت نہیں مانتی۔ مگر انہیں کیسے چھوڑ دوں؟ ڈاکٹر آتے ہیں تو انہیں چھپا دیتا ہوں"۔ میں نے جب اصرار کیا کہ ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرنا ضروری ہے تو کہا: "ارے بھئی جانے بھی دو! جو اللہ کو منظور ہوگا وہ ہو کر رہے گا۔ مجھے تو ان کے ساتھ ہی سکون ملتا ہے"۔ —— معالج کی ہدایات پر صرف اتنا عمل کیا کہ انہوں نے پہلے دورے کے بعد سگریٹ اور پان یکسر ترک کر دیا مگر کتب کو فراموش نہیں کر سکا —— حقہ پینے لگے۔ دفتر میں بھی اس کا اہتمام کرتے۔ چپراسی تازہ چلم بھر کر رکھ جاتا تھا۔ سہیل صاحب ایک ہاتھ میں حقے کا نیچہ اور دوسرے میں قلم سنبھالے اپنے کام میں مصروف رہتے۔

سہیل صاحب نے ڈاکٹر عبدالمغنی کے ساتھ مل کر اردو کے فروغ کے لئے کام کئے، محکمۂ نشر و اشاعت کی ملازمت بھی کی، صحافی بھی رہے سیاست سے بھی دلچسپی رکھی۔ لیکن انہیں اصل شہرت ملی وہ ان کے افسانوں کی وجہ سے ملی۔ سہیل صاحب نے اردو افسانہ نگاری کو وہ کچھ دیا ہے جسے تاریخ ادب فراموش نہیں کر سکتی۔ پریم چند نے جس روایت کی داغ بیل ڈالی تھی سہیل صاحب نے بہت خلوص اور ایمانداری سے نہ صرف اسے قائم رکھا بلکہ آگے بڑھایا۔ پریم چند سے انہیں قلبی لگاؤ تھا اور خود کو وہ ان کی روایات کا امین سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے کبھی اس ڈگر سے انحراف کی کوشش نہیں کی۔ باوجودیکہ محرکات کی کمی نہ تھی۔ پریم چند نے جس طرح اپنے افسانوں کو خالص دیہاتی فضا میں پروان چڑھایا، ٹھیک اسی طرح سہیل صاحب نے بھی اپنے قلم کو انہی مسائل کی عکاسی کے لئے وقف کر دیا جو دیہاتوں میں سانس لینے والے پسماندہ، کچلے ہوئے اور محنت کش طبقوں کو درپیش رہے ہیں۔ پریم چند سے اپنے اس رشتے کو انہوں نے، مرتے دم تک ان کے گھر میں جان دے کر اور بھی پختہ

کر دیا ہے۔ اگرچہ اس میں ان کے ارادے کو کوئی دخل نہ تھا لیکن مشیت کو ان کی موت سے یہ استعارہ پیدا کرنا ضرور مقصود تھا کہ

"دیکھو! میں ساری عمر تمہارے پتا کی روایت کا امین رہا مگر اب یہ بار امانت مجھ سے نہیں اٹھ سکتا کیونکہ اب اس امانت کی واپسی کا وقت بھی قریب آ پہنچا ہے جو مجھے مشیت نے سونپی تھی اور جس کی واپسی میں رخصت یک لمحہ بھی ممکن نہیں۔ اس لئے اب یہ امانت میں تمہیں واپس دینے آ گیا ہوں کہ پریم چند کے صحیح وارث آخر تمہیں ہو! اسے لو! اور گواہ رہنا کہ مجھ پر خیانت کا الزام نہ آئے۔ زندگی نے جب تک وفا کی مجھ سے اس میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔ اب فرصت زیست محض چند لمحوں کی ہے۔ میں تمہارے پاس اس لئے بھی آ گیا ہوں کہ تم بھی میرے جنازے کو کندھا دے سکو ورنہ جلد پہنچنے کے لئے تمہارے پاس نہ جانے مناسب وقت ہو کہ نہ ہو اور اگر پہنچو بھی تو شاید مجھے نہ پا سکو۔" غرض یہ وہ جامع اور بلیغ استعارہ ہے جس کی تعبیر مختلف پہلوؤں سے ہو سکتی ہے اور ہوتی رہے گی۔

سہیل صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ وہ اب اس مقام پر ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ لیکن ان کی طبعی سادگی، انسان دوستی، انتھک محنت اور بے پایاں خلوص ہی ہمارے لئے مشعل راہ بن سکتا ہے۔

سہیل صاحب کی رحلت کے بعد ہر جانب سے تعزیتی پیغامات آ رہے ہیں۔ ادبی رسائل و جرائد انہیں خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں جنہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا غم کسی ایک طبقے، کسی ایک جماعت، کسی ایک گروہ یا کسی ایک ملت کا غم نہیں بلکہ پوری انسانیت کا غم بن گیا ہے۔ سلطان اختر نے روح سہیل کو یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

صد مخزن الفاظ و معانی تھے سہیل
تہذیب و شرافت کی نشانی تھے سہیل
خاموش ہوئی بزم فسانہ اختر
اس دور کی اک لمبی کہانی تھے سہیل

تہذیب کے خوش رنگ نوشتے تھے سہیل
عظمت زینت ایام گزشتہ سے تھے سہیل
ہر سمت سے اب مدح سرائی ان کی
انسان کے بھیس میں فرشتہ تھے سہیل

"آہنگ" نے کہا اس ایک جملے میں کیا بے پناہ کرب سمٹ آیا ہے:-

"آج بھی الاؤ جل رہا ہے مگر اس کے ارد گرد بیٹھے سبھی لوگ خاموش ہیں، کیونکہ ان میں سے سب سے اچھی کہانی کہنے والا اٹھ گیا ہے"

روح سہیل سے یہ حسرتناک سوال بھی "آہنگ" ہی کا ہے کہ:-

"آپ کے ساتھ کیا کیا دفن ہو گیا، یہ آپ نے دیکھا ہے؟"

اور "عصری آگہی" نے تو گویا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے :—

"راکھ کے نیچے ابھی کچھ کچھ آگ باقی تھی جو ہوا کا جھونکا آنے پر ذرا جاگ اٹھتی پر ایک لمحہ میں پھر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔ وہ پھر جھجکتے ہوئے الاؤ کے پاس آ بیٹھا اور راکھ کو کرید کرید کر اپنے ٹھنڈے جسم کو گرمانے لگا۔

اسی راکھ کے پاس زمین پر وہ چادر اوڑھ کر سو گیا۔

(پریم چند — پوس کی رات)

اس دھرتی پر یہ الاؤ نصف صدی تک روشن رہا۔ وہ اردو زبان کی روشنی، حرارت اور حلاوت کو دور دور تک پہنچاتا رہا۔ وہ اس دھرتی کے دبے کچلے انسانوں کے رستے زخموں، ان کی محرومیوں اور دکھوں کی درد بھری کہانیاں سناتا رہا۔ وہ حقیقت پسندی اور انسان دوستی کی عظیم روایات کو زندگی کے نئے حقائق سے جوڑ کر فن کی نئی جہات دکھاتا رہا۔ وہ اردو زبان، ادب اور انسان کی خدمت گزاری کے لئے اپنے عہد کے سیکڑوں نوجوانوں کے حوصلے بڑھاتا رہا وہ جو بے کراں درد مندی اور بے پایاں خلوص و محبت اور یگانگت کا الاؤ بن کر زندہ رہا۔ ۲۹ نومبر کو اچانک بجھ گیا، راکھ ہو گیا اور دھرتی کی چادر اوڑھ کر سو گیا ہم عہد کرتے ہیں کہ اس الاؤ کو اپنی روح میں روشن رکھیں گے"

اب جبکہ سہیل صاحب صفحۂ وجود پر نہ رہے، کئی رسائل ان کے فن اور شخصیت سے متعلق اپنے خاص نمبر شائع کرنے کی باتیں کر رہے ہیں جو ان کی زندگی میں نہ ہو سکا وہ اب ہونا چاہتا ہے۔ گویا ہم، جو روایت پرستی سے خود کو الگ رکھنے کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اور کسی کو روایت پرست کہہ دینے پر بپھر جاتے ہیں، آج بھی "قدر مردم بعد مردن" کے ہی اسیر نظر آتے ہیں۔

— ••• —

ہر ایسی کہانی کو جس میں جنسی تحریک کا ذکر ہو، عریاں کہہ دینا اور ہر اس کہانی کو جس میں بھوک کا ذکر ہو سیاسی پروپگنڈہ کہہ دینا بالکل غلط بات ہے۔ جنس اور بھوک دو بڑی جبلی طاقتیں ہیں، جو ان کے اندر حرکت پیدا کرتی رہیں۔ اگر یہ دونوں صلاحیتیں انسان سے چھین لی جائیں تو پھر اس میں کچھ نہیں رہ جائے گا اور اور کہانی کے لئے مواد کا ملنا بھی مشکل بلکہ ناممکن ہوگا۔ ان دونوں صلاحیتوں کا اعتراف کرنا لکھنے والے کا پہلا فرض ہے البتہ ہر مسئلے کو سنجیدہ بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے۔ جنسی کہانی کے لئے عریانی اور بھوک کی اہمیت جتانے کے پروپگنڈہ کی ضرورت نہیں۔ دونوں مسئلوں میں اثر پیدا کرنے کے لئے سنجیدگی ضروری ہے۔

سہیل عظیم آبادی

مناظر عاشق ہرگانوی
صدر شعبۂ اردو مارکھم کالج ہزاری باغ (بہار)

سہیل صاحب ـــــ ایک تعزیتی نوٹ

سہیل ۔۔ بادلا ۔ دب کی ابدی قدروں پر توجہ دینے کے بجائے اپنے فن کو اپنے وقت کی سیاسی سماجی اور اصلاحی تحریکوں سے اظہار کا ذر ۔ بنایا۔ وہ زندگی کے معمولی واقعات، اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور دکھوں کو اس طرح پیش کرتے رہے جیسے وہ واقعات عام افسانوں سے ساتھ گذرتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں پریم چند اسکول سے وابستہ سمجھا جاتا ہے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے رفیق کار اور پریم چند کے جانشین تھے۔ وہ پرانی تہذیب کے امین اور بہترین نفیس انسان تھے۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود وہ مجھ سے بھی بے حد قریب تھے۔ جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اپنے تعلقات اور کوششوں سے وہ نئی اور پرانی نسلوں کے درمیان زبردست رابطے کا کام کرتے رہے اور اسی طرح زندگی کے تسلسل کو ہمواری وہم آہنگی کے ساتھ آگے بڑھانے کی انہوں نے کوشش کی۔

سہیل صاحب سے میری پہلی ملاقات ۲ مئی ۱۹۶۷ء کو ہوئی۔ ۲ مئی کو بہار شریف میں بہار اردو لائبریری بہار شریف کے زیر اہتمام مقامی سرکس میدان میں ڈاکٹر اختر اورینوی کی زیر صدارت ایک شاندار مشاعرہ ہوا تھا جس میں اس وقت کے نائب وزیر اعلیٰ ستیندر (؟) کرپوری ٹھاکر بھی شریک ہوتے تھے اور اردو کے حق میں ولولہ انگیز تقریر کی تھی جس کا چرچا بہت دنوں تک رہا تھا۔ اس مشاعرے میں میں بھی مدعو تھا۔ اسے اتفاق کہئے یا میری گوشہ نشینی کہ اس وقت تک بہار کے کسی بھی بڑے ادیب یا شاعر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں ان دنوں ہند و پاک کے تقریباً تمام چھوٹے بڑے رسائل میں چھپ رہا تھا۔ اس لئے میرے نام سے سبھی واقف تھے ــــ مشاعرہ ۹ بجے رات سے شروع ہوا۔ اور پچھلے ۳ بجے رات تک چلتا رہا۔ مقامی لوگوں کے علاوہ دور دور سے آئے شعرا نے سامعین کو نوازا تھا۔ صدر مشاعرہ ڈاکٹر اختر اورینوی، جگن ناتھ آزاد، معین احسن جذبی، رضا نقوی واہی، رضا کریم رضا، عبدالرحمن حیشی (؟)، کلیم عاجز، مہجور شمسی، حفیظ بنارسی، علقمہ شبلی، ظہیر صدیقی، فرحت قادری، صبر رضوی گیاوی، حسن بہاری، شکیب ایاز، امتیاز احمد ماہر، نگہت عظیم آبادی، سہیل ہمدم، راجندر ادیب، ہری ہر تواری، شہزاد مسعودی، آراسی، ارشد منیر، پرشاد عاشق، ادیب قادری وغیرہ نے مشاعرہ کا کار ۔ ابتدا میں پروفیسر معین خان چلا رہے تھے، پھر یہ سرداری انہوں نے سہیل صاحب کو سونپ دی۔ سہیل صاحب آل انڈیا ریڈیو پٹنہ کی طرف سے یہ مشاعرہ

صدا بند کرنے کے لئے گئے تھے۔ مشاعرہ شروع ہوا تو میں اپنی باری کا منتظر تھا۔ یکے بعد دیگرے تقریباً سبھی شعراء پڑھ چکے۔ صرف اختر اورینوی اور معین احسن جذبی باقی رہ گئے تھے کہ میرا نام پکارا گیا۔ اور جب غزل پڑھ کر میں اسٹیج سے اترنے لگا تو سہیل صاحب نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ بولے "آپ اتنے نوجوان ہیں میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے چھپنے ہوئے مضامین سے بھی آپ کم عمر نہیں لگتے۔ اسی لئے آپ کو پڑھوانے میں مجھ سے یہ غلطی ہوئی۔ میں آپ کو بالکل بزرگ سمجھ رہا تھا۔ بہر حال مل کر بے حد خوشی ہوئی۔"

مجھے مزید نروس کرنے کے لئے جگن ناتھ آزاد بولے "Oh, you are so young"

انہوں نے بھی بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ سہیل صاحب نے ہی جذبی، اختر اورینوی اور ڈاکٹر ندرا امام سے مجھے ملوایا۔ ندرا امام مشاعرہ سننے کے لئے آئے تھے۔ سہیل صاحب سے اسٹیج پر بہت ساری باتیں ہوئیں۔ ان سے مل کر اور متاثر ہو کر آگے بڑھا ہی تھا کہ رضا لنقوی واہی صاحب نے مجھے اپنے پاس کھینچ لیا۔ وہ اپنی منڈلی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

اس پہلی اور یادگار ملاقات کے بعد سہیل صاحب سے خط و کتابت شروع ہو گئی۔ انہوں نے دس بارہ سال کی مدت میں مجھے ایک سو سے زیادہ خطوط لکھے ہوں گے اور سینکڑوں بار اُن سے ملاقات ہوئی ہوگی۔ یادوں کا ایک سلسلہ ہے جو ذہن کے گوشے میں محفوظ ہے۔

سہیل صاحب کا پہلا خط مجھے ۱۱ر مئی سنہ ۶۷ء کو ملا تھا۔ یہ خط ۹ر مئی کا لکھا ہوا ہے۔

پٹنہ۔ ۹ر مئی ۶۷ء

برادرم! سلام و دعا

آپ کا خط ملا۔ خوشی ہوئی۔ واقعی میں نے آپ کو اتنا کم عمر نہیں سمجھا تھا۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور آپ بڑے بڑے کام کر سکیں۔

مجھے نوجوانوں کو آگے بڑھتے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ ہر اچھا کام انفرادی ہونے کے باوجود سب کا ہوتا ہے۔ ادب کا بھی یہی حال ہے۔ میں نے آپ کے کچھ مضامین پڑھے ہیں۔ اور یہ دیکھ کر بطور خاص خوشی ہوئی ہے کہ آپ سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ یہ بڑی بات ہے۔ اسے نبھائیے۔ سنجیدگی مضامین کی قیمت میں اضافہ کرتی ہے اور سنجیدگی سے علاحدگی اس کی قیمت کو کم کر دیتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ سستی شہرت کے پیچھے نہ دوڑیئے۔ اس کی زندگی کم، بلکہ نہیں کے برابر ہوتی ہے پوری ایمانداری کے ساتھ کام کرتے جایئے کم لکھئے لیکن اتنا اچھا کہ لوگ آپ کو بھلا نہ سکیں۔ سستی شہرت کے تمام ذرائع کو اپنے اوپر حرام کر لیجئے۔ صرف اسی حال میں آپ اچھا کام کر سکیں گے۔ میری اس بات کو ہمیشہ یاد رکھئے۔ کم سے کم میں نے سدا اسی پر عمل کیا ہے اور ہر نوجوان کو یہی مشورہ دیتا ہوں۔

انٹرویو کا مسئلہ بھی اسی قسم کا نظر آتا ہے۔ میرے لئے بھی اور آپ کے لئے بھی۔ میں نے ایک بار تیج کے نمائندے کو مختصر سا انٹرویو دیا تھا۔ اور جب شائع ہوا تو پچھتایا تھا۔ اس لئے کہ واقعی پڑھنے والوں کو کچھ زیادہ نہیں ملتا۔ اس لئے اگر اسے چھوڑ دیجئے تو اچھا ہے۔ مجھے ان لوگوں پر رحم آتا ہے، جو ادیب بننا چاہتے ہیں اور دوسروں کو انٹرویو دے کر زندہ رہنا

ہا ہتے ہیں۔ جس طرح مزدور اپنی محنت کے مطابق مزدوری کا مستحق ہوتا ہے۔ اسی طرح ادیب بھی اپنی تخلیقات کی حیثیت کے مطابق عزت اور زندگی کا مستحق ہوتا ہے۔ اسے ہمیشہ معیار پر جانچئے اور اس کی قیمت مقرر کیجئے۔

مگر خط و کتابت آپ جاری رکھیں تو مجھے خوشی ہوگی۔

خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔

خیر اندیش

سہیل عظیم آبادی

سہیل صاحب کو سمجھنے کے لئے ان کا یہ خط بھی بے حد اہم ہے۔

علا منزل، سلطان گنج، پٹنہ ۶

Sohail Azimabadi

۲۵ مئی ۱۹۷۶ء

برادرم دعائیں۔

آپ کا خط مورخہ ۲۲ مئی کو ملا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ آپ نے میرے بارے میں اتنی جلد رائے قائم کر لی۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ بلکہ نہ آپ اپنے ساتھ انصاف کر رہے ہیں اور نہ میرے ساتھ۔ اور وہ بھی اس حال میں کہ جب آپ میرے خلاف بہت سی باتیں سن چکے ہیں اور اب آپ کو میری شکایت کرنے والوں پر غصہ بھی آنے لگا۔ اتنے کمزور مت بنئے کہ دوسروں کے کہنے پر فوراً یقین کر لیجئے اور تھوڑی دیر بعد رائے بدل دیجئے بلکہ جب کوئی کچھ کہے تو سنئے اور اسے پرکھنے کی عادت ڈالئے۔ اپنا تجربہ سب سے قیمتی شئے ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں بہت معمولی انسان ہوں اور ساری انسانی کمزوریاں مجھ میں موجود ہیں۔ کوشش کرتا ہوں کہ دل میں رہیں۔ کبھی کوئی کمزوری ابھر بھی سکتی ہے۔ میں کمزوریوں سے خود کو

مبرا نہیں سمجھتا۔ اور یقیناً مجھ میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو دوسروں کو پسند نہیں آ سکتیں۔ لیکن اس معاملے میں مصلحت پسندی یا مصالحت کا میں قائل نہیں ہوں۔ میں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی کہ کون میرے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے۔ اور نہ میں اس بات پر مصر ہوں کہ ہر آدمی مجھ سے خوش رہے یا مجھے اچھا سمجھے اور کہے۔ اگر میں لوگوں کے بارے میں رائے رکھنے میں حق بجانب ہوں تو دوسرے میرے بارے میں بھی کوئی رائے رکھنے کا حق رکھتے ہیں۔ البتہ اگر ایمانداری کی بنیاد پر ہو تو مستحسن ہے۔ اگر کوئی خواہ مخواہ میرے بارے میں غلط باتیں کہے تو کہاں تک پیچھا کرتا رہوں گا۔ البتہ مجھے اپنی سماجی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ اگر میں کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتا ہوں تو پرکھ کے بعد اور ایمانداری کے ساتھ رائے قائم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ دوسرے اگر یہ نہیں کرتے تو میں یقیناً ذمہ دار نہیں ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ کن لوگوں نے میرے خلاف آپ سے شکایتیں کیں۔ اور جاننا بھی نہیں چاہتا۔ اور اگر جان بھی جاؤں تو نہ اس کے خلاف میرے دل میں کبھی انتقام کا جذبہ پیدا ہوگا اور نہ کبھی اس سے ذکر بھی کروں گا۔ البتہ اس آدمی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کا حق مجھے بھی پہونچ جائے گا۔

ہمارا سماج آج منافقت کے کہرے میں لپٹا ہوا ہے۔ یہ کہرا ہی کسی کی شکل پہچاننے نہیں دیتا۔ اس پر غضب یہ ہے کہ سماج میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اپنے چہروں پر نقاب ڈالے رہتے ہیں۔ کچھ لوگ کئی نقاب ڈالے رہتے ہیں اور ان کی اصل شکل نظر ہی نہیں آتی۔ آپ یکے بعد دیگرے نقاب ہٹاتے جائیے پھر بھی اصل چہرے کا پتہ نہیں چلتا۔ ابھی آپ نوجوان ہیں اور بڑی حد تک زندگی کی کشاکش سے دور۔ اس لئے آدمیوں کو

پہچاننے کا موقع نہیں ملتا۔ لیکن مستقبل آپ کو بہت سے ایسے سبق دے گا کہ آج جو خواب آپ دیکھ رہے ہیں دھواں دھواں نظر آنے لگے گا۔ اور بڑی مایوسی ہوگی اور اتنی زیادہ کہ کبھی اعتماد ٹوٹنے لگے گا۔

میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں کہ کچھ لوگ میرے خلاف شکایتیں کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو میرے خیالات کی وجہ سے مجھے پسند نہیں کرتے۔ کچھ لوگ ہیں جو میری دو ٹوک باتوں کو پسند نہیں کرتے۔ کچھ لوگ کسی اور وجہ سے۔ کچھ اور کسی وجہ سے۔ یعنی میں سب کے توقعات پورے نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ میں ہر ایک کے توقع کے مطابق خود کو ثابت کروں۔ اور یہ ممکن بھی نہیں۔ اس لئے یہ بات میرے لئے بے معنی ہے کہ کون میری شکایت کرتا ہے اور کون تعریف کرتا ہے۔ تعریف اور برائی، دونوں سے میں خود کو الگ رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

آپ نے میرے بارے میں اتنی جلدی رائے بدل لی، اسے میں اچھا نہیں کہہ سکتا۔ میں اپنے دماغ کی نارسائی کا اعتراف کر لوں کہ مسلسل بیس تیس سال کے تعلقات سے بھی لوگوں کو نہ پہچان سکا۔ اب کچھ لوگوں کو پہچاننے کا موقع ملا ہے تو اُن سے الگ ہو گیا ہوں۔ اب ان سے ملنے کا ارادہ نہیں ہے۔ یہ مجھ میں کمزوری ہے۔ جب کسی سے نباہ نہ ہو سکے تو الگ ہو جاتا ہوں۔ چنانچہ ادھر متعدد لوگوں سے تعلقات اس طرح ہو گئے جیسے کبھی ملاقات نہیں تھی۔ اور اس کا ذرا غم نہیں بلکہ پچھتاوا یہ ہے کہ آخر اتنے دنوں تک میں ساتھ کیوں رہا۔ وہی چہرے پر نقاب والی بات آ جاتی ہے۔

اپنے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ مومن ہونے کا دعویدار نہیں۔ کافر بھی ہو سکتا ہوں لیکن منافق ہرگز نہیں ہوں۔ کفر مجھے گوارا ہے لیکن منافقت کو برداشت کر ہی نہیں سکتا۔ اس کی فکر نہ کریں کہ کون میرے بارے میں کیا کہتا ہے۔ جب میں فکر نہیں کرتا تو آپ فکرمند کیوں ہوتے ہیں۔ آپ کو ابھی زندگی کا طویل سفر طے کرنا ہے۔ اور اس سفر میں آپ کی ملاقات طرح طرح کے [illegible] اللہ میاں نے آپ کو آنکھیں دی ہیں۔ کم سے کم چار آنکھیں خود پیدا کیجئے تاکہ لوگوں کو پہچان سکیں۔ کلیم عاجز کا یہ شعر تو آپ کو یاد ہی ہوگا ؎

نبھانا سنگ سے ہو تو آئینے کی خو رکھیو
جو بات دل میں ہو وہ سب کے روبرو رکھیو

خیر۔ یہ بات ختم۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ایم اے کرنے کا ارادہ ہے۔ میں آپ کے حالات نہیں جانتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ہمت بلند رکھئے اور ایمانداری کے ساتھ محنت کرتے جائیے۔ آپ زندگی میں کامیاب ہوں گے اور وہی ہوگا جو آپ چاہیں گے۔ انگریزی مقولہ سو فیصد سچ ہے "Where there is a will there is a way" اردو میں بھی مقولہ ہے "جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے"۔ یہ طے کر لیجئے کہ ایم اے کر لینا آپ کی پہلی منزل ہے اور دوسرے کام بعد کے۔

نقادوں کی بات نکل آئی۔ آپ غور کریں گے تو اندازہ ہوگا کہ ابھی تک اردو ادب میں Seriousness نہیں آیا ہے۔ یعنی لکھنے والے لکھنے کے معاملے میں اب تک Serious نہیں ہیں۔ یعنی لوگ لکھنے کے لئے نہیں لکھتے۔ کچھ لوگ وقت گذارنے کے لئے لکھتے ہیں۔ کچھ لوگ شہرت حاصل کرنے کے لئے اور کچھ لوگ روپیوں کے لئے۔ لکھنے کے لئے لکھنے والے بہت کم ہیں جو کچھ لکھ کر کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ یہی حال نقادوں کا بھی ہے۔ پیداوار ہی کم ہے تو دکاندار کیا تو لے گا۔

[illegible] ان کی طرف نظر بھی نہیں اٹھاتے یا اس لائق ہی [illegible] تھے۔ حالانکہ مستقبل کے ضامن یہی لکھنے والے ہیں۔ ساری امیدیں انہیں سے ہیں۔ میرا یہ ہمیشہ سے عقیدہ ہے کہ نوجوانوں کو آگے بڑھنے دو۔ اگر کوئی قدم غلط اٹھائیں گے تو خود ٹھوکر کھائیں گے پھر سنبھل جائیں گے۔ میں ادب میں سود خوری کا قائل نہیں ہوں۔ اگر میں نے لکھنا ترک کر دیا ہے تو میرا نام نہیں آنا چاہئے لکھنا اس کا آنا چاہئے جو لکھ رہا ہے۔ اگر خراب لکھتا ہے تو بھی کہو۔ لیکن اس کے وجود کا اقرار کرو البتہ میرا مطالبہ Seriousness کا ہے۔ نوجوانوں سے بھی۔ ہمارے نوجوان بہت سے تجربے کر رہے ہیں۔ سارے تجربے خوبصورت نہیں اور نہ سارے تجربوں کے نتیجے اچھے ہوں گے لیکن تجربے تو ہونے ہی چاہئیں۔ تجربوں سے اچھے اور برے نتیجے اخذ ہوتے ہیں اور انہیں نتیجوں کی بنا پر معیار بنتے ہیں۔ تجربوں سے اچھی چیز نکلی تو زندہ رہے گی اور اگر بے معنی چیز برآمد ہوئی تو از خود ردی کی ٹوکری میں چلی جائے گی۔ اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

چند دنوں پہلے ایک رسالے کے ایڈیٹر سے ایسی ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے ان سے یہی کہا تھا کہ نئے لکھنے والوں کا فراخ دلی سے استقبال کرو۔ اسے اس کی جگہ دو اس کے وجود کو تسلیم کرو۔ اگر تم تسلیم نہ کرو گے تو وہ اپنی طاقت سے تسلیم کروا لے گا۔ نئی نسل پرانی نسل کے مقابلے میں ہمیشہ زیادہ طاقتور رہی ہے۔ اس میں vigour زیادہ ہوتا ہے۔ ہم سب کسی زمانے میں باغی تھے۔ روسو کا قول درست ہے "ایک عہد کا ملحد دوسرے عہد میں ولی ہوتا ہے۔" کبھی ہم نے اپنے بزرگوں سے بغاوت کی تھی۔ اب عزیزوں کی بغاوت سے کیوں گھبرائیں۔ اگر ادب میں باغیوں کی پیدائش بند ہو جائے تو جمود پیدا ہو جائے گا۔ سڑاند پیدا ہوگی۔ بغاوت بری چیز نہیں۔

انٹرویو کے سلسلے میں آپ کی دلیلیں قابل قدر ہیں لیکن اب تک خود کو تیار نہ کر سکا۔ مجھے اس میں [illegible] Cheapness معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ میری کمزوری ہو۔ ممکن ہے یہی۔ میں قدامت پسند نہیں ہوں لیکن ہر انسان کی زندگی کا کوئی گوشہ اس سے خود پوشیدہ رہتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس معاملے میں ایسا ہی ہو۔ آپ کی دلیل کی روشنی میں سوچوں گا۔

پٹنہ میں ان دنوں رسالوں کا سیلاب سا آ رہا ہے کئی ماہنامہ رسالوں کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ آپ نے اعلانات دیکھے ہوں گے۔

کبھی پٹنہ آئیے اور میرے ساتھ دو چار دن قیام کیجئے۔

خدا کرے آپ مع الخیر ہوں — سلام و دعا۔

خیر اندیش

سہیل عظیم آبادی۔

سہیل صاحب مجھے کتنا مانتے تھے اور میری قدر ان کے دل میں کتنی تھی اس کا اندازہ اس خط سے ہو گا۔

HALL Political and Cultural Urdu

weekly Editor: Suhail Azimabadi

PATNA - 6

۴ راگست [illegible]

عزیزم سلمہ دعائے خیر

ادھر بہت دنوں سے تمہارا کوئی خط نہیں آیا۔

میں آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت سے سبکدوش ہو چکا ہوں اور ایک ہفتہ وار اخبار نکالنے کی تیاریوں میں ہوں۔

اور تنہا ہوں۔ اس لئے قدم قدم پر الجھنیں ہیں۔ خاص کر مضامین کی فراہمی میں۔ تم کو بھی نہیں لکھ سکا۔ تم کچھ لکھا کرو۔ لیکن اخبار بنیادی طور پر سیاسی ہے ادبی کم۔ معلوماتی مضامین بھی ہوں۔ لکھا کرو۔ اگر موقع ہو تو ایک دو دن کے لئے آجاؤ تو تم سے باتیں ہوں۔

اور حالات اچھے ہیں۔ خدا کرے تم اچھے ہو۔ کچھ مضامین بھیجو۔

دلدعا
سہیل عظیم آبادی

سہیل صاحب کے مزاج میں بے حد شگفتگی تھی۔ اکثر ان کی صحبت سے قہقہے پھوٹتے ہیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر پھیل جاتی ہے۔

بانکی پور کلب پٹنہ میں ڈاکٹر قمر رئیس، مجتبیٰ حسین، سہیل عظیم آبادی، شکیلہ اختر، مصطفیٰ کمال، سرور جمال اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سہیل صاحب گفتگو میں حصہ نہیں لے رہے تھے۔ آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ شکیلہ اختر نے انہیں مخاطب کر کے کہا "آپ بہت سوتے ہیں"

"سوتا نہیں ہوں بلکہ میں سستی مسلمان ہوں، اس لئے صرف سنتا ہوں" سہیل صاحب نے بے حد سادگی سے جواب دیا۔

مظہر امام نے علامہ جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی اور مناظر عاشق ہرگانوی کو دن کے کھانے پر بلایا تھا۔ جمیل مظہری کچھ دیر سے پہونچے۔ سہیل صاحب کے پوچھنے پر کہنے لگے "آنے میں دیر ہو گئی۔ ذرا میں داڑھی بنوانے ایک سیلون چلا گیا تھا لیکن ایک خاص بات یہ ہوئی کہ اپنی کمزور نظروں سے آج میں نے آئینہ میں صورت دیکھی

سچ کہتا ہوں، عمر کی زیادتی سے اپنی شکل نہیں پہچانی گئی۔ ابوالخیر کشفی کی یہ رباعی بے طرح یاد آرہی ہے۔

پیری کا عجیب طور نظر آتا ہے
ہر دور عجیب دور نظر آتا ہے
بھولے سے جو آئینہ اٹھاتا ہوں
اس میں تو کوئی اور نظر آتا ہے

سہیل صاحب اس شعر کی گہرائی میں کھو گئے اور دیر تک داد داد کرتے رہے۔

بہار اردو اکیڈمی پٹنہ کے دفتر میں سہیل عظیم آبادی رضوان احمد اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ گفتگو عید کی نماز تک پہونچی تو سہیل صاحب کو مولوی عبدالحق یاد آ گئے۔ بولے "ایک بار بابائے اردو کی وجہ سے میری عید کی نماز چھوٹ چکی ہے۔ میں نماز کے لئے تیار ہو کر جب عبدالحق صاحب کے پاس پہونچا کہ انہیں اپنے ساتھ عید گاہ لیتا چلوں تو انہوں نے یہ کہہ کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا کہ جب فرض نہیں پڑھتے تو واجب پڑھ کر کیا کرو گے۔ حالانکہ علی گڑھ کے زمانے میں عبدالحق صاحب PRAY MONITOR تھے اور انہیں مولوی کا خطاب خود سرسید نے دیا تھا۔"

سہیل صاحب کی یہ شگفتگی، یہ بذلہ سنجی اب کھو گئی ہے یاد۔ اور صرف یاد کا سلسلہ ہے۔ ان کے انتقال پر بہتوں نے مجھے خطوط لکھے ہیں اور صبر کی تلقین کی ہے۔ دو چار خطوط ملاحظہ کیجئے۔

ڈھاکہ

D/- 18/12/79

برادر محترم! سلام و رحمت

خبر ملی ہے کہ بزرگوارم سہیل عظیم آبادی صاحب ۲۹ نومبر کو انتقال کر گئے ہیں۔ اللہ مرحوم کو جنت نصیب کرے۔ ہم لوگوں کے لئے مرحوم کے دل میں کافی ہمدردی تھی۔ بہار کا ایک بہت بڑا ادبی ستون گر گیا ہے۔ صوبہ بہار ہی میں نہیں بلکہ پورے برصغیر ہند و پاک بنگلہ دیش میں ان کی ہمہ گیر شخصیت اردو زبان و ادب کے لئے بڑی غنیمت تھی۔ ان کی یاد میں ہم نے ایک تعزیتی جلسہ اپنے مکان پر کرایا تھا جس میں کافی تعداد میں شعراء اور ادبا شریک ہوئے تھے۔ ایک قطعہ آپ بھی سن لیجئے ؎

پیکر کہ حلقہ حلقہ تھا زنجیر کی طرح
وہ یاد آرہا ہے مجھے رو رہا ہوں میں
یہ بھی چراغ گل کیا صوبہ بہار کا
اسے موج باد تند مجھے رو رہا ہوں میں

خیر اندیش
حصیر نوری

پٹنہ
۳ دسمبر ۱۹۷۹ء

برادر مکرم! السلام مسنون

اچانک ۲۹ نومبر کی شام کو سہیل صاحب کے انتقال کی خبر ملی۔ اس وقت سے ذہن ماؤف سا تھا۔ تین دنوں تک کوئی کام نہیں کیا۔ آج جا کر کچھ لکھنا پڑھنا شروع کیا ہے۔ نظریاتی اختلافات کے باوجود ان سے کتنے قریبی تعلقات تھے آپ جانتے ہیں۔ خود آپ سے بھی بہت ہی نزدیکی مراسم تھے۔ ان کا دم بہت غنیمت تھا۔ اب ویسا انسان بہت مشکل ہے۔ خراب موسم کے باوجود تجہیز و تکفین میں بے پناہ مجمع تھا۔ کل قرآن خوانی و تعزیتی جلسہ تھا۔ خدا مغفرت کرے۔

والسلام
رضوان احمد

پٹنہ
۶ دسمبر ۱۹۷۹ء

محترمی!

آپ کا تعزیت نامہ ملا۔ آپ نے جس طرح دعائے مغفرت اور ہم لوگوں کو صبر و سکون کی تلقین کی ہے اس سے بڑا سہارا ملا اور سبھوں کا غم ہلکا ہوا۔ خدا آپ کے غم کو بھی ہلکا کرے۔

والسلام
لطیف الرحمٰن

سری نگر
21 12 .79

ناظر صاحب! آداب

سہیل بھائی کی موت کا بھی دل پر اثر ہوا۔ میں بہت حساس ہوں۔ جس کی سزا بھگت رہی ہوں۔ آپ جانتے ہی ہیں ان سے ہم لوگوں کے کتنے گہرے مراسم تھے۔ ان کی اچانک موت سے جو دکھ ہوا ہے اس کا اندازہ ہونا اور جو خلا ادبی اور سماجی حلقوں میں پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا مشکل ہے۔

اللہ ان کی مغفرت فرمائے
آپ کی بھابی
میلنہ امام

سہیل عظیم آبادی — افسانہ نویسی — ناول نگاری — صحافت اور انسانیت کا ایک ستون اب ہمارے درمیان نہیں ہے — لیکن یادیں — باتیں — کارنامے —— ؟ !

پ

نصر وارثی اوگانوی
سلطان گنج، پٹنہ ۶

سہیل عظیم آبادی — جامع الصفات ادیب

نام آتے ہی ترا وقت کا پہیہ گھوما
ایک عنوان سے کتنے ہی فسانے جاگے

ودیعدار، فنکار اور انسان دنیا کی یہ تین ہستیاں ایسی ہیں جو موت کا مزہ چکھنے کے بعد بھی وجود عالم تک زندہ رہتی ہیں اور ہر جا ان کی صفات کا چرچا ہوتا ہے۔ یہ تین ہستیاں روشن چراغ کی مانند ہیں جس کی روشنی دور دور تک پھیلی ہوتی ہے اور اس کا روشنی سے مرجھائی ہوئی زندگی کو تازگی ملتی ہے۔ جب یہ چراغ گل ہو جاتا ہے تو کرب احساس سے ہر شخص تلملا جاتا ہے اور غم واندوہ کی گہری تاریکی میں بھٹکنے لگتا ہے۔ ۲۹ر نومبر ۱۹۷۹ء کو ایک اور چراغ بجھا اس کا نام تھا سید مجیب الرحمٰن سہیل عظیم آبادی۔

سہیل عظیم آبادی کون تھے؟ ہر ایک شخص یہ کہے گا کہ وہ ایک عظیم فنکار تھے، ایک بلند پایہ صحافی تھے، زبان وادب کے نکتہ شناس تھے، پریم چند کے راہ قلم کے ایک صاحب قلم تھے۔ لیکن میں کہوں گا کہ وہ ایک عظیم فنکار کے ساتھ ساتھ سچے محب وطن، ایثار شعار انسان، نئے فنکاروں کے عدیم النظیر قائد اور سیکولرزم کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ جس نے بھی ان کی صحبت حاصل کی ہوگی وہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہا ہوگا۔

اس عظیم انسان سے میری سب سے پہلی ملاقات بہار اردو اکیڈمی میں ہوئی تھی۔ اس وقت وہ اکیڈمی کے سکریٹری تھے۔ وہ دن ۱۹۷۵ عیسوی کا تھا اور شاید وقت شہر کا تھا تاریخ مجھے یاد نہیں ہے۔ اس ملاقات کے درمیان ان کی سادگی، انکساری، صاف گوئی، منکسر المزاجی، کشادہ دلی اور محبت کا احساس مجھ کو کافی ہوا اور پھر ان سے قربت حاصل کرنے کی آرزو میرے دل میں جاگ اٹھی۔ وقت سرکتا گیا اور آرزو مچلتی رہی۔ اللہ بھلا کرے میرے مخلص دوست اشرف صدیقی صاحب کا جن کے توسط سے میری یہ آرزو پوری ہوگئی۔ میں سہیل عظیم آبادی سے قریب ہو گیا اور مجھ کو ان کی پرخلوص صحبت ملنے لگی۔ جب صحبت کا سلسلہ دراز ہونے لگا تو اچانک ان کی روح پرواز کر گئی۔ سہیل عظیم آبادی ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن میرے دل کے گوشے میں ان کی فرقت کا غم آج بھی باقی ہے اور ساری اردو دنیا بھی اس غم میں ڈوبی ہوئی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ایک عظیم ادیب چل بسا۔ "بے جڑ کے پودے" کا خالق ابدی نیند سو گیا۔ "چار چہرے" کا مصنف داغ مفارقت دے گیا پریم چند کا تنہا ادبی وارث جدا ہو گیا۔ نئے فنکاروں کا قائد روٹھ گیا۔ فاتحہ کشوں اور محتاجوں، اکرم فرما ہمیشہ ہمیشہ کیلئے

خاموش ہوگیا اور جھونپڑیوں میں زندگی گذارنے والے کسانوں کے دُکھ درد سے بے قرار ہو جانے والا دل قیامت تک کے لئے ساکن ہو گیا۔

ان کے دل میں مفلسوں، مزدوروں، لاچاروں اور دیہاتوں کی تنگ و تاریک گلیوں میں مٹی اور پھوس کے بنے جھونپڑے میں زندگی بسر کرنے والے غریبوں کے لئے بے پناہ ہمدردیاں تھیں جس کا اندازہ ان کی لکھی گئی کہانیوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ان کا سچا پیار ان ہی لوگوں کو برابر ملتا رہا۔ انہوں نے قلم بھی پکڑا تو ان ہی لوگوں کے لئے۔ ان کی زیادہ تر کہانیوں میں دیہات کے مناظر اور وہاں رہنے والے غریبوں کے ابھرتے ٹوٹتے جذبات کے نقوش ملتے ہیں۔ ان کی تخلیق کردہ کہانی "چوکیدار" پڑھئے۔ اس میں ایک طرف رام لال چوکیدار کی وفاداری کی انتہا ملتی ہے اور دوسری طرف رام چندر بابو ڈپٹی مجسٹریٹ کی پست کرداری کا عکس نظر آتا ہے۔ اس کہانی میں انہوں نے رام لال اور ڈپٹی صاحب ان دونوں کرداروں کو ایسے انداز سے پیش کیا ہے کہ ہر ایک قاری اپنے آپ کو حقیقت سے بالکل قریب پاتا ہے اور اس کے دل میں غریبوں کی جگہ بن جاتی ہے۔ ان کی تقریباً ساری کہانیاں سچائی اور حقیقت کے آئینہ دار ہیں جس سے ان کی انفرادیت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں الفاظ کا مخزن جملوں کی شاندار سجاوٹ، زبان کی بے مثال چستی، کرداروں کی حسین بندش، عصر حاضر کی سچی تصویر اور ایام گذشتہ کے نقوش بھی ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں دلکش ہوتی ہیں جو ہر کس و ناکس کا دل جیت لیتی ہیں۔

یہ نا قابل تردید حقیقت ہے کہ ان کا وجود پریم چند کا جامع تھا اور ان کی ہستی علم و ادب، اخلاص و اخلاق کا گہوارہ تھی۔ جو بھی قریب گیا کچھ نہ کچھ لے کر آیا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی اُن کے در سے مایوس لوٹے خواہ وہ نیا فنکار ہو یا فاقہ کش انسان ہو۔ انہوں نے کتنوں کو قلم پکڑنا سکھایا۔ کتنوں کو ادبی رسالے کے لئے ان کی رہبری ملی۔ ان کی جیب سے کتنوں کی ضرورتیں پوری ہوئیں اور کتنوں نے ان کی بافیض ذات کی بدولت گمنامی کی کھائی سے نکل کر شہرت کی بلندی پائی۔ وہ ہمیشہ اردو ادب پر بادل بن کر برستے رہے تاکہ نو مولود پودے مرجھانے نہ پائیں۔ وہ حاجت مندوں کی دنیا میں دردمند دل لے کر گھومتے رہے تاکہ ان کی حاجت صرف تشنہ نہ رہ جائے۔

سہیل عظیم آبادی مرحوم کا ادبی و ملی خدمات کی داستان بہت لمبی ہے۔ پوری داستان کو قلم بند کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ انہوں نے بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے شامل اردو کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ تادم حیات اردو کی اشاعت و ترویج کا کام پوری لگن اور محنت کے ساتھ کیا۔ اردو کی بقا اور فروغ کے لئے اپنی صحت کی بازی لگا دی۔ بحیثیت صحافی بھی انہوں نے اردو کی مثالی خدمات انجام دیں۔ ان کی ادارت میں متعدد اخبارات و رسائل منظر عام پر آکر بے حد مقبول ہوئے۔ وہ بہار اردو اکیڈمی سے شائع ہونے والا سہ ماہی جریدہ "زبان و ادب" (جنوری ۸۴ء سے ہر ماہ شائع ہوتا ہے) کے علاوہ رسالہ "تہذیب" کے مدیر بھی رہ چکے تھے اور ان رسائل کی مقبولیت میں انہیں کا ہاتھ تھا۔ الغرض انہوں نے جس زمین پر قدم رکھا اسے آسمان کر دیا۔

ایسا دل و دماغ اور ایسا جامع الصفات ادیب جو کسی قوم کو خوش نصیبی ہی سے کہیں مدتوں میں ہاتھ آتا ہے ۱۹۷۹ء میں پریم چند کے صاحبزادے امرت رائے کے سامنے اپنی آخری ہچکی لے کر دنیا والوں سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گیا۔ افسوس اب وہ پُر درد آواز جو دنیائے اردو میں سبق بن کر بلند ہوئی تھی ایسی خاموش ہوئی کہ پھر نہ سنائی دے گی۔ وہ پر جوش سینہ جو غریبوں کے مصائب کے پہاڑوں کو

سیلاب جو کر بہا لے جاتا تھا وہ ایسا پھٹا کہ پھر کبھی میں سیلاب نہ آ سکے گا۔ وہ پُرنم آنکھیں جو مظلوم کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بہاتی تھیں وہ ایسی بند ہو گئیں کہ پھر ان کی روانی ہم نہ دیکھیں گے وہ پھلدار دست و بازو جو شب و روز کی خدمت گذاری میں مصروف تھے وہ ایسے تھکے کہ پھر نہ اٹھیں گے۔ وہ دردمند دل جو ہمیشہ غریبوں کے کام آتا تھا وہ ایسا چور ہوا کہ پھر نہ دھڑکے گا اور وہ پُر زور قلم جو گاؤں کی تصویر کشی میں تنہا مصروف تھا وہ ایسا ساکن ہوا کہ پھر حرکت میں نہ آ سکے گا ـــــ

خاموش ہوتی بزم فسانہ نگار
اس دور کی اک لمبی کہانی تھے سہیل

سید اعجاز نوادوی

سہیل

کیوں نہ ماتم میں ہو عظیم آباد اُٹھ گیا ہے ادب کا اک استاد
آج مرگِ سہیل سے اس کا ہو گیا خانۂ ادب برباد
جو ہیں واقف زبانِ اردو سے وہ یہ کہتے ہیں با دلِ ناشاد
آتشِ غم سے دل سلگتا ہے جب کبھی آتی ہے ہم کو ان کی یاد
آج ویران ہے دیارِ سخن
مر گیا آہ! تاجدارِ سخن

کیوں نہ ہوں مفلسوں کی آنکھیں نم ان پہ ٹوٹا ہے آج کوہِ غم
ان کے رونے کا کیا بھلا پوچھو زندگی جن کی ہو کتابِ الم
کون پرساں ہو اب مصیبت میں مفلسوں کا نہیں کوئی ہمدم
کس کو ہو فکر سرد چولھوں کی کون رکھتا ہے زخم پہ مرہم
ان کے فن میں لہو ٹپکتا تھا
ساری دنیا کا دل دھڑکتا تھا

یوں تو سب ہی ہیں صاحبِ اعجاز ہے مگر اُن کا منفرد انداز
جب کہ ثانی نہیں کوئی اُن کا کیوں نہ اردو ادب کو ہو پھر ناز
تھی نہ غفلت انہیں حقیقت سے جب کبھی فکر نے کیا پرواز
بے سہاروں کو جس سے تھی ڈھارس آج گم ہو گئی ہے وہ آواز
فن میں اُن کو ہے فوق بیدی پر
یہ ہیں منشی پریم کے ہمسر

اسٹرشاذ

سہیل عظیم آبادی

ایک ادیب، ایک رہنما

"كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" ——— موت بلاشبہ ایک حقیقت ہے، حقیقت پسندی کا ایک اور داغ دے گئی دل کے کانٹوں نے ایک اور حادثہ کو قبول کیا، دل کی گہرائیوں سے ایک اور آہ نکلی اور اردو ادب کا بطلِ جلیل سہیل عظیم آبادی ہم سے رخصت ہو گیا۔ سہیل صاحب اردو دنیا میں کیا مقام رکھتے ہیں یہ کہنے کی قطعی ضرورت نہیں، منصب و مرتبہ ایک ایسی چیز ہے جسے دل کی آنکھ ہی دیکھتی ہے، دل کے کان ہی سنتے ہیں اور دل کے نازک ہی قبول کرتے ہیں ظاہری چیزیں ان اندرونی عظمت و سطوت کو محسوس نہیں کرسکتیں۔

وہ عظیم افسانہ نگار جسے دنیا سہیل عظیم آبادی کے نام سے جانتی ہے، وہ بہترین انشاء پرداز جس نے اپنی عظمت کو عظیم آباد کے کونے میں بند کرنے کی کوشش کی اور اس کی عظمت کا پیالہ چھلک ہی پڑا، اس کی شہرت اردو دنیا میں بلاقید زمان و مکاں سہیل کے نام سے ہونے لگی۔ عصر جدید کے اردو ادب پر سہیل صاحب نے ایسے نقوش ثبت کئے ہیں جو شاید کبھی نہ مٹ سکیں بالخصوص جدید افسانوی ادب پر ان کی قد آور شخصیت نمایاں ہے شاید یہی نہ مٹنے والے نقوش سہیل عظیم آبادی کو لافانی بنائے رکھیں گے۔ سہیل عظیم آبادی ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو سکتے ہیں، وہ سہیل جسے خالقِ حقیقی نے ایک فانی جسم اور خلاقانہ صلاحیتیں دے کر بھیجا تھا اور جسے کل نفس ذائقة الموت پر ایمان تھا۔ بلاشبہ ایسے سہیل کو موت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے لیکن کیا وہ سہیل جو ایک عظیم افسانہ نگار تھا، جو ادب کا ایک بطلِ جلیل تھا جو بلند پایہ انشاء پرداز تھا۔ وہ جس کی ادبی حق پسندی سے ادب دشمن خوار کھاتے تھے، وہ جس کی فکری لغزشوں سے لوگ درگذر کرتے تھے اسے موت کبھی نہیں آسکتی۔ اگر ہم اس سہیل کو تسلیم نہ بھی کریں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ سہیل کی جسمانی موت نے ایک تخلیق کار ہم سے چھین لیا ہے ادب کی تخلیقی کاوشوں کا ایک ادبی کارخانہ تباہ ہو گیا نہ معلوم پھر ایسا تخلیق کار اردو ادب کو میسر بھی ہو سکے گا یا نہیں!

آج ایک عظیم افسانہ نگار کی موت ہو گئی، کل ایک بہترین شاعر اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ ادب دوستوں نے اظہار تعزیت کیا۔ ورثاء کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور بس! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اتنے بڑے نقصان کی تلافی صرف چند جملوں میں ہو گئی ہو۔ سہیل صاحب کی موت نے یقیناً اردو دنیا کو ایک صدمۂ عظیم سے دوچار کر دیا ہے لیکن کیا وہ اتنے بڑے صدمے کا حق ادا کر سکیں گے؟ چند اردو دوستوں کے مبالغہ آمیز بیانات آئیں گے جن سے سہیل صاحب کی شخصیت مبہم ہو کر رہ جائے گی۔ کچھ حضرات انہیں موجودہ افسانوی ادب کا بانی قرار دیں گے تو کچھ جدید افسانوی تکنیک کا موجد بتائیں گے، چند ایک حقیقت پسندوں کی صف اول میں لا کھڑا کریں گے۔ تعزیتی جلسے ہوں گے جن میں لوگ پرنم آنکھوں دھڑکتے دلوں اور لرزتے قدموں کے

ساتھ سہیل صاحب کی شان میں گل افشانی گفتار سے چار چاند لگائے گئے۔ بہکی بہکی باتیں بھی ہوں گی اور پھر وہ خصوصیات جو سہیل صاحب میں نہ بھی رہی ہوں گی ان میں داخل کی جائیں گی ان مراحل سے گذرتے ہوئے سہیل عظیم آبادی کو بانیانِ اردو کی صف میں لا کھڑا کیا جائے گا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر رسائل کے نمبر بھی شائع ہوں گے جن میں سہیل صاحب کی زندگی کے ہر ایک گوشے پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی اس طرح سہیل صاحب ایک عظیم افسانہ نگار، ایک عظیم انشاء پرداز اور باشعور اداریہ نگار کی حیثیت سے نباضِ وقت قرار پائیں گے اور ان کے نام پر ناشران نمبرات کا بوجھ اٹھائیں گے، سہیل صاحب دوکانِ ادب کا ایک سودا قرار پائیں گے اور ان کے نام پر ناشران پیسے بنائیں گے۔ سہیل صاحب اپنی زندگی میں جو کچھ بھی رہے ہوں مرنے کے بعد اپنی عظمت کا زیادہ سے زیادہ ثبوت دیتے جائیں گے دولت کے وہ وسائل جو وہ آج تک دوسروں کے لئے تو کیا اپنے لئے بھی فراہم کرنے میں ناکام رہے تھے۔ وہ فراہم ہو جائیں گے لیکن ____

کیا ان باتوں سے سہیل کی موت پر غم کا حق ادا ہو گیا؟

اور کیا ایک ادیب کی موت پر اظہار تعزیت کا یہ انداز صحیح ہے؟

نہیں! ہرگز نہیں! غم کا حق تو یہ کیا اس جیسے ہزاروں طریقوں سے بھی ادا نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ایک ادیب کی موت پر اظہار تعزیت کا یہ انداز صحیح ہے۔ آپ کسی ادیب کے ساتھ، کسی افسانہ نگار اور انشاء پرداز کے ساتھ مبالغہ آمیزی کر کے نہ صرف یہ کہ اس کی شخصیت مبہم کریں گے بلکہ ادب کے ایک بڑے نقصان کی ذمہ داری بھی آپ پر عائد ہو گی۔ کل جب اردو ادب کا ایک معمولی طالب علم اس شاعر یا ادیب کا مقام تلاش کرے گا تو آپ کے تنقیدی مضامین کہاں اس کی رہنمائی کر سکیں گے؟ آپ کے مبالغہ آمیز جملے اسے صف اول کا ادیب اور بہترین شاعر گردانیں گے۔ لیکن جب وہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں اور ادبی کارناموں کو تولے گا، ان کے ذریعہ تیار کردہ ادب پر نگاہ ڈالے گا تو اسے کتنی مایوسی ہو گی۔ اس کی مایوسی اس حیثیت سے بالکل حق بجانب ہو گی کہ صف اول کے ادیب کی یہ تحریر ہرگز نہیں ہونی چاہئے۔ پھر آپ خود غور کریں کہ اظہار تعزیت کا یہ طریقہ کہاں تک درست ہے؟ ان تعزیت ناموں میں تصنع، بناوٹ اور جھوٹی ہمدردی کی جھلکیاں آپ کو آسانی نظر آئیں گی اور ساتھ ہی ساتھ آپ یہ بھی محسوس کر سکیں گے کہ کہنے والے کی بات کہاں تک دل سے نکلی ہے اور کہاں تک زبان سے۔

یہ تو ایک عمومی بات تھی جس کا ضمنی طور پر ذکر کر دینا میں نے مناسب سمجھا۔ واقعی اگر آپ سہیل عظیم آبادی سے سچی محبت رکھتے ہیں اور ان کی موت پر ایک رو دینے والا دل رکھتے ہیں اور اگر واقعی ان کی موت سے آپ نے گہرا اثر لیا ہے تو سہیل عظیم آبادی جیسے عظیم افسانہ نگار کے ساتھ انصاف کرنا نہ بھولئے۔ اگر آپ کو سہیل عظیم آبادی کی شخصیت سے محبت ہے اور آپ ان کے عقیدت مندوں میں سے ہیں تو بلاشبہ ان کی موت نے آپ کے اندر غلو کے جو مادے پیدا کر دئیے ہیں ان سے انحراف نہیں کیا جا سکتا ان حالات میں آپ اپنی غلو کی جس کسی منزل سے گذار کر جو کچھ بھی بنا ڈالیں ان حالات میں مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ لیکن اگر آپ کی محبت قلبی فقط ایک ادیب کی وجہ سے ہے تو میرے خیال سے اس قسم کا سلوک نہ صرف یہ کہ ادب کے لئے نقصان دہ ہو گا بلکہ خود سہیل صاحب کی شخصیت بھی اس خسارے سے نہ بچ سکے گی۔

اگر آپ سہیل صاحب کی افسانہ نگاری اور ادبی صلاحیت کے معتقد ہیں تو آپ کے لئے بہتر ہو گا کہ اعتقاد کا چشمہ اتار پھینکیں کھلے آنکھوں اور کھلے دماغ کے ساتھ ان کے افسانوں پر نگاہ ڈالیں ان کی ہر خصوصیت جو ادب کے لئے مفید ہو سکتی ہے بہترین صلاحیتوں میں شمار کیجئے اور وہیں ان کی فنی اور فکری خامیوں (جن کا ہر انسان میں پایا جانا ضروری ہے) کی نشاندہی کیجئے۔ یقین جانئے کہ ایسا کرنے میں اگر ہم کامیاب ہو گئے تو آئندہ بھی اردو ادب کی تشکیل صحیح ہو سکے گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سہیل عظیم آبادی کا شمار آزادی کے بعد کے افسانہ نگاروں کی صف اول میں ہوتا ہے ان کے

افسانوی ادب کو نہ صرف یہ کہ ایک گراں بہا عطیہ دیا ہے، ایک قابلِ قدر ذخیرہ فراہم کیا ہے بلکہ افسانوی ادب کی موجودہ کروٹیں بھی ان کی مرہونِ منت ہیں۔ وہ نہ تو ادب میں جدیدیت کے مخالف تھے اور نہ ہی ترقی پسندی کے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو انھوں نے اپنی تحریروں میں درمیان کی راہ اپنائی ہے جو ایک کامیاب اور دیرپا ادب کی ضمانت ہے۔ سہیل عظیم آبادی نے طویل عرصے کی تخلیقی خدمات کے بعد افسانوی دنیا میں اپنا ایک مقام پیدا کیا اور عرصہ دراز تک خود کو صرف افسانہ نگاری کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے لیکن ایک طویل مدت کے بعد جب آپ کو "ساتھی" اور "زبان و ادب" کی ادارت سنبھالنی پڑی تو دنیا نے یہ دیکھا کہ یہ افسانہ نگار صرف افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کا انشا پرداز اور بہترین صحافی بھی ہے۔ سہیل صاحب اپنے اندر قدیم روایات کی کشش کے اجزا سمیٹے رہے لیکن انھیں کوئی مناسب موقع فراہم نہ ہو سکا۔ جہاں وہ ان خیالات کو واضح طور پر پیش کر سکتے البتہ ان کی تحریروں سے چند اشارات ملتے ہیں۔ وہ ادب میں نئی چیزیں اور نئی اصطلاحات وضع کرنے کے خواہاں بھی ہے۔ لیکن شاید انھوں نے اپنے اندر اتنی ہمت نہ پائی یا ماحول نے ان کو ایسا کرنے سے روکے رکھا۔ اگر ماحول کی ناسازگاری ان کی طبیعت اور ذوق سے نہ ٹکراتی تو نہ جانے آج کتنے اصطلاحات اور جدید الفاظ اردو ادب کے افق پر جھلملاتے نظر آتے۔ ابتدا میں جب اکادمی کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالے کی ادارت آپ کو سونپی گئی تو آپ نے اس سہ ماہی جریدے کا نام اردوستان رکھنا پسند کیا۔ جریدے کا پہلا شمارہ اسی نام سے منظرِ عام پر بھی آیا لیکن وقت کی اصطلاح میں اردوستان کا نام کچھ عجیب سا تھا لہٰذا دوستوں اور اکادمی کے ذمہ داران کا مطالبہ زور پکڑتا گیا کہ رسالہ کا نام تبدیل کیا جائے۔ ان مطالبات کے زیرِ اثر جریدے کا دوسرا ہی شمارہ "زبان و ادب" کے نام سے شائع ہوا۔

اس واقعے سے آپ کو یہ تاثر دینا مقصود نہیں کہ سہیل صاحب میں قوتِ ارادی کا فقدان تھا بلکہ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سہیل صاحب کی ادبی راہ میں ماحول نے کیسے کیسے کانٹے بوئے تھے۔ زبان و ادب کی کئی سالہ ادارت کے درمیان سہیل صاحب کے قلم نے بے پناہ جواہر ریزے اُگلے ہیں تو وہیں ان سے لغزشیں بھی ہوئی ہیں۔ آپ کی تحریر دشمنانِ اردو دوستوں کو جگانے کا ایک عظیم اور یادگار کارنامہ انجام دیتی ہے۔

"اردو زبان سے محبت کرنے والوں کو اس نقطۂ نظر سے سوچنا چاہئے۔ حکومت مالی امداد دے سکتی ہے لیکن اچھا ادب خرید کر پڑھنے والا نہیں دے سکتی یہ کام خود اردو والوں کو کرنا ہوگا۔ چھوٹے اسکولوں کا قیام علمی اداروں کا قیام اور ان کو صحیح ڈھنگ سے چلانا، اچھے ادب کا پیدا کرنا اور اس کی فروخت کا سامان کرنا۔ کوئی حکومت صرف امداد دے سکتی ہے۔ لیکن صرف سرکاری امداد کسی زبان کی ترقی کی ضمانت نہیں بن سکتی۔ جو زبان زمانے کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت کھو دیتی ہے وہ زندہ رہنے کی صلاحیت بھی کھو دیتی ہے اس کی سب سے بڑی مثال انگریزی زبان ہے۔ انگریزی حکومت تیس سال پہلے ختم ہو گئی لیکن انگریزی زبان ہندوستان سے ختم نہیں ہوئی اور اس کے بدترین مخالف بھی اسے ختم نہیں کر سکے۔ انگریزی زبان کی یہ طاقت اس کا زبردست علمی سرمایہ ہے۔

یہ چند الفاظ محض ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ ہیں خود اردو دوستوں کو سوچنا چاہئے کہ انھیں اپنی زبان کو ترقی دینے کے لئے کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔"

(نقشِ اول، زبان و ادب، اکتوبر ۷۷ء)

ایک جگہ میں اکادمیوں کے قیام پر شکریہ ادا کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں:۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ خود ان لوگوں کا رویہ کیا ہے جو اردو کو اپنی مادری زبان کہتے ہیں اور وہ اپنی زبان کو ترقی دینے کے لئے کیا کر رہے ہیں تو حالات بہت امید افزا نظر نہیں آتے ......
.... جن لوگوں کی زبان اردو ہے اور وہ اسے زندہ رکھنا

اور ترقی دینا چاہتے ہیں انھیں بڑی سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہئے کہ وہ اپنی زبان کو کس طرح زندہ رکھ سکتے ہیں اور کس طرح اسے ترقی دے سکتے ہیں۔" (نقش اول، زبان و ادب جنوری ۷۷ء)

اسی دور میں جب سہیل صاحب کا قلم نوجوانان اردو کے دلوں کو گرما رہا تھا ان کے اندر ایک تحریکی مزاج پنپ رہا تھا اور ٹھیک اسی وقت جب سہیل صاحب کے یہ الفاظ ایک ہمہ گیر تحریک کی شکل میں لوگوں کے سامنے آرہے تھے ان کے قلم کو زبردست ٹھوکر لگائی گئی تبدیلی حالات نے ان کا قلم چھین لیا اور عارضی طور پر اندر کا سہیل عظیم آبادی قتل کر دیا گیا۔ جسم سہیل کا قلم بھی وقت کے دھاروں میں بہنے لگا اور اس سہیل کے قلب مقتول و مرحوم سہیل کے قلم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسے ایسے خیالات پیش کرنا شروع کر دئے کہ خدا کی پناہ! اندر کا سہیل عظیم آبادی اپنی بیچارگی، بے لبسی اور بے کسی پر خون کے آنسو روتا رہا۔ ایمرجنسی کی سیاہ راتوں اور تاریک دنوں کو ترقی پسند طاقتوں کا کارنامہ بتانا آخر کیا حیثیت رکھتا ہے؟ مجھے اندر کے سہیل سے بے پناہ محبت ہے اور میں اس سہیل کا عقیدت مند بھی ہوں لیکن باہر کے سہیل کے بھی خیالات سے میں اتفاق نہیں کر سکتا۔ مجھے سہیل کے دو حصوں میں منقسم ہو جانے کا بھی شدید غم ہے۔ باہر کے سہیل نے ضمیر سے جنگ کی، اور قلم کی عظمت کو فراموش کر دیا اس جبری اور طاغوتی طاقت کو ترقی پسند طاقت کے خطاب سے نوازنا بہر حال نامناسب تھا۔ اس کا یہ خیال کہاں تک درست تھا میں اس مسئلہ میں الجھنا نہیں چاہتا اس لئے کہ یہ مسئلہ سیاسی ہے لیکن میں اس بات کا بھی اعلان کرتا ہوں کہ سہیل کے لئے بہ حیثیت ادیب ایسا لکھنا ہرگز بہتر نہیں تھا ان الفاظ کو آپ بھی ملاحظہ فرمائیں :۔

ملک کی تقسیم آزادی کے بعد کا زمانہ اردو زبان کے لئے سخت ابتلا اور آزمائش کا زمانہ تھا۔ رجعت پسند طاقتیں اسے ختم کر ڈالنے پر تلی ہوئی اور ترقی پسند طاقتیں بے بس تھیں۔ ایسی حالت میں اس بات کا زندہ رہ جانا ایک معجزے سے کم نہیں ساری باتوں کو دہرانے کی ضرورت نہیں اردو زبان کا ہر دوست جانتا ہے البتہ اس کا اقرار کرنا ضروری ہے کہ محترمہ اندرا گاندھی کی قیادت میں ملکی سیاست نے صحت مند کروٹ لی ہے۔ اور اس کا اثر ہماری تہذیب پر بھی نہایت خوشگوار پڑ رہا ہے۔

کیا انھیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ ان خوشگوار اثرات کے پیچھے کتنی سیاہیاں اور سیاہ کاریاں پوشیدہ ہیں پھر ایک ادیب کے حساس دل میں ان باتوں کا جاگزیں نہ ہونا آخر کس بات پر دلالت کرتا ہے؟ کیا کوئی ادیب اور حساس افسانہ نگار کسی شخصیت سے اس حد تک مرعوب ہو سکتا ہے کہ اس کے الفاظ سے شخصیت پرستی کی بو آنے لگے۔ سہیل عظیم آبادی ایک ایماندار ادیب ہو سکتے ہیں، ایک دیانتدار افسانہ نگار ہو سکتے ہیں ایک رجحان ساز، پرواز ہو سکتے ہیں۔ چڑھتے سورج کے پجاری تو نہیں ہو سکتے۔ اقتدار وقت کے آگے سر تسلیم خم نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ہم ان سبھی تحریروں کو سہیل عظیم آبادی کی تحریر ہرگز نہیں مانیں گے۔ یہ تو باہر کے سہیل کی آواز ہے باہر کے سہیل کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں جس میں اندر کے سہیل کی آواز قطعی طور پر مفقود ہے۔ ایک اور تحریر کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے :۔

"اس لئے اردو دوستوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اپنی زبان اور اس کے ادب کو ترقی دینے کے لئے کام کریں تو اسے بھول نہ جائیں کہ ترقی پسند طاقتوں سے تعاون کرنا بھی اردو زبان و ادب کی خدمت ہے یہ موقع زیادہ تفصیل میں جانے کا نہیں۔ ہم محض اشارہ کر رہے ہیں۔ ایک بڑی حقیقت کی طرف آپ بھی اس نقطۂ نظر سے اس مسئلے پر غور کریں تو مسئلے کے بہت سے گوشے آپ کے سامنے روشن ہو جائیں۔"

(نقش اول، زبان و ادب اپریل ۷۶ء)

یہ تھا سہیل عظیم آبادی کا مشورہ جو انھوں نے مجاہدینِ اردو کو ایمرجنسی کے منحوس لمحوں میں دیا تھا۔

ادیب کا منصب بہت اونچا ہوتا ہے۔ وہ سماج کی رہنمائی کا ذمہ دار ہوتا ہے وہ سماج کا سب سے حساس طبقہ ہوتا ہے ملک کی رہنمائی کا فریضہ اس پر عائد ہوتا ہے۔ لہٰذا اقتدارِ وقت کو اس کا تابع ہونا چاہئے نہ کہ وہ خود ہی اقتدار کا تابع ہو جائے۔ ایسا جہاں بھی ہوا ہے وہاں کے سیاسی، معاشی اور سماجی حالات بہتر نہیں رہ پاتے ہیں۔ ہندوستانی سماج میں انتشار پسندی، بدامنی اور سیاسی عدم استحکام کی ایک واضح دلیل یہ بھی ہے۔

سطور بالا میں سہیل عظیم آبادی کو ایک ضمیر فروش ادیب اور کردار انسان کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش ہرگز نہیں کی گئی ہے بلکہ ان غلطیوں کی احتراز نشاندہی کی گئی ہے جو ہمارے ادب میں عموماً پا رہی ہیں اگر ان خامیوں کا ازالہ بروقت نہ کیا جا سکا تو ہمارا ادب حکومت کے ٹکڑوں پر پرورش پانے لگے گا۔ اور یہی کی رعنائی ویسے ہی چاپلوسیوں میں گم ہو جائے گی۔

سہیل عظیم آبادی کے افسانوں میں زندگی، سرگرم اور متحرک زندگی کے نقوش ملتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جہاں فنی تقاضوں کی پوری رعایت ہے، وہیں فنی خامیوں سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ عریانیت سے روگردانی کے باوجود ان کے بعض افسانوں میں عریانیت کی ہلکی سی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ ذیل میں اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے:۔

"یہ جوان عورت پردے کے اندر گئی۔ مس بوس نے بدن کا معائنہ کیا۔

بابو رام بابو رجسٹر پر لکھتا رہا۔ مس بوس کی چیخ جیسی آواز سنائی دی۔

"ڈاکٹر"

"لیجیے مس بوس"

"اس کا چھاتی میں دودھ ہے"

"باہر بھیج دو"

مریضہ پردے کے اندر سے باہر آئی اب بھی اس کی چھاتی کی نوک پر دودھ کی بوند موجود تھی وہ سب کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی" ــــــــــ (مسٹر لاسکی)

تلاشِ معاش اس افسانے کا مرکزی موضوع ہے۔ معیشت انسانی زندگی کا ایک اہم شعبہ ضرور ہے اور اس اہم مسئلہ میں ادیبوں کی رہنمائی کی ضرورت ناگزیر ہے۔ لیکن رہنمائی کا یہ فریضہ صرف ان عریاں الفاظ سے ہی ادا کیا جا سکتا ہے؟ انسانی خامیوں کا بیان ہے جب اس کا فن اور اس کے ذریعہ تیار کردہ ادب خامیوں سے مبرا نہیں رہ سکتا ہے۔ سہیل صاحب کے نمائندہ افسانہ "الاؤ" کا مطالعہ کیجیے۔ ابھی آپ اس افسانوی محل میں داخل بھی نہ ہو پائیں گے کہ آپ کو فنی خامیوں کا احساس ہو جائے گا۔

بات کو مزید طوالت سے بچانے کے پیشِ نظر میں صرف ایک مثال پیش کر رہا ہوں:۔

"میدان کے پورب کنارے پر پیپل اور برگد کے پیڑ ہیں اور اس کے بعد کھیت، اتر کی طرف ناگ پھنی کی گھنی اور لمبی قطار ہے اس کے بیچ میں کئی نیم یا پاکڑ کے پیڑ ہیں۔"

جملے کی ساخت پر غور کیجیے، ایک افسانوی ماحول کی تصویر کشی میں نیم یا پاکڑ کے پیڑ چہ معنی دارد؟ یہاں واضح طور پر یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ افسانوی ماحول میں داخل ہونے سے قبل اس ماحول کی تصویر کشی میں نیم کا پیڑ ہو یا پاکڑ کا، اس سے افسانے میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ نیم یا پاکڑ کا درخت چونکہ ایک تصور ہے لہٰذا قاری کو افسانے کا تصوراتی ہونا بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ پھر ایک قاری جب افسانہ پڑھتے وقت یہ محسوس کرے کہ اس افسانے کی بنیاد جھوٹ پر مبنی ہے جسے افسانوی اصطلاح میں تصور کہتے ہیں اور اصل افسانے کا ہماری سماجی اور عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تو ایسا افسانہ

کامیاب نہیں کہا جا سکتا۔ ایک مغربی نقاد کے قول کے مطابق قاری کو اس بات کا احساس نہیں ہونا چاہئے کہ یہ افسانہ فن کار کے تصور کی دین ہے۔ اس احساس کا نہ ہونا اتنا ضروری ہے جتنا کہ ایک سگار کے لیے خوشبو۔ ایک سگار سے چاہنے والوں میں پانچ باتوں کی بنا پر مقبولیت حاصل کرتا ہے۔ صورت، ساخت، رنگ، ذائقہ اور مہک۔ لیکن اگر سگار میں ذائقہ کی بات میں نقص ہو یعنی اچھی طرح سلگتا نہ ہو تو دوسری حیثیتوں سے وہ کتنی ہی اہمیت کا حامل کیوں نہ ہو وہ نامقبول ہی رہے گا۔ اسی طرح کسی مختصر افسانہ کے متعلق قاری کو یہ احساس ہو جائے کہ اس کی بنیاد جھوٹ پر مبنی ہے تو دوسری حیثیتوں سے وہ کتنی ہی اہمیت کا حامل کیوں نہ ہو کامیاب نہیں ہو سکتا۔ نہ حسن بیان کام آئے گا نہ تازہ تشبیہیں اور رنگین استعارے یہ ساری چیزیں بھی اسے ناکامیابی سے نہیں بچا سکتیں۔ سہیل صاحب کا یہ افسانہ فنی اعتبار سے شاہکار کہلانے کا مستحق ہے اس لئے کہ بعد کی منزلیں جس خوبی سے طے کی گئی ہیں وہ اس کی کامیابی کی ضمانت دیتی ہیں اگرچہ شروع کی لغزشوں نے اسے پامال کر دیا ہے۔

اس مختصر سے مضمون سے یہ تاثر ہرگز نہیں لینا چاہئے کہ ان کی تحریر صرف خامیوں سے پُر تھی۔ بلکہ ان مختصر صفحات میں صرف ان کی خامیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تاکہ آئندہ ادبی نسلیں ان خامیوں سے روگردانی کرتے ہوئے سہیل عظیم آبادی کی خصوصیات سے فائدہ اٹھائیں، ان درخشاں اصولوں کے تحت منزلیں طے کریں اور اس طرح ادب کا یہ قافلہ دن بدن آگے بڑھتا رہے اور انہیں سہیل عظیم آبادی کے مشن کو پورا کرنے کی سعادت نصیب ہو۔

لفظوں کی اذاں

حضرت حافظ دہلوی (بانی و صدر حلقۂ فکر و دانش۔ بنگلہ دیش)

باہم ہیں ابھی بھائی سہیل اور محبت
محکم ہوا ابھی خادم اردو کا نشاں اور
ہر سو ہے صدا خدمتِ اردو کے جہاں میں
ہوتا ہے ابھی سوگ، فغاں اور فغاں اور
اہل ادب و شاعری و جوشِ صحافت
اشعار و معانی و صحائف میں بیاں اور
پہنچی صدا کے لئے زباں گوشِ جگر میں
سامع کی سماعت کو ہے لفظوں کی اذاں اور
تحقیق رموز اس کے ابھی کھول رہا ہے
ہوتی ہے ابھی سعیِ شب و روز عیاں اور
اڑنے ہیں پرخچے ابھی جہل و حسد کے
ہونے ہیں ابھی چاک، گریبانِ گماں اور
ہے گرچہ مگر راہِ صداقت کی مسافت
رو کے سے قلم ہوں گے رواں اور دواں اور
ہے ایک سے اک بڑھ کے بہت پھر بھی جہاں میں
اس زاویۂ فکر کا انساں کہاں اور
ہم لوگ تو اظہارِ رفاقت نہیں کرتے
ہوتا ہے مگر جوشِ محبت کا سماں اور
تقریر کبھی ختم جو کرتا ہوں میں اس پر
چلاتی ذہن میں ہے مرے مری زباں اور
لکھنے کو ابھی اس پہ بہت کچھ ہے ابھی لکھ
افسردگی خامہ بہا اشکِ نہاں اور
اک رات کی ہے روشنی سب سوچ رہے تھے
گل ہو کے تو روشن ہوئی شمعِ دل و جاں اور
ہم فرقتِ مرحوم سے حافظ ہیں پریشاں
کہتی ہے مگر حضرتِ غالب کی زباں اور
ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونناب فشاں اور

اصغر پرویز
ہزاری باغ

سہیل عظیم آبادی کے چند تاثرات

جناب سہیل عظیم آبادی ہندو پاک کے شہرت یافتہ افسانہ نگار تھے۔ وہ نہ صرف ایک عظیم افسانہ نگار تھے بلکہ ایک مشہور و معروف ادیب، ناقابلِ فراموش صحافی، حق و انصاف کے پجاری، استحصال انگیزی کے کٹر مخالف، ہندوستان میں منصفانہ حقوق کی مساویانہ تقسیم کے خواہشمند اور انسان دوست شخصیت کے مالک تھے۔ گو جسمانی طور پر آج ہمارے درمیان موجود نہیں رہے، تاہم وہ اپنے عقائد و اوصاف کے بدولت درمیان موجود ہیں۔ اور جب تک اس دارِ فانی میں جمہوریت پسندی کی فضا قائم رہے گی وہ یاد آتے رہیں گے۔ اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ جدید آسمانِ ادب میں وہ ایک درخشندہ ستارہ کی مانند مزین ہیں۔ وہ دریائے ادب کے ایک ایسے غوّاص تھے جو شب و روز نت نئی تحقیقات سے اردو ادب کے دامن کو [illegible] مالا مال کرتے رہے ہیں۔

وہ عظیم آباد جیسی تاریخی جگہ میں پیدا ہوئے۔ یہ وہی عظیم آباد شہر ہے جس میں اردو کی شخصیتیں شاد عظیم آبادی، [illegible] عظیم آبادی اور اختر عظیم آبادی پیدا ہوئیں۔ سہیل عظیم آبادی نے محض اپنے منفرد نظریہ و ایک [illegible] نگارش کی بدولت اردو ادب میں [illegible] زندگی کے پسِ پردہ حقائق [illegible] و خاص کو حقیقت سے روشناس کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے افسانے میں و دیگر تحریروں میں زمینداروں کے ظلم و ستم اور کسانوں کی معصومیت کو اجاگر کرتے نظر آتے ہیں اور یہ سب سلیس و بامحاورہ زبان میں بیان کرتے ہیں۔ اس اسلوب و بیان سے ان کے افسانے خاطر خواہ مقبول ہوئے۔ وہ پریم چند کے مقلد بنے۔ کیونکہ انہوں نے پریم چند کے موضوعِ سخن کی تقلید کی۔ ان کے افسانوں کو عوام و خاص میں ایک مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اسلوب و بیان میں مقصد واضح ہوتا ہے۔ وہ ابتذال اور عامیانہ انداز سے پہلو بچا کر لکھتے تھے۔ ان کی نظر ہمیشہ حقائق پرستی رہتی تھی۔ اور اپنی مخصوص زبان میں انسانی احساسات و جذبات کا صحیح تجزیہ کرکے باتوں باتوں میں اکثر نامساوی معاشرے کی بے انصافی کا پردہ فاش کر جاتے تھے۔ اور اس عہد کے گاؤں کی سچی تصویر کھینچ کر رکھ دیتے تھے۔ مثال کے لئے نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

"گاؤں سے پورب کو ایک بڑا سا میدان ہے کھیت کی سطح سے کچھ اونچا اور چورس۔ لوگ کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں کسی راجہ کا یہاں پر محل تھا۔ اس کی مٹی اور اینٹ سے زمین اونچی ہو گئی ہے۔ میدان کے پوربی کنارے پیپل اور برگد کے پیڑ اور اس کے بعد کھیت۔ اُتر کی طرف......" (افسانہ "الاؤ")

سہیل عظیم آبادی کا ایک افسانہ "الاؤ" [illegible]

کی گری اور جہالت [illegible] نظر آتی ہے۔ وہ اتنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ تصویر کے دوسرے رخ میں زمینداروں کے بچے کی طرفداری جذبات کو سرد کرنے کے لئے ہر دم کوشاں رہتے ہیں۔ وہ گاؤں کے معصوم کسانوں کی دہشت زدہ اور خدامت پسندی کو "الاؤ" میں اجاگر کرتے ہیں۔ چند نمونے درج ذیل ہیں۔

"طوفانی میاں نے قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور بڑبڑاتے ہوئے اٹھے "سچ ہے کلکتہ جانے سے آدمی کا دماغ خراب ہو جاتا ہے"

"سب کا حشر بھولا رام اور اندر بچھوا کا ہو گا۔ تم سب چڑیوں کی طرح چیں چیں کرتے رہ جاؤ گے اور پٹواری تمہیں باز کی طرح ہر روز شکار کرے گا۔ آج وہ، کل وہ"

سہیل عظیم آبادی کا یہ کمال ہے کہ وہ تلخ سے تلخ حقیقت اور بیچارگی و بے بسی کو نہایت معصومانہ لہجہ میں پیش کرتے ہیں۔

"آخر اس طرح کب تک چلتا۔ لوگ اکتا گئے۔ غریبوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آئے جو مقدمہ لڑیں، اس لئے چپ رہنا ہی بہتر۔ لیکن چپ تو کب تک"

کئی دانشوروں و مفکروں کا کہنا ہے کہ "ہر عظیم فنکار اپنے عہد کے انقلاب کے کسی نہ کسی پہلو کا ترجمان ہوتا ہے۔ سہیل عظیم آبادی نے بھی اس انقلابی حقیقت کے پس پردہ اسباب کو نہایت خوش اسلوبی سے اپنی تحریروں میں جگہ جگہ بیان کیا ہے۔ "الاؤ" کا ہی ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"مشکل کیا ہے؟ آج سے ہم لوگ ٹھان لیں کہ ہمیں مل جل کر رہیں گے۔ زمیندار کو بیگار نہیں دیں گے۔ کوئی دباؤ نہیں سہیں گے۔ بس! دھر میپور میں تو ایسا ہی ہوا ہے اب تو وہاں چین ہی چین ہے"

سہیل عظیم آبادی کی تحریروں میں [illegible] کھو کھلے پن اور جدیدیت کے رجحانات عام فہم زبان میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی نظر ہر نئی چیز پر پڑتی ہے۔ وہ جدیدیت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور قاری کو اس سے روشناس کراتے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"آخر کیا وجہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں جوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے گھر سے دور زندگیاں برباد کرتے پھرتے ہیں۔ کیا اپنے وطن میں وقت گزارنے کا ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں...... لمبا سفر کر کے ایشیائی ملکوں میں بے مقصد اور کبھی کبھی تکلیف کی زندگی گزارتے ہیں۔ چرس، افیون اور نشیلی چیزوں کے عادی بن جاتے ہیں۔ ان میں احساس بھی باقی نہیں رہ جاتا کہ کیا کر رہے ہیں"

وہ ایک ہندوستانی تھے ان کے دل میں وطن کی سچی محبت تھی۔ وہ اپنی اس حب الوطنی کا اظہار اپنے افسانہ "وہ آدمی" میں ایک غیر ملکی باشندہ کی زبان سے کرتے نظر آتے ہیں۔

"مجھے ہندوستان بہت پسند ہے۔ جب موقع مل جاتا ہے تو آ جاتا ہوں۔ ہندوستانی اب تک پرانے اخلاقی ضابطوں کی پیروی کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں تو اب انکی دھجیاں بھی باقی نہیں ہیں۔ تم میرے ملک جاؤ گے تو نہ جانے کیا فکر لو گے"

اس سے آگے بڑھ کر وہ ہندوستان کی تہذیبی روایت کو بھی بیان کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"ہمارے یہاں شراب پینا اچھا نہیں سمجھا جاتا اور جو لوگ پیتے ہیں انکو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ ہر ملک کے اپنے طور طریقے ہوتے ہیں"

سہیل عظیم آبادی نہ صرف ایک مشہور و معروف افسانہ نگار تھے۔ بلکہ وہ بہار کے اہم صحافیوں میں بھی ایک تھے۔ انہوں نے علم و ادب میں ناقابل فراموش خدمات انجام دیئے ہیں۔

(تفصیلات ...)

امجد علی خان

وہ راہبر جو جہانِ سفر میں ڈوب گیا

[illegible] کا دن ایک منحوس دن تھا جس دن یہ خبر ملی کہ سہیل عظیم آبادی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سبھوں سے رخصت ہو گئے۔

انسانیت میں یقین رکھنے والا، زندگی کی سچائی کا متلاشی [illegible] کا پیکر نہ جانے کہاں گم ہو گیا۔ نگاہیں کہہ رہی ہیں کہ

کہاں گیا مرا دیوانہ زیرِ بام نہیں

ہمیں ہمیشہ ہی ان کی کمی کا احساس ہوتا رہے گا۔ ان کا خلوص ان کی محبتیں ایک یاد بن کر ہمیں ہمیشہ رُلاتی اور تڑپاتی رہیں گی۔

سہیل صاحب کی اچانک موت ساری انسانیت اور بالخصوص اردو ادب کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ سہیل صاحب نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اردو ادب کی خاموش خدمتوں میں صرف کیا۔ سہیل صاحب نے ۱۹۱۱ء میں بہار کے ایک زمیندار گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ مگر چونکہ ذہن دینی تعلیم کی طرف مائل نہ تھا۔ لہٰذا یہ سلسلہ یہیں ختم ہو گیا اور پھر باضابطہ طور پر انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا۔ مگر تعلیم مکمل نہ ہو سکی اور کلکتہ بھیج دیئے گئے۔ اور چونکہ ذہن شروع ہی سے ادب کی طرف مائل تھا لہٰذا وہاں کے کئی اخبارات میں کام کرنے لگے۔

سہیل صاحب کی زندگی میں ایک مختصر دور شاعری کا بھی ہے۔ سہیل صاحب پریم چند اسکول کی آخری کڑی تھے۔ انہیں کی واحد شخصیت تھی جو آخری دم تک پریم چند سے جڑی رہی۔ انہیں پریم چند سے بے پناہ عقیدت تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے آخری سانس بھی پریم چند جی کے در پہ لی اس طرح ان کی موت بھی پریم چند کے صاحبزادے امرت رائے کے گھر (الہ آباد) ہی میں ہوئی۔ اور ؎

جان ہی دے دی جگرؔ نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا

سہیل صاحب ہی کی وہ گرانقدر ہستی تھی۔ جس نے اردو افسانوی ادب کو تنوع بخشا اور جو بلندی اور وسعت عطا کی اسے اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ یہاں ڈاکٹر راشد مرحوم کا نام بھلایا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ یہی وہ ہستی تھی جس نے سہیل صاحب کو افسانے لکھنے پر مجبور کیا۔ افسانے کی اشاعت کے بعد علامہ جمیل مظہری نے انہیں باضابطہ طور پر افسانہ لکھنے کا مشورہ دیا۔ اور اسی کے بعد سہیل صاحب نے افسانے لکھنے شروع کئے۔ اور شہرت کی بلندیوں کو چھوتے چلے گئے۔

سہیل صاحب نے اپنی کہانیوں میں دیہاتوں میں گزرگاہوں، جبر و ستم اور کلبِ تک کے منظر کو الفاظ کے موتیوں کا روپ دیکر پیش دیا۔

سہیل صاحب کے تعلقات بے حد وسیع تھے۔ بابائے

اردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب سے بھی سہیل صاحب کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی شخصیت کا بہت اثر سہیل صاحب کی شخصیت پر بھی پڑا۔ انہوں نے ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی نگرانی ہی میں اردو کا ادارہ [illegible] (بہار) میں قائم کیا [illegible] بے حد مقبول ہوئی۔ ان کے قریبی دوستوں میں مرحوم عبدالقیوم انصاری کا نام بھی سر فہرست آتا ہے۔ جن کے ساتھ مل کر انہوں نے ماہنامہ "تہذیب" پٹنہ سے جاری کیا۔ جو بے حد معیاری رسالہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سارے رسالے اور اخبارات انہوں نے نکالے۔

سہیل صاحب ایک طویل مدت تک آواز کی دنیا سے بھی جڑے رہے۔ انہوں نے ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۰ء تک آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کی۔ اور ملازمت کے دوران بھی وہ ریڈیو کے ذریعہ اردو کی خدمتیں انجام دیتے رہے۔ ریڈیو کے لئے بھی انہوں نے بہت سارے ڈرامے لکھے۔ ان میں سے بہت سے ڈرامے نشر ہو کر بے حد مقبول ہوئے۔ خاص کر "بینا جوگن"، "شیر شاہ"، "دارا شکوہ"، "جہاں آرا"، "انارکلی"، "روشنی"، "بہادر" اور "مرزا مچھو" وغیرہ۔

سہیل صاحب نے تقریباً دو سو کہانیاں لکھیں جو ہند و پاک کی سبھی زبانوں میں شائع ہو کر بے حد مقبول ہوئیں۔ اس کے علاوہ روس، فرانس، چیکوسلواکیہ اور دوسرے ممالک میں بھی کہانیاں شائع ہوتی رہیں۔ یہ فخر اردو زبان کو حاصل ہے کہ ہر زبان ہی میں ان کے افسانے آباد ہیں۔ لہٰذا سہیل صاحب کی کہانی "ناک" امریکہ کی کہانیوں کی ایک انتھولوجی میں بھی شامل ہے۔

سہیل صاحب کے افسانے کے دو مجموعے "الاؤ" اور "نئے پرانے" مکتبہ اردو لاہور سے شائع ہو چکے ہیں اس کے علاوہ انہوں نے تنقیدی مضامین، شخصی خاکے، ڈرامے، فیچر اور مزاحیہ خاکے وغیرہ بھی لکھے ہیں۔

یوں تو اردو کا دم بھرنے والے ادیبوں، صحافیوں اور دانشوروں کی کبھی کوئی کمی نہ رہی مگر سہیل صاحب جیسا اردو دوست انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ان کی گرانقدر شخصیت کے بارے میں جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہر آدمی انسان نہیں بن سکتا اور جو انسان ہوتے ہیں وہ آدمی کی سطح سے اوپر ہوتے ہیں۔ سہیل صاحب کی فطرت و عادت عام آدمیوں سے بھلا منفرد تھیں۔ انکساری، اخلاق مندی، شرافت اور محبت، یہ سب کچھ ایک ساتھ ہی ان کی فطرت میں سما گئی تھی۔

سہیل صاحب نے اپنی کہانیوں اپنی تخلیقوں سے یہ منوالیا کہ وہ جو کچھ بھی لکھتے رہے وہ ان کی اپنی ذات کے لئے نہیں تھا بلکہ سارے سماج کے لئے تھا۔ ان کے قلم نے اردو زبان کو جو بیش بہا سرمایہ دیا ہے وہ عظیم تر ہے۔ آج وہ جسمانی طور پر نہ سہی مگر وہ اپنی تخلیقوں سے ہر روپ میں ہمیشہ ہی ہمارے سامنے آتے رہیں گے۔ کیونکہ موت جسم کی ہوتی ہے۔ کسی ادیب کا ادب نہیں مرتا! کسی انسان کی عظمت نہیں مرتی! اور کسی فنکار کا فن نہیں مرتا!!! ☐

بقیہ: سہیل عظیم آبادی کے چند تاثرات۔

۲۹ر نومبر ۱۹۷۹ء تاریخ ادب میں ایک منحوس دن ہے جس دن انہوں نے جام ابدی کو نوش فرمایا اور ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جدا ہوگئے لیکن ایک کامیاب افسانہ نگار کی حیثیت سے دنیا میں جب تک علم و ادب کا پرچم لہراتا رہیگا۔ ان کا نام زندہ [illegible] ☐

قمر شادانی

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

کل نفس ذائقۃ الموت [illegible] انسان [illegible] مند میں پر آیا ہے یا جس نے عالم رنگ بو میں آنکھیں کھولی ہیں۔ اُسے شہر خموشاں اور گور گریباں کا منہ دیکھنا ہی ہوگا۔ اور اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کس کس کا ماتم کرے اور کس کس کو روئے۔ جو چند گھنٹوں یا چند دنوں [illegible] ہمارے بیچ ہنستا بولتا ہماری زندگی کا ایک جز و [illegible] انسان تھا وہ ہمارے بیچ نہ رہا۔ لوگ کہتے ہیں [illegible] ہیں اور رسالوں میں بار بار مختلف عنوانات سے [illegible] کی عدم موجودگی کا یقین دلا یا جاتا تو عقل دلیل پر کچھ [illegible] کے لئے عقل تو خاموش رہ جاتی ہے لیکن دل و دماغ کس طرح یہ تسلیم کر لینے کو تیار نہیں ہوتی ہے کہ بہار کا [illegible] جیتا جاگتا تناور درخت جو اپنی ذات میں بذات خود صد انجمن تھا۔ اجل کے ایک معمولی جھٹکے سے ہم سے سدا کے لئے چھوٹ گیا۔ جس کا نام مجیب الرحمٰن تھا اور جس نے سرزمین بہار میں دنیائے آب و گل میں پھر ایک بار [illegible] خاک کی عظمت و شہرت میں چار چاند لگانے کے [illegible] یکم جولائی ۱۹۷۱ء کو خاک پا کو وہ عظمت بخشنا چاہی جس عظمت و شہرت کے آگے انجم درخشاں بھی سہمے

یوں تو سرزمین بہار سے نہ جانے کیسی کیسی بلند و بالا ہستیاں پیدا ہوئیں جنہیں زندگی کی کسی ایک مدت پر جاکر خاک نشین ہو جانا پڑا۔ اور ان کی موت پر عزیز و اقارب اور دوستوں اور بہی خواہوں کو صبر کر لینا پڑا۔ لیکن صبر کرنے کی سب سے بڑی وجہ صرف ایک ہے کہ انسانی ہستی چاہے کتنی عظیم ہو قدرت کا یہ دستور ازل سے قائم ہے اور ابد تک قائم رہے گا ؂

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اردو شعر و ادب کے بتدریج ارتقا کی تاریخ اور اس کے مختلف مراکز کے ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ لیا جائے تو بہار کی اہمیت بھی ان میں کسی سے کم نہیں خوشی ہے اور مقام حیرت بھی کہ بہار والوں نے اردو شعر و ادب کے ارتقا میں روز اوّل سے حصہ لیا۔ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور یہی نہیں کہ صرف بہار والے داستان گل و بلبل میں اپنے شاعرانہ جذبات و احساسات کی ترجمانی کو خدمت لوح و قلم سمجھتے رہے بلکہ اردو کے جملہ اصناف کے بتدریج ارتقا میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کرتے رہے اور یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی

جاسکتی ہے کہ اردو کے اس مرکز عظیم آباد میں اردو کی شعری اور نثری وہ کوئی ایسی صنف نہیں جس میں بہار والوں نے اپنا نمایاں حصہ ادا نہ کیا ہو — بہار کا یہ چراغ جس کی لَو گرچہ اپنے ساتھ کتنوں کو روشنی بخش چکی لیکن پھر بھی دل اس کی لَو سے ابھی پوری طرح بھرا نہ تھا۔

سہیل عظیم آبادی کا اصلی میلان گرچہ افسانہ نگاری ہے اور دنیائے ادب اسے ایک کہانی کار کی حیثیت سے جانتی اور زیادہ بہتر طور پر پہچانتی ہے۔ لیکن میرا تاثر اس کے بالکل برعکس ہے اور ابھی تو اس موت پر نہ جانے کتنے بڑے بڑے فنکار اپنے زور قلم سے کیسی کیسی گہر افشانیاں کریں گے۔ ان میں کوئی لکھے گا "میرا دوست سہیل چل بسا"۔ کوئی اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرے گا کہ "سہیل بھائی نہ رہے"۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ "اردو نے اپنا ایک محسن اعظم کھو دیا"۔ اور خاص کر عظیم آباد والے یہ کہنا چاہیں گے کہ "لو عظیم آباد کا ایک چراغ گل ہو گیا"۔ لیکن نہیں کچھ نہیں، یہ ساری باتیں بکواس ہیں۔ فنکار اور عظیم فنکار پہلے ایک اعلیٰ اقدار انسانیت کا علمبردار ہوتا ہے۔ بذات خود ایک اعلیٰ اور شریف النفس انسان ہوتا ہے اور اس کی اس شرافت نفسی اور انسانی عظمت کی چھاپ جہاں اس کی شخصیت پر پڑتی ہے۔ T.S. Elliot کے قول کے مطابق ادب و شعر کے نہاں خانے اس کی شخصیت کے ان ہی اوصاف سے سنورتے اور بے نقاب ہوتے ہیں پھر انسانی زندگی اپنی عمر رواں کے ساتھ شبانہ روز زندگی میں نہ جانے کتنے حادثات و واردات سے دوچار ہوتی ہے اور یہ حادثات و واردات انسانی شخصیت کو تلخ و شیریں یادوں کا نہ جانے کیسا کیسا سدا بہار تحفہ [illegible] چھوڑ جاتا ہے — ہاں یہ یادیں جو تلخ بھی ہوتی ہیں اور شیریں بھی، جو دل کش بھی ہوتی ہیں اور غم فضا بھی۔ لیکن یہی فنکار کا ازلی اور ابدی سرمایہ بھی ہوتا ہے جس کے پس پردہ تخلیق ادب و فن کا راز پوشیدہ ہوتا ہے جیسا کہ Migual Deunamair نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"Memory is the basis of individual personality just as tradition is the basis of the collective personality of the poet or people. We live in memory and our spiritual life is at bottom simply the effort of our memory to persist to transform itself into future"

[The tragic sense of life by Migual Deunamair]

سہیل عظیم آبادی کی موت پر میں سب سے پہلے یہ کہوں گا کہ انسانیت نے ایک بہت اچھا انسان کھو دیا دوستوں نے ایک بہتر دوست گنوا دیا۔ جذبۂ ملک قوم اور خدمت شعر و ادب رکھنے والوں نے ایک بہتر کارکن گنوا دیا اور انسانی ہمدردی اور بھائی چارے کا درس دینے والا سچا علم ادب اور بے لوث خادم قوم نہ رہا — جس کا غم اور افسوس جس قدر کیا جائے کم ہے۔ لیکن اس غم کرنے سے بہتر تو یہی ہے کہ اس کی زندگی اور اس کے وجود کو بے شک ہم اس کے ذریعہ دی گئی ان ہی تلخ و شیریں یادوں سے گلزار و آباد رکھ سکتے ہیں۔ کتنا قابل قدر تھا وہ انسان اور کتنا پیارا تھا وہ کہانی کار جس نے حالات کی کشیدگی اور جذبات کی دریدگی کے باوجود ہمیں نہایت عمدہ

شگفتہ اور سپاٹ ... کہانیاں دیں ... ناول دیئے اور لوگوں کا سہارا، آپ کو زندگی بھر وقت قوم و ملت اور شعر و ادب [illegible]

ادب و آرٹ کا یہ معاملہ جس قدر رنگین ہے اتنا ہی سنگین بھی۔ قدرت نے فکر و فن کی آبیاری کے لئے سدا غربت اور عسرت کے جسم سے خون تازہ حاصل کیا ہے۔ سہیل عظیم آبادی کے [illegible] سازگار نہ رہے اور یہی وجہ تھی کہ پرورش لوح و قلم کا شاید اسی پر خلوص انساں نے بہت کم عمری سے [illegible] لے رکھا تھا۔ نا آسودہ تمناؤں اور تشنہ کام آرزوؤں انسانوں کی مظلوم زندگی کا جتنا لطیف و شدید احساس سہیل کو عنفوان شباب سے حاصل تھا وہ انہیں کا خاص [illegible] اور تنقیدی شعور میں شکیل الرحمٰن کے الفاظ [illegible] کی بھرپور ترجمانی کے لئے کافی ہیں۔

"۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۵ء تک سہیل عظیم آبادی نے جو کہانیاں لکھی ہیں ان میں محسوس ہوتا ہے کہ وہ مظلوم انسانوں کی زندگی میں زندگی جاگتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں وسعت [illegible] انہیں پڑھتے ہوئے ہمارا افسانہ نگار سے بہت سارے [illegible] وابستہ ہو جاتی ہیں" (ص ۱۴۲)

یہ بات درست ہے کہ سہیل عظیم آبادی کی کہانیوں میں انسانیت کا جو درد، آدمیت کا جو سوز اور زندگی کے لئے جو تڑپ ملتی ہے وہ فرضی نہیں اور نہ صرف ان میں مثالیت پسندی کی حقیقت پوشیدہ ہے بلکہ سہیل عظیم آبادی کی ذات اور شخصیت کا ایک بہتر اور بھرپور پرتو ہے ــــ یوں بھی کہا جاتا تھا کہ سہیل عظیم آبادی بنیادی طور پر پریم چند سے متاثر ہیں۔ ان کے نقش قدم پر چلتے بھی ہیں اور پریم چند [illegible] پسند تحریک سے انہیں خاصہ لگاؤ رہا ہے اس کے علاوہ اپنے ہوش سنبھالنے کے بعد سے کہانی نے ان کی غربت، شخصیت اور فکر و فن سب کا بھرم رکھ لیا ہے

سہیل عظیم آبادی ہی اول و آخر جو سب سے بڑی خوبی ہے وہ یہ ہے کہ آپ سیاسی ادبی کسی بھی تحریک یا انداز فکر و نظر کے نہ تو خود نمائندہ بنے اور نہ اپنی شخصیت اور فن کو ان میں قید ہونے دیا۔ اس طرح ایک اعلیٰ فنکار کے لئے جس ذہنی فکری اور شعوری آزادی کی ضرورت ہے اس کے لئے آپ نے اپنی راہیں خود بنائیں اور ہر منزل حیات آپ کے فن کے لئے خود منزل کا پتہ دیتی رہی۔

فنا اور بقا کے مسائل میں الجھا ہوا یہ سہیل عظیم آبادی ہمیشہ دوشیزۂ حیات کے زلف پریشاں کو سنوارنے میں صرف اپنی نرم و نازک اور ریشم جیسی انگلیوں کو ہی لہو لہان نہیں کرتا رہا بلکہ اپنی شخصیت کے ساتھ اپنے دل کو بھی داغدار بنانے میں اپنی خوشی اور کامیابی محسوس کرتا تھا ہاں یہ ضرور ہے کہ اس نے اپنے دل کے ان ہی داغوں سے اپنی شخصیت اور فن دونوں کو سرو چراغاں بنائے رکھا اور شاہراہ انسانیت پر ایک ایسی شمع کا نوری روشنی کی جس سے شاہراہ حیات پر چلنے والوں کے لئے سدا اجالا ہے ایک کہانی کار کی حیثیت سے سہیل عظیم آبادی کی شخصیت کی یہ تصویر عام لوگوں کے لئے بہت اہم ہے۔ اور خاص کر دنیائے ادب کا ذوق و شوق رکھنے والوں کے لئے بھی۔

سہیل فطرتاً افسانہ نگار، عادتاً شاعر مزاج، رسماً مسلمان ہیں۔ پان خوب کھاتے ہیں، سگریٹ کے عادی اور چائے پابندی سے نوش کرتے ہیں اور کہانی جی سے لکھتے ہیں..... سہیل نے اردو افسانوں میں اپنی جگہ وہاں بنالی ہے جہاں احمد ندیم قاسمی، سدرشن اور پریم چند کی بیٹھک ہے۔ یہ فنکار ایک خاص گوشہ میں جمع ہیں اور ان کا جھنڈا پریم چند کے ہاتھوں بلند ہے۔ دیہاتی پنجاب اگر احمد ندیم قاسمی کے یہاں سربلند ہے، بہاری بستیاں سہیل عظیم آبادی کے یہاں شاداب ہیں۔ سہیل عظیم آبادی کی

چشم وا بدصورتی میں ہر وہ خوشنمائی دیکھتی ہے جو بہ ظاہر نظر نہیں آتی۔ گاؤں والوں کا شکھ دکھ، دیہات والوں کا سادہ پریم، بابوؤں کی قسطائیت، سرکاروں کی شہنشاہیت [illegible] کے افسانے کے خاص موضوعات ہیں "۔

(بہار کے نو چراغ ص ۱۱۴ — ۱۱۵)

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں ان کی تمام تر کہانیوں میں کچھ اسی قسم کی باتیں ملتی ہیں۔ خواہ وہ "الاؤ" کی کہانیاں ہوں یا "نئے پرانے" کی۔ خواہ ان کی کہانیاں "روشنی" اور "دل کا روگ" ہوں۔ خواہ "سادھو" اور "دو مزدور" "پیٹ کا دھندہ"، "بھیک"، "بھائی" "بے چارہ" "رنڈیاں" اور "دل کا بوجھ" میں انہوں نے زبان و بیان فکر و فن اور کہانی کے مواد کے اعتبار سے بھی اپنے فکری، فنی اور شعوری ارتقا کی نہ جانے کتنی منزلیں طے کی ہیں جس کا اندازہ ان کہانیوں کے بغور مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔ کہانیوں کے علاوہ ان کا ایک ناولٹ "بے جڑ کے پودے" نے ان کے حیات ہی میں خاطر خواہ شہرت حاصل کی ہے۔

"بے جڑ کے پودے" — ان کا ایک ناولٹ ہے۔ ناولٹ کا فن دراصل ناول اور مختصر افسانے کی بیچ کی کڑی ہے بنیادی طور پر ناول اور ناولٹ میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا چونکہ ناولٹ کا کینوس ناول کی بہ نسبت چھوٹا ہوتا ہے اس طرح حیات انسانی کے نوع بہ نوع تجربات و مشاہدات جذبات و احساسات کی بھرپور اور مفصل ترجمانی کا موقع مختصر افسانوں کی طرح یہاں بھی ملتا ہے۔ چونکہ سہیل عظیم آبادی بنیادی طور پر حقائق حیات کے اُن رستے ناسور کو اپنے افسانوں اور کہانیوں کا موضوع بناتے ہیں جہاں انسانوں کی انسانیت، اس کی معصومیت اور شرافت اور ان سب سے بڑھ کر ہمارا غلط معاشرتی نظام ہماری زندگی کا سب سے بڑا روگ سب سے بڑا بوجھ بن جاتا ہے۔

[illegible] سنہا صاحب انگلینڈ سے قانون کی اعلیٰ ڈگری لے کر لوٹتے ہیں تو وہاں کی روایت کے مطابق اپنے ساتھ ایک حسین تحفۂ حیات بھی شامل کر لیتے ہیں۔ رانچی میں کچھ دنوں ازدواجی زندگی گذارنے کے بعد سنہا صاحب کی زندگی کا وہ گلشن شاداب سدا کے لئے مُرجھا جاتا ہے اور اپنی تنہائی و مجبوری کو بہلانے کا جواز سنہا صاحب خدمت خلق میں تلاش کر لیتے ہیں۔ وہ ایک مشن سے وابستہ ہو جاتے ہیں جہاں انہیں مس گریبن سے شناسائی ہوتی ہے۔ مس گریبن جو اسی مشن کی ایک سر برآوردہ کارکن ہے۔ اس کی نظر ایک دن اسی مشن میں یکے بعد دیگرے دو بچوں پر پڑتی ہے وہ بچے اسی مشن میں ناجائز اولاد کی حیثیت سے پلنے لگتے ہیں۔ یہ دونوں بچے جو سماج میں سنہا صاحب جیسے اعلیٰ بلند مرتبت شخصیتوں کے کالے کرتوتوں کی وجہ سے اپنی معصومیت کو مظلومیت میں بدل لیتے ہیں اور ان کی بے گناہی اور معصومیت ہی سماج کے غلط نظام کی بدولت ان کا سب سے بڑا گناہ بنتی ہے۔ دونوں بچے دیلین فریڈی کے ظلم سے تنگ آکر سنہا صاحب کے پاس امداد طلب ہوتے ہیں اور سنہا صاحب ان دونوں کو الہ آباد اور پٹنہ تعلیم کی منزلوں کو طے کرنے کے لیے روانہ کر دیتے ہیں۔ اور یکایک ایک دفعہ سنہا صاحب بُری طرح بیمار پڑتے ہیں اور اس بیماری کے دوران انہیں اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں رہتا۔ مس گرین کے ذریعہ وہ نورآ اور ارنسٹ کو بلوا لیتے ہیں جو شباب کی منزلوں پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی لاشعوری طور پر ایک دوسرے سے جذباتی رشتہ قائم کر چکے تھے۔ سنہا صاحب زندگی کی آخری منزلوں پر اس راز کو مس گرین پر فاش کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ بعد میں کہیں ارنسٹ اور نورآ معاشرے کے اس خوبصورت بندھن میں نہ بندھ جائیں۔ جسے لوگ

شادی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ناولٹ ہونے کی حیثیت سے پلاٹ چھوٹا اور پھیلا ہے۔

سہیل اگر چاہتے تو ناول کی شکل دے سکتے تھے لیکن سہیل عظیم آبادی ایک اردو فنکار ہوتے ہوئے باتیں بنانا نہیں جانتے انہیں کام کی باتیں کرنا آتی ہیں۔ بات کو بتنگڑ بنانا نہیں۔ پھر تکمیل فن کے سلسلے میں ان کا نظریہ یہ ہے کہ کم سے کم الفاظ میں باتیں زیادہ بہتر اور موثر طور پر کہی جا سکتی ہیں۔ نظام معاشرت کی غلطی کی بنا پر سنہا صاحب اور پونجی (نوکرانی) کے غلط ازدواجی تعلقات نے ارنسٹ اور نورا کو [illegible] دنیا میں لا یا۔ اس میں ان دونوں کا کوئی قصور نہیں۔ سماج کا وہ [illegible] ان کے لئے ہمیشہ قابل رحم اور ہمدردی کا [illegible] چاہئے۔ [illegible] سزا کا اگر کوئی حقدار ہے تو ملزم نے قانون کے ہاتھ اگر لمبے ہیں تو یہ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مجرم چھوٹ جائے اور مجرم کے نام پر معصوم اور بے گناہ کو ظلم کے اندھے غار میں سدا کے لئے بلکنے اور سسکنے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ یہاں فنکار کی فنکارانہ جابکدستی کا کمال وہاں جھلکتا ہے جب وہ خود غلط نظام معاشرت کے باوجود پونجی سے زن و شو کے تعلقات تو قائم کر لیتا ہے لیکن ارنسٹ اور نورا جو حقیقتاً بھائی بہن ہیں وہ بھی کہیں سماج کے اندھے قانون کی بدولت ظلم و بے زاری کے اندھے غار میں نہ گر جائیں۔ اس سے انہیں بچانا ہے۔ بے شک سہیل عظیم آبادی پریم چند سے صرف متاثر نہیں بلکہ ان کے سچے پیرو ہیں۔ سنہا صاحب اور روز و شینی کی کردار کو پیش کر کے وہ یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ انسان بہر حال انسان ہوتا ہے۔ لغزشیں اگر اس کی فطرت ہے تو اپنی لغزشوں کا احترام اور اس سے سبق لینا بھی اس کی فطرت کا ایک حصہ ہے اور اس کے کردار کا ایک پہلو بھی۔ یعنی سنہا صاحب آخر کار اپنی لغزشوں کا اقرار کر کے ہی مرتے ہیں۔

❖

انجم عظیم آبادی

قطعہ

(سہیل عظیم آبادی کی یاد میں)

اندھیرا صفحۂ قرطاس پر اب بڑھتا جائے گا
بتاؤ کون پھر الفاظ کی شمعیں جلائے گا
ترے جیسا نہ ہوگا اب کوئی اہل ہنر پیدا
قلم تا عمر تیری یاد میں آنسو بہائے گا

واقف پریمی

نذر عقیدت

(حضرت سہیل عظیم آبادی کے سانحۂ ارتحال پر)

واقف رازِ روح و تن تھا سہیل
ماہر نبضِ فکر و فن تھا سہیل
کیوں نہ تیرہ ہو بزم افسانہ
ایک تابندہ کرن تھا سہیل

افتخار عظیم چاند

ہم تو مہمان تھے چار دن کے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

فن کار کبھی نہیں مرتا۔ وہ اپنے فن کی وجہ کر ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ ایک فن کار، ایک ادیب یا ایک تخلیق کار اپنے فن، اپنے ادب یا اپنی تخلیق سے جانا جاتا، پہچانا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ایک کثیر تعداد میں لوگ موجود ہیں۔ ایک جم غفیر ہے۔ لوگ جوق در جوق چلے آ رہے ہیں۔ یہاں شاہ ارزاں کی مسجد میں تل رکھنے کی بھی جگہ نہیں ہے۔ یہ سب اپنے محبوب اور ہر دلعزیز رہنما، اپنے محسن، خادم اردو، اور اپنے بزرگ و شفیق استاد کی میّت کو کاندھا لگا کر ان کو آخری آرام گاہ تک پہنچانے اور ان کا آخری دیدار کرنے آئے ہیں۔ ان میں ہندی اور اردو زبان کے ادیب شاعر، دانشور، فن کار اور صحافی، وکیل اور جج، ڈاکٹر اور انجینئر، ایم۔ ایل۔ اے اور منسٹر، پولس آئی۔ جی، ٹیچر اور لکچرر، پروفیسر اور ریڈر، ناڈلسر اور پروگرام اکزیکیٹو، آفیسر اور کلرک، تاجر اور دکاندار، بیڑی مزدور اور رکشا مزدور وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

حاضرین کے دل غم والم میں ڈوبے ہوئے ہیں لبوں پر آہیں ہیں اور آنکھیں اشکبار ہیں۔ موسم بھی شدت غم سے کانپ رہا ہے۔ اور بادل بھی رو رہے ہیں کیوں؟۔ کیونکہ ہندوپاک سطح پر شہرت یافتہ، ایک بلند پایہ ادیب اور، "چوکیدار" اور "الاؤ" جیسے معیاری افسانے کے خالق سہیل عظیم آبادی کی زبان آج گنگ ہے۔ آنکھیں بند ہیں اور وہ ابدی نیند سو چکے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی مرحوم صرف ایک بلند پایہ ادیب ایک باکمال افسانہ نگار ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک سچے محب اردو اور خادم قوم بھی تھے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی اردو ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ آج سے چالیس سال قبل رانچی کے سنگلاخ علاقے میں انہوں نے انجمن ترقی اردو کے ایک کارکن کی حیثیت سے اردو زبان کی خدمت کا بوجھ اپنے ناتواں کاندھے پر اٹھایا تھا جسے تاعمر سنبھالے رہے۔ انجمن کا ایک ذیلی ادارہ جس کا چھوٹا ناگپور اردو مرکز تھا۔ اور جو بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی سرپرستی میں چل رہا تھا اس کے وہ مہتمم تھے اور دن رات اپنی مادری زبان کی ترویج و ترقی اور اشاعت میں لگے رہتے تھے۔ وہ نہ صرف دوستوں کے دوست تھے بلکہ دشمنوں کے بھی دوست تھے۔ وہ قوم کے بہی خواہ اور غریبوں کے ہمدرد تھے۔ ان کی نظر میں سرمایہ دار اور غریب دونوں ہی برابر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مقبول عام اور ہر دلعزیز تھے۔ اپنی قوم کے ساتھ ساتھ غیر قوم بھی ان کی کافی گرویدہ تھی۔ ان کی انسان دوستی اور غریب نوازی بھلائی نہیں جا سکتی۔

ڈھونڈ و گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم، اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

عصری ادب کے آخری افسانہ نگار اور جدید اردو افسانے کے باوا آدم منشی پریم چند کے وہ ہم خیال اور جانشین تھے۔ اور انہیں کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ سہیل عظیم آبادی کو منشی پریم چند سے گہری عقیدت تھی۔ وہ پریم چند کو اپنا استاد مانتے تھے۔ پریم چند کسانوں، مزدوروں اور سماج کے ٹھکرائے ہوئے، کچلے ہوئے اور مظلوم انسانوں کی کہانیاں لکھتے تھے۔ لہٰذا انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سہیل عظیم آبادی نے بھی مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کی کہانیاں لکھیں۔ ان کی کہانیاں زندگی کی سچی عکاسی کرتی ہیں۔ وہ مرتے دم تک اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ اپنی علالت کے باوجود بھی اپنی مادری زبان کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر ابھی چند دنوں پیشتر وہ انجمن ترقی اردو ہند کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے چنڈی گڑھ تک گئے تھے۔ انہوں نے افسانوی ادب کے گلہائے باغ کو اپنے خون جگر سے سینچا اور بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے شانہ بہ شانہ اردو کی تبلیغ کی اور اردو کے ٹمٹماتے چراغ کو روشن کیا۔ ع

چراغ انجمن تو ہیں بس ایک شب کے مہماں
تو جلا وہ شمع اے دل جو بجھے کبھی نہ جل سکے

سہیل عظیم آبادی ایک اعلیٰ درجہ کے باشعور اور ممتاز صحافی بھی تھے۔ انہوں نے کئی ادبی اور معیاری رسالے اور اخبارات نکالے۔ ان رسالوں اور اخبارات نے ثابت کر دیا کہ وہ میدان صحافت میں بھی یکتائے زمانہ تھے۔ وہ بہت ہی ٹھوس، واضح اور جامع لکھتے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے عبدالقیوم انصاری صاحب مرحوم کے ساتھ ایک ادبی پرچہ "تہذیب" کا اجرا کیا۔ بعد میں روزنامہ "ساتھی" سے بھی وابستہ رہے۔ ان کے وقت میں "ساتھی" بہار کا ایک مقبول ترین روزنامہ تھا۔ وہ مجھ سے بہت ہی مخلص اور کرم فرما تھے۔ ان کی شفقت سے آشنا میں اپنے بچپن کے زمانہ سے تھا۔ ان دنوں میں اپنے رشتے کے لوگوں کے ساتھ پروفیسر عطا الرحمن عطا کاکوی صاحب کے مکان واقع نو گھرا محلہ سلطان گنج میں قیام پذیر تھا اور سہیل چچا بغل والے مکان نور منزل میں رہتے تھے۔ وہ روزانہ ہمارے یہاں تشریف لاتے تھے۔ اور میرے چچا جان مرحوم سے برابر خلوص سے ملتے تھے۔ میں ان کو اپنا مربی اور بزرگ سمجھ کر تعظیم و تکریم کرتا تھا اور چچا جان کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ میں نے اپنے کام کے سلسلے میں جہاں بھی ان کو وقت کرنے کی زحمت دی انہوں نے بلا کوئی حیل و حوالے اور بلا کسی تامل کے میرا کام کیا۔ کیا چھوٹا کیا بڑا۔ وہ سبھی کے کاموں کو کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے اور سبھی کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے تھے۔ ع

اے فصل بہاراں رخصت ہو، ہم لطف بہاراں بھول گئے
سب کا تو مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا کر نہ سکے

لیکن اس فرشتہ صفت، انسان کو انسانیت کے مجسمہ کو اور اس انسان دوست کو ہمارے سماج والوں نے بھی نہیں بخشا۔ ۱۹۴۶ء کے فرقہ وارانہ فساد کے دوران لوگوں نے ان کے گاؤں کو لوٹ لیا اور ان کا گھر جلا ڈالا۔ اور تو اور جمشید پور میں حالیہ فرقہ وارانہ درندگی کا مظاہرہ کرنے والے شیطانوں نے پروفیسر ذکی انور جیسے لائق بھائی اور فرمانبردار شاگرد کو ان سے چھین لیا۔

"کتنا جاہل اور وحشی ہے ہمارا ملک۔ میں تو کبھی سوچنے لگتا ہوں کہ ہم لوگ کبھی مہذب زندگی گزارنا بھی سیکھیں گے یا وحشی ہی رہیں گے اور قیمتی زندگیاں وحشت کا نشانہ بنتی رہیں گی"

یہ باتیں انہوں نے مرحوم ذکی انور کی شہادت سے متاثر ہو کر تحریر کی تھیں۔ جن کو وہ اپنے چھوٹے بھائی کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ ع (بقیہ ص ۶۲ پر)

غلام ابوعاصم
نفیس منزل، گیا

غریبوں کا مسیحا

سہیل عظیم آبادی زندگی کے اس طوفان میں چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے آگے بڑھتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ لہولہان ہو گئے لیکن ان کے پائے استقامت میں لغزش تک پیدا نہ ہوئی۔ شاید یہاں کے عزم کا صلہ تھا انہوں نے جب آنکھیں کھولیں تو ہندوستان غلام تھا اور غلامی کی طوق ہر ہندوستانی کی گردن میں حائل تھی۔ ملک میں چاروں طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ جب انکے شعور نے پختگی اختیار کی تو ان کے فن نے زندگی کی برق رفتاری میں حصہ لینے کے لئے انہیں اکسایا اور تب انہوں نے فن کی شمع اٹھائی اور دوسرے فنکاروں کے ساتھ روشنی کی تلاش میں نکل پڑے۔ زندگی کی صالح قدروں کی تلاش میں انہیں نہ جانے کن کن منزلوں سے گذرنا پڑا۔ لیکن وہ ہراساں نہ ہوئے۔ کیونکہ وہ فنکار تھے۔ اس لئے ان کی آنکھیں بینا تھیں اور دل حساس و دردمند تھے۔

جب انہوں نے ملک میں پھیلے ہوئے جاگیردارانہ نظام پر نظر ڈالی تو وہاں انہیں بے ایمانی، دغابازی اور ناانصافی کے سوا کچھ نہ دکھائی دیا۔ انہوں نے اپنی کھلی آنکھوں سے یہ بھی دیکھا کہ طبقہ اعلیٰ غریب کسانوں اور مزدوروں کا استحصال کر رہا ہے ان کے حساس دل کو ایک تازیانہ لگا اور انہوں نے سوچا کہ اگر ان تخریب پسند قوتوں کے خلاف علم بغاوت نہ اٹھایا گیا تو یہ غریبوں کے خون تک کی تجارت کرنے لگیں گے۔ پھر کیا تھا۔ ان کے قلم میں جنبش و حرکت پیدا ہوئی اور وہ غریبوں کے مسیحا بن بیٹھے۔

وقت گذرتا گیا اور ماہ و سال میں تبدیلی ہوتے رہے ان کا قلم زندگی کی شاہراہ پر تیزی سے دوڑتا رہا۔ اور انسانوں کی تہذیب سے گندگیوں کو کھرچ کھرچ کر نکالتا رہا۔ انہوں نے غریب کسانوں اور مزدوروں کے دکھ درد اور جاگیردارانہ نظام کے عیوب و مظالم کو اپنے فن کا موضوع بنایا اور زندگی کی حقیقتوں کو افسانوں کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے رہے۔ ان کے قلم کی سحرکاری نے ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ کیونکہ انہوں نے انسانوں کو اپنے فن کے ذریعہ قعر مذلت سے نکال کر اس بلند مقام پر لا کر کھڑا کر دیا۔ جہاں سے انسانیت کا سراغ ملتا ہے۔

انہوں نے اپنی ساری زندگی انسانوں کی فلاح و بہبود میں گذار دی۔ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے وہ در در بھٹکتے رہے، ٹھوکریں کھاتے رہے لیکن عزم و یقین کے شہنشاہ تھے۔ اس لئے مایوسیوں اور ناامیدیوں سے کنارہ کش رہے۔ ان کی نگاہوں میں روشن مستقبل کی جھلک تھی اور انہیں اس بات کا یقین تھا کہ آج جو زندگی کی رفتار ہے، کل باقی نہ رہے گی۔ آنے والا کل روشن و تابناک ہوگا۔ اس لئے وہ اپنے مستحکم ارادے اور بلند فن کے ذریعہ چلتے رہے۔ جد و جہد کرتے رہے۔ کوششیں کرتے رہے۔

سہیل عظیم آبادی اس دنیا میں حساس طبیعت اور دردمند دل لے کر آئے تھے۔ اس لئے انہیں انسانی

برادری کی پستی کا غم تھا۔ وہ ہر وقت انسانوں کو پستی
سے نکالنے کی فکر میں منہمک رہتے تھے۔ ان کی یہ فکر انفرادی
نہ تھی بلکہ اجتماعی تھی۔ کیونکہ بنیادی طور پر وہ ایک
فن کار تھے۔ اور فن کار انفرادی زندگی گذارنا گناہ
تصور کرتا ہے۔ ان کا دل ساری دنیا کے انسانوں کی
فلاح کے لئے برابر طور سے دھڑکتا تھا۔ کبھی انسانوں کی
خوشی سے انہیں مسرت ابدی ملتی اور کبھی ان کے غم والم
سے لازوال حزن و ملال۔ انہوں نے زندگی کا مشاہدہ
کھلی آنکھوں سے شہروں، دیہاتوں اور گلی کوچوں میں
گھوم گھوم کر کیا تھا۔ اسی لئے ان کے فن میں زندگی کی
[illegible]یاں سمٹ آئی تھیں۔

چند دنوں قبل جب جمشید پور فرقہ وارانہ فساد
میں ایک بلند فنکار ذکی انور شہید کر دیئے گئے تو سہیل
عظیم آبادی بے حد اداس ہو گئے تھے۔ کیونکہ ذکی انور
کا قتل صرف ایک فنکار کا قتل نہیں تھا بلکہ ساری انسانیت
کا قتل تھا۔ اس لئے وہ مسلسل کئی دنوں تک کرب میں مبتلا
رہے۔ اور خون کے آنسو روئے۔ انہیں ملال تھا کہ انسانوں
نے ایک انسان کو اس صفحۂ ہستی سے صرف اس لئے مٹا دیا
کہ اس کا یقین سیکولرزم میں تھا۔ انہوں نے انسان کی
بربریت اور درندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور
کانپ اٹھے۔

لیکن آج انسانوں کا یہ غم خوار، فن کا شہنشاہ اور
ادب کا بادشاہ ہمارے درمیان زندہ نہیں رہا۔ اور
۲۹ نومبر ۱۹۷۹ء کی صبح ۷ بجے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔
لیکن اس کا فن اور اس کا نصب العین ہمارے لئے مشعل
راہ ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ سہیل عظیم آبادی کی زندگی سے سبق
حاصل کریں اور ان کی روح کی تسکین کا باعث بنیں۔

زندگی کو نہ ہے ثبات، نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن ہوس رنگ و بو کریں

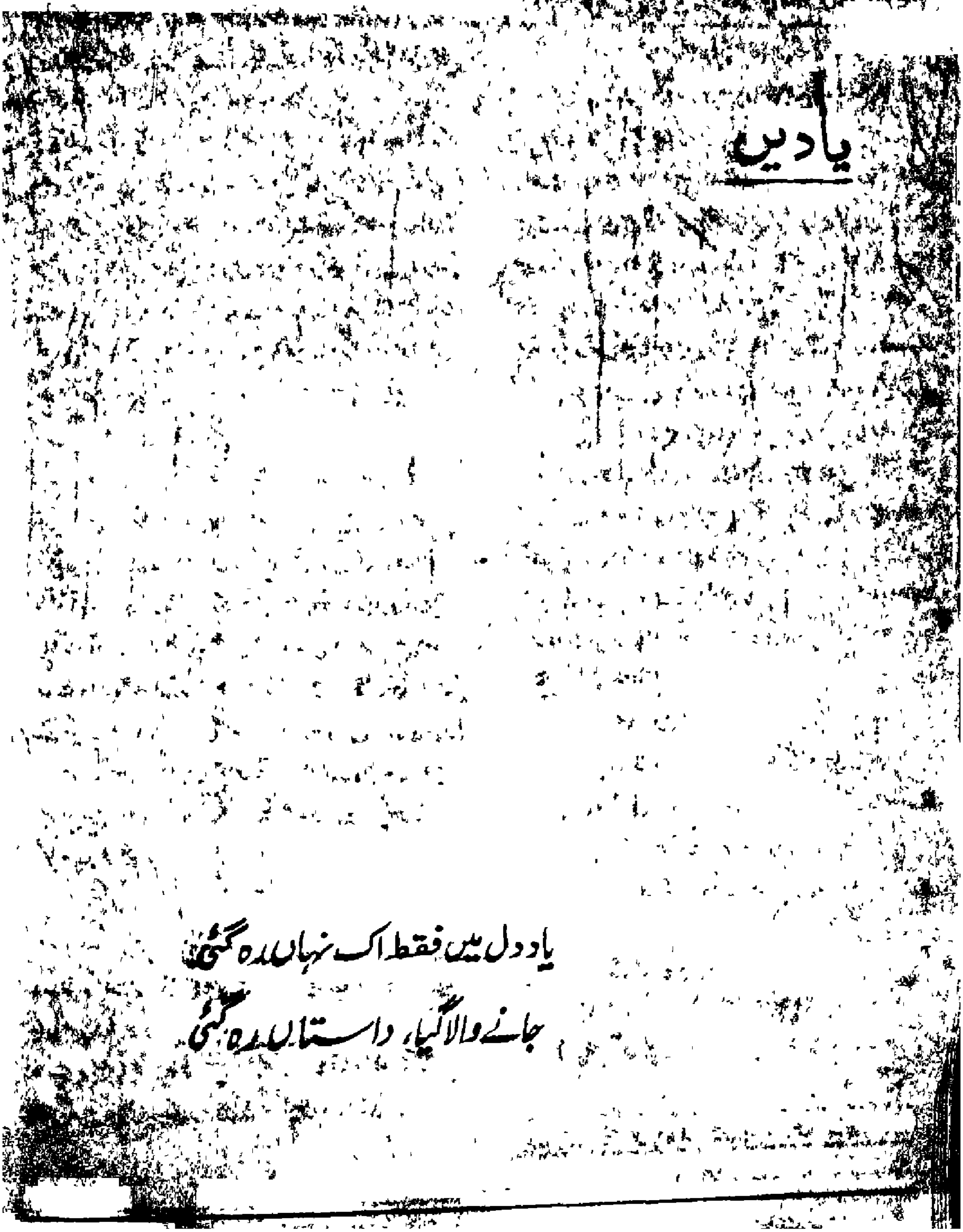
ان کی موت بھی دیارِ غیر میں واقع ہوئی۔ الہ آباد
پریم چند کے صاحبزادے امرت رائے کے یہاں انہوں نے
رحلت فرمائی۔ ۲۹ نومبر ۱۹۷۹ء کی ظالم صبح نے ان کو ہمیشہ
ہمیشہ کے لئے ہم لوگوں سے چھین لیا۔ جس نے بھی ان کے اس
جہانِ فانی سے رحلت فرمانے کی روح فرسا والمناک خبر سنی
وہ تڑپ گیا۔ کہرام تھا اداس پر سکتہ سا چھا گیا۔ اور
بہتوں کو تو یقین ہی نہیں آیا۔ لیکن موت برحق ہے۔ اور
یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ وہ ہمیں غمزدہ، افسردہ چھوڑ کر
دور بہت دور جا چکے۔ جہاں سے لوٹ کر واپس کوئی نہیں
آتا۔ اور کبھی نہیں آتا۔ ان کی موت سے اردو ادب، اور
تہذیب کے دائرے میں جو بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ وہ
کبھی پُر نہیں ہو سکتا۔ ان کی بے وقت موت دنیائے فکر و
فن کے لئے ایک حادثۂ عظیم سے کم نہیں۔ اور ان کا سانحۂ
ارتحال اردو زبان و ادب کے لئے ایک ناقابلِ فراموش اور
ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

چند ماہ قبل انہوں نے اپنے دستِ مبارک سے ہفت
روزہ "پندار" کا ذکی انور نمبر مرتب کیا تھا۔ لیکن انہیں
یہ نہیں معلوم تھا کہ "سہیل عظیم آبادی نمبر" کون مرتب
کرے گا۔ اور ان کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اب
چار دن کے مہمان ہیں۔

ہو مبارک تمہیں شہر اپنا
ہم تو مہمان تھے چار دن کے

بقیہ:۔ ہم تو مہمان تھے چار دن کے ...



یادیں

یاد دل میں فقط اک نہاں رہ گئی
جانے والا گیا، داستاں رہ گئی

افسانوں کی کتابیں دلچسپ بھی ہوتی ہیں اور مفید بھی۔ دلچسپ تو اس لئے کہ ان میں زندگی چلتی پھرتی نظر آتی ہے اور ان میں انسان کو متاثر کرنے کی پوری صلاحیت ہوتی ہے ان میں کہیں شدت ہوتی ہے اور کہیں نرمی۔ کہیں دلآویز تصور ہوتا ہے اور کہیں تلخ حقیقتیں کہیں جذبات کو سکون پہونچانے والے عناصر ملتے ہیں اور کہیں انہیں بھڑکانے والے زندگی کی ساری ناہمواریت افسانوں میں اپنے اصلی روپ میں موجود ہوتی ہے اور انسان زندگی کو سمجھ سکتا ہے۔ تاریخ گوناگوں واقعات کی پیچیدگیوں کے باوجود انسان کے دل و دماغ پر اس طرح چھا جانے کی صلاحیت اپنے اندر نہیں رکھتی جو افسانوں میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ حالانکہ افسانہ اور تاریخ دونوں انسانی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک ہی واقعہ تاریخ کی کتابوں میں بالکل خشک اور غیر دلچسپ ہوتا ہے لیکن جب انہیں تاریخی واقعات کی بنیاد پر افسانہ نگار کوئی افسانہ لکھتا ہے تو وہ زیادہ دلچسپ، زیادہ اثر انگیز اور زیادہ حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے — تاریخ لکھتے وقت مؤرخ کا صرف دماغ ہی کام کرتا ہے لیکن افسانہ لکھتے وقت افسانہ نگار کا دماغ بھی کام کرتا ہے اور دل بھی —

سہیل عظیم آبادی

یادوں کے آئینے میں سہیل عظیم آبادی

از
سید بہاء الدین احمد

ظالم وقت اتنی تیز رفتاری پر ہے کہ ہم نشیں ہم نوالہ و ہم پیالہ یکے بعد دیگرے اٹھتے جاتے ہیں۔ ایک زخم تازہ رہتا ہے۔ زخم گِنِن کے مانند۔ تمام سینہ زخموں سے داغ داغ ہوتا جا رہا ہے۔ کہاں کہاں مرہم رکھئے — ایسے ہی حالات سے گھبرا کے کہنے والے نے کہا ہوگا ؎

یاد ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

چالیس پینتالیس سال پہلے کی بات ہے۔ ایک بائیس تیئیس سال کا نوجوان ہنس مکھ باغ و بہار، پان چبا چبا کے مسکرا مسکرا کے میٹھی باتیں کرنے والا شاہراہ حیات پر کھڑا ملا۔ اصلی نام تو مجیب الرحمٰن تھا مگر سہیل جیلی کے نام سے شہرت حاصل کر رہا تھا۔ دل بے ساختہ اس کی طرف جھکا — ابھی کوئی سوا مہینے کی بات ہے کہ اسی چالیس پینتالیس سال پہلے کے مرنجاں مرنج ہنس مکھ نوجوان کا جسد بے روح کفن میں لپٹا ہوا میرے سامنے پڑا تھا اور اس عزیزان نصیب سے فرمائش کی جا رہی تھی کہ حضرت سہیل عظیم آبادی کی وفات حسرت آیات پر اپنے تاثرات کا اظہار کیجئے۔

تاثرات کا اظہار کن لفظوں میں کیا جائے۔ آرزوئیں جب خاک میں مل جائیں تو اس کی تشریح کس طرح کی جائے۔ دنیائے دل کا ایک گوشہ اجڑ جائے تو اس کو کیسے بتایا جائے۔ ایک پرانا بہت ہی پیارا اور بے حد پیارا ساتھی جب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوٹ جائے، اس طرح اس کی صورت اب کبھی نظر آئے گی تو اس کو قید بیان میں کس طرح لایا جائے — اک آہ جگر سوز کیجئے اور چپ رہ جائیے۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار ہے نہ یارائے گفتار۔

صاحبان قرطاس و قلم حضرت سہیل عظیم آبادی کا ماتم کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ایک عظیم فنکار تھے۔ دنیائے افسانہ نویسی کے تاجدار تھے۔ پریم چند کے جانشین تھے۔ بیشک وہ سب کچھ تھے۔ مگر اپنا دل تو اس لئے رو رہا ہے اور اس لئے روتا رہے گا کہ سہیل ایک دوست تھا۔ ایسا مخلص، ایسا پیارا دوست جس سے اس نصف صدی کی مدت میں کبھی کوئی اختلاف نہ رہا۔ ہزار ہم سخن ہو، ہزار ہم نظری ہو، مقام جنبش ابرو نکل ہی آتے ہیں سہیل کے ساتھ بھی ایسے مقامات اکثر نکلے۔ مگر وہ جنبش ابروی کی حد تک رہ گئے۔ اور وہ جنبش ابرو جس وقت شروع ہوتی اسی

وقت ختم بھی ہو گئی۔

بہار اردو اکادمی کے سکریٹری شپ کا معاملہ تھا۔ سہیل کا نام اس عہدے کے لئے اکثر حلقے میں لیا جا رہا تھا اور زیادہ تر اہل علم حضرات اس انتخاب کو پسند کر رہے تھے۔ مگر ایک صاحب تھے جو کسی وجہ سے اس کو پسند نہیں کر رہے تھے۔ ایسی ایسی لغو باتیں ان کے بارے میں مشہور کرنے لگے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ سہیل کا حلقہ احباب ہمیشہ بہت وسیع رہا۔ ان ساری باتوں کی خبر ان کو ہو جاتی۔ قریب قریب ہر روز تفصیلی طور پر ان سے ان باتوں کا تذکرہ رہتا۔ مگر انہوں نے اس لغو بیانی کو سنجیدگی کا باعث کبھی نہیں بنایا۔ افسوس تو ضرور کیا مگر ان باتوں کے پھیلانے والے کے متعلق کبھی کوئی تلخ بات نہ کہی۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے ـــ ان کی بدگوئی کرنے والوں کو پنپتے نہیں دیکھا۔ بلکہ برابر یہی ہوا کہ جو ان کے دام محبت میں گرفتار ہوا وہ کبھی نکل نہ سکا۔

سری نگر کشمیر میں وہ کافی عرصے رہے۔ اس دور میں جب بھی ملاقات ہوئی وہاں کے زعفران، ڈل جھیل اور چنار کے حسین درختوں ہی کا تذکرہ کیا۔ وہاں کی سردیوں کی کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد وہاں کے احباب کا اتنی محبت کے ساتھ ذکر کرتے۔ زعفران کے کھیتوں اور اس کے رنگ و بو کو ایسے دلآویز انداز میں بیان کرتے۔ کشمیر کے سیر کی بے اختیار خواہش پیدا ہو جاتی۔ اس عزم کے ساتھ کہ اپریل مئی میں یا اکتوبر میں چاہے جو بھی ہو کشمیر ضرور جانا ہے۔ یہ کشمیری پر منحصر نہ تھا بلکہ اپنے ہر دوست کا۔ خصوصاً ایسے دوست کا جو ان کا محسن بھی ہو برابر بڑی محبت اور عظمت کے ساتھ تذکرہ کرتے۔ ان کے اس دوست کا چاہے زمانہ مخالف کیوں نہ ہو، مگر ان کے دل سے نہ اس کی محبت کم ہوتی نہ عظمت۔ نہ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ کبھی جھجکتے۔ یہیں پٹنہ کے ایک بہت ہی [illegible] جو گزر گئے ہیں وہاں جا چکے ہیں جہاں اب سہیل گئے ہیں۔ ان کے بہت ہی محبت کرنے والے بزرگ دوستوں میں تھے۔ ان کا اور ان کے سارے کنبے کا جس محبت کے ساتھ وہ ذکر کرتے تھے، کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔

پٹنہ کے ۱۹۷۵ء کے سیلاب کی ہولناکی بھلائی نہیں جا سکتی۔ اکثر محلوں میں مکانوں کی چھتوں تک پانی آ گیا تھا۔ مکان والوں کو کئی کئی دنوں تک چھتوں پر پناہ لینی پڑی تھی۔ اکثر دوسرے محلوں کے مکانوں میں بھی پانی گھس آیا تھا۔ سہیل اپنے ہر ملنے والے کے گھر چاہے کشتی پر ہو، چاہے گھٹنوں پانی میں چل کر ہو، روانہ ہو جاتے۔ سب کی خیریت پوچھتے اور جو خدمت ممکن ہوتی کرتے۔ اکثر احباب کے متعلقین تو گھروں میں تھے مگر وہ خود کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ راقم سطور ہی اس وقت دلی میں تھا۔ مگر سہیل کا روزانہ آنا۔ بچوں سے خیریت دریافت کرنا۔ ان کی دلدہی کرنا، جب تک سیلاب کا خطرہ ختم نہ ہوا، برابر جاری رہا۔

کچھ عرصہ ہوا قلب کا شدید دورہ پڑا۔ اتنا کہ ان کو اسپتال میں Intensive Care میں داخل ہونا پڑا۔ احباب کا ایک تانتا صبح سے شام تک بندھا رہتا۔ ہر شخص ان کی صحت یابی کے لئے دعاگو ہی نہیں بے چین اور بے قرار رہتا۔ خدا خدا کر کے صحت ہوئی۔ گھر واپس ہو گئے۔ کچھ دنوں تو ڈاکٹروں کے مشوروں پر عمل رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اپنی پرانی عادت پر لوٹ آئے وہ جو کہا ہے کسی نے

پھر بہار آئی، وہی دشت نوردی ہوگی

پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

صحت کچھ درست ہوئی گویا بہار لوٹ آئی۔ احباب کے گھروں کے پھیرے تیز تر ہو گئے۔ کھانے پینے کی احتیاط البتہ قائم رہی۔ جہاں زیادہ تر آہستہ ہی آہستہ ہوتا مگر پھیرے ضرور لگتے۔ آتے۔ اپنی مقررہ جگہ پر تشریف فرما ہو گئے۔ جس کرسی پر بیٹھتے تھے، برابر اسی پر بیٹھتے۔ چائے کی فرمائش کے ساتھ ساتھ یہ فرمائش بھی ہوتی کہ چینی کم اور دودھ بالکل نہ ہو۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ

ایسی باتیں رہیں جو دماغ پر زور دے کر بھی کی جاتی ہیں۔ نہ کسی کا شکوہ نہ کسی کی شکایت۔ کبھی افسانہ نویسی پر گفتگو۔ کبھی شعر و شاعری کا چرچا [illegible] سہتے تھے ایک باوضع [illegible] مرا سے [illegible] جب زندہ ہوں [illegible] یاد نہیں آتے۔ ہائے افسوس اب وہ بھی موجود نہیں ہیں کہ ان سے پوچھ لیتے۔ ایسی صحبتیں ہفتہ دس دن پر ضرور ہوا کرتیں

اسی بیچ پروسٹیٹ گلینڈ کا آپریشن [illegible] آپریشن کی خبر بیک ملی اسی وقت دیکھنے چلا گیا [illegible] سے معلوم ہوا آپریشن کامیاب ہوا ہے۔ دوسرے دن گیا تو باتیں ہوئی۔ اب معلوم ہوا کہ کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ چہرے پر تھکن کے آثار تو ضرور تھے۔ مگر لبوں پر کسی قسم کی تکلیف کے اظہار کا ایک لفظ بھی نہ تھا۔ سہیل کو کبھی کسی قسم کی تکلیف کی شکایت کرتے نہ سنا۔ ایسے شاکر و صابر لوگ کم ہوتے ہیں۔ زندگی کے دن جب پورے ہو جاتے ہیں تو موت آ ہی جاتی ہے۔ کوئی نہیں روک سکتا۔ مگر اس کے اسباب کا تذکرہ کرنے والے کرتے ہی ہیں۔ صحت کی طرف سے اسی بے اعتنائی اور لاپروائی نے سہیل کی جان لی۔

آخری ملاقات جو ہوئی تو کچھ پریشان پایا۔ بولے دیکھو چنڈی گڑھ جانا ہے۔ ترقی اردو کا جلسہ ہے اور جب نا ضروری [illegible] مگر گاڑیوں کی آمد و رفت کے اوقات کا کوئی ٹھیک نہیں ہے۔ بڑی پریشانی ہے۔" میں نے کہا "میاں غنیمت سمجھو گاڑیاں نہیں جا رہی ہیں۔ جانے کا ارادہ ترک کرو۔ تمہارے لئے اتنا لمبا سفر قطعی مناسب نہیں ہے" مگر وہ کب سننے والے تھے — بعد میں معلوم ہوا کہ وہ روانہ بھی ہو گئے پھر یہ جانکاہ خبر سنی کہ بیٹے سے تو رخصت ہوتے ہی رہتے۔ چنڈی گڑھ سے واپسی میں دنیا سے بھی رخصت ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

سہیل صرف بزم احباب ہی کیلئے نہیں، محفل علم و ادب کی [illegible] کیلئے بھی ایک شمع فروزاں تھا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

سہیل تیرے بعد

(نذر سہیل عظیم آبادی مرحوم)

پناہ ڈھونڈنے جائے گی کس کے سینے میں
متاعِ لفظ و معانی سہیل تیرے بعد

پریم چند کے لہجے میں کون لکھے گا
نئی رتوں کی کہانی سہیل تیرے بعد

سنگار گاؤں کی گوری کرے گی کس کے لئے!
نہ ہوگی شام سہانی سہیل تیرے بعد

ہمارے گاؤں میں پھر بیٹھ کر الاؤ کے پاس
کہے گا کون کہانی سہیل تیرے بعد

فن فسانہ نگاری کا حسن تجھ سے تھا
ہے ختم اس کی جوانی سہیل تیرے بعد

زمین فن کا اب آنچل کسی بھی موسم میں
نہ ہوگا پھر کبھی دھانی سہیل تیرے بعد

تو اپنے عہد کا بے شک تھا معتبر دانا
نہ ہوگا اب تیرا ثانی سہیل تیرے بعد

نجم عثمانی — معرفت سید ابوالقاسم سی پی ایم۔ ایف آئی ایس۔ دھنباد

پروفیسر سید حسین

سہیل عظیم آبادی کی یاد

سہیل مرحوم سے میری پہلی مرتبہ ملاقات آج سے تقریباً بیالیس سال قبل ۳۹-۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی جب ہندوستان [illegible] مسلم لیگ کا دور تھا۔ ان دنوں دو اخبار "ساتھی" [illegible] ادارت سے وابستہ تھے اور میری نشست اکثر اخبار صدائے عام کے دفتر میں ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ موخر الذکر اخبار کے مالک اور ایڈیٹر جناب سید نظیر حیدر مرحوم پٹنہ کالج میں میرے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ صدائے عام کے دفتر میں خبروں اور [illegible] سیاسی حالات پر تبصرہ ہوا کرتا تھا جس میں راقم السطور بھی حصہ لیا کرتا تھا۔ ساتھی اور صدائے عام کے سیاسی مسلک میں سخت اختلاف تھا۔ ساتھی کانگریس کا حامی اور صدائے عام مسلم لیگ کے نظریات کا ترجمان تھا۔ اب یاد نہیں آتا کہ سہیل [illegible] میرا تعارف کس طرح ہوا۔ لیکن تعارف ہو جانے پر رفتہ رفتہ اس نے بے تکلفی کی شکل اختیار کرلی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مرحوم سے ملاقات ہو جاتی تو اکثر ہم دونوں میں سیاسی [illegible] ہونے لگتی۔ کبھی کبھی تو آتے جاتے سر راہ ملاقات کے وقت بھی کسی نہ کسی طرح بحث چھڑ جاتی، اور اگر اس وقت کوئی تیسرا ملاقاتی آ ملتا تو سہیل مرحوم از راہ ظرافت کہتے "تم بازار میں اور سڑک پر بھی لکچر دینے لگتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ کلاس میں طلبا تمہارا لکچر نہیں سنتے" (ان دنوں میں بی این کالج پٹنہ میں اردو و فارسی کا لکچرر تھا) اور یوں بحث کا ہنسی خوشی خاتمہ ہو جاتا۔ "ساتھی" کے حلقۂ ادارت سے علیحدہ ہو جانے کے [illegible] دن کے بعد سہیل مرحوم نے ایک ماہوار رسالہ "تہذیب" نامی

جاری کیا۔ جس کی [illegible] شماروں کے بعد بند ہو گیا۔ اس رسالہ کے لئے انہوں نے تقاضا کر کے مجھ سے ایک مضمون لکھوایا تھا۔ لیکن رسالہ کی اشاعت بند ہو جانے کے باعث اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ جب سہیل مرحوم آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت میں داخل ہو کر پٹنہ سے باہر دہلی اور سری نگر (کشمیر) چلے گئے تو کئی سال تک ان سے ملاقات کا موقع بہت کم میسر ہوا۔ البتہ جب ان کا تبادلہ پٹنہ کو ہو گیا اور وہاں کے ریڈیو اسٹیشن میں اردو پروگرام کے انچارج ہو کر آ گئے تو روابط میں تجدید ہوئی اور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ مجھے بھی کبھی کبھی اردو پروگرام میں شریک کر لیتے تھے۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کسی صاحب کا کوئی پروگرام پہلے سے طے تھا لیکن عین وقت پر ان صاحب نے پروگرام نشر کرنے سے معذوری ظاہر کر دی تو اس خالی جگہ بھرنے کو سہیل مرحوم مجھے پکڑ لیتے اور ٹاک کا عنوان دے کر فرمائش کرتے کہ اسکرپٹ تیار کر کے اسٹوڈیو آ جاؤ۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں قبل سے ٹاک ریکارڈ کرنے کا طریقہ جاری نہیں تھا۔
اس لئے میں مضمون تیار کر کے وقت مقررہ پر اسٹوڈیو پہنچ جاتا اور پروگرام نشر ہو جاتا۔ میرے اور سہیل مرحوم کے تعلقات میں کچھ اور قربت اس لئے پیدا ہوئی کہ ان کے بڑے بیٹے عزیزی لطیف الرحمٰن سلمہ اور میرے ایک بیٹے عزیزی سرفراز احمد کوثر دونوں ہم زلف ہو گئے تھے۔ یعنی دونوں کی شادیاں جناب فضل امام مرحوم سابق لکچرر فارسی و اردو پورنیہ کالج

کی بیٹیوں سے ہوئی ہے۔ اس وجہ سے مجھ میں اور سہیل مرحوم میں ایک سمدھیانے کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔

سہیل مرحوم بہت ہی دوست نواز اور مجلسی مزاج کے آدمی تھے، جب سید رضا کریم (مرحوم) سابق ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کی تقرری پٹنہ میں ہوئی اور وہ گاندھی میدان کے دکھن ایک کوٹھی میں سکونت گزیں ہوئے تو وہاں تاش کھیلنے کی محفل جمنے لگی جس میں سہیل مرحوم بھی شرکت کرتے تھے۔ رات کو دیر تک کھیل اور صحبت میں مشغول رہتے کبھی کبھی ساری رات کھیل ہی میں گذار دیتے۔ کثرت سے شب بیداری سگریٹ نوشی اور چائے خوری نے ان کی صحت پر برا اثر ڈالا۔ اور وہ قلب کے عارضے میں مبتلا ہو گئے۔ ان پر پہلا حملہ [illegible] علاج اور تیمارداری [illegible] نے خیر باد کہہ دیا۔

اس عرصے میں وہ ریڈیو کی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ جب بہار اردو اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا تو ان کے دوستوں اور خیر خواہوں نے انہیں اس اکیڈمی کی سکریٹری شپ کے عہدے کو قبول کرنے پر رضامند کر لیا۔ اکیڈمی کے دفتر میں ان کے گرد دوستوں اور غرض مندوں کا مجمع رہتا تھا [illegible] دفتر میں ملاقات کو گیا تو انہیں ایسے لوگوں کے درمیان گھرا پایا۔ سکریٹری ہونے کی حیثیت سے انہیں بہت سے خوشامدی اور اہل غرض لوگ [illegible] ان کے ساتھ معاملات میں جو تجربے ہوئے ان کی وجہ سے وہ اکثر تنگدل رہتے تھے اور ملازمت ترک کر دینے کی بات کیا کرتے تھے۔ اور جب مدت ملازمت آخر ختم ہو گئی تو پابندیوں سے آزاد ہو جانے سے خوش نظر آتے تھے۔ وفات سے پہلے انہوں نے پروسٹیٹ گلینڈ بڑھ جانے پر اس کا آپریشن کرایا تھا جو کامیاب ثابت ہوا۔ اس اذیت ناک مرض سے نجات حاصل ہونے پر وہ بہت مطمئن اور اپنے کو صحت مند محسوس کرتے تھے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلس عاملہ کے رکن ہونے کی وجہ سے اس کے جلسوں میں دہلی اور دوسرے شہروں کا سفر بھی کرنے لگے تھے۔ آخری سفر انہوں نے چنڈی گڑھ (پنجاب) دہلی اور الٰہ آباد کا کیا جس کے دوران میں الٰہ آباد میں سفر آخرت بھی پیش آ گیا۔

سہیل مرحوم دلچسپ اور نمایاں شخصیت کے حامل تھے اگرچہ ان کی تعلیم میٹرک سے آگے نہیں بڑھی لیکن کثرت مطالعہ اور خدا داد ذہانت کے باعث انہوں نے اعلیٰ درجے کی قابلیت حاصل کر لی تھی۔ اردو زبان و ادب سے واقفیت رکھنے کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی خاصی استعداد پیدا کر لی تھی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے ان کی صلاحیت و قابلیت کو دیکھ کر ہی ان کو چھوٹا ناگپور میں اردو کی تبلیغ و اشاعت کا کام سپرد کیا تھا جسے وہ برسوں تک بڑی محنت و خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ مولوی صاحب مرحوم کی صحبت و رہنمائی نے انجمن ترقی اردو کے ذریعہ سہیل مرحوم میں اردو کی خدمت کا جذبہ پیدا کیا اور آخر دم تک وہ اس خدمت میں مصروف رہے۔

اگرچہ سہیل مرحوم کی شہرت ان کی افسانہ نگاری کی وجہ سے ہوئی۔ لیکن ایک افسانہ نویس کے علاوہ وہ ایک [illegible] کے صحافت نگار تھے۔ عمر بھر وہ کسی نہ کسی اخبار یا رسالے کے حلقہ مدیریت سے وابستہ رہے [illegible] رسالہ 'زاوی' رسالہ 'تہذیب' اخبار 'ادنگ' [illegible] اردو ہندوستان (جس کا بعد میں نام اردو زبان و ادب ہوا) [illegible] سب میں ان کی صحافت نگاری کے جلوے نظر آتے ہیں۔ ڈراما نگاری کا بھی اچھا ذوق تھا۔ ان کی تحریر پختہ، سادہ و رواں ہوتی تھی۔ زبان و بیان کی صحت کا خاص خیال رکھتے اور پیچیدہ عبارت لکھنے سے احتراز کرتے تھے۔ ریڈیو میں ملازمت کے زمانے میں انہیں بہت سے اردو ادیبوں

...ور کالج کے اردو اساتذہ سے ملاقات اور ان کی تحریروں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ کیونکہ وہ ان سے پروگراموں کے لئے مضمون لکھواتے تھے۔ کئی مرتبہ انہوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ نئے ادیبوں اور کالج کے ٹیچروں کی تحریروں میں املا اور زبان کی فاش غلطیاں ہوتی ہیں۔ انہیں اس قسم کی غلطیوں کی اصلاح کرنا پڑتی تھی۔

سہیل مرحوم کے دوستوں، شناساؤں اور ملاقاتیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا اور اس میں ہر فرقہ اور مذہب کے لوگ شامل تھے۔ اگرچہ وہ [illegible] آزاد خیال اور نیشنلسٹ تھے۔ اپنے مسلک کے مخالف لوگوں سے بھی رواداری کا سلوک کرتے اور دوستوں سے مخلصانہ اور بے تکلفانہ روابط رکھتے تھے۔ نظریاتی اختلاف کو انہوں نے کبھی دوستی کی راہ میں رکاوٹ بننے نہیں دیا۔ البتہ تنگ نظری، منافقت، تعصب اور تصنع کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔

ان کے دوست اُن سے دور دوسرے مقامات پر رہتے تھے۔ ان سب کو ہر ماہ خط لکھا کرتے تھے۔ درحقیقت خط لکھنا اُن کا پسندیدہ مشغلہ تھا [illegible] کا بیشتر حصہ خط لکھنے میں صرف ہو جاتا تھا۔ میں نے اکیڈمی کے دفتر میں انہیں اکثر خط لکھنے میں مشغول پایا۔ اُن کے پاس ہر روز دوستوں اور رسالوں کے ایڈیٹروں کے، رسالوں کے لئے لفافے آتے تھے۔ سہیل مرحوم کے دوست ہندوستان اور پاکستان میں پھیلے ہوئے تھے جن سے اُن کی برابر مراسلت ہوتی رہتی تھی۔ جناب مشفق خواجہ سابق سیکریٹری انجمن ترقی اردو پاکستان مرحوم کے نادیدہ دوست تھے [illegible] مرحوم کی طرح مولوی عبدالحق مرحوم کی صحبت کے فیض یافتہ ہیں۔ خواجہ صاحب خود سہیل کو بھی خط لکھتے تھے اور جب مجھے خط لکھتے تو اس میں مرحوم کی خیریت ضرور دریافت کرتے۔ سہیل کی وفات کا انہیں بھی سخت صدمہ ہوا ہے۔ لطیف الرحمٰن سلمہٗ نے بتایا ہے کہ سہیل مرحوم اپنے دوستوں کے مکتوبات کا خاصا بڑا ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں جس میں تقریباً دو سو خط مولوی عبدالحق مرحوم کے بھی ہیں یہ بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ بہار اردو اکیڈمی اور اس سے زیادہ انجمن ترقی اردو ہند یا انجمن ترقی اردو پاکستان کا فرض ہے کہ وہ خطوط کے اس مجموعے کو مرتب اور ایڈٹ کر کے شائع کرے۔ یقین ہے کہ یہ مجموعہ اردو کے مکتوباتی ادب میں گراں بہا اضافہ ہوگا۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں سہیل مرحوم دو چیزوں کے آرزومند تھے۔ اول تو یہ کہ پاکستان جائیں اور وہاں اپنے مہاجر عزیز اور پاکستانی دوستوں و شناساؤں سے ملاقات کریں۔ ان کا دوسرا تمنا یہ تھی کہ پٹنہ میں اپنی سکونت کے لئے ایک مکان تعمیر کریں اس غرض سے انہوں نے ایک قطعہ زمین بھی خرید لی تھی اور مکان بنانے کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کی فکر میں تھے لیکن موت نے انہیں مہلت نہ دی اور تمام تمنائیں ادھوری رہ گئیں دونوں تمنائیں قبر میں ساتھ لیتے گئے۔

سہیل مرحوم بہار کے ایک متوسط مرفہ الحال اور مارے ابھار اگر نے اور معزز خاندان کے فرزند تھے لیکن سہیل نے کبھی اس نسبت کو وجہ افتخار نہیں سمجھا۔ ان کے مزاج میں انکسار تھا۔ رہن سہن میں کسی قسم کا تکلف نہیں کرتے تھے۔ لباس کھدر یا موٹے کپڑے کا سفید و سادہ پہنتے تھے گذشتہ چند سال سے وہ پٹنہ کے سلطان گنج محلہ کے ایک چھوٹے سے کرایہ کے مکان میں سکونت پذیر تھے۔ اس کا ایک چھوٹا سا کمرہ ان کے قبضہ میں تھا جس میں تخت پر اُن کا بستر لگا ہوا تھا اور اس کے پہلو میں ایک میز اور ایک کرسی پڑی ہوئی تھی۔ بستر اور میز پر کاغذ اور کتابیں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے ملاقاتی کو اندر آتے ہی یہ معلوم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی کہ یہ کمرہ ایک ادیب یا اسکالر کا ہے۔ گھر میں سہیل مرحوم حقہ بھی پینے لگے تھے چنانچہ بستر کے پاس ایک حقہ بھی رکھا رہتا تھا ـــــ سہیل مرحوم کی ہر دلعزیزی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اُن کے جنازے کی نماز اور تدفین کے وقت کئی سو دوستوں نے شرکت کی جن میں اُنکے عزیزوں اور دوستوں کے علاوہ ادیب، افسانہ نگار، شاعر، صحافی، اہل سیاست، ریڈیو کے ملازمین اور بہار اردو اکیڈمی کے ممبر و کارکن سب شامل تھے۔ سہیل عظیم آبادی دنیا سے رحلت کر چکے ہیں لیکن اُن کی تالیفات اور دوستوں کے دلوں میں اُن کی یاد انہیں زندہ جاوید بنائے رکھے گی ہیں! ...

جوہر نظامی
درگاہ شاہ ارزاں، پٹنہ

[illegible] تم کو میرے سے محبت نہیں رہی

سہیل عظیم آبادی مرحوم کی یاد میں

عظیم آباد پٹنہ جس نے اُجڑی ہوئی دلّی کو نیا جنم دیا تھا اس کی زرخیز مٹی سے علم و ہنر اور شعر و ادب کے تاجدار اُٹھے اور زندگی کے متعدد تابناک نفوس سے علم و ادب کے چراغ روشن کئے۔

حضرت نورت توحید ایک صاحب باطن بزرگ اور شاعر تھے، عبدالقادر بیدل، شاہ ابوالحسن فرد، راسخ، جوشش، شاہ الفت حسین فریاد، راجہ شتاب رائے شتاب، سید علی محمد شاد، شمس العلما رضا عظیم آبادی، نواب امداد امام اثر، صفیر بلگرامی، اولاد حیدر فوق بلگرامی، فضل حق آزاد، عشرت گیاوی، شفق عماد پوری، اختر بہاری، واقف بہاری، نواب نصیر حسین خیال، سجاد عظیم آبادی اور دوسرے حضرات پیدا ہوئے اور یہیں آسودۂ خاک ہیں۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

پھر اسی نگر سے بیتاب عظیم آبادی، مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی، لطیف حسین شائق، عنایت حسین امداد، باقر عظیم آبادی وغیرہ چمکے۔ پروان چڑھے انہیں گرد و پیش کے ادبی و علمی ماحول میں سہیل عظیم آبادی پیدا ہوئے، پروان چڑھے۔ پٹنہ کے دوستوں سے میرے قدیم اور گہرے تعلقات رہے ہیں اُن میں ایک سہیل عظیم آبادی بھی تھے۔

پٹنہ کالج کے متوازی سڑک جو دربھنگہ ہاؤس کو جاتی ہے اسی روڈ پر مولوی نورالحسن صاحب مرحوم رئیس ایڈوکیٹ کا پھاٹک تھا بہت بلند اور عالیشان عمارت۔ مولوی نورالحسن صاحب ایڈوکیٹ مولوی سر فخرالدین صاحب مرحوم وزیر تعلیمات بہار و اڑیسہ کے بہت مشابہ تھے اور دوست بھی تھے۔ اسی مکان میں سید جعفر امام مرحوم ایڈوکیٹ و سابق وزیر قانون حکومت بہار بھی رہتے تھے جو مولوی نورالحسن صاحب کے حقیقی بھانجے تھے اور اسی مکان میں سہیل عظیم آبادی بھی رہتے تھے۔ پٹنہ کالج کے صدر دروازہ کے سامنے اب دونوں اینی بیسنٹ روڈ کے نام سے منسوب ہے۔ اسی وقت تو اینی بیسنٹ روڈ تھا اور نہ تھیوسیفیکل ہوسٹل۔ روڈ کے دونوں طرف کھپر پوش مکانات تھے جن میں نیٹی اور گھوڑے گاڑی والے رہتے تھے۔ انہیں سے متصل ایک دو منزلہ مکان میں

سید اکرام حسین صاحب اکرام کرایہ پر رہتے تھے۔ کالج کے طالب علم تھے۔ سہیل نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے کی اور سہیل جیلی کہلائے۔ یہ واقعات غالباً ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء کے ہیں۔ وہ پہلے بھی معتبر تھے اور آج بھی معتبر ہیں۔ سہیل عظیم آبادی کا مذاق قدیم بھی تھا اور جدید بھی اور دونوں ادوار سے ان کا رشتہ استوار تھا۔

اس وقت پٹنہ کالج کے پرنسپل انگریز ہوا کرتے تھے۔ ... لوگوں میں ڈاکٹر عظیم الدین صاحب، پروفیسر عبدالمنان بیدل، حافظ عبدالمجید صاحب، پروفیسر شمس الدین صاحب منیری، ڈاکٹر علی حسن، پروفیسر سید حسن عسکری، ڈاکٹر گیان چند ماہر معاشیات، ڈاکٹر سرکار، پروفیسر ہل شعبۂ انگریزی کے۔ جو حضرات شعبۂ فارسی اور اردو سے منسلک تھے وہ سب کے سب سوٹ پہنتے تھے اور کسی کے ... داڑھی نہ تھی۔

سید جعفر امام صاحب مرحوم و مغفور کو دو شوق تھا ایک شکار کا اور دوسرے کسرت کرنے کا۔ گھر ہی کے ایک کمرہ میں اکھاڑہ بنا رکھا تھا جس میں لال مٹی اور مگدر کی جوڑیاں تھیں۔

سید اکرام حسین اکرام جس مکان میں رہتے تھے وہاں بے تکلف احباب جمع ہوتے تھے اور محفل شعر و شاعری اور موسیقی منعقد ہوتی تھی۔ اُن کے دوستوں میں سید محمد مہدی مرحوم سابق ڈائرکٹر انڈسٹری، باقر مرحوم، احد ارمان مرحوم اور راقم الحروف بھی کبھی کبھی شریک ہو جایا کرتا تھا۔ پہلی مرتبہ یہیں سہیل جیلی صاحب سے ملاقات ہوئی اور یہ ملاقات بے تکلفی میں منتقل ہو گئی۔ میں نے سہیل کو کبھی لفظ "آپ" سے مخاطب نہیں کیا۔ میں ہمیشہ اُن کو "تم" سے مخاطب کرتا اور وہ بھی مجھے تم ہی کہتے تھے۔

پھر جب سید اکرام حسین صاحب اکرام (جو بہت بعد کو پرویز شاہدی کے نام سے مشہور ہوئے) بی اے پاس کر گئے تو یہ محفل بھی ختم ہو گئی اور وہ اپنے آبائی مکان واقع رانی پور لودی کٹرہ میں جا رہے۔

پھر ایسا ہوا کہ اکثر و بیشتر ملاقات ہوتی۔ کچھ ایسا لگتا کہ وہ شریک ہو جاتے تو تردد کم اور خوشی زیادہ ہو جاتی۔ آدمی زندگی کی مادی راحتوں اور جسمانی لذتوں کا کون دلدادہ نہیں ہوتا۔ حق تو یہ ہے کہ ذہنی آسودگی کا انحصار جسمانی راحتوں اور کام و دہن کی لذتوں پر ہے۔

مگر اس بیمارستان ہستی میں ایسے بھی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی پر مصائب و آلام کو باعث راحت اور دنیا کی راحتوں اور لذتوں کو حرام کر رکھا ہے۔ اپنی زندگی کے شب و روز دوسروں کی زندگی سنوارنے اور کام آنے میں صرف کرتے ہیں۔ اللہ کے بندوں کی خدمت ہی کو حاصل حیات سمجھتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب اقتدار حاصل ہوا اور فراغت بھی پھر بھی ان کے مزاج اور کردار میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی مگر ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ کم از کم دو تین نام تو لئے جا سکتے ہیں۔ سر سید علی امام، سر فخر الدین، ڈاکٹر ذاکر حسین۔

شعر و ادب اشخاص پر معمولی طور پہ اثر انداز ہوتے ہیں لیکن غیر معمولی شخصیت سے شعر و ادب زیر و زبر ہو جاتے ہیں۔ دولت، اقتدار اور فراغت سے اشخاص بدلتے ہیں بے نقاب ہو جاتے ہیں۔

سہیل عظیم آبادی کے بہت سے دلآویز پہلو روشنی میں آ گئے ہیں۔ سہیل کو جو کچھ علاوہ اس ادبی ماحول کا اثر تھا جس میں وہ پیدا ہوئے۔ انہوں نے جو کچھ اپنایا اپنے انفرادی مزاج کے ساتھ انفرادیت

خود اپنی جگہ اہم ہے۔

سہیل اپنی دھن کے پکے تھے اور مشغول و منہمک۔ دھنی، دبلے پتلے، چہرہ شاداب، روشن جبین، ہنس مکھ دکھاوٹ پھبنے کے دلدادہ، اپنے بالوں میں اپنے ہاتھوں سے کنگھیوں سے شانہ کرتے رہتے۔ خوش پوش، عجز و انکسار اور اخلاق کا پیکر۔ ان کی آنکھوں سے ذہانت اور ... معلوم احساس کی کیفیت جھلکتی ...

... اردو میں ناول نگاری کا تعلق ہے وہ تو غدر ۱۸۵۷ء کے بعد لکھے گئے۔ اردو میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول کو فنی حیثیت سے اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بڑے ناول نگار سرشار ہیں۔ ہر کامیاب ناول نگار پہلے فنکار ہوتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کو قصہ کی اہم ضروریات سے زیادہ کی طلب نہ تھی لیکن بعض حقائق اور اصول ان کے پیش نظر تھے۔ لیکن پنڈت رتن ناتھ سرشار نے زندگی کو جس طرح دیکھا تھا اُن کی تحریر میں بھی اسی طرح کا عکس ہے۔ جو دیکھا ہے دوسروں کو بھی دکھایا ہے۔

نذیر احمد، ہادی رسوا، سرشار، راشد الخیری اور پریم چند یہ تمام خالص شرقی تہذیب و علم کی پیداوار تھے۔ اور ان میں کسی پر انگریزی ادب اور ناول نگاری کی ... ہے کہ منشی پریم چند مغربی ناول نگاروں ... متاثر ہوئے ہوں۔ کم از کم روسی ادب کا تو ضرور مطالعہ کیا ہو گا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فنِ ناول نگاری کے حسن و جمال، ارتقاء اور نشو و نما کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے انگریزی ناول نگاری کی تاریخ کو بھی جاننا ضروری ہے۔

انقلاب روس کے بعد روسی ناول نگاروں نے جس طرح غریب طبقے کے مردوں اور عورتوں کی سیرت و کردار کو بے نقاب کیا ہے دوسری زبانوں میں مشکل سے ملے گا کم و بیش ہندوستان کے اردو ناول نگار متاثر ہوئے ہیں ... قصے اور کہانیاں انسانی وجود کے ساتھ ساتھ داخل ہوئیں۔ عرب و عجم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ لیکن ... انسانی سماج نے جب ترقی و تہذیب کی ایک خاص منزل تک ترقی کر لی تو ناول نگاری کا صحیح معنوں میں آغاز ہوا۔ بعض اچھے اور اہم رجحانات داخل ہوئے۔ قصوں میں ڈرامائی انداز، ہنگامہ آرائی، قتل و خون، عشق و محبت اور شدید نفرت کے واقعات زیادہ ہوتے تھے اور اس طرح کے انداز فکر سے مغربی ناول نگاری بھی بے نیاز تھی۔ اچھے سے اچھے ناولوں میں یہ تمام افکار و خیالات اب بھی ملتے ہیں۔ لیکن اب ناول نگاری کا رخ بدل چکا ہے اب ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن بھی شریک ہو گیا ہے اور رومانیت کی جگہ حقیقت نگاری نے لے لی ہے۔ ... زندگی کی مصوری اور عکاسی کی تجربے اور ... مشاہدے ہونے لگے اور حقیقت نگاری کا دور آیا۔ نفسیاتی تجربے اور تعمیری تنقید سے بعض مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ کہیں ذہنی غذا ملی ہے اور کہیں صرف پروپیگنڈا اور کہیں ناول نگاری نے علمی حیثیت قائم کی ہے۔

لیکن عموماً اعتبار سے ادب میں گہرائی، اعلیٰ خیالات اور فکری توازن کی بڑی کمی ہے۔ کیونکہ عام رجحان ناول میں تشبیہ قیمے، رومان اور کشمکش حسن و عشق اور تفریح کا مشغلہ ہے۔ کہیں بے راہ روی کو حریت خیال سے تعبیر کیا جا رہا ہے تو کہیں فحاشی کو آرٹ سمجھا جا رہا ہے۔ خوش نشیب و فراز کا یہ قافلہ کہاں جا کر ٹھہرے گا۔؟

پہلے عشق و محبت شہزادی ماہ رُخ، نواب زادی اور طوائف سے ہوتی تھی اب کالج کی لڑکیوں نے

...مزدور کی بیٹیوں نے لی ہے۔ پریم چند کے یہاں حسن ... میں فکری بلندی نہیں ہے۔ گاؤں کی زندگی کا تقدس ... اور انسانیت کا عکس ضرور ہے۔ پھر یہ جذبہ بھی کارفرما ہے کہ جنسی تعلقات و مراسم کو ذرا کھل کر بیان کیا جائے اور ... واقعات ناگفتنی بھی لکھ دیا جائے۔

پریم چند کے بعد اردو ناول نگاری کی طرف عام توجہ ہوئی ہے۔ مگر دیکھا یہ جا رہا ہے کہ ناول سے زیادہ افسانے مقبول ہیں۔ کیونکہ ناول نگاری کے لئے بڑی صلاحیت اور بصیرت کی ضرورت ہے۔ لیکن افسانوں میں ایسا نہیں۔ اس کی وجہ دراصل فن میں بھی کافی توجہ، کاوش اور مطالعہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

... ان دنوں اچھے ناول نگاروں کی بڑی کمی ہے۔ اچھے، معیاری اور عمدہ ناول کچھ زیادہ نہیں۔ عبدالقادر سروری، علی عباس حسینی، جمیل احمد کندھائی پوری اور مجنوں گورکھپوری کی مختصر کتابوں کے علاوہ کچھ زیادہ اچھا نہیں ...

موجودہ انقلابی دور کسمپرسی اور اقتصادی بدحالی میں اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لئے زیادہ سازگار نہیں اور اعلیٰ شاعری کے لئے بھی موجودہ ماحول اور مذاق ناموافق ...

... چونکہ ... نقاد کی آنکھوں پر مغرب کی عینک ہے اس لئے وہ ناموس مشرق اور ادبی کارناموں کے قائل نہیں رہیں۔

اس کے بعد کے دور میں کچھ اجالا اجالا سا دکھائی دیتا ہے۔ اس عہد کے لکھنے والوں کی اچھی خاصی فہرست ہے پنڈت سدرشن، کرشن چندر، اوپیندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر سہیل عظیم آبادی اور شکیلہ اختر وغیرہ۔ سہیل کی کتاب "الاؤ" "نیم جڑ کے پودے" اور "چار چہرے" میں نے سرسری طور پر دیکھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی اور بھی تصنیف ہو جس کا مجھے علم نہیں۔ ان کتابوں کے دیکھنے سے سہیل عظیم آبادی کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑا۔ عبارت بہت صاف، عام فہم اور سلیس ہے۔ ارادہ تھا کہ ان کتابوں پر کچھ تعمیری تبصرہ کروں۔ مگر ایک ذاتی حادثہ کی وجہ سے آج تک ذہنی اعتبار سے سخت پریشان ہوں۔ قدرت فیاض نے اگر موقع عنایت کیا تو اس سلسلہ میں تفصیلی بحث ...

سہیل عظیم آبادی جس دور میں افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے اس وقت منشی پریم چند، پنڈت سدرشن اور کرشن چندر چھائے ہوتے تھے سہیل عظیم آبادی ان سبھوں سے متاثر ہوئے مگر اپنی الگ راہ نکالی۔

بڑے اہم سیاسی، ادبی اور سماجی تحریکات سے قوموں کی تقدیر سنورتی اور بگڑتی ہے۔ ادیب و شاعر انہی خیالات سے اپنے کو ہم آہنگ کرتا ہے جو ذوق حیات پیدا کرتے ہیں۔ آج کا انسان سارے وسائل کے بعد کمزور و ناتواں ہے۔ پیداوار کی فراوانی کے باوجود بھوکا ہے، سامان آرام و آسائش کے باوجود ناآسودہ ہے۔ کچھ لوگ اس دور جمہوریت میں لوگوں کو ڈراتے، دھمکاتے اور لوٹتے ہیں۔ ہم اور آپ دیکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں نے ایک دنیا ایسی بنائی ہے جہاں ہر برائی اچھائی نظر آتی ہے اور اسی طرح کا سہیل عظیم آبادی کی تحریر میں بھی عکس ملتا ہے

عام طور سے انسان کی مادی اور تخیلی زندگی میں ... خاص قسم کا رشتہ ہوتا ہے۔ یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ جب انسان ادب کی طرف جھکتا ہے تو کسی شئے کی جستجو میں، طلب میں وہ کس طرح کی تسکین چاہتا ہے کس طرح کی ذہنی اور جذباتی آسودگی چاہتا ہے۔ کیونکہ

زندگی کے ہر دور میں انسانی جذبات و خیالات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے یہ غلط ہو یا صحیح ادب میں بھی لوگ بدلتے ہوئے حالات، رجحانات اور ذہنی کشمکش کا عکس چاہتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ زندگی سے [illegible] بھرپور ہو۔ کم از کم ایسے ادیبوں اور شاعروں سے تو اس کی امید کی جا سکتی ہے جو صرف اپنے لئے نہیں بلکہ زندگی کے [illegible] نو مسائل اور تقاضوں کو اپنی تحریروں میں اجاگر [illegible]

سہیل عظیم آبادی مسائل حیات کو سمجھنے اور سلجھانے میں کوشش کرتے رہے ہیں اور اس میں کامیابی و کامرانی حاصل کرتے رہے ہیں۔ اگر ادیب افسانہ نگار اور شاعر اپنے سازوں کی آواز سننے والوں کے دلوں کی دھڑکن سے ہم آہنگ نہ کر سکے تو اس کو قبولیت عام نصیب نہیں ہو سکتی کیونکہ دنیا بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ ادیب کے افسانوں سے یا شاعروں کی شاعری سے قوموں کو بیدار نہیں کیا جا سکتا۔ سہیل عظیم آبادی کامیاب اور اچھے افسانہ نگار تھے صاحب علم و دانش نہ تھے۔

میرا خیال ہے کہ ہمارے زیادہ ادیب مفکر نہیں ہیں۔ سہیل عظیم آبادی کا خیال ہے کہ ادبی زندگی اور محبت سے اچھا ادیب اور شاعر ہوتا ہے۔ لیکن عہد حاضر میں انسان فکر معاش میں ایسا الجھ گیا ہے کہ اسے زندگی کے دوسرے شعبوں میں حصہ لینے کو فرصت نہیں ملتی۔ پھر کہ ہاتھ دنیا میں الگ مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہی حال راقم الحروف کا بھی ہے [illegible]

[illegible] اردو زبان کی وسعت کی وجہ سے افسانہ نگاری میں ہمیشہ زور رہا ہے۔ داستان گوئی کی روایت بہت قدیم ہے آج بھی اردو میں بہت اچھی اور معیاری کتابیں چھپ رہی ہیں۔ رسالوں میں منصفانہ اور غیر منصفانہ تنقید [illegible] مضامین اور تبصرے بھی شائع ہوتے ہیں۔ ہمارے [illegible] میں اچھے لکھنے والوں کو مالی فراغت اور خوشگوار ماحول [illegible] نہیں جس میں وہ آرام اور سکون سے کوئی اہم ادب [illegible] سکتے [illegible]

سہیل عظیم آبادی میرے قدیم دوست بھی ہیں میرے پسندیدہ ادیب بھی۔

ترقی پسند ادیب کی بنیاد اور ادب کی بنیاد سب سے پہلے لکھنؤ میں سروجنی نائیڈو کی صدارت میں پڑ چکی تھی اور اس سے بہت سے نقش و نگار تھے جیسے مختلف پھولوں کے مختلف رنگ ہوتے ہیں اور سبھوں کی الگ الگ خوشبو۔ بعد کو ترقی پسند مصنفین و ادیب پر مکمل طور پر کمیونزم کی چھاپ پڑ گئی۔

سہیل عظیم آبادی کی ایک ادا یہ بھی تھی کہ ادھر میں درگاہ کے مکان سے نکلا ادھر سہیل اپنے گھر سے نکلے رکشہ پر سوار ہوتے۔ میرے قریب آ کر رکشہ رکا اور کہا کہ چلو تم کو خدا بخش لائبریری پہونچا دوں گا۔ کبھی کبھی جب بھی ملاقات ہو جاتی تو وہ اسی فکر میں رہتے کہ وہ رکشہ پر اپنے ہمراہ ضرور بٹھائیں۔

وہ اپنے احباب کو، دوستوں کو، رسالوں کے ایڈیٹروں کو ہندوستان کے مختلف ادیبوں کو بڑی پابندی سے خطوط لکھتے تھے۔ عید اور بڑے دن کے موقع پر، نئے سال میں قیمتی کارڈ خرید کر روانہ کیا کرتے تھے۔ یہ ان کا فطری مذاق تھا۔ خط و کتابت پر ماہانہ اچھی خاصی رقم خرچ کیا کرتے تھے۔ اپنے دوستوں کو اپنے مکان پر خاطر و مدارات کرتے اور خوش بھی ہو[illegible]

ایک روح فرسا وقت ایسا بھی آیا کہ الہ آباد میں، مسافرت میں اُن کی وفات کی خبر سن کر دل بھر آیا [illegible]

انہی دنوں میری طبیعت کچھ ناساز تھی اور بخار میں مبتلا تھا۔ مجھے کسی طرح باور نہیں ہوتا تھا کہ سہیل اس دنیا میں نہیں رہے جنازہ میں شریک ہوا۔ باچشم پُرنم کاندھا دیا اور شاہ گنج کے قبرستان میں ہمیشہ مسکراتے ہوئے، ہنس مکھ اور مشہور و معروف ادیب کو سیکڑوں سوگواروں نے اپنی نمناک آنکھوں سے سپرد خاک کیا۔

امیر، غریب، چھوٹے بڑے تعلیم یافتہ لوگوں کا کیا غمگین مجمع اور کیسی یاس بھری فضا آنکھوں کے سامنے تھی شمیم فاروقی آل انڈیا ریڈیو وہیں مخصوص لوگوں سے بیانات لے رہے تھے۔ کافی آدمیوں کا ہجوم تھا۔ جس سے ان کی ہر دلعزیزی ظاہر تھی۔ بہت قریب کے رشتہ دار، اُن کے لڑکے تو غم کدہ تھے، اور بہت قریب کے دوست تو واقعی مغموم اور مضطرب تھے۔ لیکن ہمیشہ ایسے موقع پر بڑی تعداد خانہ پری کے لئے ہوتی ہے اور جا بجا لوگ روزمرہ کے مسائل اور پروگرام پر بڑی بے تکلفی سے گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود زیادہ لوگ یکساں طور پر مغموم تھے۔

میرا ایک مخلصانہ مشورہ ہے کہ سہیل عظیم آبادی کی قبر کو برسات آنے سے بہت پہلے بس ایک ماہ میں چاروں طرف سے پختہ بنا دیا جائے۔ ہر شخص مرحوم کی کسی نہ کسی بات کو یاد کر کے بے قرار ہو جاتا ہے۔ میری آنکھیں بھی کبھی کبھی آج تک آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں۔

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

"عصرِ نو کا چارہ گر بھی تھا سہیل"

نذرِ سہیل عظیم آبادی

صاحبِ فکر و نظر بھی تھا سہیل
وقت کا پیغامبر بھی تھا سہیل
حلقۂ احباب کی روحِ رواں
عرب کا منظورِ نظر بھی تھا سہیل
پیکرِ مضموں کا قلبِ مضطرب
عصرِ نو کا چارہ گر بھی تھا سہیل
چشمۂ تہذیب، سیمابِ سخن
ماہناموں کا جگر بھی تھا سہیل
اہلِ فن کا قدرداں و خیر خواہ
ناقدوں میں معتبر بھی تھا سہیل
حاسدوں کے حق میں نوکِ خار بھی
رنگِ صد گلہائے تر بھی تھا سہیل
رہنمائے رہروِ علم و ادب
قافلے کا ہمسفر بھی تھا سہیل
جس کے افسانے حقیقت میں ڈھلے
وہ ادیب باہنر بھی تھا سہیل
صفحۂ قرطاس پر ہے لازوال
انجمن میں مختصر بھی تھا سہیل

[illegible] عظیم آبادی

محترمہ ڈاکٹر شمیم افزا قمر

سہیل عظیم آبادی سے — چند یادیں

نومبر کی ۲۹ تاریخ [illegible] آسمان پر گہرے بادل تھے۔ بوندیں آہستہ آہستہ ٹپک رہی تھیں اور رات گہری اندھیری۔ ایسے خنک اور اداس موسم میں خواہ مخواہ ہی تشویش ہوتی ہے۔ گھر پر ہر ایک نے کتابوں میں پناہ لی تھی۔ میں اس بے پناہ خاموشی سے الجھ رہی تھی۔ دل کی اداسی پر قابو پانے کے لئے میں نے [illegible]
[illegible] آباد میں اردو کے مشہور افسانہ نگار جناب سہیل عظیم آبادی کا دیہانت ہو گیا۔ شمیم فاروقی شردھانجلی ارپت کر رہے ہیں"

میں نے اور قمر نے گھبرا کر ایک ساتھ کہا "کون — ؟ سہیل عظیم آبادی ؟"

اپنے کانوں پر کچھ یقین نہیں آیا تھا۔ [illegible] فاروقی صاحب کی ایک جذباتی سی تقریر شروع ہو گئی تھی۔

صرف ایک ماہ قبل کی بات ہے۔ میں قمر کے ساتھ پوجا کی تعطیل میں پٹنہ گئی ہوئی تھی۔ ان دنوں سہیل بھائی روز ہی آجاتے اور دیر تک کتابوں، کہانیوں کی باتیں کیا کرتے۔ آئندہ کا پروگرام بناتے اور بھاگلپور ضرور آنے کا وعدہ کرتے۔ آتے ہی آواز دیتے اور کہتے "جلدی سے چائے بنا لاؤ —" پھر کہتے "جانتی ہو نا میں لیموں کی چائے پیتا ہوں" میں کہتی "یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کتنی شکر لیتے ہیں۔" پھر بھی کبھی چائے میں لیموں زیادہ ہو جاتا کبھی بہت عمدہ بن جاتی —

[illegible] چائے بنتی وہ اسی مناسبت تعریف کرتے اور [illegible] مقدار میں چائے پیتے۔ اکثر وہ رکشہ روک رکھتے اور جب باتوں میں الجھ جاتے، میں رکشہ والے کو بھی چائے بھجوا دیتی کہ وہ شور نہ کرے۔ مگر اکثر رکشہ والے بھی ان سے اپنے رہا ہوا کرتے تھے سو وہ خاموش ان کا انتظار کرتے۔

[illegible] جب بھی پٹنہ جاتی پہلے انہیں خبر کروا دیتی اور وہ [illegible] ضرور پوچھتے کیسی ہو؟ ان دنوں کیا لکھ رہی ہو [illegible]

[illegible] میں قمر کے رشتہ سے انہیں بھائی کہتی۔ وہ میرے والد مرحوم کے رشتہ سے مجھے بھتیجی کہتے۔ کبھی بہت ناراضگی سے کہتے "نظام بھائی مجھے اتنا عزیز رکھتے تھے تم مجھے صرف چچا ہی کہہ سکتی ہو" میں کہتی "اور آپ شاید قمر کو ذرا بھی عزیز نہیں رکھتے ہیں" وہ ہنستے اور کہتے "ہاں [illegible] لائق بھتیجی ہو، نہیں بلکہ تم دونوں ہی نہایت نالائق ہو"

[illegible] مخدوم محی الدین صاحب کے انتقال پر زینت ساجدہ نے لکھا تھا

مخدوم، میں تمہارا پرسا کس کو دوں ؟

سہیل بھائی! میں بھی پوچھتی ہوں کہ آپ کا پرسا کسے دوں ؟

کچھ محبت کرنے والے اتنے اپنے، اتنے خاص محسوس ہوتے ہیں کہ ہر کوئی انہیں بالکل اپنا سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان پر اپنا خاص حق سمجھتا ہے۔ ایسی محبت

کرنے والی ہستیاں مشکل سے اتفاق سے پیدا ہوتی ہیں لیکن ہو جاتی ہیں۔ شاید ہم جیسے کم ظرفوں کو رُلانے کے لئے اور محبت کا سبق سکھلانے کے لئے سہیل عظیم آبادی ان چند بزرگ ہستیوں میں سے ایک تھے۔

سہیل صاحب ۳ مارچ ۱۹۸۰ء کے ایک مراسلہ میں تحریر فرماتے ہیں — "خطاط اور "چار چہرے" پر تبصرہ ... اندازہ ہوا کہ تم نے خود سے کہانیوں کو پڑھا اور ... روح تک پہونچنے کی کوشش کی ہے۔ خوش رہو ..."

اپنی ساری کمزوریوں اور بدکاریوں کے باوجود ہم ہندوستانیوں کا عورت کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر ہے۔ ہم ہمیشہ اس میں تقدس پاتے ہیں اور دیکھنا ... چاہتے ہیں۔ عورت ماں ہے، بہن ہے، بیٹی ہے، بیوی ہے ... ظاہر ہے کہ ہم اسے گرتی ہوئی حالت میں دیکھتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے اور اپنی کمزور حالت کا شدید احساس۔ یقین جانو ... عورت کے متعلق جو تقدس اور پاکیزگی کا تصور ہندوستانیوں ... میں ہے وہ کسی دوسری قوم کا نہیں۔ خواہ کوئی ہندوستانی کتنا ہی بڑا غلط کار ہو اس کا تصور بلند ہی رہتا ہے۔ میری یہ کمزوری ہے۔ بعض دوستوں کو شکایت ہے کہ میں خواہ مخواہ Idealize کرتا ہوں۔ جس شخص کے پاس کوئی آئیڈیل نہ ہو وہ قابلِ رحم انسان ہے۔

سہیل صاحب ایک آئیڈیل پرست انسان تھے۔ ہر بڑا فنکار آئیڈیل پرست ہوتا ہے — یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے آئیڈیل کو فن میں اس طرح نمایاں نہیں کرتا کہ وہ پند و نصائح کا مجموعہ بن جائے۔ سہیل صاحب کو بھی اپنے فن پر مہارت حاصل تھی۔ ان کا ناولٹ "بے جڑ کے پودے" ان کی چابکدستی اور فن پر مہارت کی اچھی مثال ہے۔ "بے جڑ کے پودے" کی اہمیت اس لئے بھی کچھ اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ وہ صرف اپنے فن کا نمونہ ہی نہیں بلکہ اس ناولٹ پر مصنف کے مزاج کی چھاپ محسوس ہوتی ہے۔ اس کا موضوع ... پلاٹ طنزیہ ہے مگر طنز کا کہیں شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ ... مسٹر سنہا گنہگار ہیں۔ انہیں اپنے گناہ کا احساس ہے، وہ اس کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں اور کرتے بھی ہیں۔ لیکن پورا ناولٹ ختم کرنے کے بعد بھی مسٹر سنہا قاری کی ہمدردیاں ... لیتے ہیں۔ طنز کا کہیں احساس نہیں ہوتا بلکہ پورا ناولٹ ایک نرم گداز دکھ سے شروع ہو کر اسی دکھ پر ختم ہو جاتا ہے۔ ... مصنف نے اپنے دل کی آنچ اپنے فن میں پیوست ...

سہیل صاحب کی ایک ہی بیماری تھی اور وہ تھی "محبت" ... وہ طنز کرنا کیا جانیں۔ وہ ہر کس و ناکس سے محبت کئے جاتے ... شاید اسی بیماری میں وہ دل کا عارضہ لگا بیٹھے۔ عام ... دل یہ بارِ گراں کب تک برداشت کرتا۔ آخر اس دل کی بیماری نے قصہ تمام کیا۔ وہ اکثر اپنی کہانیوں کے کرداروں کے متعلق گفتگو کرتے تھے۔ اور آج جب وہ ابدی نیند سو رہے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ انہیں جگا کر پوچھوں کہ آپ نے ... کے متعلق کیا کہا تھا ...

"چار چہرے" ان کی کہانیوں کا ایک مجموعہ ہے ... اردو اکیڈمی نے ان کے اس مجموعہ پر انعام بھی دیا ہے۔ ان چار کہانیوں میں ایسی چار عورتوں سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ اور ان کے ذریعہ مصنف نے عورت کی نفسیات پر روشنی ڈالی ہے۔ انہیں عورتوں کو بیچارگی کا احساس تھا ... بھی احساس تھا کہ اکثر وہ مردوں کی خود غرضیوں اور ان کی چالاکیوں کا شکار رہی ہیں۔ ان کہانیوں کا موضوع بھی یہی ہے۔ عورت کی مجبوری، اس مجبوری کا شدید احساس اور اس تکلیف دہ ماحول سے نجات حاصل کرنے کی بے انتہا کوشش۔ ان کہانیوں کے ... ایسے ہی واقعات کے گرد گھومتے ہیں۔

مرقدِ سہیل کی نذر

از:۔ شاداب رضی

طرب فروز نظاروں سے دور کوسوں دور
جہاں نہ قہقہہ کوئی نہ کوئی [illegible] گوشی
فقط سکوت کا اک سلسلہ چہار طرف ہے
فضا کے ہونٹوں پہ ہے ثبت مہر خاموشی
یہاں سانس ہے گنگ اور نغمگی چپ ہے

فضائے شہر خموشاں میں زندگی چپ ہے
ازل سے تا بہ ابد سلسلہ یہی ہو گا
گلاب خاک سے اُگ کر ملے گا مٹی میں
گلاب سرخ ہو یا کاسنی یا عنابی
مرور وقت سے مل کے رہے گا مٹی میں

یہی ہے رمز مشیت یہی حیات کا راز
یہی فنا کی حقیقت یہی ثبات کا راز
ہوائے تند کے ہاتھوں سے جبر کی معتراض
چراغ گور غریباں کی لو کترتی ہے
مری نگاہ اسی ملگجی اندھیرے میں
پہنچ کے مرقد تازہ پہ جب ٹھہرتی ہے
سوال دل نے کیا مرقد سہیل ہے یہ ؟
مگر نے دل سے کہا مرقدِ سہیل ہے یہ !
وہ مردِ خلوت و جلوت وہ مردِ لوح و قلم
وہ مردِ نیک عمل آہ! مردِ نیک بیاں
میں اپنے آپ کو بہلاؤں لاکھ یہ کہہ کے
فن سہیل ہے زندہ ! مگر سہیل کہاں ؟
مری مژہ پہ لرزتے ہوئے جو تارے ہیں
سہیل ! آپ کا مرقد کی نذر سارے ہیں

سہیل عظیم آبادی ذہنی طور پر منشی پریم چند سے بہت قریب ہیں۔ نتیجتہً ان کی تحریر اور ان کے فن پر بھی پریم چند کی چھاپ نمایاں ہے۔ فرق صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ سہیل صاحب کی کہانیوں کا بہترین حصہ ان کا اختتام ہوتا ہے وہ تمام وقت تجسس پیدا کرتے ہیں اور قاری کو ایک چونکا دینے والا اختتام پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن نہایت حد تک صحیح اور منطقی۔ یہی ان کے آرٹ کا کمال ہے ـــ لیکن پریم چند کو مہارت کردار نگاری پر ہے۔ سہیل صاحب کے یہاں کرداروں کی روپ رکھا ئیں تو ملتی ہیں لیکن حجم نہیں ملتا ان کی مختلف کہانیوں کے کردار مثلاً ردھیا، کانچی اور ماسٹر صاحب میں وہ جامعیت اور مخصوصیت نہیں ہے جو پریم چند کی نرملا۔ منی یا ہوری میں ہے۔ لیکن جہاں سہیل عظیم آبادی کہانی کے اسلوب اور ترتیب پر فوقیت رکھتے ہیں وہاں پریم چند اپنے ناول کے پلاٹ میں خود ہی اُلجھ جاتے ہیں۔

سہیل عظیم آبادی عام طور پر نہایت سادہ زبان لکھنے کے عادی تھے۔ شاید یہ سادگی بھی ان کی فطرت کی دین تھی۔ فنکار کی تحریر یا اس کے فن پر خود فنکار کا عکس نمایاں ہوتا ہے تو وہ لاکھ اپنے فن سے کتنا ہی الگ رکھنے کی کوشش کیوں نہ کرے۔ سہیل صاحب کی سادگیٔ فطرت، ان کی بصیرت، ان کی عمیق تجربہ کاری اور ان کا محبت بھرا انداز ان کی کہانیوں میں نکھرا نظر آتا ہے۔ وہ ایک کہنہ مشق فنکار تھے۔ ان کا فن کلاسیکی عہد دو میں داخل ہو چکا ہے۔ ان کا تعلق پریم چند اسکول سے تھا اور اسے محض اتفاق کہئے یا فن کی محبت کہ انہوں نے جان بھی دی تو پریم چند کے صاحبزادے امرت رائے کے گھر پر۔

خدا انہیں جنت نصیب کرے (آمین)

انیس رفیع

ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

ایوانِ ادب کی دیواروں پر بڑے بڑے اور موٹے موٹے ناموں کی تختیاں دیکھ کر میں کبھی Re-act نہیں کرتا۔ کیوں کہ ایسا کرنا فطری ہے نہ لازمی۔ میری آنکھیں خیرہ یا چکاچوند نہیں ہوتیں کیونکہ میری آنکھوں کی پتلیوں پر سیمابی پالش نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی تو یقیناً آنکھیں چکاچوند ہوتیں۔ شیشے پر پارہ چڑھ جائے تو وہ شیشہ Reflector بن جاتا ہے۔ میری آنکھوں سے مراد وہ آنکھیں ہیں جو پارکھی ہیں یعنی جو کچھ بھی دائرہ نظر میں آئے پہلے اسے جذب کرنا۔ تادیر ان پر غور و فکر کرنا۔ پھر کسی نتیجے پر پہنچنا۔ رد و قبول کی سرحدیں پھلانگنے کے بعد صورتِ اظہار کا انتخاب

یقیناً سہیل عظیم آبادی صاحب کا نام ایوانِ ادب میں ایک اہم اور محترم نام تھا۔ بچپن سے میں یہ نام سنتا چلا آرہا تھا۔ شاید چھٹی دہائی کی آخر سے جب میں نے ذہن کو ادبی دنیا کی طرف موڑنا شروع کیا تھا۔ کلکتے میں ان دنوں پرویز شاہدی کی دھوم تھی۔ اکثر و بیشتر بڑے بڑے نام سننے کو ملتے۔ کیونکہ ان دنوں شاہد جمیل (میرے بڑے بھائی) ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے بڑے ہی سرگرم رکن تھے۔ اکثر ان کے دوستوں کی نشستوں میں ان کے تذکرے ہوتے۔ کبھی کبھی ان لوگوں کی دعوتیں ہوتیں۔ راجندر سنگھ بیدی کے سلسلے میں جو نشست ہوئی تھی۔ وہ اب بھی یاد ہے افسانوں پر جب بات چلی تو سہیل عظیم آبادی کا تذکرہ [illegible] نہیں ہوتا۔ مگر وہ زمانہ میرا یہ تھا کہ سی۔ اے۔ ٹی کیٹ اور آر۔ اے۔ ٹی ریٹ کے حصار سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اتنا ہی سمجھ پایا کہ یہ لوگ بھائی صاحب کے دوست ہیں اور گپ شپ چل رہی ہے۔ اس سے زیادہ سوچنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن جب کچھ پڑھنے لکھنے کے قابل ہوا تو پتہ چلا کہ یہ وہ نام تھے جو ایوانِ ادب میں اپنا وزن رکھتے ہیں۔ پھر بھی نہ جانے کیوں شدتِ تاثر وہ نہیں تھی جو ہونی چاہئے تھی۔ شاید جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے یہی رد و قبول کا مرحلہ تھا۔ اور اس مرحلے سے اس وقت تک نہ نکلا جب تک کہ سہیل صاحب کی شاہکار کہانیاں نہ پڑھ لیں۔ ان کہانیوں کے پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ اگر اس شخص سے ملا جائے تو شاید وہ اپنی کہانیوں سے بھی بلند ہو۔ سچا خالق یقیناً اپنی تخلیق سے بلند ہوتا ہے۔ یہ خیال دل میں اٹھتا رہا، اٹھتا رہا کہ کہانیوں سے بھی اوپر بیٹھا فن کار اگر کہیں مل جائے تو بجلی کی مانند نگاہ ذہن میں کوند جائے گا۔ اور پتہ نہیں اپنا معمولی ذہن اس کی تاب بھی لا سکے یا نہیں۔

مگر ایسا ہوا نہیں۔ پہلی ملاقات پٹنہ ریڈیو پر ہوئی۔ وہ بجلی کی طرح ذہن و دل پر نہیں کوندے بلکہ نسیم سحر کی مانند ہولے ہولے دل و دماغ میں سرایت کرنے لگے۔

"چلو چائے پئیں۔ شاہد تمہارا یہ چھوٹا بھائی کہانیاں لکھتا ہے۔ میں نے کہیں دیکھا نہیں۔ خیر۔ آؤ چلو چائے پیتے ہیں۔"

اور پھر ریڈیو اسٹیشن سے جانے تک ان کی شخصیت
ایک مکمل کتاب ہو گئی ہو۔ اتنا بڑا مفکر، اتنا بڑا
افسانہ نگار۔ اپنے سے چھوٹے بہت چھوٹے سے۔ یوں
ملتے ہے جیسے برسوں کی پہچان ہو۔ اور یہیں سے شدت
تو میں اضافہ خود بخود ہوتا ہے۔ اور اب شدت تاثر
اس منزل پر ہوں کہ جی میں آتا ہے کہ بڑے بڑے ناموں [illegible]
تحقیقوں میں سب سے بڑا نام سہیل عظیم آباد [illegible]
جائے۔
بڑا اس لئے کہ وہ اپنی کہانیوں سے بھی بڑے تھے

ورنہ کبھی کبھی بڑی بڑی کہانیوں کے خالق سے ملاقات
ہو جائے تو وہ پل بھر میں اتنا بونا ہو جاتا ہے کہ اگر
کہانی اس سے چھین لی جائے تو اس کا وجود ہی غائب
ہو جاتا ہے۔ نہ ہونے کے برابر ہو جاتا ہے۔
اپنی کہانیوں سے بھی عظیم سہیل عظیم آبادی
[illegible] جانے دنیائے ادب کو اور کیسے کیسے شاہکار عطا
[illegible]
[illegible] شوق سے [illegible]
ہم بھی سو گئے داستاں کہتے کہتے

علقمہ شبلی، کلکتہ

رباعیاں

[illegible] بھائی کی یاد میں

(۱)

[illegible] مرغِ چمن [illegible]
[illegible] وطن رہتا ہے
جانا تھا نہ یوں موڑ کے منہ بھائی سہیل
[illegible] کہ افسانے کا فن روتا ہے

(۲)

اپنوں کو تو جی جان سے پیارے تھے سہیل
[illegible] دل کو بھی کچھ کم نہ دلارے تھے سہیل
[illegible] انہیں ہر دل کی سمجھ لو شبلی
سب لوگ یہ کہتے ہیں ہمارے تھے سہیل

از۔ پروفیسر خورشید سمیع
ہیڈ آف ٹکنالوجی، مظفر پور 842003

سہیل صاحب یادوں کے آئینے میں

سمجھ میں نہیں آتا بات کہاں سے شروع کی جائے سہیل عظیم آبادی کی ادبی شخصیت کچھ محتاج تعارف تو ہے نہیں اس لئے میرا منشا اس مضمون میں بس اتنا ہی ہے کہ میں اپنے اور اُن کے روابط کی مختلف سطحوں کو واضح کروں

سہیل صاحب سے مجھ سے اور میرے خاندان سے روابط دراصل تین مختلف سطحوں پر رہے ہیں۔ میرے ناناجان محترم حکیم سید شاہ محمد الیاس ریاض قادری دراصل امجھر شریف کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔۔۔ اور اورنگ آباد میں کافی دنوں تک رہنے کے بعد انہوں نے جب پہلی بار رانچی میں (چرچ روڈ) جوڑا مندر کے پاس اپنا مطب کھولا تو کم و بیش یہ وہی دور تھا جب سہیل صاحب اردو کی تحریک کے سلسلے میں رانچی تشریف لائے اور چرچ روڈ میں کافی آگے اردو گھر قائم کیا تھا۔ رانچی بڑی عجیب جگہ رہی ہے۔ کہنے کو بالکل سنگلاخ اور پوچھ جیسے تو ادائی کی کہوں گا بڑی زرخیز۔ میں نے اپنے بزرگوں سے ہمیشہ مولانا آزاد کا ذکر سنا جو انگریزوں کے دور حکومت میں وہاں قید کیئے گئے تھے۔ وہ ممبر دیکھا جس پر مولانا خطبات دیا کرتے تھے اور سورۂ فاتحہ کی

وہ تفسیر اور پھر مولانا کا ربوبیت کے سلسلے میں وہ طرز بیان۔ پھر مجاز مرحوم کا ذکر سنا جو عالم دیوانگی میں وہاں ہسپتال میں تھے۔ بہرحال! ناناجان کہتے ہیں، میری ماں کی منسوب کے سلسلے وہ اورنگ آباد (ضلع گیا) گئے تھے۔ اور وہاں کافی دیر تک گفتگو کے بعد کچھ خاطر خواہ نتیجہ نہ نکل سکا تھا۔ واپس آتے بڑے ہی غصے میں تھے سہیل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ سہیل صاحب نے بھانپ لیا کہ حکیم صاحب اس وقت غصے میں ہیں، سو اُن کے ہمراہ ہو لئے۔ مطب آئے اور مسکراتے ہوئے بولے کہ میرے ایک دوست وصی صاحب (میرے دادا) [illegible] اُن کے بڑے لڑکے سے کہئے تو سلسلہ جنبانی شروع کروں۔ ناناجان کا بیان ہے کہ بس ایک پوسٹ کارڈ لکھا، اور جواب میں تاریخ متعین کرنے کی گزارش کی گئی۔

خود سہیل صاحب کی اہلیہ (سائرہ پھوا) میری نانی مرحومہ کی اتنی گہری سہیلی کہ بس دن رات سائرہ پھوا میرے گھر ہوا کرتی تھیں۔ میری نانی کہتی تھیں، بڑی جنتی بی بی ہیں یہ سائرہ بی بی۔ اور کمال تو یہ کہ سائرہ پھوا، میری پھوا

اس طرح ہوئیں کہ میرے والد کی قریبی بہن بھی ہوتی ہیں۔ یہ جو لطیف بھائی کے لئے میں اتنا لحاظ رکھتا ہوں اس کی وجہ بھی سن لیجئے۔ بچپن میں یعنی میرا بچپن تو قطعی تھا، ان کا بچپن بھی کہہ لیجئے، مگر ذرا سا فرق کے ساتھ۔ تو یہ بڑے شریر تھے۔ میری ماں کہتی ہیں۔ لطیف بھائی کے بعد ایک اور بھائی تھا انتقال ہو ... بیچارا کہ چھت سے گرا اور بعد ... جانبر نہ ہو سکا۔ شاید ان کو خیر مجھ سے چھوٹا ہے ... بیچارا بڑا لحاظ کرتا ہے۔ حالانکہ سہیل صاحب سے تو رہنے سے اب آپ سے۔ بیچارا کہئے۔ مجھے کیا محسوس ہو رہا ہے میں سمجھا نہیں ہوں۔

اب سنئے بعد کے احوال۔ سہیل صاحب رانچی جاتے گھنٹوں مطب میں بیٹھتے۔ اور میں تو بچپن میں تھا ہی سو بوڑھوں کا ایک بوڑھا۔ بس دن رات نانا کے ساتھ بیٹھنا، علمائے کرام، سیاسی لیڈران، ادباء، شعراء کے ساتھ بیٹھ کر ان کی گفتگو سننا اور چائے کا دور، سگریٹ یا پان۔ کبھی سہیل صاحب ہیں، کبھی اختر اورینوی صاحب ہیں، کبھی رضا نقوی واہی، کبھی ... اور ایک بار تو ۱۹۵۱ء کے آل انڈیا مشاعرے میں نانا ابا نے شرکت کی تو غضب یہ کہ تمام لوگوں سے تعارف کرا دیا۔ اور یقین مانئے اتنا چھوٹا تھا میں کہ ... پر جب ان تمام بڑے لوگوں کو اپنے سامنے دیکھ رہا تھا جن کی تخلیقات میں ہمیشہ پڑھتا رہا ہوں، کہ میں تو کبھی انہیں سمجھ پا رہا تھا کہ کیا کہوں؟ یا مجھے کیا کہنا چاہئے۔ لیکن آواز دیکھا تا دبے تو کا سا سوال کر ڈالا۔ اسلام فیصل شہری ... کہ آپ شاعری کیسے کرتے ہیں۔ عرش ملسیانی بغل میں بیٹھے تھے، مسکراتے اور بولے، جواب دیجئے جناب ... سہیل صاحب بول اٹھے "جیسے تم الجبرا کا سوال بناتے ہو۔"

پھر ایسا ہوتا کہ سہیل صاحب مطب آتے تو کبھی بسمل سعیدی اور وحید اختر کے ہمراہ، کبھی کرتار سنگھ دگل (رانچی اسٹیشن کے ڈائرکٹر) غرض یہ کہ بس لطف آجاتا۔ رکشا گھر آتا، اور سہیل صاحب بیٹھے ہوتے گپ کر رہے ہوتے۔ گاجر کا حلوہ یا چائے عموماً ہوا کرتی۔ ۱۹۵۱ء میں کرشن چندر کی بچی پاگل ہو گئی تو وہ رانچی آئے۔ میں کب جو کہنے والا تھا۔ ظفر احمد کے توسط سے ملا اور بس جی بھر کر دیکھتا رہا۔ کچھ باتیں بھی کیں۔ اور جو سچ پوچھئے تو ترقی پسندی کے لئے جو ایک نرم گوشہ سا میرے دل میں ہے وہ کچھ ماضی سے منسلک ہے۔ ۱۹۵۱ء میں ایک آل انڈیا مشاعرہ پھر دلیپ سنٹر ہال میں ہوا۔ نانا جان اس میں شریک تھے۔ سرپرست ... مرحوم بھی تھے اور فراق بھی۔ جگر کی مشہور غزل

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر
کبھی غنچہ و گل و خار پر

سے مشاعرے کی ابتدا ہوئی۔ غزل بڑی اچھی آواز اور بڑے خوبصورت انداز سے جناب مشتاق احمد اسسٹنٹ پروڈیوسر رانچی نے سنائی۔ فراق صاحب نے مشہور غزل ع

نشہ سے ساز کو کھنکا کے کچھ رات کٹے ...

سنائی۔ بس کیا کہوں۔ آج تک وہ منظر ذہن میں تازہ ہے کہ بھلائے نہیں بھولتا۔ احمد شعیب اور صدیقی مجیبی اور شمیم اختر وغیرہ رانچی ہی میں تھے۔ مجھ سے بہت سینئر۔ احمد شعیب رانچی میں انٹر ڈپلوجی کے طالب علم تھے۔ صدیقی مجیبی سینٹ زیویرس میں لیبر اینڈ سوشل ویلفیر میں ڈپلوما کر رہے تھے اور میں وہیں ان کلاس ... میں پڑھ رہا تھا۔ شمیم اختر تو خیر سے شاید ایم اے کر رہے تھے۔ ظفر احمد بی اے کر چکے تھے اور رتو روڈ میں رہتے تھے۔ ... کے والد نظام صاحب وکیل میرے نانا کے

دو سستوں میں تھے۔

اب آپ جانئے۔ یقین کیجئے کہ نہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ میری تعلیم بڑی ہی کم عمری میں ہوئی۔ بس یوں سمجھئے کہ ۱۹۴۰ء میں میٹرک، اور وہ بھی فرسٹ ڈویژن، بہار میں ۲۴ واں پوزیشن۔ بس پھر کیا تھا ہنگامہ ہو گیا اور لوگ مجھے سائنس میں رکھنے پر بضد، اور اس توقع کے ساتھ کہ یہ لڑکا تو بڑا سائنسداں ہوگا ہی۔ اب میں کیا ہوا یا کیا ہو سکوں گا یہ تو بقول نانی اماں "اپنے حبیب کے صدقے اس لڑکے کو بر وان چڑھا مولا، سارے گھر کی آس لگی ہے اس پر"۔ ۱۹۴۶ء تک رانچی ہی میں گذارنے کے بعد جب میں آنرز اور ایم ایس سی کی ڈگریاں بغل میں دبائے رانچی سے پٹنے آیا تو معلوم ہوا کہ اپنے دن اب گذر چکے ہیں اور جو مرحلے ہیں تو ایسے کہ بابو سوچ لو کہ کیا کر سکو گے؟ میرا دادیہال کیا کہئے۔ بس ایک ہنگامے کا عالم۔ دو اپنے چچا اور ایک پھوپھا پاکستان جا چکی تھیں، بہت پہلے ہی۔ جن میں سے ایک رفو چچا کی شادی سہیل صاحب کے سالے کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ وہ بھی پاکستان ہیں۔ باپ اسمبلی میں معمولی اسسٹنٹ تھے کل لوگ جن میں سارے لوگ سوتیلے ہی تھے۔ پتہ نہیں کیا چاہتے تھے۔ پھر کچھ دور کے رشتے دار جو رشتہ میں چچا اور پھوپھا وغیرہ لگتے تھے، لیکن بڑے خود غرض اور مطلبی۔ اور کمال تو یہ کبھی کہ طعنہ زنی، کچھ کریں یا نہ کریں، ہمیشہ یہی کہتے کہ میرے باپ کسی کے ساتھ کچھ اچھا سلوک ہی نہیں کرتے۔ استہزائیہ انداز، تمسخرانہ لب و لہجہ، طنز اور طعن و تشنیع اور ادھر میرے باپ جن کی ماں بچپن میں ہی فوت ہو چکی تھیں، باپ کے مرنے کے بعد کس ان کس سبھوں کو بچاتے رہتے۔ ہر ممکن بھلائی کرتے اور ہمیشہ اپنی مخالفت سنتے اور برداشت کرتے جن کا رشتہ مذاق کا ہوتا وہ میرے گھر ضرور آتے۔

اور اماں سے بھابی کا رشتہ بنا کر کبھی کبھی ہلکا اور کبھی گہرا، اچھا اور برا مذاق کرتے۔ اور بیچاری گم سم کبھی نماز پڑھنے لگتیں، کبھی کسی بہانے کھسک جاتیں۔ سوا سہیل صاحب کے جنہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ میرے دوست کی لڑکی ہے، اس سے مذاق کرنے کی سوچ نہیں سکتا۔ چھ بہنوں اور چار بھائیوں میں سب سے بڑا یہ خاکسار، [illegible] اور مسائل اَن گنت۔ خیر سے ۱۹۴۶ء میں ہی دی سی نے بحالی کر دی اور مگدھ یونیورسٹی میں لکچرر ہوا۔ آرہ میں پوسٹنگ ہوئی۔ اُن دنوں زوار حسین وائس چانسلر ہوا کرتے تھے۔ غلام عباس صاحب اور دادا جی صاحب کی شفقتیں مجھے ہمیشہ سے حاصل تھیں سو رہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے سہیل صاحب لودی کٹرہ آتے۔ رکشا روکا، مجھے شاباشی دی اور بولے یہ تمہاری منزل نہیں میاں خورشید۔ سرخوش ہو جاؤ۔ پھر شاید چائے پی اور نانا جان کو مبارکباد دے کر چلے گئے۔ اور ادھر میں تھا کہ سکندر اعظم بنا ہوا تھا۔ بس ایسے جیسے کہ پتہ نہیں کہاں کی گورنری مل گئی ہے مجھے۔ نوکری کا یہ عالم کہ چھ مہینے سے ساتواں مہینہ کبھی گذرے کہ نہ گذرے کہنا مشکل، کمیشن کا انٹرویو دینا ایک محبوب مشغلہ رہتا لیکن جیسے جیسے انٹرویو دیتا گیا اور سہیل روڈ کا چکر بڑھتا گیا، ایسا لگا کہ ہر انٹرویو میں میری حیثیت ویسی ہی تھی جیسی کہ مجروح کے اس شعر میں کیفیت ہے کہ

ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح

ہر انٹرویو کے بعد سہیل صاحب کے یہاں جانا ضروری، اور ہمارے زمانے کے دکھڑے، گلے، شکایتیں وغیرہ اور ان کا مسکرانا۔ ارے میاں پیو چائے، تمہاری عمر ہی کیا ہوئی ہے۔ کوئی over age ہو گئے ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر پھوا سے کہتے۔ بڑا ضدی ہے

کچھ بگڑنے لگا بس پکڑنے لگا، شستے کسی کی تب تو، خیر گھبراؤ
مت۔ ارے کچھ نہیں ہوگا تو پھر دیکھا جائے گا۔ میں
تمہارے ساتھ نکلوں گا کسی دن — لیکن ایسا نہ ہوا۔ اتفاق
سے میرا نام مظفر پور کے لئے بھیج دیا گیا۔ بحالی کا پروانہ
کمیشن کے ذریعہ جب ملا تو میں دنگ سہیل صاحب سے ملا۔
بولے تم تو کہتے تھے تمہارا نام کمیشن بھیجتی ہی نہیں۔ یہ کیسے
[illegible] مظفر پور اکثر آتا رہوں
گا تم سے ملوں گا۔ میں نے زوار صاحب سے ملاقات کی، وہاں
ملیں اور چلتا بنا۔ اور آج تک شمالی بہار میں اسی نوکری پر
بسر کر رہا ہوں۔ پھر ایسا ہوا کہ ۶۹ء کے قریب کی بات ہے
جب میری شادی ہوئی ہی تھی کہ سہیل صاحب نے ایک
سائنسی پروگرام میرے نام بھیجا دیا۔ میں نے بقول ان کے
بہت اچھا کیا۔ مظہر امام صاحب وہاں ان دنوں پروگرام
[illegible] آخر کنج، میں مقیم کئی پروگرام لگاتار
کرتا رہا۔ سہیل صاحب کو کبھی کسی مضمون سے شکایت نہ تھی۔
بس ذرا پڑھنے کے انداز پر بہت ڈانٹ ڈپٹ کرتے
اور شیشے کے اس پار سے مختلف قسم کے اشارے
کرتے۔ داہی صاحب سے ملاقات میں نے بھی کچھ بڑھالی
تھی۔ کاؤنسل میں بیٹھ کر گپیں ہانکا کرتا اور ان کا سگریٹ
پھونک ڈالتا۔ پھر ذرا ہمت افزائی ہوئی تو کتاب میں
لکھنے لگا۔ کتاب لکھنؤ سے نکلا کرتا۔ پہلے کچھ مضامین تو
ویسے ہی نکل گئے۔ لیکن پکاسو والا مضمون تو اتنا پسند
آیا لوگوں کو: مظہر امام، داہی صاحب، عابد سہیل وغیرہ،
کہ مجھے ایسا لگا کہ یہ لوگ مجھے بیوقوف تو نہیں بنا رہے
ہیں۔ حالانکہ تب اس میں بنانے کی بات بھی کیا تھی —
سہیل صاحب نے کہا اچھا ہے اور مہارت پیدا کرو۔ ونے
پھر تحریک نے اسے ڈائجسٹ کیا۔ ایک بندا ایلیٹ کا
منظوم ترجمہ کی شکل میں بعد میں آیا۔ سہیل صاحب "حال"
نکال رہے تھے۔ سو ایک مضمون برٹرنڈ رسل پر میں نے بھیج
دیا۔ بڑے آب و تاب سے شائع کیا۔ ریڈیو پروگرام
بھی مسلسل جاری رہا۔ لیکن ادھر ازدواجی تعلقات بری طرح
خراب ہو گئے۔ سہیل صاحب کے تقریباً ایک درجن خطوط
آج بھی میرے پاس ہیں جن میں انہوں نے ازدواجی زندگی
کی نزاکتوں کو سمجھایا ہے۔ میں نے انہیں ہی بیچ میں ڈالا اور جو
[illegible] کرا تے چکے تو انہوں نے لطیف بھائی کے سسرال
کے بھی نہ لگائے ہوں گے۔ جتنے بار کر دہ میرے سسرال
دوڑے۔ تھک ہار کر بیٹھ گئے اور میری شادی علیحدگی میں
بدل گئی۔ ایک بڑی حسین غزل جو ایک المناک مقطع پر ختم ہو
گئی۔ پھر میں نے بیسویں صدی میں افسانہ لکھا "شک
کی دیوار" یقین مانئے بڑی معصوم کوشش تھی [illegible]
پھر آپ جانئے ۷۲ء تک کا دور مقدمے بازی کی نذر
ہو گیا۔ سہیل صاحب کبھی ڈانٹتے، کبھی تسلی دیتے، لیکن
ان کا صرف تسلی میرے لئے دوا نہ بن سکا۔ میں نے مقدمے
بازی کے دوران کون سی رات چین سے گزاری اور کون سا
دن میں آرام سے بیٹھ سکا کہ لکھ سکتا۔ ۸۲ء تک مکمل
خاموشی رہی۔ کچھ نہ رہا کچھ نہ بچا کا سا عالم۔ اور جو ایک
نیا لکھنے والا ۵ یا ۶ برسوں تک مسلسل نہ لکھے تو اسے
بھلانے کا بھی سوال کہاں پیدا ہوتا ہے؟

عاجز آکر میں نے لارنس کے مشہور ناول "لیڈی
چیٹرلیز لور" کا اردو ترجمہ شروع کیا اور مکمل بھی۔ عابد
سہیل چھاپتے۔ مگر کتاب (لکھنؤ) بھی بند پڑا تھا۔ مزید
الجھنیں کھیے دیتے۔ مظہر امام نے مسودہ پر اصلاح کا کا[illegible]
کیا مگر کچھ نہ ہو سکا۔ پھر سہیل صاحب اکیڈمی کے سکریٹ[illegible]
بنے۔ میں نے مسودہ دیا۔ غور سے پڑھا۔ کوئی چند
دنوں بعد سبزی باغ میں ملے اور بولے بہت اچھا ہے
میں تو چاہتا ہوں لیکن لوگ نہیں چاہتے۔ مسودہ آگر دا[illegible]

جاؤ۔ ان دنوں وہ مسودہ علیم اللہ حالی کے پاس ہے۔ اور اُن کے رحم و کرم کا محتاج ہے۔ ہاں! ایک بات تو کہنا بھول ہی گیا تھا۔ ریڈیو کی ملازمت کے دوران انہوں نے ایک سیکنڈ ہینڈ کار خریدی تھی جس پر میں نے بھی بدقت تمام سہانا سفر کیا ہے۔ پتہ نہیں وہ کار اب [illegible] اب کہاں دیکھنے کو ملتی ہے...؟

۶۹ء سے میں نے پھر لکھنا شروع کیا — "علامت نگاری" "فن اور تنقید" اور "فن اور شخصیت" سبھی تحریک میں چھپے۔ سہیل صاحب سے ذکر کیا۔ بولے میں تحریک نہیں پڑھتا۔ پروفیسر حبیب المرسلین ساتھ تھے۔ ذرا بُرا لگا۔ مگر پی گیا۔ پھر جب ایک مضمون ترقی پسند ادب نمبر گفتگو (لکھنؤ) میں آنے کی بات ہوئی تو آپ سوچئے چالیس سال کا انتخاب، وہ بھی آفسیٹ پرنٹنگ پر، سردار جعفری کے ایسے تعریفی خطوط۔ میں سہیل صاحب سے ملا۔ ذکر کیا۔ وہ سمجھے کہ حضرت اب راہ پر آ گئے ہیں۔ بڑے خوش ہوئے۔ بولے "تم ترقی پسند ادب اور تحریک دونوں ہی کی بازدید اور از سرِ نو دریافت کر سکتے ہو۔ پٹنے میں زیادہ تر لوگ جدیدیت کے شکار ہیں اور میں اُن پر فاتحہ پڑھ چکا ہوں۔" میں نے ذکر کیا کہ میں نے کرسٹافر کاڈویل کو بھی غور سے پڑھا۔ میں ادب برائے زندگی کا تو قائل ہوں لیکن سیاسی رعایت کا نہیں۔ وہ قائل ہو گئے۔ مجھے خزانچی روڈ بلائے جانے لگے۔ پرگتی شیل لیکھک سنگھ کی نشستوں میں، کبھی کبھار مٹھائی اور چائے بھی چلتی اور مارکس کی میٹریلزم کا عملی ثبوت سامنے آ جاتا۔ میں نے کچھ مضامین بعد کو اپنے طور پر لکھے مثلاً "تنقید اور تاثراتی لب و لہجہ" شاعر بمبئی کے لئے۔ سہیل صاحب بولے ارے بھائی میرے یہاں بجلی فیل کرادی گئی۔ مالک مکان کے دو بھائیوں میں بحث ہوئی اور لائن کٹ کردی گئی۔ دن میں پڑھوں گا۔ پھر انہوں نے پڑھا اور متفق ہوئے۔ میں نے ان سے کہا "میں نے عصری آگہی کے لئے ایک مضمون لکھا ہے، ادب برائے حیات۔ جلد آئے گا۔ اور سارتر ایک ترقی پسند ادیب، عصری ادب میں بھیجا ہے۔" پھر سہیل گیا کے لئے منشی پریم چند نمبر کے لئے احمد شعیب صاحب کی فرمائش پر ایک مضمون بھیجا۔ بہت خوش ہوئے۔ میں بیان نہیں کر سکتا۔ بولے یہ رسالے میں پڑھتا ہوں۔ تم انہیں جگہوں میں لکھو۔ میں ضرور پڑھوں گا اور اپنی رائے لکھ بھیجوں گا۔ اپنے ساتھ رکشے پر لے جا رہے تھے۔ راستے میں پروفیسر موسیٰ رضا اور احمد شعیب ملے۔ ذرا سا رکے۔ احمد شعیب مضمون کے لئے شکریہ ادا کرتے رہے۔ پھر ایسا ہوا ایک دن انہوں نے مجھے چار بجے بلایا۔ میں شوکت حیات کے ساتھ وہاں پہونچا۔ پتہ نہیں کیسے شوکت حیات کے منہ سے نکل گیا کہ منشی پریم چند کو تو ہم لوگ Disown کر چکے ہیں۔ بہت بگڑے۔ پھر بات نکلی کہ کسی صاحب نے منشی پریم چند کو فرقہ پرست لکھا ہے۔ آگ بگولہ ہو گئے۔ اور مجھے لیکر خزانچی روڈ چلے گئے۔ راستے بھر وہ جھنجھلاتے رہے۔ اور پھر دم [illegible] بات پر بڑے [illegible] رہے۔ میں کیا کہتا۔ میں بھی بہت متاثر ہوا۔ سچ پوچھئے تو انتہا پسندی کبھی اچھی چیز نہیں۔ ترقی پسندوں نے کیا کیا یہ بعد کو معلوم ہوگا۔ لیکن جدیدیت کا یہ مفہوم میری نظر میں ہرگز نہیں کہ وہ ترقی پسندی کی ضد ہے۔ یعنی یہ کہ حزبِ مخالف کا رول۔

ہاں! یہ تو کہنا بھول ہی گیا کہ ایک رات جب تک [illegible] کے پاس بڑی تیز آندھی چل رہی تھی۔ میں محاورے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ حقیقتاً بہت تیز آندھی چل رہی تھی اور برآمدے میں کھڑے مستقبل کے ادیب اور شعراء ٹوٹی چھتوں کے نیچے خود کو ہوا اور پانی کے تیز جھکڑ سے بچانے کی کوشش بھی کر رہے تھے اور اونچے

اونچے الفاظ بولی رہے تھے کافی زوروں پر۔ فنی نزاکتوں سے لے کر طنز کا بازار گرم تھا میں، احمد جمال پاشا اور سہیل صاحب کتاب منزل سبزی باغ میں بیٹھے حالات حاضرہ پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ہمیں کچھ بھی نہ لگا کہ گرد و پیش میں کیا ہو رہا ہے چائے چل رہی تھی اور وہ ہم لوگوں کو سمجھا رہے تھے۔ کبھی کبھی میں اعتراض کر بیٹھتا [illegible] تمام تر ماضی کی روایات کو دوہراتے۔ کبھی قائل ہوتے اور کبھی قائل کرتے۔ پھر ٹمپو پر میرے ساتھ چلے۔ سلطان گنج کے پاس آ تے اور بولے، میں چنڈی گڑھ جاؤں گا، دلی، الٰہ آباد بھی پروگرام میں شامل ہے۔ ممکن ہوا تو سردار جعفری سے ملوں گا۔ تم کملاداس کی کتاب [illegible] اب کے مظفر پور سے ساتھ لیتے آنا، پڑھ کر دے دوں گا۔ میں نے کہا ٹیمپو جھکڑ چل رہا ہے، میں آپ کو گھر تک پہونچا دوں، بعد کو دوسرے ٹمپو سے چلا جاؤں گا۔ بولے "نہیں تشریف لے جائیے گھر پر آپ کا انتظار ہو رہا ہوگا، یہاں سے میرا راستہ الگ اور آپ کا الگ"۔ سہیل صاحب کی ایک عادت تھی، کم سے کم میرے ساتھ۔ یعنی اگر وہ مجھے کسی کام سے باز رکھنا چاہتے تو آپ جناب پر اتر آتے۔ اور آج جو میں اس ٹکڑے پر غور کر رہا ہوں تو لگتا ہے کتنی صحیح بات کہہ دی تھی انہوں نے، میں ہی پاگل نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ یہاں سے واقعی اُن کا راستہ الگ تھا اور میرا الگ۔ اور اب وہ ایک ایسے راستے پر چلے گئے کہ جہاں سے واپس آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

کہتے ہیں مرنے والے کی آخری خواہش کا احترام کیا جاتا ہے میں نے، جو اب ادھر کئی ایک مضامین لکھے ہیں جو جستہ جستہ ملک کے مشہور مؤقر جرائد میں آ رہے ہیں، آپ دیکھیں گے کہ میں رفتہ رفتہ ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کے خطوط کو واضح کر رہا ہوں۔ اگر ایک جانب میں نے "علامت نگاری" جیسے مضمون میں میلارمے اور بودلیئر کی شاعری میں علامتی حیثیت کو اجاگر کیا، اور اس کے خوب و زشت دونوں ہی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے، تو دوسری جانب فن اور شخصیت کے رابطے کو نہ صرف قائم کیا ہے بلکہ اس سلسلے میں بھی ہر وہ ممکن پہلو پیش کیا ہے جو اس کی حمایت یا بصورت دیگر مخالفت میں جاتی ہے۔ دراصل ادب کبھی یک رُخا نہیں ہوتا۔ ترقی پسندی اپنے وسیع تر مفہوم کے ساتھ اگر ایک خوبصورت انداز میں آئے اور وہ بھی اس طرح کہ اس میں سیاسی ادعائیت نہ ہو، اور جدیدیت اپنے منفی رجحانات، معاندانہ سلوک اور ترقی پسندی کی مخالفت سے گریز کرتے ہوئے یوں بڑھے کہ اس میں سیاسی، سماجی اثرات کو شجر ممنوعہ نہ سمجھا جائے تو دونوں میں کوئی بُعد نہیں رہ جائے گا۔ آپ الفاظ کی تکنیک میں چاہے جتنی بھی آزمائش کرلیں، اور تجرباتی انداز میں جتنا بھی اچھوتا انداز اختیار کریں، یہ ذہن نشین رکھیں کہ یہ لفظوں کا خزانہ مبتذل، پھٹ، ارذل اور عامیانہ ہوتا جائے گا۔ اس لئے کہ جس زندگی سے یہ الفاظ اپنی قوت حاصل کر رہے ہیں وہ زندگی ہی ایسی ہوتی جا رہی ہے، الفاظ بہر حال زندگی سے اپنی قوت حاصل کرتے ہیں۔

ہم نہ تو منشی پریم چند کو خارج از بحث قرار دے سکتے ہیں، نہ بیدی، سہیل عظیم آبادی، سجاد ظہیر یا کسی اہم فنکار کو، اس لئے کہ ہمارا ادب ہمیشہ ماضی سے منسلک رہا ہے۔ دراصل آج جو کچھ بھی ہمارے [illegible] کا تسلسل (Continuing Part) ہے۔ اور جب تک ہم ماضی کی حالیت (Presentness of Past) کو نہیں سمجھ سکیں گے تب تک ہمیں ان کی قدر نہیں معلوم ہوگی۔ جو لوگ افسانوی ادب کی حالیہ صورت حال کو سامنے رکھ کر چل رہے ہیں انہیں تو اور بھی سمجھنا چاہیے کہ دراصل

حال کی حیثیت اور اس کا تصور ماضی کا شدید احساس ہے روایت کے سلسلے میں بار بار کہتا رہا ہوں کہ روایت صالح بھی ہوتی ہیں اور فرسودہ بھی، اس لئے روایات سے مکمل بغاوت کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس سے میں تو یہاں تک محسوس کرتا ہوں کہ قانون اگر فرسودہ ہو جائیں تو شاید ان میں ترمیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن روایات کی خلاف ورزی میں سے احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ جب تک یہ روایات زندہ ہیں تب ہی تک پرسایا ڈھانچہ کھڑا ہوا ہے۔ ورنہ اگر روایات کے لئے محبت اور احترام کا ہر رشتہ یا ان رشتوں میں سے ایک بھی رشتہ اگر ٹوٹ گیا تو دیکھتے دیکھتے یہ سارا شیرازہ بکھر جائے گا۔ ادیب یا فنکار ہمیشہ اپنے ہی اچھی ورثوں سے استفادہ کرتا ہے۔ اپنے دور کے سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، اقتصادی، لسانی، تہذیبی اور ثقافتی مسائل کو غور سے دیکھتا ہے۔ پھر ان دونوں کے ساتھ اس کی اپنی شخصیت بھی ہوتی ہے فنکار کا خمیر جس مٹی سے اٹھا ہے وہ مٹی اپنی تمام تر صفات کے ساتھ اس میں جلوہ فگن ہوتی ہے اور ان تمام چیزوں میں سے وہ مختلف تناسب میں اُن چیزوں کو جو ترکیبی ہوتی ہیں اور اس کی طبیعت سے مطابقت رکھتی ہیں، یکجا کرتا ہے اور اپنے فن میں اس طرح سموتا ہے کہ وہاں اس کی شخصیت کی عکاسی بھی ہوتی ہے تمام اثرات بھی اور پھر اس کی اپنی منفرد آواز بھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں، اور اس کے ساتھ گویا کہ ساری دھرتی ناچ رہی ہوتی ہے۔ یہی وہ اسلوب ہے جو شخصیت سے وجود میں آتا ہے۔ دراصل اسلوب شخصیت کا دوسرا نام ہے۔ لیکن یہ کہ شخصیت کو وہی سمجھ سکیں گے، جن کی اپنی کوئی شخصیت ہوتی ہے۔ اور شخصیت یا تو ہوتی ہے یا پھر نہیں ہوتی۔ اور یہ کہ یہ کوئی پروپیگنڈا نہیں اور اگر ہو بھی تو آل احمد سرور کا یہ قول ذہن میں رہے کہ ہر ادب پروپیگنڈا ہوتا ہے لیکن ہر پروپیگنڈا ادب نہیں ہوتا ورنہ آخر کیا بات ہے کہ فرقہ وارانہ یکجہتی کی حمایت کولونیل ازم کی مخالفت، استحصال کے خلاف آواز بلند کرنا اور عالمی سطح پر تمام انسانوں کے لئے مساوات کا تصور لے کر دنیا کے کتنے ادیب بڑھے، اور اسے نہ صرف اپنی زندگی کا بلکہ ادب کا بھی جزو بنالیا۔ اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ادیب پر کوئی سماجی ذمہ داری عائد ہی نہیں ہوتی تو میں کہوں گا کہ وہ نہیں جانتے کہ اسی مقصد کی خاطر کرسٹافر کاڈویل نے اپنی جان تک دے دی۔ اور سجاد ظہیر اور مخدوم محی الدین سے لیکر سہیل عظیم آبادی تک تمام لوگ اسی راہ پر اپنی جان گنوا گئے اور دلبری کا بھرم بھی رکھ گئے۔ تو کیا یہ کوئی اتنی ہی فضول سی شئے تھی۔ اور یہ پروپیگنڈا کرتے رہے۔ جو شخص جس نظریئے کا حامی ہوتا ہے اُسے اس میں پروپیگنڈا نظر نہیں آتا۔ اس لئے بھی کہ یہی اس کا مقصد بھی ہوتا ہے اور منتہائے مقصد بھی۔

میں انتہائی دیانت اور خلوص اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ سہیل صاحب کے لئے ہماری ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئی ہیں۔ ہمیں ہی اُن کو زندہ رکھنا ہے۔ اُن کو حال کی روشنی میں از سر نو سمجھ، اور اُن کے شایانِ شان جگہ پر متعین کرنا ہے۔ جدیدی اُن کے فن سے نئی راہیں تلاش کریں اور اُن کے ہمعصر یہ ہرگز نہ سوچیں کہ اُنہیں بھلایا جا سکتا ہے۔ ع

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ بہ عشق

شمس الہدیٰ ایم۔اے۔ ڈیہاڑہ بہار شریف

سہیل عظیم آبادی کی یاد میں

ہر ایک سمت فضاؤں میں کیوں اداسی ہے
کسی کی چشم حسیں میں ہے کیوں نمی اتنی

ہر ایک فرد بشر کیوں ہے کھویا کھویا سا
ہے کیوں یہ زلف بتاں میں یہ برہمی اتنی

نہ جانے کیوں یہ اچانک فضا کا رنگ ہوا
ہر ایک غنچہ و گل میں وہ تازگی نہ رہی

یہ چند لمحوں کے اندر بدل گیا عالم
کسی کی شوخ لبوں پر بھی کچھ ہنسی نہ رہی

یہاں کی طرف بھی ذرا نظر کیجئے
یہ مہر و ماہ کی دنیا بھی اشکبار رہی

پتہ نہیں تھا کہ ایسی بھی کچھ گھڑی ہوگی
زمین ہند کی صورت بھی سوگوار رہی

[illegible] یہاں سے چلا کوئی اٹھ کر
سہیل ہاں وہی فخر بہار تھا کوئی

وطن کا دوست وہ انسانیت کا حامی بھی
ادب نواز فسانہ نگار تھا کوئی

عظیم آباد کی محفل یہ سونی سونی ہے
کروں تو شمس کہاں تک یہ خامہ فرسائی

ابھی تو درد زکی کا بھی دل میں قائم تھا
مگر اک اور مصیبت ابھر کے پھر آئی

نئے فسانہ نگاروں کی روشنی تھا وہ
ادب کی بزم کا اک شہسوار تھا کوئی

[illegible] سے تھا کہ اسے بے پناہ الفت تھی
تھا خوش مزاج بڑا جاندار تھا کوئی

قدیم چند کی دنیا کا جانشیں تھا وہ
غضب کا رنگ تھا سچ مچ ادب نوازی میں

زباں سلیس و عوامی و دلنشیں واللہ
عجب حسین تھی تحریر جانگدازی میں

سہیل کیا تھا کہاں تک کسی نے سمجھا ہے
ہمارے آپ کی خاطر وہ بیقرار بھی تھا

وہ تھا مجسمہ سادگی حقیقت میں
[illegible] واقعی کوئی اک مرد انکسار بھی تھا

[illegible]ک نازش ارض و سماں کا پیکر بھی
چمکتے چاند ستاروں کی دلکشی تھا وہ

چمن کی آبرو عزت تھا کیا نہیں تھا وہ
ہر ایک غنچہ و گل کی کوئی ہنسی تھا وہ

خدا سے اپنی دعا ہے کہ مغفرت کیجو
بنا حسین ہوتا آزاد [illegible]

ٹپک رہی ہیں نگاہوں سے اشک کی بوندیں
کہاں ملے گا وہ دلشاد مرد تھا کوئی

از شمس۔ م۔ عارف ماہر آروی

سہیل عظیم آبادی

کچھ یادیں

حضرت اکبرالہ آبادی نے طنزاً یہ کہا تھا کہ ؎

لوگ کہتے ہیں کہ آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

[illegible] کبر کے زمانے میں فارغ البالی تھی "پلاؤ" کھانے کے لئے مرنے کے بعد "فاتحہ" خوانی کی مجلس منعقد کی جاتی تھی کیونکہ بقول غالب ؎ "تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے" والی بات تھی۔ اب نہ فرصت نہ پیسے ہیں نہ ویسی جذبہ ہے مگر وہ "تقریب کچھ تو..." کا عمل قدر مشترک ہے۔ فی زمانہ خاص کر اردو سماج تعزیتی جلسہ، تقاریر، کسی رسالے اور اخبار کے خصوصی نمبر کا اجراء وغیرہ کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہے اگر عقیدت کا بخار زیادہ چڑھا تو لکھے انھوں پی۔ ایچ ڈی بھی کر ڈالا مگر مرنے کے بعد۔ زندگی میں اس لئے نہیں کہ مرحوم سے منسوب بہت ساری باتیں تردید کے خوف سے نہیں کی جاسکتیں ایسی ہی کیفیت سے بردست ہم آپ دوچار ہیں۔ ابھی سہیل عظیم آبادی کو مرے ہوئے مشکل سے پندرہ دن ہوئے ہیں کہ "سہیل عظیم آبادی نمبر" کا اعلان ہوگیا۔ اتنا ہی نہیں اس "نمبر" میں شریک ہونے کی "نوٹس" بھی۔ اب مشکل یہ ہے کہ بربنائے تعلقات کچھ لکھنا ہی ہے۔ مگر تعلقات ایسے تھے کہ جذبات کا دریا اترنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

جمعرات ۲۹ نومبر ۷۹ء مطابق ۸ محرم الحرام ۱۴۰۰ھ کو [illegible]بجے شام کو سبزی باغ کچھ کتابیں لانے گیا ہوا تھا۔ واپسی پر آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ کے مالک کے بھائی ایک کپڑے کی دوکان پر کھڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے آواز دی ــــ ماہر صاحب! ــــ ماہر صاحب!! سبزی باغ کی ہماہمی میں ایسا لگا کوئی مجھے آواز دے رہا ہے۔ ادھر ادھر دیکھا۔ وہ صاحب نظر آئے سلام علیکم کے بعد انھوں نے فرمایا ــــ "سہیل صاحب الٰہ آباد میں فوت کر گئے لاش آسام میل سے صبح سویرے آئے گی شاہ گنج کے قبرستان میں مدفون کرنے کا نظم ہے" یہ ساری باتیں بہت بناسنوار کے راستے میں فضل عظیم آبادی ملے ان سے دہراتا ہوا اس خبر کو آگے بڑھا تو شوکت حیات ملے ان سے بھی دہرایا۔ دونوں میں کسی کو اس خبر کی صداقت پر یقین نہ آیا۔ مجھے بھی پہلے یقین نہ ہوا۔ مگر فضل نے یہ کہہ کر یقین دلایا کہ "بھئی! مرنے کی خبر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ غلط ہو۔" رات بھر خلش رہی۔ دعا گو رہا کہ جھوٹ ثابت ہو۔ دوسری صبح بھاگا بھاگا سبزی باغ گیا معلوم ہوا کہ وہ خبر سچ تھی۔ لاش آگئی ہے۔ نماز جنازہ بعد جمعہ ادا ہوگی۔ دفتر آیا مگر سارا ذہن تھا۔ بہت ساری یادیں کلبلاتی رہیں۔ وہ زمانہ یاد آیا جب "الاؤ" پڑھا تھا۔ اس وقت ذہنی طور سے میں بھی "ترقی پسند مصنفین" سے جڑا ہوا تھا۔ پھر سہیل صاحب کی مساعی جمیلہ کی یاد آئی جو انھوں نے چھوٹا ناگپور کے علاقے میں اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کی تھی۔ وہ زمانہ بھی یاد آیا جب وہ "ساتھی" اخبار پٹنہ سے نکالتے تھے۔ ایک ادبی پرچہ

"تہذیب" "کا اجڑا مچھلیک سپاہی" راوی۔ اور ہفتہ وار "ہمالیہ" کے مدیر کی حیثیت سے بھی وہ یاد آئے۔ اور سب سے زیادہ وہ یاد آیا جب پروفیسر انیس امام کی ریڈیو والوں نے تحریک کی تھی۔ سہیل صاحب اس وقت پٹنہ ریڈیو سے منسلک تھے۔ ان کے ایک دوست جناب نصرت آروی مرحوم آرا میں تھے۔ انہیں کے ساتھ سہیل صاحب میرے غریب خانہ پر مہتر، آرا پر بہت بات کئے تشریف لائے۔ انیس امام صاحب کے سلسلے میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ میں طلبا جناب "آرا" کا منتظر تھا۔ نصرت صاحب صدر اور انیس امام صاحب ... کا زمانہ بھی شاہ آباد ضلعی انجمن ترقی اردو کا جنرل سکریٹری میں ہی تھا۔ شاہ آباد کے شعری اور ادبی فنکاروں کی ایک نشست میں نے طائی تھی کہ ریڈیو والے ہر ضلع سے لکھنے والوں کی ایک فہرست اس ضلع کی ادبی انجمنوں سے طلب کر کے ... فنکاروں کو پروگرام دیں۔ سہیل صاحب نے میری اس تجویز کو سراہا۔ دفتر پر تو مجھ سے پوچھ کر ہر صنف میں لکھنے والوں کے پتے اور نام لکھے اور ان کے مطابق پروگرام دیتے رہے۔ یہ سہیل صاحب کا بڑا پن تھا۔ وہ دل کے جتنے صاف تھے اتنے ہی ملنے جلنے میں بھی۔ بہت مختصر جملے ہوتے تھے مگر بے حد معنی خیز۔ وہ ایک صحافی، ادیب، افسانہ نگار اور مجلسی انسان تھے۔ ان کی تحریر ان کی زندگی کی طرح نہایت سادہ، آسان اور بامحاورہ تھی۔ سیاسی مسلک نیشنلسٹ تھا۔ ہاں! خوب یاد آیا۔ ابھی حال میں انہوں نے "بے جڑ کے پودے" ایک کتاب طبع کرائی تھی۔ میں انہیں مبارکباد دینے گیا ہوا تھا سلطان گنج میں ملاقات ہوگئی۔ گھر لے گئے۔ بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور اسی دوران یہ پتہ چلا کہ انہوں نے شاعری بھی کی تھی۔ اپنا کلام بھی سنایا اور مجھ سے بھی سنا، خود بھی دوسروں کے اور اشعار بھی سنائے۔ بے پناہ خلوص اور بے شمار دعائیں دیکر رخصت کیا۔ جب بھی ان سے ملتا ایسا لگتا اپنے خاندان کے کسی بزرگ سے مل رہا ہوں۔ وہی پیار، وہی ڈانٹ اور وہی شفقت۔ سہیل صاحب کیا گئے تہذیب و تمدن کی چہار دیواری کی ایک اور دیوار گر گئی اس دیوار سے پہلے ایک دیوار اختر اورینوی مرحوم کی موت گرا دی تھی۔ اب تو اقبال کی زبان میں ہی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ؎

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی!

نذرِ سہیل

فخرالدین دہلی

سورج ہے، چاند ہے، کہ ستارہ سہیل ہے
سچ ہے کہ روشنی کا منارہ سہیل ہے

اردو زباں کے نام پہ جو نام وقف ہے
وہ نام، نام نامی تمہارا سہیل ہے

افسانوی ادب ہو، صحافت کہ فکر و فن
ہر شے میں امتیاز تمہارا سہیل ہے

پرچم بدستِ ظلم سے ٹکرا گیا سہیل
مظلوم دل کا راج دلارا سہیل ہے

کل بھی تو قارئین کا پیارا سہیل تھا
اور آج قارئین کا پیارا سہیل ہے

یک نام جسم کا تھا تو شاید سہیل تھا
اب نام ذہن کا ہے ہمارا سہیل ہے

علم و ادب کو جس سے نئی زندگی ملی
دستِ ... کا وہ اشارہ سہیل ہے

انجم شاہین
عالم گنج، پٹنہ

سہیل چچا

پٹنہ ریڈیو کے شام کے نشریہ میں اعلان کیا گیا کہ ہندوستان کے مایہ ناز افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی کا انتقال ہوگیا، میرے دل میں چھن سے کوئی چیز ٹوٹ گئی، یعنی عظیم آباد کا ایک روشن ستارہ معدوم ہوگیا، کاش کبھی ایسا نہ ہوتا......

ابھی تو میں نے ان کے بستر کے ارد گرد بے شمار نامکمل افسانوں کے بے شمار اوراق بکھرے پڑے دیکھے تھے......

۱۹۶۲ء یا ۱۹۶۳ء کی بات تھی میں .A .B کی طالبہ تھی۔ مجھے اور عصمت آرا کو جو ان دنوں آرا کالج میں لکچرر ہیں افسانہ لکھنے کا شوق ہوا۔ اس کے قبل ہم دونوں کے افسانے اسکول اور کالج کی میگزین میں اور پٹنہ کے رسالہ صبح نو میں شائع ہو چکے تھے۔

ایک روز عصمت آرا نے کہا کہ تم سہیل عظیم آبادی سے کبھی ملی ہو، میں نے نفی میں جواب دیا، تو کہنے لگی تمہارے پڑوس میں رہتے ہیں چلو تم سے ملا دیں۔ میں ذرا جھجکی، ذرا رکی، مگر ملنے کے شوق نے اکسایا، کہا چلو......

ہندوستان کے ایک مایہ ناز فنکار اور ایک ڈرامہ قدم قدم چلتا ہوا قلم...... میں جب گھر تک پہونچی تو عصمت سے پوچھا "عصمت وہ ہم لوگوں سے ملیں گے یا ٹال دیں گے۔"

"نہیں، تم چلو تو سہی......"

سوچا تھا خوب صورت سا بنگلہ ہوگا...... ایک خوب صورت میز ہوگی اور عمدہ کرسیاں...... یا پھر قیمتی قالین بچھا ہوگا اس پر سہیل عظیم آبادی بیٹھے لکھا کرتے ہوں گے...... مگر وہاں اختر اورینوی والا کوئی ماحول نہیں تھا (میں اس سے قبل اختر اورینوی مرحوم سے مل چکی تھی)

ایک بڑی سی چوکی پر سفید چاندنی بچھی تھی۔ اس پاس کاغذوں کا انبار لگا تھا۔ ہاتھ میں قلم...... اور چار پانچ لفافے رکھے تھے...... ایک طرف میگزین اور کتابیں یونہی بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ میں نے دل میں سوچا تو گویا یوں بھی تخلیق کا کام ہو سکتا ہے، اور خوب تر ہو سکتا ہے۔

سہیل عظیم آبادی نے نظر اٹھائی اور عصمت سے مخاطب ہوئے "یہ آج تم کس پردہ نشین بی بی کو پکڑ لائی ہو" (اس زمانے میں میں سخت پردہ کرتی تھی)

عصمت نے تفصیل بتائی۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے کس کی لڑکی ہو، والد کا نام بتایا تو مسکرائے...... اچھا تو یہ بھتیجی نکلی۔ خوب جانتا ہوں تمہارے والد کو......

...... اس زمانے میں قیوم انصاری سے بھی وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد باتوں کا سلسلہ چلا بے حد خلوص سے ملے پھر اپنی بیگم کو آواز دی "بھائی ذرا چائے پلائیے...... بھتیجی آئی ہے۔"

اس ملاقات کے بعد میں اکثر سہیل چچا کے یہاں جانے لگی۔ میں نے ان کو اپنے افسانے دکھائے۔ غور سے پڑھا اور بولے "لکھے جاؤ"......

میں نے سوچا...... یہ کیا بات ہوئی کہ لکھے جاؤ۔ تعریف نہ تنقید......

ایک دن کہا کہ ایک اچھی کہانی ریڈیو کے لئے لکھو...... میں لکھ کر لے گئی۔ اس کو پڑھا اور کہا پھر لکھو۔ میں نے لکھا...... پڑھ کر وہی جملہ دہرایا۔ اس کو ایک بار اور دیکھ جاؤ...... میں عجیب چکر میں تھی...... کیونکہ تین بار کی نظرثانی سے کہانی کا رنگ و روپ بالکل بدل چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پھر نئے سرے سے کہانی کو لکھا۔ دیکھا تو کہنے لگے اب کچھ بات بنی......

میری کہانیوں پر کبھی قلم نہیں لگایا۔ مگر ناپسند چیز کو دیکھ کر دوبارہ، سہ بارہ لکھنے کا ضرور مشورہ دیتے تھے۔ جنس کہانیوں کی ٹکنیک، پلاٹ، کردار، کیسی دل توڑنے والی باتیں نہیں کہیں، حالانکہ آپ کے سامنے مجھ جیسے نئے لکھنے والوں کی کیا حیثیت تھی۔ اکثر بے حد طول ہوکر فرماتے تم عورتیں بڑے زور و شور سے لکھنا شروع کرتی ہو مگر پھر سنانا...... خصوصاً ہماری عورتیں تو لکھنے کے معاملے میں بے حد کاہل ہوتی ہیں۔ فن میں ڈوب جانا نہیں جانتی ہو، تو ابھرو گی کیسے...... لکھو تو جم کر لکھو......

میرے اکثر افسانے پر ان کا زبردست اعتراض یہ تھا کہ تمہاری طرح تمہارا قلم بھی نقاب ڈالے رہتا ہے۔ بے باکی سے لکھو جو چاہتی ہو کھل کر لکھو اور اس وقت ہم جیسی لڑکیوں کا حال یہ تھا کہ لفظ "محبت" لکھنے میں قلم کانپ جاتا تھا۔ میں انہیں اپنی مجبوری بتاتی تو وہ الٹا مجھے سمجھا دیتے تھے۔ ایک بار میری کہانی ممتاز آپا کو دکھا کر نیچے یہ لکھ دیا۔

"جو انسان محبت بھری نظر کو نہیں پہچان سکتا وہ کسی کے دل کی دھڑکنوں کو کیسے سن سکتا ہے۔ محبت زندگی ہے۔ جو کسی سے محبت نہیں کرتا وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ زندگی اور خوشی کے لئے محبت کرنا ضروری ہے۔ آج جسے قباحت کہا جاتا ہے، کل وہی قانون بن سکتا ہے۔ آج جو باغی ہوگا کل وہی نئے قانون کا خالق ہوگا۔ کمزور اور بزدل لوگ دوسروں کے بنائے قانون کی پیروی کرتے ہیں۔ جیسے بیل گاڑی میں جتے ہوئے بیل آنکھیں بند کئے پرانی لیکھ پر چلتے جاتے ہیں...... دائمی سچائیاں صرف چند ایک ہیں۔ باقی سچائیاں سب اضافی ہیں۔ ایک بات کسی جگہ جائز اور کسی جگہ ناجائز سمجھی جاتی ہے۔"

سہیل چچا کے خیالات کا عکس اس اقتباس سے ضرور ظاہر ہوتا مگر کیا وہ خود ان پر مکمل طور پر عمل کرتے ہوں گے؟

چاہے فنکار اپنے قلم سے جو دل چاہے لکھ دے مگر دوسروں کے بنائے قانون کی پیروی کرنا اس کے لئے بھی ضروری ہے۔ وہ "بے جڑ کے پودے" میں بھی باغی ذہن کے "نئے قانون" کا کوئی حل نہیں پیش کر سکے۔

ان دائمی سچائیوں کے بارے میں میرے اور سہیل چچا کے خیالوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ نہ میں ان کی بات سمجھ سکی اور نہ وہ میرے خیالات سے متفق ہوئے

چیز یہ تو تفصیل طلب بحث ہے مجھے یہاں نظریاتی زق پر کوئی مضمون لکھنا نہیں ہے۔ میں نے تو ان کو بہ حیثیت ایک انسان بالکل مکمل پایا ہے۔ بے حد پرخلوص بڑے مشفق اور خاکسار آدمی تھے۔ مجھے یاد ہے میں نے صرف ایک بار ان کو غصہ میں دیکھا اور وہ غصہ بھی ایسا کہ جس پر غصہ کم اور خلوص کا شک زیادہ ہو۔

جیسے ہی ان کی نظر مجھ پر پڑی کہنے لگے ....." دیکھو تمہاری چچی نے میرے کاغذات کو ردی کی ٹوکری میں بھر دیا ہے۔"

میں سمجھ گئی کہ کاغذات سے مراد وہی نامکمل افسانے اور خطوط کے انبار ہیں۔ چچی بھی کچھ کم خفا نہیں تھیں مجھ سے شکایت کرنے لگیں " دیکھو اعجاز . . . یہ برسوں سے یونہی کاغذوں اور کوڑے کباڑ کو جمع کئے ہیں۔ وہیں کھانا کھاتے ہیں، لکھتے ہیں، سوتے ہیں اور مہمانوں سے ملتے ہیں۔ میں نے ان کا چوکی صاف کر دیا ہے تو غصہ کر رہے ہیں۔ اتنے ڈھیر سارے کاغذوں کے ٹکڑے بھلا کون سے کام کے ہو سکتے ہیں۔"

خیر میں نے ردی کے بڑے سے ٹوکرے سے ان کے نامکمل افسانے علاحدہ کئے، مگر آج میں سوچتی ہوں کہ چچی نے ان کو خوب سمجھ لیا تھا یہ افسانے مکمل شائد ہی ہوں۔ کیونکہ سہیل چچا کو اپنے دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ وہ تنہا پسند یا گوشہ نشین آدمی نہیں تھے۔ صرف جان پہچان کا بھی آدمی ہو تو اس سے ملنے اور بات کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ ان کے گھروں میں ملنے والوں کی تعداد کبھی کم نہ ہوئی۔

میں بھی اکثر کہتی تھی کہ آپ لکھنے کے لئے دوسرا کمرہ لے لیجئے یہاں تو کوئی کام سکون سے نہیں ہو سکتا جواب دیتے کہ " ہاں میں بھی سوچ رہا ہوں "۔ مگر افسوس زندگی نے یہ مہلت نہیں دی..... یا وہ مہلت مل بھی جاتی تو وہ علاحدہ کمرے میں رہ کر شائد نہ لکھتے ....

وہ ایک اچھے فنکار ہی نہیں تھے ایک مخلص دوست، باوفا شوہر اور ایک مشفق باپ بھی تھے۔

گرچہ چچی پرانے خیال کی ایک مذہبی اور گھریلو بیوی ہیں۔ شوہر کے افسانوی فن سے ناآشنا مگر میں نے دیکھا وہ اپنی شریک زندگی کا نام بھی احترام سے لیتے کبھی تم نہیں کہا، ہمیشہ آپ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اکثر چچی کو چھیڑنے کے لئے بستر پر بیٹھ جاتے یا ان کو وضو کا لوٹا اٹھا لیتے تو چچی بگڑ جاتیں، کہتیں میرے وضو کا لوٹا کیوں لے لیا۔ تو جواب دیتے ارے بھئی ابھی نہا کر آ رہا ہوں با وضو ہوں چچی کہتیں.. مجھے آپ کے وضو پر یقین نہیں ہے جانے کیا کیا کر نہیں۔ سہیل چچا خوب ہنستے۔

آج سہیل چچا ہمارے درمیان نہیں رہے۔ مگر انہوں نے اردو افسانے کا جو ذخیرہ چھوڑا ہے وہ ان کو یاد رکھنے کے لئے کافی ہے۔ فنکار نہ کبھی مرا ہے اور نہ مرے گا۔ وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

●●

بقیہ :۔ سہیل صاحب کی یاد میں

کاش! وہ ہڑتال ختم نہ ہوتی۔ کاش! انہیں ریزرویشن نہ ملتا۔ کاش! کوئی انہیں اس سفر پر جانے سے روکنے میں کامیاب ہو جاتا۔ کاش، سہیل صاحب ابھی نہ مرتے کاش، وہ کچھ دن اور زندہ رہتے ______ مگر ...... مگر ...... وہ تنہا جی کر کرتے بھی کیا؟ انہوں نے اب تک جن اصولوں اور آدرشوں کے ساتھ زندگی کا سفر طے کیا تھا وہ بھی تو ایک ایک کر کے مرتے جا رہے تھے ______

رضا اشک سمستی پوری

سہیل عظیم آبادی سے ایک ملاقات

[illegible] سہیل عظیم آبادی صاحب [illegible] سے میری پہلی اور آخری ملاقات پٹنہ ریڈیو اسٹیشن میں [illegible] میں ہوئی تھی۔ وہ اس وقت آرٹسٹ اسٹاف کی حیثیت سے اردو سیکشن کے انچارج تھے اور مظہر امام پروگرام ایگزیکیوٹیو۔ مظہر امام صاحب کی وساطت [illegible] مجھے ایک اردو پروگرام ملا تھا۔ میں جب سمستی پور سے [illegible] چلنے لگا تو میرے دوست مرحوم قمر سمستی پوری نے [illegible] سہیل صاحب تمہیں کوئی لفٹ نہیں دیں گے وہ بہت کائیاں ہیں۔ اگر دوبارہ پروگرام چاہتے ہو تو جو کچھ بھی ملے سہیل صاحب کو پلا دینا۔ قمر صاحب کی یہ گفتگو مجھے بہت بری لگی اور میں پٹنے چلا آیا۔ مگر راستہ بھر سوچتا رہا۔ ہو سکتا ہے قمر صاحب کا کہنا سچ ہو مگر سہیل عظیم آبادی تو ایک بڑا فنکار ہے۔ وہ کائیاں کیسے ہو سکتا ہے [illegible] عموماً چھوٹے فنکار کی حوصلہ افزائی کرتے [illegible] نصاب کی کتابوں میں بھی پڑھا [illegible] بار ہا رسائل میں دیکھا ہے۔ ان کے متعلق میرے ذہن میں بڑے خوبصورت اور رومانی خیالات تھے۔ جیسے قمر صاحب کے اس جملے سے بڑا دھچکا لگا۔ یقیناً [illegible] اس سے بڑا افسانہ نگار اب تک پیدا نہیں کیا [illegible] پریم چند کی ادبی روایات کو جس خوش اسلوبی [illegible] انہوں نے برتا ہے اور انہیں آگے بڑھایا ہے۔ یہ سہیل صاحب ہی کا حصہ ہے۔ کرشن چندر [illegible] اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کی صف میں اگر بہار کے کسی افسانہ نگار کو رکھا جا سکتا ہے تو وہ سہیل عظیم آبادی ہی ہے (غیاث احمد گدی کا نے اس وقت یہ مقام حاصل نہیں کیا تھا) بہر کیف انہیں الجھے سلجھے خیالات میں گم میں سمستی پور سے پٹنہ چلا آیا [illegible] اسٹیشن پہونچ کر میں ان کا دفتر ڈھونڈنے لگا۔ ایک جگہ ایک نیم پلیٹ (Name Plate) دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ غور سے پڑھا۔ جلی حرفوں میں لکھا تھا۔ "سہیل عظیم آبادی"۔ ایک لمحے تک رک کر سوچتا رہا۔ میں ان سے کیا باتیں کروں گا۔ کہاں اردو کا ایک مستند [illegible] معروف ادیب اور کہاں مجھ جیسا گمنام اور نو مشق شاعر۔ میری ہمت اندر جانے کی نہیں ہو رہی تھی پھر بھی کلیجہ کڑا کر کے ذرا پردہ جو سرکایا تو دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحہ اندر سے آواز آئی "کون؟" میں گھبرا گیا اور بوکھلاتے ہوئے لہجے میں کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا "مجھے سہیل صاحب سے ملنا ہے میرا ایک پروگرام ہے" اندر کئی اصحاب بیٹھے ہوئے محو گفتگو تھے۔ ایک صاحب کچھ فائلیں الٹ پلٹ کر رہے تھے۔ انہیں میں سے ایک صاحب نے خندہ پیشانی سے

میرا استقبال کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ کہئے کیا کام ہے۔ میں ہی ہوں سہیل عظیم آبادی۔ میں چند لمحات بُت بنا ہوا انہیں دیکھتا رہا۔ اچھا یہی ہیں سہیل عظیم آبادی جن کے افسانے کا ڈنکا ہند و پاک میں برسوں سے بج رہا ہے اور جو قحط بہار پر کرشن، مخدوم اور ساحر کے دوش بدوش قصبہ قصبہ، قریہ قریہ ہندوستان بھر کا دورہ کر کے یہاں کے کروڑوں سسکتے بلکتے اور دم توڑتے ہوئے انسانوں کے لئے فنڈ فراہم کرتا رہا ہے ــــ شانے سے بے نیاز کاندھے تک لہراتا ہوا زلف کسی مفکر کی طرح بڑی بڑی اور شانت اور گمبھیر آنکھیں، سوچتا اور مسلسل سوچتا ہوا شکن در شکن چہرہ اور لباس ایسا کہ بیساختہ غالب کا یہ شعر پڑھنے کو جی چاہے ہے ؎

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

سفید لٹھے کا میلا علی گڑھ پاجامہ اور گیروا رنگ کا گھٹنے تک کرتا۔ آنکھوں پر سفید اور دبیز شیشے والا عینک۔ ہونٹوں سے لگا ہوا سگار اور سگار کا پیچ در پیچ پھیلتا اور سمٹتا ہوا دھواں ــــ سر تا پا میں دیر تک اُن کا جائزہ لیتا رہا اور جب میری محویت ختم ہوئی تو میں نے کہا۔ مجھے رضا اشک کہتے ہیں۔ میرا ایک پروگرام ہے۔

"اچھا آپ ہی رضا اشک ہیں۔ مظہر امام صاحب تو آپ کے بڑے مداح ہیں۔ کیسی ملاقات ہے ان سے آپ کی؟"

بس یونہی سی۔ ڈاکٹر مظفر حمیدی صاحب نے ملوایا تھا ماہنامہ کتاب کے کسی حالیہ شمارے میں میں نے بھی ذاتی طور پر آپ کو پڑھا ہے۔ ٹھیک لکھ رہے ہیں۔ سہیل صاحب بولے۔ "جی شکریہ" میں ان سے ا... سے بیحد خوش ہوا۔

سہیل صاحب! میں بھی آپ کو عرصے سے جانتا ہوں اُس وقت سے جب میں دسویں درجہ کا طالب علم تھا ایک کہانی تھی آپ کی میرے کورس میں۔ افسوس کہ عنوان یاد نہیں مگر کہانی مجھے یاد ہے۔ اس کہانی سے میں بہت متاثر ہوا تھا اور اب تک کچھ دھندلا دھندلا سا نقش ہے اُس کا میرے ذہن پر۔ پھر ادھر ماہنامہ کتاب میں آپ کی بھی کئی جاندار کہانیاں پڑھی ہیں۔ ایک کہانی جو حال ہی میں آئی ہے جس کا مرکزی کردار کوئی سنگتراش ہے مجھے بہت اچھی لگی مگر وہ کہانی راجندر سنگھ بیدی کی متھن سے کسی حد تک ملتی جلتی نظر آتی ہے۔

ہاں ایسا تو اکثر ہوتا ہے مگر میری کہانی کا موضوع ہی الگ ہے، بالکل الگ۔ متھن پر تو بہت لے دے ہوئی تھی رسائل میں۔ سہیل صاحب نے کہا۔

جی ہاں، مگر میرے خیال میں متھن بہت اچھی کہانی ہے۔ سعادت حسن منٹو کے بعد اب اگر کوئی ایسی کہانیاں لکھ سکتا ہے تو وہ بیدی ہی ہے ــ ویسے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کہانی فحش اور مخرب اخلاق ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے سہیل صاحب؟ میں نے پوچھا

دیکھئے صاحب! یہ فحش وحش کا جھگڑا بے سود ہے اصل میں ہمیں فنکار کے intention کو دیکھنا چاہئے کہ اثر وہ چاہتا کیا ہے۔ اس کا کوئی مقصد بھی ہے یا یونہی sex کو جگانا چاہتا ہے۔ دوسری صورت میں یقیناً کہانی فحش ہوگی ــ اب اگر کسی مشین کی piston کی حرکت کو دیکھ کر کوئی شخص شہوانی کیفیات سے دوچار ہو جائے تو بھلا بتائیے کیا علاج ہے اس کا ہم فنکاروں کے پاس؟

جی ہاں! بالکل درست فرمایا آپ نے۔ سہیل

صاحب سے متفق ہوتے میں نے کہا۔ منٹو کے ساتھ بھی ہمارے قارئین اور ناقدین کا یہی رویہ تھا۔ مگر منٹو کی صرف ایک کہانی "کھول دو" اس بات کی تردید کے لئے کافی ہے اس کہانی میں جب ایک اغواشدہ لڑکی جو عالم بے ہوشی میں پائی گئی تھی Operating room روم میں ڈاکٹر کے کھڑکی کھول دو کہنے پر جب اپنی ساڑی کھول کر خود کو عریاں کر لیتی ہے تو پورا اسی منظر بڑی بے رحمی کے ساتھ بے نقاب ہو جاتا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے اور بعد میں بربریت کا جو ننگا ناچ ہوا [illegible] سے بہتر کہانی اور کیا ہو سکتی ہے۔

جی ہاں جی ہاں، منٹو ایک عظیم فنکار تھا۔ حقیقت نگاری میں اس کا کوئی ثانی نہیں پیدا ہوا۔ اردو ادب میں بلکہ ہندی میں بھی اور ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی۔ سہیل صاحب نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا۔

ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک خوبرو نوجوان اندر داخل ہوا۔ آتے ہی اس نے سوال کیا۔

"استھانا جی (ہندی سیکشن کے انچارج) میری کہانی نشر نہیں ہوئی اب تک"۔

"آپ کی کہانی اشلیل تھی اس لئے select ہی نہیں ہو سکی"۔

"اشلیل، کیا اشلیل تھا اس میں؟" نوجوان نے [illegible] پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"استن (پستان) شبد کا پریوگ کیا ہے آپ نے اس کہانی میں"۔

"تو کیا ہوا۔ شبد کوئی اشلیل نہیں ہوتا۔ اگر اشلیل ہے تو اسے شبد کوش (لغت) سے نکال کیوں نہیں دیتے" نوجوان کافی ذہین معلوم ہوتا تھا۔ استھانا جی کو اپنے [illegible] قائل کئے جا رہا تھا۔ مجبوراً مجھے بھی اس بحث میں حصہ لینا پڑا۔ سہیل صاحب نے کہا بھائی ابھی کچھ دیر پہلے ہمارا موضوع بحث بھی یہی تھا۔ پھر آپ نے اس کہانی کو دوہرایا۔ سہیل صاحب پھر اشلیل اور غیر اشلیل پر ایک لمبی چوڑی تقریر کر گئے مگر ڈیفنس استھانا جی کا ہی کر رہے تھے۔ مجھے کسی سے کچھ مطلب نہ تھا۔ صرف سہیل صاحب کو متاثر کرنا منشا تھا میرا۔ اس لئے میں نے کہا سہیل صاحب! بدقسمتی سے اس لفظ کا استعمال میں نے بھی کیا ہے ایک جگہ ایک غزل میں

حد تو یہ ہے دودھ سے خالی
اب ماں کا استن ہوتا ہے

سہیل صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اچھا اچھا آپ نے یہ ہندی غزل کہی ہے۔

نہیں، ہے تو اردو ہی، کہیں کہیں ہندی قوافی ٹپک گئے ہیں۔

بحث طول پکڑ گئی تھی۔ میں موقع کی تاک میں تھا۔ پھر ایک موقع ملا۔ میں نے کہا۔ ڈاکو مان سنگھ کے سوانح [illegible] نے لکھا ہے۔ ابھی یہ [illegible] نکلا ہی تھا [illegible] صاحب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ سہیل صاحب نے کہا بھائی اشک صاحب ادب کی اس محفل میں ڈاکوؤں چوروں اور جیب کتروں کا ذکر۔ میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا

[illegible] چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
[illegible] بادہ و ساغر کہے بغیر

اچھا صاحب کہہ جائیے۔ معلوم ہوتا ہے جاسوسی ادب زیادہ پڑھتے ہیں۔ استھانا جی نے طنز کیا۔

جی حضور! رامائن مقدس کے رچیتا بالمیک بھی تو ڈاکو ہی تھے پہلے۔ مجھ سے جب کوئی جواب [illegible] نہ بن پڑا تو یہ جملہ پھینکا۔

"اور آپ کیا کہتے پہلے ؟" استھانا جی نے پھر ایک سوال کیا مجھ سے۔

میں نے کہا ––

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

استھانا جی نے شعر نہیں سمجھا۔ اس لئے زیر لب مسکرا کر چپ ہو گئے ––– سہیل صاحب نے کہا۔ ہاں بھائی وہ ڈاکو مان سنگھ کا قصہ سنا تیے۔ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ڈاکو مان سنگھ کے پاس ایک دن ایک پریس رپورٹر بغرض انٹرویو پہنچا۔ اس نے اس سے بہت سے سوالات کئے۔ ان سوالات میں سے ایک سوال یہ بھی تھا۔

"کس پولیٹیکل پارٹی سے وابستگی ہے آپ کی ؟"

"جس پارٹی کا خون اشلیل نہیں ہے" مان سنگھ کا جواب تھا۔

خون تو سب کا ایک جیسا ہوتا ہے پھر یہ اشلیل کیا؟ رپورٹر نے پوچھا۔

رپورٹر کی زبان سے یہ جملہ نکلا ہی تھا کہ مان سنگھ نے اس کا بایاں ہاتھ تھام لیا اور ان کی انگلیوں کو اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے ساتھ ملا کر زمین پر رکھ دیا۔ اور میان سے چم چماتا ہوا خنجر نکال کر رپورٹر کے داہنے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا ––– اسے کاٹ ڈالو اگر تم نہیں کاٹو گے تو میں کاٹ ڈالوں گا ––– خوف سے رپورٹر کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور وہ لرزنے لگا۔ مان سنگھ نے کہا دیکھا۔ تمہارا خون اشلیل ہے۔ وہ جسم سے نکلتے ہوئے ڈرتا ہے۔ میرا خون اشلیل نہیں ہے۔ یہ بالکل بے خوف، بے باک اور نڈر ہے مان سنگھ کی یہ منطق رپورٹر کی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ وہاں سے مزید انٹرویو لئے بغیر اپنی جان بچا کر بھاگا۔

استھانا جی کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں سمستی پور سے آیا ہوں تو انہوں نے پوچھا "آپ ارون جی کو جانتے ہیں؟" میں نے کہا جی جانتا ہوں۔ اکثر ان کے ہاں آنا جانا ہوتا ہے میرا۔ سہیل صاحب کی کبھی کوئی ارون سے ملاقات ہو چکی تھی اس لئے انہوں نے استھانا جی سے پوچھا۔ بھئی استھانا صاحب ! کئی مہا کاویہ کے رچناکار، پدم شری پلار رام اوتار ارون کیسے شاعر ہیں ؟

ارون جی میں ربی (رابندر ناتھ ٹیگور) بابو کی پرچھائیں ہے۔ استھانا جی نے کہا۔ اور میں یہ ریمارک سن کر زیر لب ہنسی کو چھپانے کی سعی کرتا رہا۔

اسی طرح گفتگو چلتی رہی، کام بھی ہوتا رہا۔ چائے اور کافی بھی آتی رہی۔ سہیل صاحب سگار پہ سگار پیتے رہے۔ بار بار اسے بجھا کر رکھتے، پھر پیتے۔ اشلیل غیر اشلیل، فحش غیر فحش، ادب غیر ادب، ترقی پسند غیر ترقی پسند، جدید، قدیم وغیرہ وغیرہ۔ گفتگو طویل ہوتی جا رہی تھی۔ سہیل صاحب دھواں دھار بول رہے تھے " جدید ادب سے انکار کیسے ہے مغرب میں۔ ایلیٹ اور ایذرا پاؤنڈ نے اپنا لوہا منوا لیا ہے۔ کیا غالب جدید نہیں تھے، اقبال جدید نہیں تھے، فیض اور مخدوم جدید نہیں تھے۔ یہ سب اپنے اپنے وقت میں جدید تھے۔ اب بھلے ہی قدیم ہو گئے ہوں۔ منٹو، کرشن، بیدی، عباس عصمت اور انتظار حسین بھی جدید تھے اور ہیں میں تو کہتا ہوں کلام حیدری اور اختر اورینوی بھی جدید ہیں اور میں بھی جدید ہوں۔ کیا ہم نے پریم چند کی ادبی روایات کو آگے نہیں بڑھایا ہے ؟ پھر جدید کیسے نہیں ہوئے۔ آج کے یہ شعراء اور ادبا بھی تو کل

ہماری طرح ہی قدیم ہو جائیں گے۔ سہیل صاحب نے مجاز لکھنوی کا ایک شعر کوٹ کیا ؎

جو ہو سکے تو ہمیں پائمال کر کے بڑھ
نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر

اب میں نے قطع کلام کرتے ہوئے اُن سے پوچھا حضور گستاخی معاف، کیا جدید شعراء سے آپ متاثر ہوتے ہیں ؟

کسی سے بھی نہیں۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔ اور لوگ کس طرح سمجھتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔

سمجھتے ہوں گے۔ ویسے مجھے موقعہ ہی کہاں جو جدید بھی پڑھوں اور قدیم بھی۔ بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھ رہا ہوں۔ بہت سی سماجی اور گھریلو ذمہ داریاں ہیں، بال بچے ہیں، شادی بیاہ ہے پھر ان کی تعلیم و تربیت اور نگہداشت بہت کچھ لکھا۔ اب لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ابھی بہت سے غیر مطبوعہ مسودے پڑے ہیں۔ یہ چھپ جائے تو پھر کچھ لکھوں۔ بولتے بولتے انہیں کچھ یاد آ گیا۔ کارڈ بورڈ پر ایک چھپا ہوا ملفوف دعوت نامہ مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ہمارے لڑکے لطیف الرحمٰن کی شادی پر آپ بھی تشریف لائیں۔ میں نے کارڈ لیکر اُن کا شکریہ ادا کیا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ کتنا مخلص ہے سہیل عظیم آبادی ——

میں گیارہ بجے ریڈیو اسٹیشن پہونچا تھا اور اب شام کے پانچ بجے چکے تھے۔ ادھر کی اداس اور تھکی ہوئی شام۔ اس دوران میں نے تین بار سہیل صاحب کو چائے پلا کر مشکور کرنا چاہا۔ جب کہتا سہیل صاحب چلئے چائے پیئے، فوراً کہتے ٹھہرئے منگواتا ہوں۔ اور میں بے بس ہو جاتا۔ اور اس طرح ہر Tea Table میں انہیں چار یا پانچ چائے یا کافی کی قیمت ادا کرنی پڑتی اور میرے ذہن میں میرے عزیز دوست قمر سمستی پوری کا جملہ گونجنے لگتا "سہیل بڑا کائیاں ہے، جو کچھ ریڈیو سے ملے سب اس کی ذات پر خرچ کر دینا، سب اس کی ذات پر خرچ کر دینا"

ریڈیو اسٹیشن سنسان ہو چکا تھا۔ چند کارکن یہاں تہاں رہ گئے تھے۔ چند لڑکیاں لان میں کھڑی خوش گپیاں کر رہی تھیں۔ تبھی سہیل صاحب نے کہا چلئے وقت ختم ہو رہا ہے۔ آپ کی ریکارڈنگ کر لوں۔ میں اُن کے ہمراہ ریکارڈنگ روم تک آیا۔ ریکارڈنگ روم میں مجھے ایک گدے دار Chair پر بٹھاتے ہوئے مائک درست کیا۔ مجھ سے غزلوں کی اسکرپٹ لی، ٹیبل پر پھیلایا۔ پڑھنے کا طریقہ سمجھایا اور Operating روم میں جا کر مشین اسٹارٹ کر دیا۔ لال بتی جلی اور میں نے غزل پڑھنی شروع کر دی۔

صوتِ لبِ معبود ہوں آدم ملقب ہوں
منجملۂ تخلیقِ دو عالم . . . .

آپریٹنگ روم سے دوڑ کر آئے اور کہنے لگے، ایسے نہیں بھائی، اشعار ذرا ٹھہر ٹھہر کر پڑھئے۔ آواز میں گمبھیرتا لایئے، اپنی شخصیت کو ڈھالئے۔ کیا آپ نے اچھے شعراء کی غزلیں کبھی ریڈیو پر نہیں سنیں۔ جمیل مظہری اور واہی صاحب کو تو ضرور سنا ہوگا۔ جمیل صاحب کی تو آواز بھی اچھی نہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ واقعی کوئی شاعر آواز کا جادو جگا رہا ہے۔ اتنی جلدی جلدی پڑھئے گا تو غزلیں بس دو منٹ میں ختم ہو جائیں گی بقیہ تین منٹ کا کیا ہوگا۔ میں نے پوچھا اگر پانچ منٹ سے بڑھ گیا تو ؟ کہا کوئی مضائقہ نہیں میں Adjust کر لوں گا۔ وقت بڑھے تو بڑھے، گھٹے نہیں۔

میں نے پھر غزل شروع کی۔ اس بار گاڑی دوسرے مصرعے پہ آکر رک گئی۔ میں نے آپریٹنگ روم کے قدآدم شیشے سے اُس پار سہیل صاحب کا جھلایا ہوا چہرہ دیکھا دوڑ کر آئے۔ اسکرپٹ مجھ سے لے کر خود اشعار پڑھنا شروع کیا۔

دیکھئے اس طرح پڑھئے۔ رُک رُک کر، ٹھہر ٹھہر کر جس طرح مشاعروں میں پڑھتے ہیں۔ درمیان میں کچھ کچھ بولتے بھی جائیے جیسے یہ شعر دیکھئے، توجہ چاہتا ہوں، غور طلب ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اس بار اُن کی کاپی کی اور کامیاب رہا۔ مگر وہ پھر آ دھمکے۔ واہ خوب، بہت خوب، ایسے ہی پڑھئے۔ مگر ٹیبل سے آپ نے اسکرپٹ کیوں اٹھالیا۔ دیکھئے نہیں فل اسکیپ سائز کا یہ سن لیٹ پیپر کلف دار، کھڑ کھڑ کی آواز آگئی ہے۔ یا تو پیپر کو ہاتھ ہی میں لئے رہئے یا ٹیبل پر ہی رہنے دیجئے۔ ریڈ لائٹ جلنے پر ان کا مقام مت بدلئے۔ دوسرا صفحہ پلٹنا ہو تو نہایت آہستگی سے پلٹئے۔

میں نے غزل پھر شروع کی۔ اشعار پڑھتا جاتا اور قدآدم شیشے کے پار اُن کے چہرے کے تاثر کو بھی کنکھیوں سے دیکھتا جاتا۔ دیکھتے دیکھتے ان کا چہرہ بالکل غضب ناک ہوگیا اور مجھے ایسا لگا جیسے اس بار وہ مجھ پر برس پڑیں گے اور کہیں گے جناب تشریف لے جائیے، آئندہ اچھی طرح مشق کر کے آئیے گا مگر میرے سامنے آتے ہی مسکرانے لگے۔ کہنے لگے بھائی آپ سانس اتنی زور زور سے کیوں لیتے ہیں۔ بالکل اسنوفیلیا پیشنٹ کی طرح۔ ٹیپ میں سوں سوں کی آواز آگئی ہے۔ بالکل محنت بیکار گئی۔ آپ نروس ہو رہے ہیں۔ آپ غزل یوں پڑھئے جیسے سمجھئے کہ آپ کو کوئی سن نہیں رہا ہے۔ سہیل صاحب کے اس ریمارک سے میں بہت شرمندہ ہوا اور دل ہی دل میں میر کا یہ شعر دہرانے لگا۔

رکھ پاؤں بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہہ شیشہ گری کا

میں نے پھر اشعار پڑھنا شروع کیا۔ ایک بار، دو بار، تین بار، چار بار، بار بار مگر کوئی نہ کوئی خرابی پیدا ہو جاتی کبھی کاغذ کی آواز، کبھی سانس کی آواز، کبھی جوتے کی آواز، کبھی یہ، کبھی وہ۔ اب مجھے اپنے آپ پر خود ہی غصہ آ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ واپس چلا جاؤں۔ ایسی حالت میں سہیل صاحب کا کیا ردعمل ہوا ہوگا، میں نہیں کہہ سکتا۔ میں واقعی نروس ہو چکا تھا۔ چونکہ ریڈیو کے متعلق میری کوئی واقفیت نہیں تھی اور اسے میں بہت بڑی چیز سمجھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ میری آواز ہند و پاک کے کروڑوں افراد سنیں گے اسی لئے نروس نس کا دورہ مجھ پر پڑا۔ ورنہ درجنوں مشاعروں میں تحت اللفظ ہی میں میں نے بڑی کامیابی سے غزلیں اور نظمیں پڑھی ہیں۔ میرا سر بار ندامت سے اس وقت اور بھی جھک گیا جب ہندی کے ایک تھرڈ کلاس کوی کو سہیل صاحب بلا کر لے آئے اور ان سے اس کی کویتا مائک پر پڑھوا کر مجھے اس کے لہجے کی نقل کی دعوت دی۔ کوی مہاراج کا سر فخر سے اونچا تھا اور میں ہارے ہوئے جواری کی طرح سر نیچا کئے سوچ رہا تھا۔ کاش کوی جی کسی کوی سمیلن میں میرے ساتھ ہوتے۔

قصہ مختصر یہ کہ بڑی جد و جہد اور کد و کاوش کے بعد میری ریکارڈنگ مکمل ہوئی۔ سہیل صاحب مسکراتے ہوئے آئے۔ ان کا صبر اور ضبط دیکھنے کی چیز تھی۔ کبھی کی دید نہ شنید، مگر یہ خلوص، یہ اخلاق، یہ پیار، یہ یگانگت، یہ سہیل صاحب کا ہی حصہ تھا

ار بار حوصلہ افزائی کرتے۔ گھبرائیے نہیں، پہلا پہلا پروگرام ہے آئندہ سے ٹھیک رہے گا۔ آپ ترنم سے کیوں نہیں پڑھتے۔ یہ ریڈیو ہے نا۔ عوامی دوقت کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں مجھ سے کہا۔ اچھا چلئے آپ کی ریکارڈنگ اب آپ کو سنا دوں۔ محنت تو کرنی پڑی مگر ریکارڈنگ شاندار ہوئی ہے۔ اور جب میں نے پہلی بار اپنی آواز سنی تو ششدر رہ گیا۔ پروگرام نشر ہونے کے بعد احباب کا خیال تھا کہ یہ آواز میری نہیں کسی معمر اور کہنہ مشق شاعر کی ہے۔ یہ سب سہیل صاحب کا معجزہ تھا۔

شام کے چھ بج گئے۔ سہیل صاحب سلطان گنج جانے کے لئے پابہ رکاب تھے۔ میں نے اصرار کیا۔ حضور میں نے جب جب چلنے کی فرمائش کی آپ نے Pass کیا۔ ایک وار میری جانب سے ہو۔ مسکرانے لگے کہا چلئے۔ پھر ہم لوگ فریزر روڈ کے ایک خوبصورت اور سجے سجائے بار میں آگئے۔ اندر داخل ہوتے ہی کاسیلنگ کاؤنٹر پر پیمانوں کی قرینے سے سجی ہوئی قطاریں دیکھ کر بے ساختہ میرے منہ سے یہ شعر نکل گیا ؎

قطارِ شیشہ ہے یا کاروانِ ہمسفراں
خرامِ جام ہے یا جیسے کائنات چلے

سہیل صاحب پھڑک اٹھے۔ پوچھا کس کا شعر ہے، مجروح کا؟ میں نے کہا ہاں۔ کہنے لگے بھائی ترقی پسندوں کا کیا کہنا۔ کیا بات کہی ہے۔ بات میں بات۔ حیات و کائنات سے کتنا گہرا رشتہ تھا اس کا۔ کوئی بات بے مقصد نہیں۔ خطابت تو خطابت ہی سہی مگر ہمارے یہ جدید شعراء؟ کیا لکھ رہے ہیں یہ لوگ؟ میں بالکل چپ رہا۔ میری ہمت نہیں ہو رہی تھی ان سے بحث کرنے کی۔ میں انہیں ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ اب جو میں نے پھر بار کا جائزہ لیا تو سمجھ گیا کہ قمر صاحب ٹھیک ہی کہہ رہے تھے، سہیل صاحب بڑا کایاں ہے۔ سہیل صاحب اب اپنے اصلی رنگ میں آگئے تھے۔ بھلا میں نے اُن سے کب کہا تھا کہ بار میں چلئے۔ میں تو محض انہیں چائے یا کافی پلانا چاہتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ کچھ ناشتہ وغیرہ۔ میں نے بوتلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ سہیل صاحب! چلے گی؟

نہیں۔

کیوں کیا آپ نہیں پیتے۔ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

آپ پیتے ہیں؟ انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔

پیتا تو نہیں مگر پی لوں گا۔ میں نے کہا۔

نہ پیتا تو ہوں مگر نہیں پیوں گا۔ سہیل صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے لاکھ اصرار کیا۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ مجبوراً میں نے مٹھائیوں کا آرڈر دیا۔ اسپنج، گلاب جامن، سندیسہ، برفی وغیرہ وغیرہ۔ چلتے وقت کاؤنٹر پر جب ہم پہونچے اور پاکٹ میں ہاتھ ڈال ہی رہا تھا کہ سہیل صاحب نے جھٹ سے Pay کر دیا۔ میں نے لاکھ احتجاج کیا۔ ایک نہ سنی کہنے لگے وہ آپ سے پیسہ لے گا ہی نہیں۔ آپ ہمارے مہمان ہیں۔ جب میں آپ کے ہاں آؤں گا تو بدلہ چکا دیجئے گا۔

یہ کہاں ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا۔

مسکرانے لگے۔ دیر تک مسکراتے رہے۔ مصافحہ کیا اور مجھے گلے لگا کر رخصت کیا پھر جیسے کچھ یاد آیا۔ کہنے لگے لطیف الرحمٰن کی شادی میں آنا مت بھول لئے گا۔ اور لوٹتے ہوئے میں راستہ بھر سوچتا رہا کتنا مخلص ہے، کتنا عظیم ہے سہیل عظیم آبادی۔ آفتاب کی ایک ذرۂ کمتر پہ یہ نوازش — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔

اور آج جب سہیل عظیم آبادی ہم میں نہیں ہیں۔ موت کے آہنی پنجے نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انہیں ہم سے چھین لیا ہے۔ اُن کا ایک خط میری ٹیبل پر پڑا ہے۔ لکھا ہے:۔

• آپ لطیف الرحمن کی شادی پر نہیں آسکے، مگر آپ کا لکھا ہوا سہرا آپ کی یاد تازہ کرتا رہا۔"

میں سہیل صاحب کے خط کو بار بار پڑھتا ہوں، آنکھوں سے لگاتا ہوں، چومتا ہوں۔ یہ خط نہیں، سہیل صاحب کی ایک یادگار تصویر ہے جس میں اُن کا دل دھڑک رہا ہے، ان کی روح مسکرا رہی ہے، اُن کا جسم حرکت کر رہا ہے اور جسے میں نے حرزِ جاں کی طرح اپنے دل کی دیوار پر چسپاں کر لیا ہے ۔۔ آہ!

سہیل عظیم آبادی! تو امر ہے، عظیم ہے، غیر فانی ہے۔ !!!

اور روشنی دکھاتا رہا ہر قدم پہ تو

از — معصوم شرقی

خود تھا جو ادیب، ادب کی وہ جان تھا
اہلِ قلم کی آن تھا محفل کی شان تھا
پیکر تھا وہ خلوص کا ہر ایک کے لئے
ہر ایک خاص و عام پہ وہ مہربان تھا

ساری حیات جہدِ مسلسل میں جو رہا
آندھی میں بھی چراغ جلاتا چلا گیا

رنگیں سہیل تجھ سے تھا اردو کا یہ چمن
گویا امریم اردو بھی اور ہندوستاں میں
نام و نمود سے نہ رہا تجھ کو واسطہ
خدمت زباں کی جیتے جی کی تو نے بے صلہ

جاری ہے تیرا فیض بتاؤں کہاں کہاں
شہرِ خموشاں میں ہے تیری ذات درخشاں
ہر لمحہ تیرا چہرہ ہے آنکھوں کے سامنے
چھپنے کو سب کی آنکھوں سے ہے آج تو نہاں

بس کارواں بناتا رہا ہر قدم پہ تو
اور روشنی دکھاتا رہا ہر قدم پہ تو

منارتھا تو پریم کا، کعبہ تھا پیار کا
تیرا وجود گویا تھا نغمہ ستار کا
صبح عظیم آباد ہے شام عظیم آباد
تو کیا گیا کہ ختم ہے قصہ "بہار" کا

اعجاز علی ارشد

سہیل صاحب کی یاد میں

سہیل صاحب آدمی نہیں تھے

زندگی بھر نہ انہوں نے کبھی دوستوں کے ساتھ دشمنی کی، نہ اپنے مفاد کے لئے دوسروں کو نقصان پہونچایا، نہ پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کی۔ نہ کسی کے سامنے اس کی جی حضوری کی پناہ دی، نہ کبھی مصلحت پرستی میں مبتلا ہوئے، نہ کبھی خود غرضی کا شکار بنے۔ پھر وہ آدمی کس طرح ہوئے؟ پھر میں نے سوچا کہ سہیل صاحب فرشتہ بھی نہیں تھے چوں کہ انیسویں صدی عیسوی تک شائد فرشتے اس دنیا میں آتے رہے ہوں مگر جب سے بیسویں صدی اپنی ساری بدکاریوں، مکاریوں اور ریاکاریوں کے ساتھ شروع ہوئی ہے کم از کم ہندوستان میں فرشتوں نے آنا ضرور بند کر دیا ہوگا۔ آخر کار ذہن نے فیصلہ کیا کہ سہیل صاحب نہ آدمی تھے نہ فرشتہ بلکہ انسان تھے۔ وہی انسان جسے اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔ مزید غور کیا تو اس نتیجے پر پہونچا کہ وہ صرف انسان ہی نہیں تھے انسان دوست بھی تھے۔ انسان دوستی سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتی تھی۔ بلکہ سایہ بھی کبھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے مگر سہیل صاحب کا حال یہ تھا کہ وہ ترقی پسندوں کے جلسے میں ہوں یا سفر میں، اندھیرے میں ہوں یا اجالے میں انسان دوستی کا جذبہ کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر اردو ادب کے سرحق یعنی نقاد غیر جانب داری کے ساتھ ان کے فن کا پوسٹ مارٹم کریں تو وہاں بھی انسان دوستی کا یہ جذبہ ضرور ملے گا۔

اپنی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے میں معلمی کے ...ن پیشے سے وابستہ ہوں وہاں انسان دوستی کا یہ جذبہ ...دھیرے دھیرے کم ہوتا جا رہا ہے حالانکہ اسے بڑھنا چاہئے تھا۔ سہیل صاحب اکثر بھی ملاقاتوں میں اس موضوع کو چھیڑتے اور اردو کے ان دو ممتاز اساتذہ کا بڑے پرلطف انداز میں تذکرہ کرتے جنہوں نے صرف اس بنیاد ...ہ ایک دوسرے سے بات چیت ترک کر دی تھی کہ ان ...میں سے ایک کو دوسرے کے مقابلے میں امتحان کی ایک کاپی زیادہ جانچنے کے لئے مل گئی تھی۔ واضح ہو کہ اس وقت ...یک کاپی جانچنے کی اجرت صرف چار آنے تھی۔

چنڈی گڑھ کا سفر ان کا آخری سفر تھا حالاں کہ یہاں سے آخرت کی طویل سفر کی ابتدا ہونے والی تھی۔ سفر سے چند دن پہلے ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ریلوے والوں نے ہڑتال کر دی ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ سہیل صاحب روزانہ ہڑتال ختم ہونے کی دعائیں مانگا کرتے اور میں ان کی دعائیں قبول نہ ہونے کی دعا کرتا۔ کیونکہ ان کی صحت بہر حال اتنے لمبے سفر کے لائق نہیں تھی۔ مگر شائد بارگاہِ الٰہی میں میری دعا پہونچنے سے پہلے ہی ان کی دعا قبول ہو چکی تھی۔ ہڑتال ختم ہو گئی، انہیں ریزرویشن بھی مل گیا اور وہ چنڈی گڑھ روانہ ہو گئے۔ (بقیہ ص ۹۹ پر)

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

(ڈاکٹر محمد ابراہیم۔ شعبۂ اردو متھلا یونیورسٹی دربھنگہ)

سہیل عظیم آبادی ایک شخص، ایک فرد، ایک صحافی، ایک افسانہ نگار، ایک ادیب اور دانشور کا نام نہیں، ایک عہد، ایک دور اور ایک دبستان کا نام ہے۔ انسانیت کے ایک بلند مینارے کا نام ہے جسے اردو دنیا سہیل عظیم آبادی کہتی ہے۔ سہیل عظیم آبادی ایک عہد کا نام ہے جو گذر گیا اور اپنے ساتھ ایک دور کو لے گیا۔ پریم چند کے میخانے کا ایک پرانا میخوار چلا گیا۔ دم توڑا بھی کہاں؟ پریم چند کے بیٹے کے گھر میں۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

سہیل صاحب سے میری ملاقات ایک دو دن کی نہیں برسوں کی ہے۔ ان کا بڑا لڑکا لطیف الرحمٰن میرا دوست، بچپن کا ساتھی ہے۔ اس نسبت سے سہیل صاحب میرے چچا تھے اور وہ بھی بہت عزیز رکھتے تھے۔ اب سہیل صاحب نہیں رہے تو ایسا لگتا ہے کہ ایک بار پھر میں یتیم ہو گیا ہوں۔ میرے بچپن کی بات ہے۔ سہیل صاحب ان دنوں پٹنہ سے ایک رسالہ تہذیب نکالا کرتے تھے۔ عبدالقیوم انصاری صاحب کے تعاون و اشتراک سے۔ قیوم انصاری مرحوم سے ان کی ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سہیل صاحب کی قوم پرستی اور وطن دوستی تھی۔ سہیل صاحب ایک اچھا دوست، ایک بڑا کانگریسی، نیشنلسٹ اور سچا قوم پرست تھے، سوشلسٹ اور وطن دوست تھے۔ افسانہ نگار اور فنکار تو وہ تھے ہی۔ ہم لوگ پیر بہوڑ محلہ میں

ایوب صاحب ایڈووکیٹ کے مکان کے متصل رہا کرتے تھے میرے چچا پروفیسر عبدالعزیز مرحوم سے ایوب صاحب کی دوستی تھی اور قربت بھی۔ کالج کے دونوں ساتھی بھی تھے میرا آنا جانا ایوب صاحب کے یہاں اندرون حویلی بھی تھا محمودہ پھوپھا اور ان کی بہن مسعودہ پھوپھا ہمیں بہت مانتی تھیں دونوں لاولد تھیں۔ محمودہ پھوپھا نعیم صاحب بیرسٹر کی زوجہ اور ایوب صاحب کی بھابھی تھیں۔ ان کے مکان میں میں نے بڑے بڑے دانشوروں اور فنکاروں کے اجتماع دیکھے ہیں۔ علامہ جمیل مظہری کا تو قیام برسوں اسی مکان میں رہا اجتبیٰ رضوی جب بھی پٹنہ میں آتے ایوب صاحب کے یہاں ضرور آتے۔ شاہ عزیز منعمی اور قیوم انصاری صاحبان کا تو آنا جانا روزانہ کا معمول تھا۔ پھر ایوب صاحب ایڈووکیٹ انجمن ترقی اردو بہار کے صدر بنائے گئے اردو کے پروانوں کا اجتماع بڑھ گیا۔ ایوب صاحب نے زندگی بھر اردو کی خدمت کی۔ بابائے اردو عبدالحق کی طرح انہیں بھی اردو زبان و ادب سے سچا عشق تھا۔ شادی نہیں کی اور زندگی بھر گیسوئے اردو کو سنوارتے اور تابدار بناتے رہے۔ ایوب صاحب بہار کے بابائے اردو تھے۔ اردو کے لئے زندہ رہے اور اردو کے لئے مر گئے اور سارا اثاثہ، اپنی حویلی اور مکان سب کا سب

اکھڑ کو دے گئے۔ آج اردو کے نام پر اُن کے ہی مکان میں ایوب اردو گرلس اسکول ہے اور بس۔ کاش ہم لوگ اتنے بے حس نہ ہو سکتے۔ خیر، میں کہہ رہا تھا کہ ایوب صاحب کو اس منزل تک لانے، ان کے ادارہ بنانے اور بہار میں اردو تحریک کو آگے بڑھانے والوں میں سہیل صاحب پیش پیش تھے۔ سہیل صاحب ایوب صاحب کے یہاں صبح و شام آتے انہیں حوصلہ بخشتے، ہمت بڑھاتے۔ اکثر دونوں میں میں نے تم سے تو اور تو سے آگے بھی بات جاتے دیکھی ہے۔ میں سہیل صاحب سے یہیں قریب ہوا اور متاثر بھی۔ یہ ذہنی قربت بڑھتی گئی اور میں قریب سے قریب تر ہوتا گیا۔

اسکول سے کالج میں آیا۔ سائنس کالج پٹنہ میں پڑھ رہا تھا۔ سنہ ۵۹ء کی بات ہے کہ تبلیغی جماعت والے مجھے اغوا کر کے دلّی لے گئے اور بنگلے والی مسجد میں قید کر دیا اندر باہر کرنا منع۔ اکیلے کہیں جانا منع۔ اور درود وظائف کی مصیبت الگ۔ جہاں جاؤ جماعت کے ساتھ جاؤ۔ اسی بنگلے والی مسجد کے بغل میں اردو کے مشہور شاعر حضرت اسداللہ خاں غالبؔ کا مزار ہے اور پیچھے ذرا اندر کو حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ جس کے مجاور ان دنوں سلام صاحب تھے۔ ایک روز چھپ چھپا کر نکلا، حضرت غالب کے مزار پر جا کر فاتحہ پڑھا اور حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ میں داخل ہوا۔ وہاں سہیل صاحب کو مراقبے میں پایا حیرت ہوئی کہ یہ آزاد منش آدمی یہاں کہاں؟ معلوم ہوا کہ کشمیر سے دلی آ گئے ہیں اور باضابطہ ہر جمعرات کو حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر فاتحہ پڑھنا، درگاہ میں حاضری دینا ان کا معمول ہے۔ میری طرف دیکھا، عظیم آباد کی شرافت امنڈ آئی، گلے لگایا، گھر آنے کی دعوت دی۔

سہیل صاحب کو آل انڈیا ریڈیو نے ہندوستان بھر میں گھمایا۔ انہوں نے گھوم گھوم کر بے انتہا دوست پیدا کئے۔ بے تکلف وہ سبھوں سے ملے۔ نہ کبھی وہ بر خود غلط ہوئے اور نہ کبھی ان میں تصنع اور برتری کا احساس پیدا ہوا۔ حق اور ناحق میں تمیز ضرور پیدا کرتے رہتے مگر دوست دشمن کی پہچان نہ تھی۔ آدمی کی پہچان تھی۔ ان کے مزاج کی ساخت و تعمیر میں ان کی آبائی رہبنداری اور ریاست کو دخل تھا۔ خوش گفتار تھے مگر خوش کردار نہیں۔ کم از کم میں انہیں خوش کردار نہیں مانتا۔ یوں خوش وضع تھے۔ خوش طبع تھے، بذلہ سنج اور لطیفہ گو تھے۔ طبیعت میں سادگی بھی تھی اور رنگینی بھی۔ موقع ملتا تھا تو کھل کھیلتے تھے۔ ان کی زندگی کھلی ہوئی کتاب کی طرح تھی۔ سب کو وہ اپنا دوست سمجھتے تھے۔ جس سے اکثر ان کا نقصان ہوا۔ خاکساری، وضع داری اور باربازی نے انہیں تباہ کر دیا۔ حیرت آپ کو ہوگی یہ جان کر کہ سارے ہندوستان میں گھومنے والا، افسانہ نگاروں، شاعروں اور ادیبوں کا مجمع لگانے والے، دوسروں کو افسانہ نگار، لکچرار، ناقد اور محقق بنانے والا، دوسروں کا گھر بسانے والا خود زندگی بھر بے گھر رہا۔ اپنے لئے ایک گھر نہ بنا سکا۔ بچوں کے لئے ہی کچھ کرتا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ کثیر الاولاد تھے یا آمدنی کے ذرائع محدود تھے، خود بھی ایک، چچے اور بڑے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ بچے صرف دو لطیف الرحمٰن اور شان الرحمٰن۔ دراصل انہوں نے اپنی ساری کمائی دوستوں میں لٹائی اور اردو زبان و ادب کی خدمت میں تو گھر ہی گنوا دی۔

اردو افسانے کو سنوارنے، نکھارنے اور اسے پونم کا چاند بنانے میں سہیل عظیم آبادی، علی عباس حسینی، سدرشن، منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور بیدی سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں رہتے۔ صوبہ بہار کے تو وہ اولین افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں اور سب میں ممتاز۔

بہار اسکول سے افسانوی دنیا کا قطب مینار سہیل عظیم آبادی

۱۹۶۴ء کی بات ہے، میں نے اسی سال اردو میں ایم اے کیا تھا اور ملازمت کی تلاش میں سرگرداں۔ کشمیر یونیورسٹی میں لکچرار کی ایک جگہ خالی تھی۔ اشتہار دیکھا۔ فارم منگوایا اور مشورہ کے لئے سہیل صاحب کے پاس گیا۔ ریڈیو اسٹیشن ہی میں ان سے ملاقات ہو پائی تھی۔ گھر پر ان کا ملنا محال تھا۔ ان دنوں وہاں گیا تو شکیل الرحمٰن صاحب کو بیٹھے دیکھا۔ سہیل صاحب نے ملایا۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن سے ملو۔ شکیل صاحب سے باضابطہ ملاقات اس سے قبل ہوئی نہ تھی دیکھا تھا، پہچانتا تھا۔ جانتا تھا کہ وہ کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ سہیل صاحب اپنی کرسی سے اٹھے اور چلے پرنس ہوٹل چائے پینے پلانے اور گپ لڑانے کے لئے۔ پرنس ہوٹل مخصوص اڈہ تھا۔ میں نے مدعا عرض کی، ان کی رائے کا طالب ہوا۔ چیخ پڑے تم کشمیر جانا چاہتے ہو نوکری کرنے کشمیر گھومنے کی جگہ ہے رہنے کی نہیں۔ کشمیری یہودی النسل ہیں شکیل سے پوچھو۔ انہیں جتنا وہاں ملتا ہے اس سے ایک سو روپیہ کم دے کر بھی یہاں بلاؤ گے تو وہ چلے آئیں گے۔ شکیل صاحب نے بھی حامی بھری اور ایک لطیفہ سنایا جس سے کشمیریوں کی سرشت اور ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ بھی سن لیجئے۔ شکیل صاحب نے کہا کہ ایک کشمیری کڑی دھوپ میں گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ اتفاقاً ایک ہندوستانی ادھر سے گذرا۔ اس آدمی کو پسینے پسینے دیکھ کر از راہ ہمدردی مشورہ دیا کہ بھائی دھوپ میں کیوں لیٹے ہو درخت کی چھاؤں میں جا کر آرام کرو۔ یہ سن کر وہ کشمیری اٹھا اور ہاتھ پھیلا دیا۔ پیسے دو میں نے تمہارے مشورے قبول کئے۔ اس لطیفے کو سننے کے بعد کیا ردعمل ہوا ہوگا مجھ پر، کتنی نفرت ہوئی ہوگی کشمیریوں سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔

۱۹۶۵ء کی بات ہے، میں بی۔ ایس کالج داناپور میں عارضی طور پر کام کر رہا تھا اور جی۔ ڈی کالج بیگوسرائے کے لئے کمیشن میں انٹرویو دے چکا تھا۔ میرا انتخاب بھی ہوا مگر بحالی میں تاخیر ہو رہی تھی مقامی سیاست کی وجہ کر کالج کے ارباب اختیار و اقتدار سے نہ میری شناسائی تھی اور نہ ان تک میری رسائی۔ میں پھر سہیل صاحب کے پاس پہونچا۔ انہوں نے جوگی پریس کے مالک ورما صاحب کو فون کیا تمہارے رہتے گنیش دت کالج میں میرے بھتیجے کی بحالی ہوگی یا نہیں؟ ورما صاحب نے کہا اپنے بھتیجے کو بھیج دو۔ اور ورما صاحب نے کرشن کانت سنگھ کو فون کیا وہ ان دنوں منسٹر تھے اور گنیش دت کالج کے پرنسپل کے سمدھی ہونے والے تھے۔ بات بن گئی اور میں اس طرح بیگوسرائے پہونچا اور گنیش دت کالج میں ملازمت شروع کی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر درد کی دوا صل علیٰ سہیل تھے۔ سہیل صاحب مسیحا تھے، سب کے کام آتے۔ سب کے چارہ ساز تھے۔ کسی کو مایوس نہ کیا مگر میرے مذہب میں آدمی کی پوجا روا ہوتی تو میں سہیل صاحب کی ضرور پرستش کرتا، پوجتا — کہاں ملتے ہیں ایسے لوگ —؟

ایک واقعہ اور سن لیجئے — میں نے اپنا مقالہ ڈاکٹر آف فلاسفی (پی۔ ایچ۔ ڈی) کی ڈگری کے لئے پٹنہ یونیورسٹی میں جمع کیا۔ علامہ جمیل مظہری نگراں تھے یونیورسٹی نے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو اکسپرٹ بنا دیا۔ اب علامہ کلکتہ میں قیام فرما تھے شکیل صاحب کشمیر میں اور نارنگ صاحب دلی میں — یہ سہیل صاحب ہی تھے کہ یہ تینوں حضرات یکجا ہو سکے وائیوا آخری مرحلہ بھی ہے اور نازک مرحلہ بھی۔

اس روز میں پھر سہیل صاحب کے پاس گیا۔ وہ ان دنوں بہار اردو اکیڈمی کے آنریری سکریٹری تھے۔ خوبی قسمت کہئے یا سہیل صاحب کی ذات کی برکت کہ ان سے ملنے نارنگ صاحب اکیڈمی میں آگئے۔ سہیل صاحب نے مجھے ملایا — نارنگ صاحب نے مبارکباد دی۔ مختار مصطفےٰ نے اعتراض کیا وائیوا نارنگ صاحب ڈھائی بجے ہے اور آپ گیارہ بجے ہی کلا براہیم کو مبارکباد دے رہے ہیں۔ جواب ملا میں توکل آدمی ہوں صاحب۔ واقعی ابراہیم صاحب نے اچھا کام کیا ہے لیجئے صاحب ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری مل گئی۔ ایسے تھے سہیل صاحب۔ کتنی باتیں لکھوں، کتنی باتیں کہوں — نہ مجھے فرصت اور نہ آپ کو فراغت نصیب۔

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ سہیل عظیم آبادی کی موت بلاشبہ ایک دور اور ایک عہد کی موت ہے جو عبارت تھا کلاسیکی روایت، ثقافت اور شائستگی تہذیب سے۔ ایک پرخلوص جذبے کی موت ہے جو احترام انسانیت کے لئے سرگرم کار تھا، ایک وطن دوست، قوم پرست مرد جانباز کی موت ہے جو ہزار مصیبتوں میں بھی سربلند رہا — ایک فنکار اور دانشور کی موت ہے جس نے فکر و فن کو اپنے جگر کے خون سے سینچا اور زندگی بھر خون افشانی کرتا رہا۔ کاش سہیل صاحب ابھی نہیں جاتے۔ ع

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

گو انہوں نے اپنے پیچھے افسانہ نگاروں اور ادیبوں کی ایک بڑی جماعت چھوڑی ہے مگر ع

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں؟

ناشاد اورنگ آبادی

نذرِ سہیل عظیم آبادی

ملک کا اک نامور فنکار رخصت ہوگیا
اک مصنف اک کہانی کار رخصت ہوگیا
فخر جس پر تھا دبستانِ عظیم آباد کو
وہ ادب کا قافلہ سالار رخصت ہوگیا
جو اٹھاتا تھا قلم پیکارو مظالم کے خلاف
وہ سبھوں کا مونس و غمخوار رخصت ہوگیا
گیسوئے اردو کو سلجھانے کی خاطر رات دن
زندگی بھر جو رہا بیدار رخصت ہوگیا
جنگِ آزادی میں بھی آگے رہے جس کے قدم
وہ صحافت کا علمبردار رخصت ہوگیا
نام تابندہ کیا جس نے عظیم آباد کا
وہ ستارہ علم کا شہکار رخصت ہوگیا
تا قیامت اہلِ اردو کو ملے گی روشنی
وہ ادیب و پیکر افکار رخصت ہوگیا
جانے کتنی عمر تک دیں گے مثالیں جس کی لوگ
وہ سبق آموز و خوش کردار رخصت ہوگیا

آج ہیں ناشاد بلبل اور ہوا نوحہ کناں
کہ چمن کا پھول اک شہکار رخصت ہوگیا

قسیم الحق گیاوی
مدرسہ تعلیم القرآن۔ رانی گنج۔ ضلع گیا۔ بہار

سہیل عظیم آبادی

★ یادیں ★ ملاقاتیں ★ باتیں

افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی
گیا سے خاص تعلق رکھنے والے سہیل صاحب
بہار اردو اکادمی کے سکریٹری سہیل صاحب
انجمن ترقی اردو کے رہنما سہیل صاحب
روز مل بیٹھنے والے سہیل صاحب
ہم سب سے بچھڑ کر دور چلے جانے والے سہیل صاحب

یہ ہے ایک سلسلہ وار ارتباط جو مجھ کو سہیل صاحب سے رہا۔

طالب علمی کے زمانے میں جب رسائل پڑھنے کا شوق پیدا ہوا اور پھر یہ شوق دس گیارہ برس کی عمر سے ہی جنون کی حد تک پہنچ گیا تو میں سہیل صاحب سے نہ صرف واقف ہوا بلکہ ان کی عزت اور قدر بھی کرنے لگا۔ اس وقت کے معیاری رسائل میں سہیل عظیم آبادی کے افسانوں کی اشاعت کثرت سے ہوتی تھی۔ بچپن میں رسائل کے اندر میری سب سے پسندیدہ چیز افسانہ ہی تھی۔ میں سب سے پہلے افسانے ہی پڑھا کرتا تھا اور ان افسانوں میں سہیل عظیم آبادی کے افسانے مجھے پسند بھی آتے تھے اور متاثر بھی کرتے تھے۔ سہیل صاحب کے افسانوں کی زبان سلیس اور انداز بیان غیر پیچیدہ اور نہایت صاف ستھرا تھا۔ میں سہیل صاحب کے افسانے پڑھ پڑھ کر ان کی یادیں اپنے دل میں بسائے رہتا تھا۔

پھر میں جب کچھ بڑا ہوا۔ ۱۶ سے ۲۰ اور ۲۰ سے ۲۵ برس کی منزل پر پہنچا تو میں نے سہیل صاحب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط بھی دیکھے اور ان کو بھی دیکھا، مگر دور ہی دور سے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سہیل صاحب کو گیا سے خاص تعلق تھا۔ سہیل صاحب کی رشتہ داریاں بھی گیا میں ہیں۔ نواب احمد سعید قادری اور سید مظفر نواب ان کے قریبی رشتہ داروں میں ہیں۔ مگر میں نے دیکھا کہ اپنے رشتہ داروں سے زیادہ سہیل صاحب گیا کے ان لوگوں کے قدرداں، دوست اور قریبی ساتھی بنے رہتے تھے جو کسی نہ کسی حیثیت سے اردو کے خادم یا اردو کے فنکار تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ گیا کے مشہور و معتبر شاعر حضرت سہیل سہسرامی کی بڑی عزت کرتے تھے اور جب گیا آتے تھے تو ان سے بڑے ادب کے ساتھ ملتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ماہنامہ "سہیل" گیا کے ایڈیٹر ادریس سہسرامی کو اپنے چھوٹے بھائی سے کم نہیں مانتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ہفتہ وار "مورچہ" اور ماہنامہ "آہنگ" کے ایڈیٹر اور مشہور افسانہ نگار جناب کلام حیدری کے وہ عاشق تھے۔ گیا آتے تھے تو کلام حیدری کے یہاں ہی ٹھہرتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے قدرداں و مداح تھے اور یہ اردو کا رشتہ ایسا رشتہ تھا جو ان کے خونی رشتوں سے بھی زیادہ مستحکم ہو چکا تھا۔ چونکہ اردو کے رشتہ کو سہیل صاحب مستحکم رشتہ سمجھتے تھے اسی لئے سہیل صاحب مجھے بھی عزیز رکھتے تھے۔ اور مجھ سے بھی محبت و خلوص کے ساتھ ملتے تھے اور اسی خلوص کا نتیجہ تھا کہ جب میں نے ۱۹۷۶ء میں گیا کے جواہر ٹاؤن ہال کے اندر اردو کانفرنس منعقد کی تو سہیل عظیم آبادی اس

عظیم الشان اردو کانفرنس کے چیف گیسٹ تھے۔ اس کانفرنس میں جہاں سید نصیر عبدالمغنی، جناب غلام سرور، مولانا بے تاب صدیقی، پروفیسر ابوذر عثمانی جیسے اردو کے خدام شریک تھے وہیں اس کانفرنس کے مشاعرہ میں مدہوش ناروی، مضطر لکھنوی، حفیظ بنارسی جیسے نامور شعراء بھی شریک تھے اور ان سب کے درمیان سہیل صاحب کی ہی ایسی شخصیت تھی جو مجھے اس کانفرنس کے [illegible] chief کے لئے مناسب و موزوں نظر آئی تھی — اور یہ ارتباط ایک طرفہ بھی نہیں تھا اس لئے کہ ۱۹۸۲ء میں جب اویس سنبھلوی نے "سہیل و کے تسنیم الحق گیاوی نمبر" کا اعلان کیا اور اس سلسلے میں ایک خط انھوں نے سہیل صاحب کو بھی لکھا تو سہیل صاحب نے فوراً جواب دیا اور اس نمبر کی تائید کرتے ہوئے اویس صاحب کو بھی لکھا کہ "تسنیم مجھے بھی پسند ہیں"۔ سہیل صاحب کی عزیز نوازی تھی۔

پھر سہیل صاحب بہار اردو اکادمی کے سکریٹری کی حیثیت سے میرے سامنے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہار اردو اکادمی کے سکریٹری کے عہدہ پر نہ ان سے پہلے کوئی مناسب آدمی تھا نہ ان کے بعد کوئی مناسب شخص آیا۔ سہیل عظیم آبادی اس عہدہ کے لئے مناسب و موزوں تھے محض اس لئے کہ وہ اردو اور اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی صحیح قدر کرنا جانتے تھے۔ اردو کے ادیب و شاعر ان کے زمانے میں جب اکادمی کے دفتر میں داخل ہوتے تھے تو کم از کم یہ اطمینان رہتا تھا کہ اردو کے ایک عظیم فنکار سے ضرور ملاقات ہو جائے گی۔ سہیل صاحب ڈیوٹی کے بہت پابند تھے۔ وہ دن بھر اکادمی کے دفتر میں موجود رہتے تھے اور ہر آنے جانے والے سے اس اخلاق سے ملتے تھے کہ جو لوگ اردو اکادمی کی عنایات سے محروم رہ جاتے تھے انھیں بھی احساس محرومی سے چھٹکارا مل جاتا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ سہیل صاحب خوش اخلاقی سے ملتے تھے بلکہ ہر آنے جانے والے اردو کے فنکار کو وہ اپنے پیسوں سے چائے بھی پیش کرتے تھے۔ یہ ایک عجیب ادا سہیل صاحب کی تھی کہ سکریٹری بہار اردو اکادمی ہوتے ہوئے بھی وہ اردو کے فنکاروں کو اپنے خریدے ہوئے ان لینڈ لیٹرس پر خطوط لکھتے رہتے تھے اور آنے جانے والے اردو کے لوگوں کو اپنے پیسے کی چائے پلاتے رہتے تھے۔

کوتاہیاں اور خامیاں کس میں نہیں ہوتیں۔ پھر انتظامی عہدوں پر جو لوگ فائز رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہر درخواست دہندہ کی درخواست پر "منظور" لکھ دینا ناممکن ہوتا ہے۔ ہر با اختیار آدمی کو "ہاں" کے ساتھ "نا" بھی کہنا ہی پڑتا ہے۔ اس لئے سکریٹری شپ کے زمانے میں لوگوں کو سہیل عظیم آبادی سے کچھ شکایتیں بھی پیدا ہوئیں۔ خود میں بھی کچھ دنوں تک ان سے شاکی رہا ہوں مگر بحیثیت مجموعی وہ نہایت کامیاب سکریٹری تھے۔ ان کے زمانے میں بہار اردو اکادمی نے بہت کام کیا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سکریٹری ہوتے ہوئے بھی سہیل صاحب اکادمی کے مخلص ممبروں کی بات اپنی مرضی کے خلاف بھی مان لیتے تھے۔ سہیل صاحب کی رائے ہے کہ یہ کام نہیں ہونا چاہئے مگر جب اکادمی کے کسی مخلص ممبر کا بہت زور ہوا کہ یہ کام ہونا ہی چاہئے تو سہیل صاحب ہتھیار ڈال دیتے تھے۔ وہ اختلاف رائے کے موقع پر وقار کا سوال کھڑا نہیں کرتے تھے۔ یہ بڑی خوبی کی بات تھی۔ ورنہ سہیل صاحب کی شخصیت ایسی تھی کہ وہ اگر سکریٹری کے اختیارات کو پورے طور پر کام میں لاتے تو ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام ہونا مشکل تھا۔

یہ بات سچ ہے کہ سہیل صاحب بہت زیادہ فعال آدمی نہیں تھے گپ شپ کرنا، چائے پینا پلانا، باتیں کرنا اور بہت باتیں کرنا، خط لکھنا اور بہت خطوط لکھنا اتنے سارے مشغلے پہلے سے ان کے پاس تھے تو وہ ہمہ وقت سکریٹری کی حیثیت سے کیسے سوچ سکتے تھے۔ کاموں میں تاخیر ضرور ہوتی تھی مگر ان کے زمانے میں اکادمی کے پیسوں کا غلط مصرف بہت کم لیا گیا۔ سہیل صاحب کی قدر ہم لوگوں کے دلوں میں اس وقت اور بڑھ گئی جب سہیل صاحب کے بعد ایک شاہ صاحب سکریٹری بنا دئے گئے۔ شاہ صاحب تو شاہ صاحب ہی ٹھہرے سہیل عظیم آبادی سے ان کا کیا مقابلہ۔ مگر شاہ صاحب کی آمد سے اتنا ضرور ہوا کہ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو سہیل عظیم آبادی کا دور نظامت سنہرا نظر آنے لگا۔ یہ ایک احسان شاہ صاحب کا

مرحوم سہیل عظیم آبادی یہ ہے اور جب کہ سہیل صاحب نہیں رہے ہم سب کو شاہ صاحب کا احسان مند ہونا چاہیے کہ انھوں نے سہیل عظیم آبادی کے ادبی خدمات کو تابناک [illegible]

[illegible] تو اردو کے ایک شاعر کی حیثیت سے انجمن ترقی اردو سے [illegible] ابتدائی ایام ہی سے ہے مگر پچھلے چند برسوں میں انجمن کو میں نے اپنا بہت زیادہ وقت دیا۔ میری ہی کوششوں سے گیا کے اندر انجمن کی اردو [illegible] اردو کانفرنسیں ہوئیں۔ برسوں میں گیا ضلع انجمن کا جنرل سکریٹری رہا۔ پھر جناب غلام سرور نے مجھے پٹنہ ڈویژن کا ڈویژنل آرگنائزر بنایا۔ اس کے بعد [illegible] میں پروفیسر عبدالمغنی کے دور صدارت میں میں انجمن ترقی اردو بہار کا سکریٹری منتخب کیا گیا۔ بہرحال جب میں انجمن ترقی اردو کے عہدہ داروں کی صف میں شامل ہوا تو سہیل عظیم آبادی کی عزت انجمن کے ایک سرپرست رہنما کی حیثیت سے کرتا رہا۔ سہیل عظیم آبادی بابائے اردو عبدالحق صاحب مرحوم کے ساتھ کام کر چکے تھے انھیں کے [illegible] پندرہ برسوں رانچی کے جنگلوں میں اردو کی ترویج و اشاعت کا کام کرتے رہے۔ موجودہ مرکزی انجمن ترقی اردو کے بھی سہیل صاحب معزز ممبر تھے اور انجمن ترقی اردو بہار کے استحکام میں بھی ان کے مشورے شریک رہا کرتے تھے۔ سہیل صاحب کا یہ ایک فطری ذوق تھا اسی لئے ہزاروں اختلافات کے باوجود بھی وہ انجمن کے لوگوں سے جڑے رہتے تھے۔ انجمن کی بھلائی، ترویج اور استحکام ان کا مطمح نظر تھا۔

پھر وہ دور بھی آیا جب میں نے انجمن ترقی اردو کے آفس کی ذمہ داریاں سنبھال لیں اور مستقل طور پر پٹنہ میں رہنے لگا حسن اتفاق کہ انجمن کا دفتر گویا سہیل صاحب کے محلہ میں ہی قائم ہوا۔ سہیل صاحب سلطان گنج میں رہتے تھے اور انجمن کا دفتر پتھر کی مسجد میں تھا دونوں محلوں میں چند قدموں کا فاصلہ ہے اس لئے پٹنہ میں قیام کے دوران سہیل صاحب سے میرے روابط بہت بڑھ گئے کبھی میں ان کے گھر چلا جاتا تھا کبھی وہ میرے دفتر چلے آتے تھے کبھی آرٹ پریس میں ہم دونوں جمع ہو جاتے تھے۔ آرٹ پریس کے مالک جناب سید انیس الرحمٰن صاحب سہیل صاحب کے حقیقی بھانجے ہیں انیس الرحمٰن صاحب کے اندر کچھ ایسی محبت بھری کشش ہے کہ میں روزانہ رات گئے تک آرٹ پریس میں بیٹھنے لگا۔ سہیل صاحب بھی اکثر و بیشتر آتے ہی تھے اس طرح ملاقاتوں اور باتوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا

اکثر ایسا بھی ہوا کہ سہیل صاحب آرٹ پریس پہنچے اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے مخصوص لہجے میں کہا ”قسیم چلو“ میں بھی کچھ نہیں پوچھتا تھا کہ کہاں چلوں۔ ہم دونوں وہاں سے اٹھ کر پٹنہ کی سڑکوں اور گلیوں میں گھومنے لگتے تھے باتیں ہوتی رہتی تھیں، بڑی بے تکلفی کے ساتھ، بڑی ہی پیاری باتیں، ادب کی، سیاست کی، اسلام کی، انجمن کی، اِس کی، اُس کی ـــ کبھی گھوم رہے ہیں، کبھی کسی کے گھر جا کر مل رہے ہیں۔ کبھی کسی کے یہاں جا کر چائے پی رہے ہیں۔ سہیل صاحب ان دنوں ہوٹل کی چائے بالکل نہیں پیتے تھے ہاں پان بازار کا کھا لیتے تھے۔ کبھی کبھی سگریٹ بھی پی لیتے تھے ورنہ زیادہ تر حقہ پیتے تھے وہ بھی گھر جا کر اطمینان سے (یہاں اکادمی کی سکریٹری شپ کے زمانے میں چونکہ وہ دن بھر اکادمی کے دفتر ہی میں رہتے تھے اس لئے ان کا حقہ بہار اردو اکادمی کے دفتر میں بھی ”ہو۔ حق“ کرتا رہتا تھا)۔

پھر میں نے پٹنہ چھوڑ دیا۔ سہیل صاحب بھی چھوٹ گئے۔ گیا کے ایک معمولی سے قصبہ رانی گنج میں میرا قیام ہے۔ مگر پھر بھی سہیل صاحب کی خیریت کبھی انیس الرحمٰن صاحب کے خطوط سے کبھی کسی اور ذریعے سے معلوم تو ہو ہی جاتی تھی۔ پٹنہ جانے پر ملاقات بھی ہوتی تھی۔ مگر میں یہ کیا سن رہا ہوں کہ سہیل صاحب بھی چلے گئے! ـــ کیا کیا جائے موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کے آگے ساری حقیقتیں دھری رہ جاتی ہیں۔ موت ایک نہ ایک دن آنی ہی تھی۔ سہیل صاحب بھی اس سے نہ بچ سکے۔ کیسے بچتے۔ وہ سب سے باتیں کرتے تھے۔ کیا موت سے باتیں نہ کرتے۔ کسی سے منہ موڑ لینا سہیل صاحب کا کام نہیں تھا موت آئی ہوگی تو سہیل صاحب نے بے تکلفی سے کہا ہوگا کہ آؤ آؤ تم سے بھی باتیں کر لوں مگر یہ تو بہت برا ہوا کہ اب وہ قیامت تک موت ہی سے باتیں کرتے رہیں گے۔ ہم لوگوں سے باتیں کرنا بند کر دیا ہے انھوں نے ـــ ∎∎

سہیل عظیم آبادی

شجر سایہ دار

عزیز اندوری (نئی دہلی)

سہیل صاحب کو مرحوم لکھتے وقت جانے کیوں میرا قلم بار بار رک رہا ہے۔ اور دل کو یقین نہیں آتا کہ سہیل صاحب جیسے شخص مر بھی سکتے ہیں۔

سہیل صاحب کبھی نہیں مر سکتے۔ اس لئے کہ بظاہر ان کی موت کا اعلان کر دیا جائے لیکن وہ ان ذہنوں میں آج تک زندہ ہیں اور کل بھی زندہ رہیں گے جو خلوص، محبت، ہمدردی اور شفقت کے پرستار ہیں۔ اس لئے بھی کہ سہیل صاحب ہی کی وجہ سے بیشمار ذہنوں نے خلوص، محبت، ہمدردی اور شفقت کے مفہوم کو سمجھا اور اسے تازہ و بالیدہ بنائے رکھا۔

مجھے آج تک ایسا ایک شخص بھی نہیں ملا اور نہ میں نے کبھی کوئی ایسا واقعہ ہی سنا جس سے محسوس ہو سکے کہ سہیل صاحب کی ذات سے کسی بھی قسم کی شکایت رہی ہو۔ اس لئے کہ سہیل صاحب نے "اردو تحریک" کو ساری عمر اپنی سانسوں کا حساب دیا۔ اردو کے بہت سے ہنگامے دیکھے بلکہ ان ہنگاموں میں عملی طور پر حصہ بھی لیا۔ اور یہ حصہ ایسا بھی نہیں کہ انھیں محض ایک "تماشائی" کی طرح سمجھ کر ان کی ذات پر سرسری سی گفتگو کر لی جائے بلکہ ان کے اسی عملی حصہ نے نہ صرف "اردو تحریک" کو جاندار ہی بنایا بلکہ سہیل صاحب کی شخصیت کو ایسا طوفان بھی بنا دیا جس کے دھارے چاروں اور بہہ نکلے لیکن ان دھاروں نے کبھی کسی کو ڈبویا نہیں بلکہ ڈوبنے والوں کا سہارا بن کر انہیں کنارے تک پہنچانے کا فرض ادا کرتے رہے۔

سہیل صاحب مختلف "زمانے" دیکھے ہوئے شخص تھے۔ انھوں نے ترقی پسندی کے عروج کا زمانہ بھی دیکھا اور ترقی پسندوں کے ولولے اور جوش پر لبیک بھی کہا نیز اس تحریک کے زیر اثر تخلیق کئے گئے ادب کو "نجات" کا وسیلہ بھی سمجھا۔ اور ترقی پسندوں کی سرد مہری کا وہ زمانہ بھی انھوں نے دیکھا جب اس تحریک کی مخالفت رنگ لا کر رہی اور بہت سے ایسے قلمکار جو اس تحریک سے منفعت حاصل کر چکے تھے جب اپنے قلم کی تیزی سے گریز کرنے اور "گوشہ عافیت" تلاش کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس وقت بھی سہیل صاحب کا قلم تھکا نہیں۔ ہر چند بعض نے "اردو جوان ذہن" "بوڑھے قلم" کی "تھکن" کا مذاق اڑا رہے تھے اور شدت کے ساتھ ایک ایسے رویے کا اظہار کر رہے تھے جس سے "ٹکراؤ" کی انتہا پسند صورتیں ابھر کر سامنے آئی رہیں۔ مگر سہیل صاحب کا "بوڑھا قلم" کبھی نہ تو تھکا

اور نہ انھوں نے "ٹکراؤ" کی حساسیت سے اپنی پرچھائیں بلکہ وہ اس ادبی خلفشار میں پہلے سے زیادہ اعتدال اور اعتماد کے ساتھ اپنے قلم کی "حفاظت" کے لئے میدان میں ڈٹے رہے ۔ ادبی "ٹکراؤ" کی جو صورتیں ادبی مصلحتوں کے تحت پیدا کی گئی تھیں وہ رفتہ رفتہ ہوا کے جھونکے سے زیادہ کچھ اور ثابت نہ ہو سکیں اور اسی لئے سہیل صاحب کا قلم ۔ جو وقت کے انصاف کا منتظر تھا ۔ ہوا کے ان جھونکوں کے سامنے جھکا نہیں بلکہ اس نے ان کی ذات کو ایسا شجرِ سایہ دار بنا دیا جس کی ایک شاخ بھی اس سے جدا نہ ہو سکی ۔

ادبی مصلحت پسندوں نے سہیل صاحب کو پست کرنے کے لئے جو دشواریاں اور "ٹکراؤ" کی جو صورتیں پیدا کیں وہ اپنی جگہ واقعی سخت تھیں لیکن ان سے کہیں زیادہ سخت وہ حالات تھے جو انھیں ذاتی اور نجی طور پر پریشانیوں کے عذاب میں مبتلا کرنے پر آمادہ تھے ۔ لیکن ہنستے ہنساتے ، ماتھے پر شکن لائے بغیر سہیل صاحب نے اس عذاب کے زہر کو پی کر جس طرح زندہ رہنے کے ثبوت دیئے اس سے بھی ان کی ذات ایک تناور درخت کی طرح بن گئی جسے زمانے کے شدید طوفان بھی اپنی جگہ سے نہ اکھاڑ سکے ۔

سہیل صاحب کی یہ جرات مندی ۔ یہ بلند ہمتی اور اولوالعزمی کا یہ جذبہ ۔ جہاں خود ان کی ذات اور ان کے ارادوں کو مستحکم بناتا رہا ہے، وہ ایسے ان لوگوں کے لئے مشعلِ راہ بھی بنا جو کارگہِ حیات میں دور تک پھیلے ہوئے اندھیروں سے نبرد آزما ہو کر مایوس ہو جاتے ہیں ۔ سہیل صاحب ایسے ان لوگوں کو حوصلہ دلانے کے جو "حیلے" تلاش کرتے تھے اس سے ان کی عظمت اور فراخ دلی بھی ثابت ہوتی ہے ۔ بھلا بتایئے ۔۔ جس کا دل زخموں سے چور ہو وہ دوسروں کے زخموں کو مندمل کرنے کی جرات کر سکتا ہے ! لیکن سہیل صاحب نے اس جرات مندی کی ایک دو نہیں بے شمار مثالیں قائم کیں ۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ بات ایک سچائی کی طرح ان کی ذات سے تا دمِ آخر جدا نہ ہو سکی کہ ان مثالوں کو قائم کرتے وقت وہ کبھی کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوئے ۔ انھوں نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا ۔ چاہے حالات کتنے ہی سخت رہے ہوں .... وہ کبھی کسی کی خبر گیری سے غافل نہیں رہے ۔ ادبی مصلحت یا ادبی جوڑ توڑ کے تحت انھوں نے کبھی کسی سے رشتہ باندھنے کی کوشش نہیں کی ۔ اس لحاظ سے وہ بہت سے ادب نوازوں سے بہت بلند تھے جو "احباب" کی خبر گیری کو بھی "نظریاتی اور ادبی" میزانوں پر تولتے ہیں اور "خورشیدی رویئے" کے پیش نظر تعلقات استوار کرتے ہیں ۔ سہیل صاحب نے تعلقات کو استوار کرنے میں اس قسم کا کوئی ثبوت نہیں دیا جس سے معلوم ہو کہ وہ کسی خاص مصلحت کی وجہ سے کسی کو "اپنا" کہنے (سمجھنے نہیں) پر مجبور ہیں ۔۔ وہ رشتے باندھنے میں کبھی بھی "چھوٹے یا بڑے ادیب" کی تخصیص کو پیش نظر نہیں رکھتے تھے ۔ بلکہ انھوں نے اس سلسلے میں ہمیشہ ایسی مثالیں قائم کیں جو ان کے ہم پلہ ہونے والے بہت سے "بڑے ادیبوں" کے ہاں دور دور تک نہیں ملتیں ۔ وہ صداقت پسندی اور حق گوئی کے دامن کو کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے ۔ اسی لئے وہ ایسے لوگوں کی طرف سے بھی کبھی نگاہیں نہیں پھیرتے تھے جنھیں حالات نے گوشۂ گمنامی میں پہنچا دیا ہے ۔

سب جانتے ہیں مرحوم سلام مچھلی شہری نے اپنے عہد میں بہت سے ایسے توانا اور جرات مندانہ ہئیتی تجربے کئے جن کے باعث اردو شاعری کو نئی سمتوں سے آشنا کرنے کی راہیں ہموار ہوئیں ۔ اور اس بات کا علم بھی سب کو ہے کہ سلام کے انتقال کے فوراً بعد (اور بڑی حد تک ان کی زندگی میں بھی) ان کی اس ذہنی توانائی اور عملی جرات مندی کو ادبی مصلحت کا بری طرح شکار کر دیا گیا ۔ یہاں تک کہ [illegible]

جنھیں بدلتے ہوئے حالات نے ادب کی باگ ڈور سنبھالنے کی قوت بخش دی تھی۔ ان کے ذہن سے سلام کا نام اس طرح ٹوٹ کر گر گیا جیسے کسی شاخ سے کوئی ہرا بھرا پتہ ٹوٹ کر گر جائے۔

ان کے تم سلام کے حلقے میں اس طرح [illegible] خاموش ہو گئے جیسے ایک [illegible] کی طغیانی اور جوش اچانک ہی ختم ہو جائے۔ ایسے میں جن چند حق پسند ادیبوں نے سلام کو دستانی سے جڑا ہوا اپنا سمجھ کر اس کی یاد کو اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھا سہیل صاحب ان میں شامل تھے۔ اس سلسلے میں وہ اکثر میری حوصلہ افزائی کرتے۔ سلام کے متعلقین کی خبر گیری سے بھی غافل نہیں رہتے۔ اپنے خطوط میں سلام کی بیوی اور [illegible] بچوں کے بارے میں برابر دریافت کرتے۔ اور مجھے برابر اس بات پر اکساتے رہتے کہ میں اس سلسلے میں ذرا بھی مایوس نہ ہو کر سلام کی "شعری قوتوں" اور ان کی "جرأت مندی" پر برابر لکھتا ہوں۔

سہیل صاحب کی ادبی حیثیت کا تعین ہو چکا ہے اس سلسلے میں اور بھی بہت کچھ لکھا جائے گا۔ لیکن وہ ایک شخص۔ ایک انسان کی شکل میں جس قدر عظیم تھے اس کا اظہار ضروری ہے۔

اس لیے بھی کہ مجھے ان کی ذات ہمیشہ ایک ایسے شجر سایہ دار کی صورت میں نظر آئی جس کے سایے میں رہِ حیات پر گامزن تشنہ لب تھکے ہارے مسافر سکون کی سانس لیتے رہے۔

عمر کی اس منزل پر پہنچنے اور زمانے کی گرم و سرد (گرم زیادہ سرد کم) ہواؤں کو جھیلنے کے بعد بھی وہ تازہ دم نظر آتے تھے۔ اور بظاہر ایسا محسوس نہیں ہوا کہ دوسروں کے ذہنوں کو تمازت اور تازگی بخشنے والا ان کا چہرہ اچانک ہی اس طرح مرجھا جائے گا۔

مگر اس سچائی کو بھی کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ سہیل صاحب نے کارزارِ حیات میں جس تیز رفتاری سے "جہد" کیا اور جس طرح انھوں نے اپنے وجود کو ارد گرد کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنے کے لیے وقف کر دیا اس نے ان کے جسم کی کمان کو اتنی زور سے کھینچا کہ وہ آخر ایک جھٹکے کے ساتھ ٹوٹ گئی اور راہِ حیات [illegible] ہم جیسے تشنہ لب، تھکے ہارے مسافر چیخ چیخ کر کہنے لگے،

ع

ہزار بار شجر سایہ دار راہ میں تھا۔

بقیہ: سہیل عظیم آبادی

— یادیں — ملاقاتیں نہیں — باتیں

صدمہ ہے تو یہی کہ اب وہ ہم لوگوں سے باتیں نہ کر سکیں گے۔ موت بڑی حاسد ہے۔ اس سے جو بھی بات کر لیتا ہے وہ اسے اپنا اور صرف اپنا بنا لیتی ہے۔ پھر کسی سے باتیں کرنے نہیں دیتی۔ سہیل صاحب پر بھی اس حاسد کا قبضہ ہو چکا ہے۔ آیئے ہم سب ان کے افسانے پڑھیں۔ ان کے کارناموں کو زندہ رکھیں۔ ان کی غیر مطبوعہ تخلیقات کی اشاعت کا انتظام کریں۔ ان کے پسماندگان کے دکھ سکھ میں شریک رہیں اور ان کے لئے دعا کریں کہ اے اللہ! تیری قدرت سے کیا بعید [illegible] صاحب کو بھی بخش دے۔ آمین۔

بقیہ: سہیل صاحب اور اُن کا آخری خط

امرت رائے کے ساتھ پٹنہ اور پھر بہار شریف آنے کا ارادہ بھی لیکن الہ آباد ہی میں سہیل صاحب کے سفر کی آخری منزل ثابت ہوئی جہاں سے فانی دنیا کا سفر اختیار کیا۔ امرت رائے نے وفاداری کا حق ادا کیا۔ الہ آباد پہنچ کر ہی سہیل صاحب کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور قلب کا دورہ پڑا۔ امرت رائے کے یہاں مقیم تھے۔ اس کے بعد ہسپتال منتقل کیے گئے۔ لیکن روح نے جسم سے ناطہ توڑ دیا۔ خدا غریقِ رحمت کرے۔ بڑے پابند وضع تھے۔ گاندھیین تھے۔ سیکولرزم پر اعتماد رکھتا — ان کی موت اس کا ثبوت ہے۔

عبدالقیوم ابدالی، رانچی

میرے پیکرِ تصوّر میں وہ حیات تازہ ساری

۳۰ر نومبر کی منحوس شام کو اچانک صدیق مجیبی صاحب نے یہ خبر دی کہ سہیل عظیم آبادی کا انتقال ہوگیا۔ میں تو تھوڑی دیر کے لئے بالکل خالی الذہن ہوگیا۔ یہ نہیں ہے کہ موت کوئی غیر متوقع چیز تھی یا میں یہ بھی نہیں تھا کہ سہیل صاحب انتقال کر ہی نہیں سکتے تھے۔ موت تو آنی ہی تھی لیکن اتنی جلدی وہ ہم سب کو تنہا چھوڑ جائیں گے اس کی کب امید تھی ؟ ۔۔ ابھی تو بہت سارے کام باقی تھے۔ بہت سی ذمہ داریاں ان کے سر تھیں۔ ابھی اتنی جلدی بھی کیا تھی ؟ مجھے تو آج بھی ایسا لگتا ہے کہ وہ ابھی کسی طرف سے ہنستے ہوئے نکل آئیں گے۔ کمزور جسم لیکن ایک ٹھوس عزم اور پختہ ارادہ کے مالک وہ دبلی پتلی شخصیت ابھی کسی گلی سے نکل کر مجھے گلے سے لگا لے گی۔ ان کی موت کے بعد جب میں اُن کے گھر گیا تو میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا کہ کہیں برابر کی طرح وہ جاندار مسکراہٹ اور دار اخاہ کے ساتھ مجھ سے لپٹ نہ جائیں۔۔ لیکن ۔۔۔

وہ ہنستے ہوئے دن۔ ان کے ساتھ گذاری ہوئی وہ قیمتی گھڑیاں ان کے پیار بھرے سینکڑوں خط اور اُن کی پیار بھری باتیں۔ یہ سب تو آج بھی میرے ذہن و دل پر یورش کر رہی ہیں۔ مجھے مجبور کر رہی ہیں کہ میں اپنے عظیم محسن اور ہمدرد کے بارے میں کچھ لکھوں۔ اور اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ تین چار سال کے اس طویل یا مختصر عرصے میں مجھے تو اتنی بھی فرصت نہ ملی کہ میں کبھی اُن سے ان کے بارے میں کچھ پوچھتا۔ آج میں سوچتا ہوں، کیا میں واقعی اتنا خود غرض تھا کہ میں نے اُن کی زندگی کے بارے میں، اُن کے غموں کے بارے میں، ان کی دنیا کے بارے میں کبھی کچھ نہیں پوچھا ؟ شاید پورے کا پورا قصوروار میں نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اپنے بارے میں پوچھنے کا موقع ہی کب دیتے تھے ؟ انہیں تو رانچی کے ذرے ذرے کی فکر تھی اور ہر چھوٹے سے چھوٹے جاندار سے محبت تھی۔ اتنے سارے لوگوں کی خیریت، پھر اپنے مسائل اور انجمن ترقی پسند مصنفین یا انجمن ترقی اردو کے مسائل، یا پھر رانچی کی ادبی دنیا اور رانچی یونیورسیٹی کے مسائل، آخر میں بھی کتنا لمبا خط لکھتا۔ چنڈی گڑھ انجمن ترقی اردو کی کانفرنس میں جانے سے دو دن قبل انہوں نے مجھے خط لکھا۔ اپنے بارے میں اگر کچھ لکھا تو یہ کہ وہ کل چنڈی گڑھ روانہ ہو جائیں گے، واپسی پر دہلی، علی گڑھ اور الہ آباد بھی جائیں گے۔ پریم چند صدی تقاریب کے سلسلے میں امرت رائے سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ میرے پرچے کے لئے لوگوں سے کچھ چیزیں لیتے آئیں گے۔ اس کے علاوہ دو جملے اور تھے۔ رانچی میں انجمن ترقی پسند مصنفین بہت اچھا کام کر رہی ہے۔ حالات معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ میں بہت خوش ہوں۔ ممبر سازی کا کام ضرور ہونا چاہئے۔ اب آپ بتایئے کہ اس خط میں انھوں نے اپنے بارے میں کیا لکھا

مجھے جہاں تک یاد ہے میں نے انہیں پہلی بار ۱۹۷۵ء کے اواخر میں انجمن ترقی اردو بہار کی انتخابی نشست میں دیکھا تھا۔ خدا بخش لائبریری کے پاس کسی کالج کے ہال میں انتخاب ہو رہا تھا۔ میں رانچی سے آیا ہوا تھا اور سربرآوردہ مندوبین میں بھی تھا اور وہ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے بلکہ چھائے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں میں ایک معمولی طالب علم تھا اور وہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے چوٹی کے افسانہ نگار، چنانچہ میں دور ہی سے انہیں دیکھتا رہا اور ان سے ملنے یا گفتگو کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ویسے یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اتنے بڑے فنکار کا جو ہیولیٰ میرے ذہن میں تھا سہیل صاحب اس میں کسی طرح فٹ بیٹھ ہی نہیں رہے تھے۔ میرے ذہن میں تو ایک لحیم شحیم اور خوش لباس آدمی کا تصور تھا۔ یہاں ایک دبلا پتلا اور کھدر دھاری شخص ہے کہیں سے بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اتنا بڑا افسانہ نگار ہے۔

خیر صاحب، تو یہ تھی میری ان سے پہلی ملاقات۔ اس کے بعد ان سے ایک عرصہ تک ملاقات تو نہ ہو سکی، البتہ خط و کتابت کی سبیل نکل آئی۔ ہوا یہ کہ میں نے ان پر ایک خاکہ لکھا اور اسے "زبان و ادب" کو بھیج دیا۔ یہ مجھے معلوم نہ تھا کہ "زبان وادب" کے ایڈیٹر بھی سہیل ہی صاحب تھے۔ مضمون سہیل صاحب نے مجھے واپس کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ایک بہت ہی خوبصورت خط لکھا۔ اس کے چند جملے یہاں نقل کرتا چلوں۔

" آپ کا مضمون ملا۔ مضمون دلچسپ ہے لیکن سرسری اور ہلکا تاثراتی مضمون ہے "زبان وادب" سہ ماہی رسالہ ہے اور تفصیلی مضمون شائع کرتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے یہ مضمون لکھا اور افسوس اس کا ہے کہ آپ پٹنہ آئے لیکن مجھ سے ملے نہیں۔ آپ سے مل کر مجھے یقیناً خوشی ہوتی۔ آپ نوجوان ہی ہمارے لئے مستقبل کی امیدیں ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ خوشی اس سے ہوتی ہے کہ ہونہار نوجوان کو ابھرتے ہوئے دیکھوں اور ادب کا کارواں آگے بڑھتا جائے۔۔۔"

(۲۲-۶-۷۷)

اسی سلسلے کے دوسرے خط میں انہوں نے لکھا۔

"بہت ممکن ہے ابھی تم جن لوگوں سے متاثر ہو، کل ان سے تم مایوس ہو جاؤ۔ اسلئے کبھی جلدی میں کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کرو۔ جب بار بار کی تحریروں سے تم کسی سے متاثر ہو سکو تو سمجھو کہ متاثر ہوتے ہو۔ وقتی تاثر کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ اس لئے ایک مشورہ دوں گا۔ فوراً کسی شخص کے بارے میں اچھی یا بری رائے ہرگز نہ قائم کرو۔" (۲۸-۶-۷۷)

اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ چل نکلا۔ انہوں نے بڑی مستعدی سے اور طویل طویل خطوط لکھے۔ ایک خط میں انہوں نے اپنے بارے میں لکھا۔

" اردو سنسار" کا قیام ضروری سا ہو گیا تھا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ باغ آئندہ نسل کے لئے لگایا جاتا ہے۔ یہی میں کر رہا ہوں۔ اپنے تجربے کی روشنی میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ پڑھے لکھے لوگوں کا ایک ادارہ بنایا جائے جس میں منافع خوری کی ذہنیت کام نہ کرتی ہو بلکہ صحیح معنوں میں اس کا مقصد لکھنے والوں کی مدد کرنا ہو۔ کم سے کم

ہندوستان میں پبلشروں کی حالت جونک کی سی ہے... یہ خیال تو میرے دماغ میں بہت دنوں سے تھا۔ لیکن حالات ایسے نہ تھے کہ میں خود کو ایک کام کے لئے وقف کر سکوں۔ ۱۹۴۶ء میں بہار میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ان سے زندگی کا ڈھانچہ ہی بدل گیا تھا اور خود کو باقی رکھنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ ریڈیو کی ملازمت بھی جو میرے ذہن میں کبھی نہ تھی۔ میں تو ایک مقصد کے لئے اپنی زندگی وقف کر کے رانچی گیا تھا۔ لیکن حالات نے رانچی چھوڑ کر سارے ملک کی خاک چھاننے پر مجبور کیا۔ جہاں جہاں قسمت نے میرے حصے کے دانے بکھیر دیئے تھے، وہاں وہاں چنتا پھرا۔ اب اللہ پاک کا احسان ہے۔ دونوں بچوں نے تعلیم ختم کر لی۔ دونوں برسر روزگار اور خوش ہیں۔"

[illegible] اکتوبر [illegible]

سہیل صاحب سے میری دوسری ملاقات دسمبر ۱۹۷۰ء میں ہوئی۔ رانچی میں کل ہند اردو اساتذہ کانفرنس ہو رہی تھی۔ ان کے بہت سارے دوست، قدرداں اور چاہنے والے آئے ہوئے تھے۔ اچانک ان سے میری ملاقات بین روڈ پر ہو گئی۔ ایک صاحب نے میرا تعارف کرایا اور وہ بے ساختہ مجھ سے لپٹ گئے۔ مجھ جیسے آدمی سے ان کا خلوص جس سے ادبی دنیا تو کیا رانچی کا ادبی حلقہ بھی واقف نہ تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ پھر مجھے لئے لئے اپنے تمام دوستوں سے ملے۔ تمام لوگوں سے میرا تعارف کرایا۔ مجھ سے ملوایا اور اس طرح ان کے ساتھ میں [illegible] تک رہا۔ بہت سی باتیں سننے اور جاننے کا موقع ملا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک شاخ رانچی میں قائم کرنے پر زور دیا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد بھی وہ بار بار خطوط میں لکھتے رہے۔ اپنے ایک خط میں انہوں نے لکھا تھا۔

" رانچی میں انجمن کی شاخ ضرور قائم کیجئے اس کی بڑی ضرورت ہے۔ ادب کے نام پر گمراہی پھیلائی جا رہی ہے۔ اچھا لٹریچر پڑھئے سمجھئے اور آپس میں اس پر بحث کیجئے اپنے ہم خیالوں اور ہم خیالوں سے باتیں کیجئے اور انہیں ایک مرکز پر اکٹھا کیجئے۔ شروع میں زیادہ لوگوں کی شرکت کی امید نہ رکھئے۔ زمانہ بدل چکا ہے۔ ادب میں بھی فیشن کی پیروی کی جاتی ہے۔ جدید ادب کے نام پر زیادہ ایسی تحریریں آ رہی ہیں جن کو ادب کے ساتھ صرف مذاق ہی کہا جا سکتا ہے۔"

سہیل صاحب ادب میں ترقی پسندی کے قائل تھے انہوں نے بیشتر پردیپ کو غالباً بیشتر پردیپ ہی تھے، یہاں تک کہہ دیا تھا کہ " وہ جو ترقی پسند نہیں ہے وہ ادب ہی نہیں ہے۔" وہ زندگی بھر ادب اور زندگی میں ترقی پسند نظریات کے فروغ کے لئے کوشاں رہے۔ لیکن تنگ نظری کی ان کے یہاں کوئی جگہ نہیں تھی۔ مجھے یاد ہے کرشن اختر صاحب کی کتاب پر (اردو افسانہ میں لیس بین ازم) میں نے ایک مضمون لکھا تھا۔ وہ مضمون "ہماری زبان" کو بھیجا تھا۔ وہ مضمون شائع نہ ہو سکا تو سہیل صاحب کے کہنے پر وہ مضمون میں نے انہیں روانہ کر دیا۔ سہیل صاحب میرے ہمدرد بھی تھے اور بزرگ بھی۔ انہوں نے غالباً یہ بہتر نہیں سمجھا کہ میں اپنی ادبی زندگی کا آغاز ہی ایسے مضمون سے کروں

چنانچہ انہوں نے اپنے ۲۹ر دسمبر ۷۸ء کے خط میں لکھا۔

" ڈاکٹر ستش۔ اختر کی کتاب میں نے پڑھی ہے۔ مجھے تو اس مضمون میں کوئی برائی نظر نہیں آئی۔ اس میں محنت کیا ہے۔ اس بیچارے نے اردو کے ان افسانوں کا جائزہ لیا ہے جن میں لسبین ازم کی تصویریں ہیں۔ ان افسانوں کا تجزیہ کیا ہے لسبین ازم ایک نفسیاتی کجروی ہے اور بہت سی عورتوں میں پائی جاتی ہے اکثر ان عورتوں میں جو کم عمری میں بیوہ ہو جاتی ہیں اور ان کا دوسرا بیاہ نہیں ہوتا یہ عورتیں بدنامی سے بچ کر اس طرح اپنی جنسی تسکین کا سامان مہیا کر لیتی ہیں۔ جب یہ علت موجود ہے تو افسانوں اور ناولوں میں اس کا ذکر بھی ضرور آئے گا اور جب افسانوں میں ذکر آئے گا تو مضامین میں بھی ذکر آئے گا ہی۔ ایک حقیقت کا ذکر فحاشی نہیں۔ بشرطیکہ لذت اٹھانے کے لئے نہ کیا جائے "

لیکن مجھے ان سے اتفاق نہ تھا کیونکہ اردو افسانوں میں اس ذکر سے بُعد ہی نہ تھا بلکہ مجھے یہ اختلاف تھا کہ ستش۔ اختر صاحب نے لسبین ازم کی جو وجہیں بیان کی ہیں وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہیں کیونکہ انہوں نے حقیقت کا غائر مطالعہ نہیں کیا ہے یا کم از کم ان کے سوچنے سمجھنے کا انداز ترقی پسندانہ نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ دوسرے لوگ مجھ سے اتفاق نہ کر سکیں لیکن میں آج بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔

سہیل صاحب سے آخری ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب میں پٹنہ آیا، مئی ۷۹ء میں شاید۔ وہ فرداً ہر شخص کے بارے میں پوچھتے رہے۔ میں خیریت بتاتا رہا۔ انجمن کی ایک سال کی کارگذاریوں سے وہ بہت خوش تھے۔ ہم نے رانچی سے ایک سہ ماہی پرچہ نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ انہوں نے پریم چند پر ایک مضمون لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔

(ان کا انتقال ادبی دنیا کے لئے کتنا بڑا سانحہ تھا یہ تو ادب والے جانیں۔ لیکن مجھے ایسا لگا کہ میں بالکل بے یار و مددگار ہو گیا ہوں، دنیا کے لق و دق صحرا میں تنہا کھڑا ہوں، اور دنیا کے ایک قطرے کی بھی امید نہیں۔

اہلِ علم و صاحبِ فن بھائی سہیل
ذی علم ادیب اہلِ سخن بھائی سہیل
سنسان ہوئی بزمِ ادب لے ناوک
بے شبہ نہ رہے محرزمن بھائی سہیل

۱۴۰ ھ

ناوک حمزہ پوری

سہیل عظیم آبادی
یادوں کے آئینے میں

شکیل شفیق

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشین دل
می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

اسد اردو کا افسانوی ادب اس مسلسل حادثات کا شکار ہے کہ ابھی الزماں مرحوم کی بے وقت موت کے غم میں ابھی آنکھیں خشک بھی نہ ہو پائی تھیں کہ موت کے ستم ظریف ہاتھوں نے سہیل عظیم آبادی جیسا کو ہم سے چھین لیا۔ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ سہیل صاحب جن حالات میں ہم سے رخصت ہوئے اس سے یہ بات تو بالکل ثابت ہو گئی کہ ان کی زندگی اردو کی خدمت کرتے ہوئے گذری۔ انھوں نے اپنا ادبی سفر جس مقام سے شروع کیا تھا وہیں آکر ختم بھی کیا اور اس طرح مرنے میں بھی اپنی وضعداری کو برقرار رکھا اور جو وراثت انھیں پریم چند سے ملی تھی اسے اس کے صحیح وارث کو سپرد کر دیا۔ گویا

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

سہیل صاحب نوجوانی میں ہی بابائے اردو مولوی عبد الحق کے قریب آئے اور ان کی رہنمائی میں ایک عرصے تک اردو کی خدمت کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ ریڈیو سے وابستہ ہوئے اور ایک مدت تک کشمیر، دلی اور پٹنہ میں نئی نسل کی تربیت کرتے رہے تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ اردو صحافت کو بھی انھوں نے

ایک عرصہ تک بہار میں اردو صحافت کی آبیاری کی اور کتنوں نے ان کے خرمن سے خوشہ چینی کی ہے۔ مرحوم سیاست سے بھی خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ سیاست میں خالص گاندھیائی نظریہ کے حامل تھے سوشلزم سیکولرزم اور جمہوریت کے علمبردار تھے۔ ساری زندگی صاف دھلا ہوا سفید کھدر پہنتے رہے۔ وضعداری کا یہ عالم تھا کہ نوجوانوں سے بھی دوستانہ سلوک رکھتے اور جس شخص سے ملتے نہایت ہی بے تکلفی اور سادگی سے پیش آتے۔ تقریباً ۱۹۔ ۲۰ سال سے سہیل صاحب مرحوم سے میرے تعلقات تھے اس طویل مدت میں کبھی بھی کسی سے ترش کلامی کرتے نہیں دیکھا۔ نرم گفتاری مرحوم کا شعار تھا بڑے ہی ملنسار تھے۔ ان سطور کے لکھتے وقت مرحوم کی ساری باتیں ایک ایک کرکے یاد آرہی ہیں سہیل صاحب کو پان کا بڑا شوق تھا اور اس کے لئے بڑا اہتمام کرتے خاص طور پر الگ سے جو چونا کھاتے وہ گلابی رنگ کا ہوتا تھا جیسے جنوبی ہند کے کسی شہر سے منگاتے تھے۔ چائے زیادہ پیتے تھے۔ یہاں تک کہ کوئی بھی بغیر دودھ کے استعمال کرتے سگریٹ خود بنا کر پائپ سے پیتے اور کبھی کبھی دو آتشہ جانے

کے لئے سگریٹ کے تمباکو میں تھوڑی سی وہسکی یا برانڈی ملاتے گویا تمباکو کو اس میں باستے تھے۔ ایسا عموماً جاڑے کے دنوں میں کرتے۔

جن دنوں سہیل صاحب پٹنہ ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ تھے۔ راقم الحروف کو اکثر اپنے پروگرام کے سلسلے میں ریڈیو اسٹیشن جانا پڑتا تھا۔ ٹیفن کے اوقات میں وہ چائے کی پیشکش کرتے اور ریڈیو اسٹیشن سے نکل کر پرنس ہوٹل آتے اور وہاں ایک مخصوص ٹیبل پر بیٹھتے۔ یہی ان کا معمول تھا۔

سہیل بھائی مرحوم کا حلقۂ احباب بڑا وسیع تھا۔ ان کے ملنے والوں میں ادیب و شاعر کے علاوہ کثرت سے سیاستداں، تاجر، طلبا، اور سماج کے دیگر افراد شامل تھے۔ غیر مسلموں سے بھی ان کے بہت ہی گہرے مراسم تھے۔ کبھی کبھی مرحوم کے ساتھ کسی غیر مسلم گھرانے میں جانے کا موقع ملتا تو بڑی حیرت ہوتی کہ افراد خانہ ان سے اپنوں جیسا سلوک کرتے۔ وہاں وہ کسی کے دادا کسی کے چچا اور کسی کے بھیا کہلاتے تھے۔ ان کے انتقال کے چند ہی دنوں بعد یعنی محرم مطابق یکم دسمبر ۱۹۷۹ء کو مجھے دلی جانے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت تک دلی میں سہیل صاحب کے انتقال کی خبر نہیں پہنچی تھی۔ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ۳ دسمبر کی صبح میں سنٹرل سکریٹریٹ کے بس اسٹاپ پر دلی یونیورسٹی کی بس میں سوار ہوا۔ ایک سیٹ پر سیاہ شیروانی اور چست پاجامے میں ایک صاحب پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ والی جگہ خالی تھی۔ چہرے بشرے سے ساغر نظامی کے چھوٹے بھائی لگے اور ان کے حلیہ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کوئی شاعر ہیں۔ میں نے وہ جگہ لے لی۔ جب بس چل پڑی تو میں نے پیش قدمی کی اور اپنا تعارف کراتے ہوئے ان سے گفتگو شروع کی۔ وہ گلزار دہلوی کے بڑے بھائی خار دہلوی تھے۔ بڑے تپاک سے ملے اور باتیں شروع ہو گئیں۔ اگلے وقتوں کی وضعداری کے وہ نمونہ تھے اور دلی مرحوم کے سچے جانشین لگے۔ تمام راستہ ادب کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہوتی رہی۔ ان کو اس بس سے مال روڈ تک سفر کرنا تھا۔ دوران گفتگو کئی مرتبہ میں نے سہیل صاحب کے انتقال کی خبر دینی چاہی مگر بات کا رخ کسی نہ کسی طرف مڑ جاتا۔ آخر میں خار دہلوی صاحب نے بہار میں اپنے ملنے والوں کے حالات دریافت کئے اور اس سلسلے میں سہیل صاحب سے سلام پہنچانے کے لئے فرمائش کی۔ میں نے کہا یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ وہ سکتے میں آگئے۔ میری حیرت دیکھ کر انھوں نے وجہ دریافت کی تو میں نے سہیل صاحب کے سانحۂ ارتحال کی خبر دی۔ انھیں میری باتوں پر یقین نہیں آیا بولے ابھی تو صرف چند دن ہوئے ہیں سہیل صاحب چنڈی گڈھ سے واپس پٹنہ لوٹے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں یقین دلایا۔ وہ رو پڑے اور بولے کہ

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

سہیل بھائی مرحوم کی شخصیت اتنی باغ و بہار اور اتنی متنوع تھی کہ اس مختصر صحبت میں اس کا بطور کلی احاطہ کرنا مشکل ہے تاہم میں نے ان کی زندگی کے خاص خاص پہلوؤں کی نشاندہی کر دی ہے تاکہ مزید تلاش و جستجو کرنے والوں کی صحیح سمتوں میں رہنمائی ہو سکے۔

جہاں تک سہیل عظیم آبادی صاحب کے فن کا تعلق ہے تو صرف یہ کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا کہ وہ پریم چند اسکول کی آخری کڑی تھے۔ ہمیں اس بات کا تعین کرنا ہوگا کہ اردو افسانے کو تکنیکی اعتبار سے سہیل صاحب نے کس حد تک برتا۔ فن کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کیا۔ اپنی کہانیوں کا مواد خام انھوں نے کس طرح حاصل کیا۔ اپنی تخلیقات میں سماج کے کس طبقے کی نمائندگی کرتے رہے۔ نظریاتی طور پر کس حد تک ترقی پسند تھے اپنے ناولوں اور افسانوں میں کس طرح کی زبان استعمال کی۔ یہ چند بنیادی سوالات ایسے ہیں کہ ان پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے جس کی گنجائش اس بحث میں نہیں۔ سہیل صاحب کے فن اور ان کی شخصیت پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور یہی ان کے لئے بہترین خراج عقیدت ہوگا۔

سہیل صاحب کی ذہنی وابستگی ان کی اکثر و بیشتر

تخلیقات سے ظاہر ہوتی ہے۔ سماج کے نچلے طبقے کے مسائل سرمایہ دار طبقہ کے ذریعہ ان کا استحصال کسانوں اور مزدوروں کی زبوں حالی، سماج کے اندر طبقاتی کشمکش اور دیہی زندگی میں بیداری کی حد تک احساس بیداری ان کی تخلیقات کے اہم موضوعات ہیں۔ مسائل کی تہ میں اتر کر ان کا فنی اور فکری تجزیہ کرنا سہیل صاحب کو خوب آتا تھا۔ اپنے کرداروں کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر وہ ان کے ذریعہ جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے تھے جس ماحول کا کردار پیش کرتے اس کی سچی ترجمانی کرتے، ان کے کردار روزمرہ کے چلتے پھرتے جیتے جاگتے کردار ہوتے تھے۔ مرحوم کو اپنے موضوعات پر بڑی سخت گرفت تھی۔ وہ اپنا موضوع عام زندگی سے تلاش کرتے۔ وہ جب بھی قلم اٹھاتے زندگی کی سچی اور جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے۔ انداز بیان اتنا دلکش اور اچھوتا ہوتا اور زبان اتنی سادہ اور پرکار استعمال کرتے کہ ان کی کہانیوں میں پریم چند کی کہانیوں کا لطف ملتا۔ مختصر یہ کہ سہیل صاحب کے اٹھ جانے سے نہ صرف ایک عظیم فنکار ہم سے چھین گیا بلکہ ایک بہترین انسان ہمارے درمیان نہیں رہا۔ پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

مرحوم جناب سہیل عظیم آبادی کی یادیں

صفی نصیرآبادی

عظمتوں کے تاجدار اے رفعتوں کے شہسوار
آپ آکاشِ ادب کے تھے "سہیل" نامدار

آپ تھے اس دور کے فی الواقعی جادو نگار
نوکِ خامہ نے بہائے تھے ادب کے آبشار

جوششِ فکر و عمل سرمایۂ ذوقِ سخن
آپ نے خدماتِ قومی میں کیا خود کو نثار

آپ کے افسانے دنیائے ادب میں مایہ ناز
آپ نے "صحرائے اردو" کو کیا باغ و بہار

باعثِ صد فخرِ ملت، قابلِ رشکِ چمن
حشر تک زندہ رہے گا آپ کا علمی وقار

تھے صحافی آپ ہند و پاک کے مانے ہوئے
آپ کے ممدوح بے حد، ان گنت اور بے شمار

آپ نے جو کچھ بھی لکھا آج بھی ہے سنگ میل
آپ کی ہر اک کہانی ہے ادب میں شاہکار

آپ نے "تہذیب و ساقی" کی صحافت بھی کیا
عمر بھر کرتے رہے ہر طور سے قومی سدھار

ابتدا سے تھی طبیعت مائلِ اردو ادب
اور آخر تک رہے اس فکر میں مصروف کار

خلد میں کیوں جا بسا ہی آپ نے۔ بزمِ ادب
کس طرح زندہ رہیں گے آپ کے اب جاں نثار

ساتھ چھوڑا آپ نے اور راہی جنت ہوئے
صبر دے اللہ آجائے زمانے کو قرار

دل کے آئینے میں ہے تصویر روشن آپ کی
تذکرہ ہوتا رہے گا آپ ہی کا بار بار

یہ صفی بھی آپ ہی کا اک عقیدت مند ہے
آپ کے غم میں ہے یہ بھی دل شکستہ دل فگار

سید فیاض الرحمٰن
ایڈیٹوریل افسر
بہار اسٹیٹ ٹکسٹ بک کارپوریشن پٹنہ

بات ۵۴-۱۹۵۳ء کی ہے۔ کالج کی تعلیم کا زمانہ تھا۔ ادب سے آنکھ مچولی کا شوق اسکول کی دسویں جماعت سے شروع ہو چکا تھا۔ کالج میں قدم رکھتے ہی انیس الغنی جو اندنوں اسسٹنٹ انجینئر ہیں اور میں نے چند ساتھیوں کے تعاون سے "خرمن" نامی ایک ماہنامہ جاری کیا۔ سبزی باغ میں دریاپور کی مسجد کے قریب کرایہ پر ایک دفتر لیا گیا۔ نوجوانی کا زمانہ تھا۔ اور راتوں رات مدیر محترم بن جانے کا بے پناہ جذبہ۔ تگ و دو شروع ہو گئی۔ چند ماہ تک ہم لوگ اپنے خون جگر سے خرمن کی آبیاری کرتے رہے۔ جلد ہی ہم لوگ تھکن محسوس کرنے لگے خرمن کے لئے "سب کچھ لوٹ کر لانا اور کوٹ کر کھانے" والی بات تھی سرپرست بنانا، خریدار بنانا اور اشتہارات وصول کرنا۔ یہ ساری ذمہ داریاں ہم سبھوں کی اجتماعی ذمہ داریاں تھیں۔ ان کاموں کے لئے تیاگ اور تپسیا کی ضرورت پڑتی ہے۔ لڑکپن نے ابھی ابھی ساتھ چھوڑا تھا نوجوانی کی دیوار گلستاں سے لڑکپن کی دھوپ ابھی پورے طور سے ڈھلی نہیں تھی۔ نوبت یہ رہی جاری رکھنا کہ خرمن کا جاری رکھنا ہم لوگوں کے لئے ایک سنگین مسئلہ بن گیا طرہ یہ کہ اسیر زلف خرمن ہونا تھا کہ ہم لوگوں کی درسی تعلیم پر عدم توجہی کے بادل منڈلانے لگے۔

سہیل صاحب مرحوم ہم لوگوں کی چال کی رفتار آہستہ پر مشفقانہ نظر رکھے ہوئے تھے۔ خرمن کے دفتر کے برابر میں ہفتہ وار سویرا کا دفتر تھا۔ مطیع الرحمٰن شمیم اور زید بھائی جو اندنوں لازم و ملزوم تھے۔ سویرا لوگوں تک پہنچانے کی تگ و دو میں راتوں کی نیند کا سودا کر چکے تھے۔ مرحوم سہیل صاحب ان دونوں حضرات کی خیریت دریافت کرتے ہوئے خرمن کے دفتر تشریف لایا کرتے تھے۔ حسن اتفاق یہ ہوتا کہ مرحوم جب تشریف لاتے دونوں فرشتے غائب پائے جاتے اور میں اپنے دفتر میں موجود ہوتا۔ دو تین بار تو سہیل صاحب حسن اتفاق سمجھ کر ٹال دیے گئے لیکن جب حسن اتفاق پر دیدہ و دانستہ کی چھاؤں پڑتی نظر آنے لگی تو دال میں کالا والی بات سہیل صاحب کے دل میں بیٹھ گئی۔ واقعہ یوں ہے کہ سہیل صاحب جب کبھی پٹنہ اور خاص کر سبزی باغ کی گلیوں سے گزرتے تھے تو در و دیوار بھی سلامی دئے بغیر آگے نہیں بڑھنے دیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ سہیل صاحب کی آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ دفتر گلی سے ڈھائی فٹ اونچائی پر اور اس میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھے ہوئے زید ہاشم بھائی

سہیل صاحب کی ٹوپی دور ہی سے نظر آجاتی تھی۔ آن کی آن میں پتہ کھڑکا، بندہ سرکا۔

انسان کے ضبط کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ سہیل صاحب کو بھی ضبط کا یارا نہ رہا — پانچویں بار آئے تھے۔ آتے ہی دفتر "سویرا" میں خانہ خالی ٹیبل کرسی سی گرد دیکھ کر برس پڑے "اب تم مار کھاؤ گے: مخبری کرتا ہے. تمہارے برابر میں رہنے والے دونوں فرشتے ہمیشہ غیر حاضر پائے جاتے ہیں۔ جی... جی ... حسن اتفاق ... میری گھگھی بندھ گئی۔

حسن اتفاق ..... یا تماشہ .. ادھر موجودگی — ادھر عدم موجودگی تشدد اور عدم تشدد تو آپ دیر محترم لوگ خوب سمجھتے ہوں گے۔ سن لیجئے! اب سہیل تشدد پر اتر آیا۔ اور یہ بھی کان کھول کر سن لیجئے! آپ لوگوں کا جو ڈرامہ "خرمن" کے پردے پر چل رہا ہے بہت ہو چکا پولیس والے اور کاتبین حضرات جب لٹھ لے کر بقایا جات کی وصولی کے لئے "خرمینوں" کی تلاش کریں گے تو میں تم لوگوں کو پولس سے پکڑوا کر ان لوگوں کے حوالے کر دوں گا۔ پڑھنے لکھنے کا زمانہ ہے ابھی ادھر توجہ دیجئے۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے اگلے ماہ سے "خرمن" کے لئے خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ کے پاس تمہارے خطوط دیکھے تو جان کی خیر نہیں — اور ہاں — وہ "انیس خرمن" (انیس النبی) کہاں ہیں؟ ان کا بھوت بھی آج ہی اتارنا ہے [illegible]

دیکھا آپ نے سہیل صاحب کی ادب نوازی اور ادب پروری عزیزوں اور نو آموز ادیبوں سے ان کا پیار! سہیل صاحب کا خیال تھا کہ درسی تعلیم کی قیمت پر جو ادب نوازی اور ادب کاری ہوگی وہ ادب نواز اور ادیب دونوں کے حق میں بری ہوگی۔ ان کا یہی جذبہ تھا کہ وہ ہم دونوں کے لئے نیک خواہشات رکھتے تھے۔ ان کے زریں مشوروں پر عمل کرتے ہوئے کالجوں کی ادبی انجمنوں میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بی۔ اے کی منزل میں جیتے ہوئے بہت سارے کپ ڈھیر سی کتابیں دکھائیں تو پیٹھ تھپتھپائی اور کہا کہ انھیں سنبھال کر رکھنا۔ یہ جامعاتی زندگی کے "دہر دہر" حصیں۔

یہ تھا سہیل صاحب کا پیار۔ اوسے مبسدری کی حد تک ہم لوگوں کی وابستگی اور سہیل صاحب جیسے قدآور ادیب کی ہم لوگوں پر نظر کرم

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے [illegible]
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

سنہ [illegible] میں ایک بار سہیل صاحب میری موجودگی میں دفتر "ساتھی" میں پہنچے۔ میں روزنامہ "ساتھی" میں بحیثیت مترجم ملازم تھا۔ سہیل صاحب پان چباتے شہادت کی انگلی سے اپنی زلفوں کی سرزنش کرتے دفتر میں داخل ہوئے۔ نظر پڑتے ہی آزمائشوں میں ڈالنے والے سوالات کی بوچھار شروع کر دی" ڈیوٹی کا وقت کب سے کب تک ہے؟

جی — دہی — ۳ بجے دن سے جب تک پہلے اور چوتھے صفحات کا مواد تیار نہ ہو جائے اور مدیر حاضر شاہد رام نگری سے اجازت مل جائے۔ تنخواہ کیا ملتی ہے؟ — جی جی .... لفظ [illegible] تلاش Ex[illegible]lo[illegible] تو پڑھا ہوگا؟ یہی ہے اس لفظ کا معنی۔

جی میں آیا کہہ دوں — یہی تو آپ سے نہ ہوا۔ روزنامہ ساتھی ان ہی کمیوں کی وجہ سے آپ کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن زبان سمیٹ لی۔ سہیل صاحب جیسے مخلص اور کردار ساز کے سامنے اس طرح زبان کھولنا بے ادبی کے مرادف ہوتا۔ سہیل صاحب میری تنخواہ سن کر سمجھ گئے مالی پریشانیوں سے دوچار ہے۔ حکم ہوا کہ آل انڈیا ریڈیو پٹنہ کے لئے ایک فیچر تیار کردوں۔ تعمیل حکم کے لئے میرے پاس وقت نہ تھا۔ ام۔ اے کا فائنل امتحان سر پہ تھا۔ وقت کی تنگی کا رونا رو دیا۔

[illegible] کمبخت جب دیکھو مسائل کی پوٹلیاں جیبوں میں بھرے رہتا ہے۔ سہیل صاحب نے ڈانٹ پلائی۔ "سنا ہے تم گاتا وانا بھی ہے کل ریڈیو اسٹیشن آجانا۔ کچھ اسی انداز کا پروگرام مل جائے گا۔ آئندہ کے لئے خبردار رہنا۔ دوسرے دن اس کے کندھوں پر بندوق رکھ کر

ف تحریر کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔
آج سہیل صاحب نہیں رہے۔ صرف یادیں باقی ہیں۔ ان ہی یادوں کے جھروکے سے ان کا پیار، ان کا بے پناہ خلوص اور ہم

خوبیوں کیلئے قیمتی موتی دل کی گہرائیوں میں اترتے رہیں گے۔

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

سہیل عظیم آبادی

اپنے کردار کے آئینے میں

از: تسنیم بلخی - کہنہ سرائے بہار شریف

ادبی دنیا دور روشن ستارے کو زندگی بھر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا ہوا دیکھتی آ رہی جسے اختر اور ینوی اور سہیل عظیم آبادی کے نام سے جانا جاتا ہے زمانہ حال اور ماضی کے ان دو انمول رتن کو اردو ادب کا آب حیات تصور کرتا ہے۔

سہیل عظیم آبادی اردو ادب کے ایک ایسے روشن چراغ تھے جنکی ہر ایک کرن نئے فنکاروں کے فن کو جلا بخشتی رہے گی۔ سہیل عظیم آبادی اصولوں اور نظریات کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اور وہ ترقی پسند نظریات کے حامل تھے۔ اس قدر کہ آخری عمر تک اس سے وابستہ رہے خاص طور پر افسانوی ادب اور اس فن سے انہیں پر خلوص لگاؤ تھا سہیل عظیم آبادی نہ صرف نظریاتی بلکہ عملی طور پر ترقی پسند نظریات اور تحریک سے وابستہ تھے۔ سہیل عظیم آبادی اردو کے عظیم ناول نگار منشی پریم چند سے بہت متاثر تھے!

سہیل عظیم آبادی کے افسانے اپنے عہد اور ماحول کے عکاس ہیں جو سیاسی اور سماجی صورت حال پر مبنی ہیں سہیل عظیم آبادی اپنے کرداروں کے ذریعہ فرد اور سماج کے گہرے رشتے اور مختلف نوعیتوں کو بڑی خوبی سے پیش کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں! سہیل عظیم آبادی کا ناول "بے جڑ کے پودے" سیاسی اور سماجی شعور کی بہترین نمائندہ ہیں۔ اور قاری پر ایک انمٹ چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔ جس سے قاری بہت متاثر ہوتا ہے ویسے بھی فنی اور تکنیکی اعتبار سے ان کے افسانے موجودہ عہد میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ سہیل عظیم آبادی بلند پایہ افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ ناولٹ نگار بھی تھے اور سب سے بڑھ کر باشعور صحافی تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ سہیل عظیم آبادی نام ہے ایک اسلوب کا اور انکی موت اسلوب کی موت ہے طرز نگارش کی موت ہے اور طرز زندگی کی بھی وہ اس دار فانی سے کوچ ضرور کر گئے ہیں۔ پر وہ اپنی تحریروں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ بہار میں پریم چند کے فنی سرمایہ کے آخری اور نہایت ہی اہم وارث کی حیثیت سے سہیل عظیم آبادی کی شخصیت بے حد نمایاں اور ممتاز ہے۔ سہیل عظیم آبادی نے اپنی تخلیقی کاوشوں سے اردو افسانہ کے دامن کو مالا مال کیا۔ انکے افسانے ہندوستان کی عوامی زندگی کی سچی اور مکمل ترجمانی کرتے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی نہ صرف ایک بڑے افسانہ نگار ہی تھے بلکہ وہ ایک بڑے انسان بھی تھے اپنے انداز حیات کو انہوں نے آخری دم تک برقرار رکھا ان کے اندر صبر و شکر اور مستقل مزاجی کے عناصر بھی تھے انکے مزاج کی ان خصوصیات نے انکی سیرت کو اور بھی سنوارنے اور چلا بخشنے میں بھرپور مدد کی۔

سہیل عظیم آبادی ناول نگار، ڈرامہ نگار اور افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ کئی رسالوں کے مدیر بھی رہ چکے تھے اردو کی بقا و تحفظ کے لئے چلائے جانے والی تحریکوں میں پیش پیش رہے اور اردو کی خدمت کا یہ ذوق انہیں بابائے اردو مولوی عبدالحق سے ملا تھا۔

عثمان شاہی
محلہ عالم گنج (گھیرام)
پٹنہ ۔ ۸۰۰۰۰۷

سہیل عظیم آبادی

وہ جناب سہیل عظیم آبادی اب ہمارے درمیان نہیں رہے ۔

اردو ادب جتنا یتیم آج ہوا، اتنا احساس مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا ——— جناب سہیل عظیم آبادی کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ وہ ایک عظیم افسانہ نگار تھے تو دوسری جانب بڑے ناول نگار بھی، ایک جانب بڑے ڈرامہ نگار تھے تو دوسری طرف بلند پایہ صحافی بھی، ایک طرف عظیم مفکر تھے تو دوسری جانب عظیم انسان بھی۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ عہد حاضر میں وہ اردو زبان کے سب سے بڑے سپہ سالار تھے اور اپنی ذات میں اردو تحریک کی جیتی جاگتی انجمن ۔

جناب سہیل عظیم آبادی نے غیر منقسم ہندوستان کے زمانہ میں بابائے اردو جناب مولوی عبدالحق کے ساتھ رہ کر اردو تحریک سے اپنی سپاہیانہ زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اسی طرح کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ رہ کر اپنی صحافتی زندگی شروع کی اور منشی پریم چند کے ساتھ رہ کر ادبی سفر شروع کیا ——— یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اردو تحریک کے سلسلے میں ان کا آغاز سفر ہوا منشی پریم چند کے گھر سے اور منشی پریم چند کے خاندان میں اس سفر کا خاتمہ ہوگیا۔

جناب سہیل عظیم آبادی ۱۵ر نومبر ۱۹۷۹ء کو چنڈی گڑھ اردو کانفرنس میں شرکت کے لئے پٹنہ سے روانہ ہوئے۔ اردو کانفرنس ختم ہونے کے بعد دہلی واپس آئے۔ دہلی میں شری برج ورما کے یہاں مختصر قیام کیا۔ اور اس کے بعد بذریعہ ٹرین شری شیام نندن مشرا سابق وزیر خارجہ حکومت ہند کے ساتھ الہ آباد تک گئے۔ وزیر خارجہ تو پٹنہ کے لئے روانہ ہوگئے، لیکن جناب سہیل عظیم آبادی الہ آباد میں رک گئے، جہاں ان کا قیام منشی پریم چند کے چھوٹے صاحبزادے جناب امرت رائے کے یہاں ہوا، جو ہندی کے ایک بڑے ادیب ہیں۔

[illegible] نومبر ۱۹۷۹ء کو انہیں دل کا دورہ پڑا۔ ٹرنک کال کے ذریعہ پٹنہ میں خبر ہوئی۔ احباب الہ آباد کو روانہ ہوئے۔ جناب سہیل عظیم آبادی سے آخری ملاقات بھی ہوئی، لیکن حالت نازک تھا۔ دو دنوں تک موت اور حیات کی جنگ لڑنے کے بعد جس شخص نے زندگی میں کبھی ہار نہیں مانی تھی، موت کی آغوش میں سو گیا۔

جناب سہیل عظیم آبادی منشی پریم چند پر ایک کتاب لکھ رہے تھے۔ جس کا عنوان تھا ——— "پریم چند کا آخری سفر"۔ اس کے علاوہ پٹنہ میں بڑے پیمانہ پر منشی پریم چند جینتی کرانے میں بھی مصروف تھے اور ترنت امرت رائے کو

اس جنگ میں شرکت کے لئے پٹنہ لانے والے تھے۔ لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ خود ایک ایسی منزل کی طرف چلنے والے ہیں، جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔

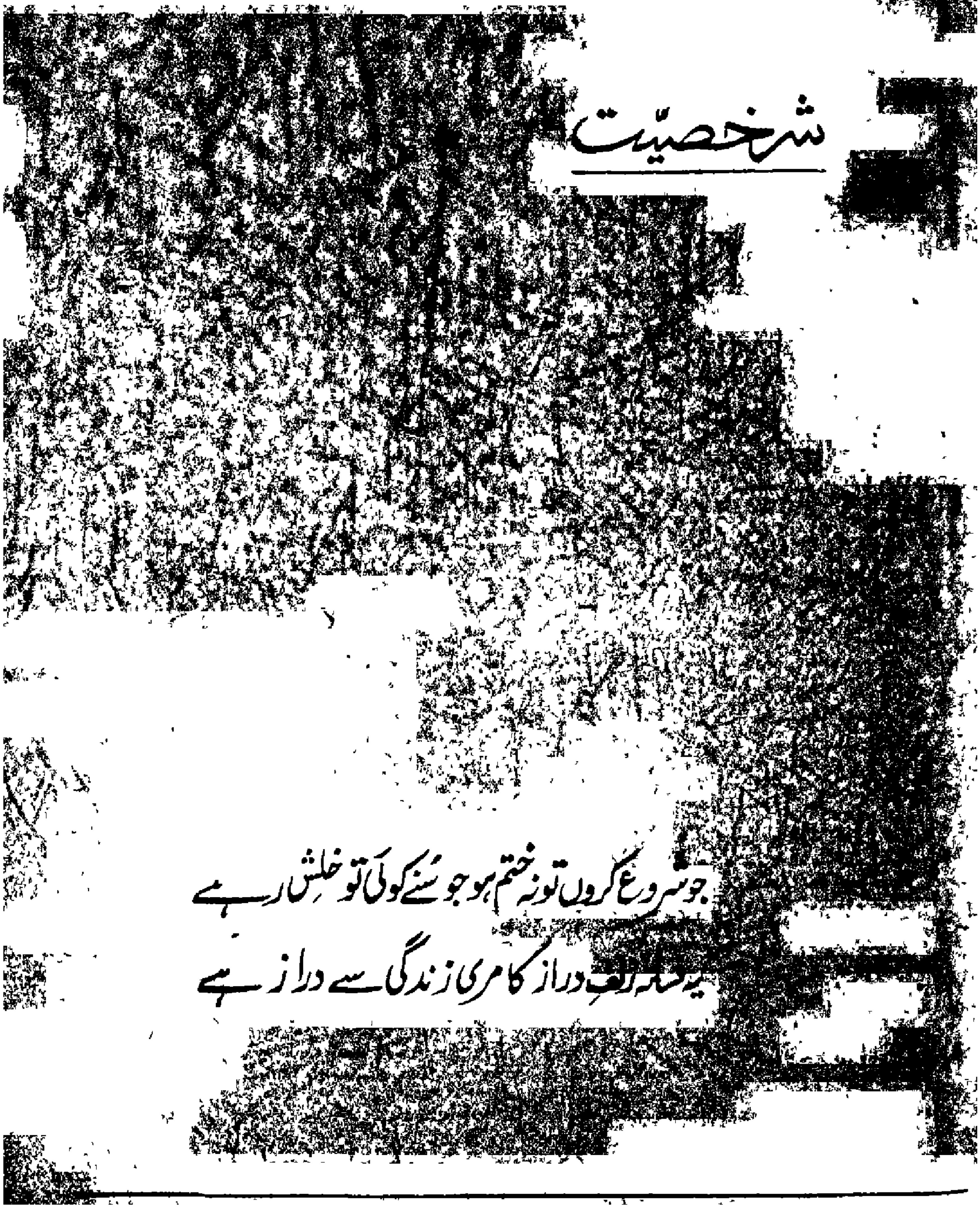
الہ آباد سے ان کی نعش بذریعہ ٹرین پٹنہ لائی گئی اور ۳ رنومبر ۱۹۷۹ء کو ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں انہیں شاہ گنج قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ آج تک کسی اردو ادیب کی موت پر اتنے لوگوں کا ہجوم نہیں دیکھا گیا تھا۔ جنازہ کی نماز میں لیڈر، پروفیسرز، ڈاکٹرز، شاعر و ادیب، بڑی تعداد میں رکشا ڈرائیورز، طلباء، وکلاء، غرضکہ ہر مکتبۂ فکر کے لوگ موجود تھے اس سے ان کی بھرپور عوامی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

نماز جنازہ درگاہ حضرت شاہ ارزاں میں جمعہ کی نماز کے بعد جناب طیب ابدالی لکچرر شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی نے پڑھائی۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تمام خبریں تفصیلی طور پر کئی دنوں تک دی گئیں۔ آل انڈیا ریڈیو میں تعزیتی جلسہ ہوا۔ اس کے علاوہ ریڈیو پر کئی دنوں تک تعزیتی پیغامات پیش کئے گئے۔ ان کی فن اور شخصیت پر کئی پروگرام ہوئے اور ان کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

جناب سہیل عظیم آبادی عہد حاضر کے ایک عظیم ادیب ہونے کے ساتھ [illegible] بڑی بات یہ ہے کہ وہ عہد حاضر کے ایک عظیم انسان [illegible] اردو تحریک سے ان کی دلچسپی ان کی حیات سے لے کر ان کی موت تک رہی۔ وہ صرف ادیب ہی نہیں تھے بلکہ اردو زبان کے ایک عظیم جاں نثار بھی تھے۔ اردو تحریک کے سلسلے میں انہوں نے آخری سفر کیا اور منشی پریم چند کے خاندان میں ان کی موت ہوئی۔ اس سے اردو اور پریم چند سے ان کی گہری محبت کا بھرپور ثبوت ملتا ہے۔ ان کی [illegible] کے علاوہ ہند و پاک کی تقریباً سبھی اہم زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ روس، فرانس، چیکوسلواکیہ، جرمنی، امریکہ، اٹلی اور چین میں بھی ان کی بے شمار کہانیوں کے ترجمے ہوئے۔ اور انہوں نے اردو زبان کو بین الاقوامی سطح پر روشناس کرایا اور ان ملکوں کے عوام نے جناب سہیل عظیم آبادی کی عظیم تخلیقات کو پڑھ کر ان سے بے پناہ عقیدت محسوس کی اور انہیں بھرپور خراج عقیدت پیش کیا۔ ان کا عظیم ناول "بے جڑ کے پودے" چند سال قبل روس کے تاریخی شہر ماسکو میں ہونے والی عالمی کتابوں کی نمائش کے لئے منتخب ہوا۔ اس ناول نے جناب سہیل عظیم آبادی کو لافانی شہرت بخشی۔ یہ ناول بہت جلد لندن سے انگریزی زبان میں شائع ہونے والا ہے۔

جناب سہیل عظیم آبادی کی موت پر ملک کے اخبارات و جرائد میں جو غم منایا گیا اور جس طرح آج تک تعزیتی پیغامات شائع ہو رہے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے قبل اردو زبان و ادب کے کسی ادیب پر اتنے آنسو نہیں بہائے گئے ہوں گے۔ خاص کر ہندی زبان کے جاننے والوں پر ان کی موت کا بے حد اثر ہے۔ کئی اخبارات نے اپنے اسپیشل ایڈیشن نکالے اور نمبروں کا اعلان کیا۔

جناب سہیل عظیم آبادی نے نہ صرف یہ کہ زبان و ادب کی بھرپور خدمت کی بلکہ فرقہ پرستی کے خلاف بھی ساری زندگی لڑتے رہے [illegible] نکی انور کی موت کا بھی ان پر بہت [illegible] تھا۔ وہ اردو کے واحد ادیب تھے جنہیں ترقی پسند اور [illegible] کرتے تھے اور ان کی انسانیت کے آگے سبھی اپنا سر جھکاتے تھے۔

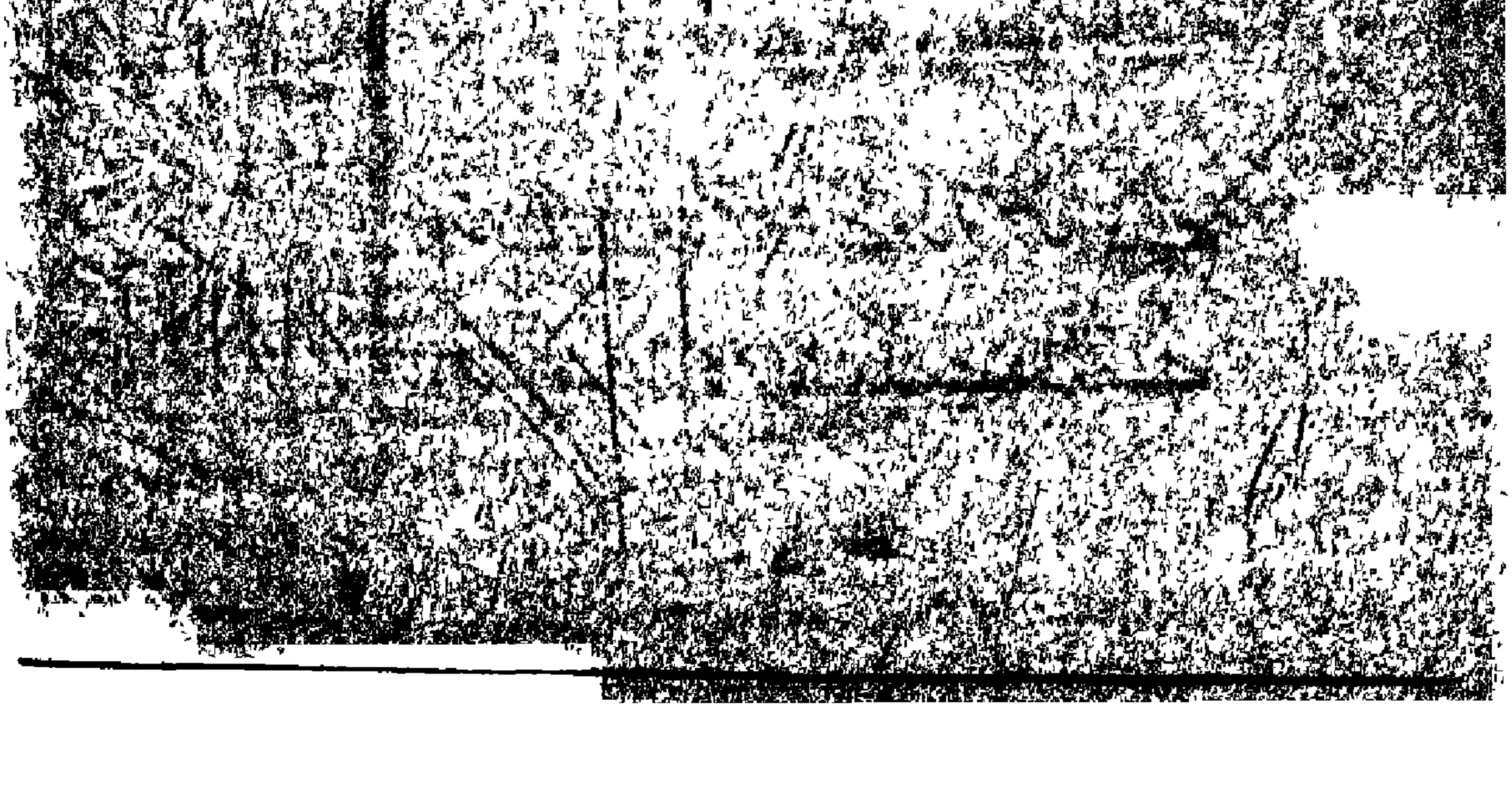


شخصیت

جو شروع کروں تو نہ ختم ہو جو سُنے کوئی تو خلش رہے
یہ فسانہ زلفِ دراز کا مری زندگی سے دراز ہے

بچہ گھر کی کسی بڑی بوڑھی سے کہانی سنتا ہے اور کہانی میں کھو جاتا ہے۔ جہاں کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی وہ اچانک سوال کر دیتا ہے اور کہانی کہنے والی پھر اسے سمجھاتی ہے۔ بچے کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن جب وہی کہانی کہنے میں بار بار الجھتی ہے اور بچہ بار بار سوال کرتا ہے تو کہانی کا سارا مزا جاتا رہتا ہے۔ کچھ عورتیں کہانی اتنے اچھے ڈھنگ سے کہتی ہیں کہ بچہ کہانی میں گم ہو جاتا ہے اور کوئی سوال نہیں کرتا۔ بچے اسی عورت سے بار بار کہانی کی فرمائش کرتے رہتے ہیں۔ ٹھیک یہی حال کہانی پڑھنے والوں کا بھی ہے۔ ان کے دماغ میں بھی سوالات پیدا ہوتے ہیں اور مشکل یہ ہوتی ہے کہ لکھنے والا سامنے نہیں ہوتا جو اُسے سوالات کا جواب دے یا اُلجھنوں کو سلجھائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا ایسے لکھنے والوں کو پڑھنا ہی چھوڑ دیتا ہے۔ ماہر کہانی کار باتوں کو اُلجھاتے نہیں اور جو اُلجھا کر قصہ بیان کرتے ہیں وہ زیادہ دنوں تک مقبول نہیں رہ سکتے۔ وقتی طور پر کسی وجہ سے مقبول ہو بھی جائیں تو یہ مقبولیت دیرپا نہیں ہو سکتی۔

"سہیل عظیم آبادی"



کوثر چاند پوری

سہیل عظیم آبادی

مشہور ادیب، ناول نگار اور افسانہ نویس سہیل عظیم آبادی ۲۹ نومبر ۱۹۷۹ء کو وفات پا گئے۔ کس قدر اندوہناک اور دلدوز تھی یہ خبر، انسان پیدا ہو کر مرتے ہی رہتے ہیں۔ ان کا آنا مسرت کا باعث ہوتا ہے اور ان کا جانا رنج و ملال کا۔ لیکن ادیب کا پیدا ہونا اور اس کا مرجانا اپنی نوعیت کا انوکھا حادثہ ہے۔ اس کی پیدائش سے انسانیت پر نکھار آتا ہے اور موت سے انسانیت مضمحل ہو جاتی ہے۔ دل کی دھڑکنیں مدھم ہو جاتی ہیں۔ درحقیقت سچا ادیب اپنے اندر ایک دنیا لے کر پیدا ہوتا ہے اور اس کی موت کائنات کے بہت بڑے حصے کو اپنے ساتھ سمیٹ لے جاتی ہے۔ مسرت کے یہی لمحات اور رنج و ملال کے یہی حادثے سہیل صاحب کی ولادت اور وفات میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ بڑے ادیب اور افسانہ نگار بھی تھے اور بڑے انسان بھی۔ ان کی شخصیت ظاہری اور باطنی حسن سے آراستہ تھی۔ یہی اوصاف ان کے اخلاق اور خلوص میں جلوہ گر تھے۔ ان کے مزاج میں شگفتگی تھی۔ احباب سے گھل مل کر ملنے کے عادی تھے۔ جن لوگوں سے ملاقات ہو جاتی انہیں بڑی سنجیدگی سے نبھاتے۔ مجھ سے قلمی تعارف مدت سے تھی۔ پٹنہ سے ساتھی نکلا تو مجھ سے قلمی تعاون کے طالب ہوئے۔ میں نے متعدد افسانے ساتھی اور ان کی ادارت میں چھپنے والے دوسرے رسائل میں لکھے۔ وہ جب کبھی دہلی آتے مجھ سے ضرور ملتے۔ [illegible] کو [illegible] پر تشریف لاتے۔ میرے عزیز ڈاکٹر ظفر احمد نظامی (ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی) لکچرر جامعہ ملیہ سے بھی ان کے مراسم تھے۔

وہ دہلی آکر ان سے ملنے کی کوشش بھی کرتے۔ خطوط میں انہیں دعائیں لکھتے۔ ایک مرتبہ میں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کی ایک افسانوی تقریب میں شرکت کرنے لکھنؤ گیا جو سردار رتن سنگھ کے اہتمام میں منعقد ہو رہی تھی۔ سہیل صاحب بھی پٹنہ سے آئے تھے اور جناب نسیم انہونوی کے دولت کدے پر مقیم تھے۔ میں بھی وہیں قیام کیا کرتا ہوں۔ میری اور سہیل صاحب کی مسہریاں ایک ہی کمرے میں تھیں۔ ان دنوں ان کے ایک صاحبزادے بھی لکھنؤ میں تھے اور روزانہ شام کو ملنے آیا کرتے تھے۔ ایک صبح کو چائے کی میز پر جناب صلاح الدین عمر اور چند دوسرے حضرات موجود تھے۔ ایک ادارہ اکیڈمی کے سکریٹری بھی تھے۔ سہیل صاحب نے اُن سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ آپ اردو اکیڈمی کے سکریٹری ہیں۔ میں نے برجستہ کہا اچھا گویا آپ کے ہم زلف ہیں۔ سہیل صاحب اور دوسرے صاحبان نے اس پر خوب قہقہے لگائے۔ اسی زمانہ میں سہیل صاحب بہار اردو اکیڈمی میں سکریٹری شپ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ سہیل صاحب بیمار تھے، دل کے عوارض کا شکار تھے گمی بالکل چھوڑ رکھا تھا۔ دانت سب ٹوٹ چکے

فور بے میں اردلی خوب ل کر کھایا کرتے تھے۔ کسی ڈاکٹر کے زیر علاج تھے۔ میں نے مشورہ دیا کہ دراسا گو کا پوسٹ چھین ولا تیل کیا جا ہئے۔ بیماری میں قوت کی بڑی اہمیت ہے

انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کے خلاف یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔ ریڈیو سے اس جلسہ میں مختلف مقامات کے افسانہ نگار جمع تھے۔ حیات اللہ انصاری، جوگندر پال اور چند دوسرے دانشور بھی شریک بزم تھے۔ سہیل صاحب نے بھی افسانہ پڑھا جس کو پسند کیا گیا۔ سہیل صاحب سے میری آخری تفصیلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد وہ کئی مرتبہ دہلی آئے لیکن مل نہ سکے اور ایک منحوس صبح کو انتقال کی خبر آگئی۔ شدید افسوس ہوا۔ سہیل صاحب طرز ادب تھے۔ ان کی تحریر دل نشین اور معنی خیز ہوا کرتی تھی۔ اس میں انسانیت کی فلاح اور بہبود کا جذبہ کر دنیں لیا کرتا تھا۔ آخر میں کچھ لوگوں کو ان سے اختلاف ہو گیا تھا۔ وفات کے بعد بہار کے سب ادیبوں نے رنج و ملال کا اظہار کیا۔ ملک میں جگہ جگہ تعزیتی جلسے ہوئے۔ سہیل کے سلسلے میں یہ سب کچھ کافی نہیں۔ یہ جانگداز حادثہ اس سے زیادہ کا طالب ہے۔ سہیل صاحب ایک دور کی علامت تھے۔ پریم چند کی روایت کو انہوں نے آگے بڑھایا۔ تقلیدی انداز سے نہیں تخلیقی ندرتوں کے ساتھ۔ ضرورت ہے کہ ملک ان کی مستقل یادگار قائم کی جائے۔ انہوں نے عمر بھر تک اپنی مادری زبان اردو کی خدمت کی ہے اور اس زبان کو ملک کی دوسری زبان کی شکل میں دیکھنے کی حسرت لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ ارباب اردو کا فرض ہے کہ ان کی خدمات کو فراموش نہ کریں۔ پٹنہ میں کسی سڑک کا نام سہیل روڈ رکھا جائے اور ان کے ساتھ جگہ جگہ اردو اسکول قائم کئے جائیں۔ میں اس سلسلے میں برابر آواز بلند کرتا رہوں گا۔ سہیل صاحب کے سفر آخرت پر مجھے سخت ملال ہے۔ خدا انہیں دوسری دنیا میں آرام و راحت سے رکھے اور ان کی قبر پر انوار الٰہی کی بارش ہوتی رہے۔ آسمان ابد تک لحد پر شبنم افشانی کرتا رہے۔

سہیل عظیم آبادی

★ ★

علم و عمل کا پیکر ایثار سہیل بابا
وہ باوفا وہ مونس و غم خوار سہیل بابا
اہلِ زبان و اہلِ قلم اہلِ فن سہیل
وہ اہلِ فکر شوخ و طرحدار سہیل بابا
ہر قطرہ جس کے خون کا ہے سرمایۂ ادب
افسانہ کے مزاج کا معمار سہیل بابا
مقتل کو جس نے کوچۂ جاناں بنا دیا
وہ واقفِ غم و رسن و دار سہیل بابا
مستانگیٔ زلف ادب جس کے دم سے تھی
حسنِ ادب کا وہ واقفِ اسرار سہیل بابا
نوری نگاہ ڈھونڈ رہی ہے سہیل کو
وہ دوست وہ رفیق وہ غم خوار سہیل بابا

ڈاکٹر مجاز نوری

پرکاش فکری
رانچی



سہیل بھائی

سہیل بھائی سے میری باضابطہ ملاقات کب ہوئی۔ مجھے قطعی یاد نہیں۔ میرا خیال ہے ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ بتدریج طے ہوا۔ وہ برسوں پہلے رانچی میں انجمن ترقی اردو کے تحت چھوٹا ناگپور میں اردو کو مقبول عام بنانے کے لئے متعین ہوئے تھے اور یہیں مقیم تھے۔ میں اس زمانے میں اسکول کا طالب علم تھا۔ اور ہمارے کورس میں ان کی مرتب کی ہوئی ایک کتاب بھی چل رہی تھی۔ اس زمانے میں وہ شخص جس کی چیزیں اور جس کا نام باقاعدہ طور پر چھپتا تھا ایک بہت دور کی چیز معلوم ہوتا تھا۔ لکھنا اور چھپنا، دونوں ہی باتیں بہت دور کی معلوم ہوتی تھیں۔ لہٰذا میں اہم میرے اس وقت کے ساتھی انہیں دیکھ کر عقیدت اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے دوچار رہتے تھے۔

اسی زمانے میں ان کے افسانوں کا مجموعہ ''الاؤ'' ہاتھ لگا کہانیوں کو پڑھ کر کون سا تاثر پیدا ہوا، یہ تو یاد نہیں نہیں مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ ان کی کہانیاں پڑھ کر ان سے عقیدت اور بڑھی اور سہیل عظیم آبادی کا نام ذہن پر مرتسم ہوگیا پھر سہیل بھائی رانچی سے چلے گئے۔ مگر رانچی سے ان کا رشتہ برابر قائم رہا اور رانچی میں انہوں نے جو دوست بنائے تھے وہ تادم آخر ان کے دوست رہے اور ان کی کشش کھینچ کر انہیں اکثر رانچی لاتی رہی۔

رانچی میں ان کے مستقل قیام کے زمانے میں ایک بہت دلچسپ مگر کسی حد تک پُراسرار شخصیت سے ان کی بہت گہری دوستی تھی۔ نام تھا عجائب خاں۔ دوسری جنگ عظیم کا آخری دور تھا۔ رانچی بہت بڑی فوجی چھاؤنی بن چکا تھا۔ تجارت اور ملازمتوں کی خاطر دور دراز کے لوگ یہاں جمع ہوگئے تھے۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں کی دھوم دھام تھی۔ عجائب خاں ان محفلوں میں برابر رونق افروز ہوتے۔ وہ پکے نیشنلسٹ تھے اور مسلم لیگ کے طوفانی دور میں کسی مسلمان کا نیشنلسٹ ہونا بذات خود ایک عجیب بات تھی۔ وہ صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے۔ سہیل بھائی نے ان کی موت کے بہت بعد ان پر ایک بہت اثرانگیز کہانی لکھی۔ عنوان عجائب خاں ہی تھا اور اس طرح اپنا حق دوستی ادا کیا۔

وہ ادیب تھے۔ کہانی کار تھے۔ مگر ان کے ملنے جلنے والوں کے حلقے میں ادب سے قطعی نا علم لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی اور کمال یہ تھا کہ ان سے جو ایک بار ملا وہ ہمیشہ کے لئے ان کا گرویدہ ہوگیا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ رانچی جیسے غیر ادبی شہر میں بھی ان کی موت سے بیسوں ہی آنکھیں اشکبار ہوئی ہوں گی۔

انہیں اس بات کا شوق نہیں تھا کہ لوگ ہر حال میں انہیں بڑا ادیب سمجھیں اور ان کے دربار میں حاضری دیں اور پھر ان کا دربار ہی کہاں تھا۔ رانچی جب بھی آتے وہ خود ڈھونڈ ڈھونڈ کر لوگوں سے ملتے۔ سب کی خیریت پوچھتے۔

بے جا تکلفات کے متکلف ماحول سے ان کی طبیعت الجھتی تھی۔ سڑک پر ان کے ساتھ چلنا ایک دشوار مرحلہ ہوتا۔ ہر دس بیس قدم پر ان کا کوئی نہ کوئی شناسا مل جاتا اور پھر ان کا رکنا اور اس سے حال احوال پوچھنا ان کے لئے ضروری ہو جاتا اور اس طرح منٹوں کا فاصلہ گھنٹوں میں طے ہوتا۔

میں نے پہلے یہ کہا ہے کہ ان سے باضابطہ ملاقات کب ہوئی، یاد نہیں۔ مگر اتنا ضرور یاد آتا ہے کہ آزادی کے فوراً بعد کے عرصے میں اختر پیامی اور کلام حیدری رانچی آگئے تھے اور سہیل بھائی بھی رانچی میں اسی دوران، پتہ نہیں کس سلسلے میں کافی دنوں کے لئے مقیم رہے، اور شاید کلام حیدری اور اختر پیامی ہی کی وساطت سے ہم دو چار لوگ جو ادب سے دلچسپی رکھتے تھے، ان کے قریب ہونے میں کامیاب ہوئے۔

وہ وقت ادب کے لئے بہت سازگار تھا۔ سیاسی حالات نے ذہنوں کو کافی متحرک کر رکھا تھا۔ کافی کچھ لکھا جا رہا تھا۔ پاکستان سے رسالوں اور کتابوں کی آمد میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ آزادی کے فوراً بعد کا زمانہ یوں تو بڑا الم انگیز تھا مگر امنگوں اور امیدوں کی فصلیں خشک نہیں ہوئی تھیں۔ ادب میں ترقی پسند تحریک کا بول بالا تھا۔

سہیل بھائی بھی بہت لکھ رہے تھے، وہ ترقی پسندی کے سلسلے میں بہت پُر جوش تو نہیں تھے مگر ہم راہ کارواں ضرور تھے۔ ان کے پاس اردو کے ان تمام ادیبوں کے خطوط آیا کرتے تھے جن سے اردو ادب کا وقار قائم ہے۔ اور سبھوں سے تقریباً ان کے ذاتی تعلقات اور گہرے مراسم تھے۔ یہ خطوط، ان کی شخصیت کی شناسائی میں ہم لوگوں کے مددگار ثابت ہوئے۔ لہٰذا ہم لوگ اس تاک میں رہتے تھے کہ ان کے نام آئے ہوئے خطوط نہ صرف پڑھے جائیں بلکہ چرا لئے جائیں۔ اور ہم لوگوں نے خط چرائے بھی۔ آج کئی ایسے خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔ اسی زمانے میں ہم لوگوں کے درمیان یہ بات مشہور ہوئی کہ سہیل بھائی کے اس وقت کی ایک قدرے مشہور ادیبہ سے کچھ نازک سے تعلقات ہیں۔ اس ادیبہ کے خطوط بھی بڑی ہوشیاری سے چرائے گئے، ہم تمام لوگوں نے انہیں پڑھا۔ بار بار پڑھا۔ مگر بین السطور میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ملی جو سہیل بھائی اور اس ادیبہ کے تعلقات کی نازکی کا سراغ دیتی۔ اور ہم لوگ اس فیصلے پر پہنچے کہ سہیل بھائی بڑے معصوم آدمی ہیں اور ان کی معصومیت پر ہمارا ایمان ہمیشہ کے لئے قائم ہو گیا۔

سہیل بھائی بے حد مشہور تھے، کامیاب تھے، بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے مگر ایسا لگتا تھا، ان باتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ ان ادیبانہ تکلفات سے بہت دور تھے۔ جو معمولی لکھنے پڑھنے والے بھی اختیار کرکے دنیا میں منفرد ہونے کا سوانگ رچاتے ہیں۔

پٹنہ میں بھی ان سے جو ملاقاتیں ہوئیں وہ بس یوں ہی چلتے پھرتے ہی ہوئیں۔ مگر انہوں نے وہ تصنع آمیز رویّہ کبھی اختیار نہیں کیا۔ جو ایسے موقعوں پر اکثر لوگ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہ بھئی تم پٹنہ آئے تو میرے یہاں آنا چاہئے تھا میرا گھر موجود تھا۔ ادھر اُدھر ٹھہرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

وہ مل گئے تو پھر گھنٹہ دو گھنٹہ ان کا ساتھ رہنا ضروری تھا۔ پھر انہیں جہاں بٹھا دیجئے، جس چائے خانے میں بیٹھ جائیے انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ وہ چھوٹے بڑے کے درمیان خواہ مخواہ کی دیوار کبھی کھڑی نہیں کرتے۔ یہ چھوٹائی بڑائی چاہے آدمیوں کی ہو، چاہے جگہوں کی۔

آخری بار یعنی ستمبر ۷۹ء میں جب ان سے ملاقات ہوئی تو ساتھ کا زیادہ وقت سبزی باغ (پٹنہ) کے ایک چائے خانے ہی میں گذرا۔ کسے خبر تھی کہ یہ سہیل بھائی سے آخری ملاقات ہے۔ اور دوبارہ کبھی پٹنہ جب آؤں گا یہ مہربان آنکھوں اور شفیق چہرے والا شخص کہیں نہیں کبھی نہیں نظر آئے گا۔

سہیل بھائی سب کے سہیل بھائی تھے۔ اپنی بزرگی کا بوجھ وہ کسی پر نہیں ڈالتے۔ اپنے بڑے ادیب ہونے کیا اپنے لکھنے پڑھنے کا بھولے سے بھی کوئی مظاہرہ نہیں کرتے۔

سے بڑے ناموں کی وردان یا گردان کا بھی انہیں کوئی شوق نہیں تھا۔

سہیل بھائی کے یہاں یا تو مستقل مزاجی کی کمی تھی یا حالات ہی ایسے ہوتے جو ان کی مستقل مزاجی کو زک پہنچاتے۔ انہوں نے ماہنامے بھی نکالے۔ روزنامہ بھی جاری کیا اور ہفتہ وار بھی۔ مگر پائیداری کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ البتہ ریڈیو کی ملازمت میں کچھ جم کر رہے۔ "تہذیب" دوبارہ نکالنے کی سوچ رہے تھے۔ مواد بھی جمع کر لیا تھا۔ مگر پھر نہ جانے کیا ہوا۔

ہفتہ وار "ساتھی" بڑی امنگوں سے نکالا مگر وہ بھی کم عمری کا شکار ہو گیا۔ اپنی کتابوں کے لئے دوسروں کی طرح آتا [illegible] نہیں ہوتے تھے۔ انہیں اس کے لئے متفکر نہیں پایا کہ کتاب چھپی ہے تو اس کی خوب خوب پذیرائی ہو۔ ڈھیر سارے رسالوں میں تبصرے ہوں اور ان کے نام کا ڈنکا بجے۔

لکھنا ان کی زندگی کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ مگر اس لکھنے کی بازگشت سے انہیں کوئی مطلب نہیں تھا۔ ملاقات ہونے پر ملنے والا ہی ان سے لکھنے لکھانے کے متعلق کچھ پوچھتا تو بتاتے۔ اپنے طور پر اسے موضوع گفتگو شاید ہی بناتے۔ انہیں ادیبوں کی سیاست اور ان کے ہتھکنڈوں سے دور ہی محسوس کیا۔ بہت ہی چھوٹے لوگوں نے انہیں چھوٹا سمجھنے کی جسارت کی مگر انہوں نے جواباً کوئی کارروائی نہیں کی۔ ادبی سیاست سے دامن کشی ہی بہت سی وجہوں میں سے ایک وجہ ہے کہ "جشن سہیل" منایا گیا اور نہ ان کی زندگی میں کسی رسالے کا سہیل نمبر نکلا۔ جبکہ ان کے ہمعصروں نے اس میدان میں بڑی چوکسی دکھلائی۔

وہ منھ پر تعریف و توصیف کے بھی زیادہ قائل نہیں تھے۔ اس لئے ہم جیسوں کو وہ پسند کرتے ہیں یا ناپسند کرتے ہیں اس کا اندازہ ان کی گفتگو سے کم ہی ملتا تھا۔ "عالم"، "اقدو زبان و ادب" یا "تہذیب" کے لئے چیزیں منگواتے وقت، ان کے خطوط کے لہجے نے مجھے یقین آمیز خوشی ضرور بخشی کہ سہیل بھائی میری تحریروں کو پسند کرتے ہیں۔

میں ان سے ہر لحاظ سے چھوٹا بالکل ذرۂ حقیر، وہ ہر لحاظ سے بڑے، بہت بڑے مگر اس بڑے پن کے استعمال کی انہیں مجبوری بھی درپیش ہوئی تو انہوں نے ایسے موقعوں پر بھی بے حد احتیاط سے کام لیا۔ میری ایک کمزوری پر وہ میری تنبیہہ کرنا چاہتے تھے مگر انہوں نے براہ راست مجھے کچھ نہیں کہا۔ ایک وسیلہ ڈھونڈ کر اپنی فہمائش مجھ تک پہنچائی۔

ان کی بڑائی کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ وہ دوسروں کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کے صاحبزادے شان الرحمٰن ریڈیو میں ملازم ہو کر رانچی آئے۔ اب سہیل بھائی ہیں کہ بار بار مجھے لکھ رہے ہیں "شان وہاں گیا ہے رانچی اس کے لئے نئی جگہ ہے، اسے دیکھتے رہنا"

ایسی محبتیں دینے والا، ایسا حق جتانے والا، خود سے بے نیاز مگر دوسروں کے جذبات کی پاسداری کرنے والا، دوسرا کون ملے گا۔ انہوں نے کیا لکھا اور اردو ادب کو کیا دیا۔ یہ کام تو پیشہ ور نقاد اور یونیورسٹیوں کے پروفیسران کریں گے۔ ہم ایسے لوگ تو انہیں سہیل بھائی ہی کی حیثیت سے یاد کرتے رہیں گے۔ وہ سہیل بھائی جن سے مل کر یا جن کی کہانیاں پڑھ کر ہمیشہ ایسا لگا کہ وہ ہم میں سے ہیں اور یہ کہ ہمارا بھی کوئی ہے۔ مگر ان کی موت اب یہ کہنے پر مجبور کر رہی ہے کہ ہمارا بھی کوئی تھا جو اب نہیں رہا۔

(بشکریہ عصری آگہی، دہلی)

اچاریہ شوکت خلیل

قصہ چھٹے درویش کا

جو نکلا کہیں کے لئے اور بھاگ کر کہیں اور جا چھپا ہمیشہ کے لئے

ایک طرف میرے سامنے جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی سے برادرم مجیب اختر کا لکھا ہوا ۱۹ نومبر کا خط ہے جس میں وہ لکھتے ہیں "یہاں سہیل عظیم آبادی صاحب اور پروفیسر عبدالمغنی صاحب آئے ہوئے ہیں۔ آج میری ان لوگوں سے ملاقات ہوگی وہ لوگ میرے ہوسٹل آنے والے ہیں" اور یہ دوسری تحریر ہے مدیر پندار کی — "ہم بہت جلد ہفتہ وار پندار کا سہیل عظیم آبادی نمبر شائع کرنے جا رہے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی اردو کے نامور ادیب تھے اور پریم چند اسکول کی آخری کڑی۔ انہوں نے اردو ادب کے ساتھ ساتھ اردو زبان اور صحافت کی بھی خدمت کی ہے وہ ایک بلند پایہ صحافی بھی تھے — ان سے آپ کے گہرے ذاتی تعلقات وارتباط تھے . . . " اور میرے سامنے ایک اور تحریر ہے خود سہیل عظیم آبادی صاحب کی جو انہوں نے اسی اکتوبر میں مجھے لکھی تھی — "کانفرنس ضرور کرو۔ کچھ کرتے رہنا چاہئے۔ مگر جن تاریخوں میں تم یہ کانفرنس کرنی چاہتے ہو ان میں میں پٹنے سے باہر چنڈی گڑھ، دہلی وغیرہ میں رہوں گا — کانفرنس کی تاریخ بڑھا کر دسمبر میں کیوں نہیں کر دیتے؟ اس وقت میں بھی شریک ہو سکتا ہوں —"

اب ذرا بتایئے آپ کہ تحریروں کے اس گورکھ دھندے میں میں کہاں کا رہ گیا۔؟ دو مہینے قبل وہ خود مجھے اپنے دہلی کے پروگرام کی بابت لکھتے ہیں۔ دو ہفتے قبل ایک صاحب دہلی سے لکھتے ہیں کہ وہ یہاں پہنچ چکے ہوئے ہیں اور اس کے دو ہفتے بعد یہ مدیر پندار ہیں کہ لکھتے ہیں کہ وہ رہے تھے نہیں اب اس دنیا میں — اور پھر لکھتے ہیں "ان سے آپ کے گہرے ذاتی تعلقات وارتباط تھے" ارے بھائی! ذاتی تعلقات تھے کیسا بلکہ گہرے ذاتی تعلقات تھے۔ اور اللہ میاں جھوٹ سے بچائے پوچھیں تو یہ بھی میں کہوں کہ اس روئے زمین پر ہوش سنبھالنے کے بعد ادب نام کی کسی مخلوق کی شکل میں سب سے پہلے انہیں ہی میں نے قریب سے دیکھا تھا، ان سے ہی واقف ہوا تھا۔ اور پھر پیدا تفیت اور یہ ملاقاتیں بڑھ کر ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ بن گئی تھیں — مگر بھیا میرے! اب مجھے ان سے جو دوست خدا کے لئے۔ "کیوں؟"

— صاحب یہ کیوں ویوں میں کچھ نہیں جانتا۔ سہیل عظیم آبادی نامور ادیب، پریم چند اسکول کی آخری کڑی، یا ممتاز صحافی وغیرہ وغیرہ رہے ہوں گے آپ کے لئے — میرے لئے تو وہ صرف سہیل بھائی تھے — اور بھائی! بھائی بھی وہ کس قدر شاندار اور دلچسپ قسم کے تھے کیا بتاؤں میں تمہیں۔ سن لو گے۔ جان لو گے تو ہنس پڑو گے بھک سے جل اٹھے گی تمہارے ہونٹوں پر لائیٹر سی . . . .

میرے چچا ہیں دہر ناصری صاحب۔ اب قائد اعظم صاحب کے مزار پر پھول چڑھانے کے سلسلے میں پاکستان میں

ستقل سکوت اختیار کر رکھی ہے انہوں نے۔ سہیل عظیم آبادی صاحب ن بے [illegible] پیدا کئے۔

۔ ناصر سنو، ایک دن اور تم کھچڑی کا پروگرام رکھو اپنے یہاں — قیوم خضر کو بھی بلا بھیجو ۔ ویسے بن گئی گرم گرم مونگ کی سوندھی، خوشبو دار کھچڑی۔ لونگ کی چھونک پڑی۔ باز کی مجبوری یا رامی بریانی والی — پٹنہ کے گلی گھاٹ موڑ والے [illegible] در کھلے ہے۔

یہ بات ہے ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء کی اللہ میاں کی تازہ بہ تازہ رحمتوں کے نزول کی وہ عمر تھی میری۔ یعنی یہی کوئی اٹھارہ انیس کا سن رہا ہوگا میرا۔ لکھنا تو خیر بالغے کی زبان میں اپنی پیدائش کے دوسرے ہی دن میں نے شروع کر دیا تھا۔ مگر اس وقت اکا دکا چیزیں یہاں وہاں چھپنے بھی لگی تھیں۔ اس وقت چچا صاحب نے سہیل صاحب کو کھچڑی کی دعوت کھلائی تو پوچھیے مت کہ مجھے اس کی کس قدر خوشی تھی ؟

مگر آج اگر میں سچ بات کہہ دوں تو شاید لوگ برا مان جائیں گے۔

برا مان جائیں گے کیا لوگ گالیاں بھی دینے لگیں گے اور ممکن ہے کہیں جو میں سامنے پڑ گیا تو وہ پیٹ بھی ڈالیں مجھے۔ مگر میرے بھائی! ذرا خدا لگتی کہو، لوگوں کے ڈر سے سچ کو چھپانا کوئی اچھی بات ہے کیا ؟ اس لئے جو سچ ہے اُسے چھپاؤں گا نہیں۔ اور تم بھی سنو — سچ یہ ہے کہ سہیل بھائی کی موت کی خبر سن کر مجھے بالکل بالکل صدمہ نہیں ہوا۔ ارے صاحب اسے آپ میری حماقت کہہ لیجئے۔ بچپنہ کہہ لیجئے یا جو کچھ بھی آپ کے جی میں آئے کہہ لیجئے کہ چچا صاحب نے انہیں کھچڑی کی دعوت کھلائی تو مجھے اس لئے بڑی خوشی ہوئی کہ میں نے سمجھا اس بہانے مجھے اتنے بڑے ادیب کی قربت کا موقع ملا۔ مگر حقیقت کیا ہے۔ یہ تو میں اب سمجھا ہوں جب کہ حافظے کا سر سفید ہونے لگا ہے — حقیقت یہ ہے میرے بھائی کہ اس ملک میں اردو کا ادیب بننے سے کہیں بہتر ہے کہ آدمی کہیں کسی چوراہے پر مونگ پھلی کا خوانچہ لگا لے یا آدمی مچھلی کی آڑھت کھول کر بیٹھ جائے۔ مچھلی کا بیوپار کرنے والے کے جسم سے مچھلی کی بو تو نکلتی ہے اور مچھلی کی بو میں زندگی کی پوری علامت موجود ہوتی ہے آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ مگر اس ملک کے اندر اردو کے بیشتر ادیبوں کے جسم سے کیسی بو نکلتی ہے کبھی [illegible] آپ نے ؟ نہیں محسوس کی [illegible]

آپ کبھی سہیل بھائی کے قریب سے گزرے ہوں گے یا ان کے پاس بیٹھے ہوں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ساری زندگی ان کے وجود سے، ان کے سراپا سے قلندری، سادگی اور [illegible] ہو اپنا پن کی بو آتی تھی — اور جانتے ہیں کیوں ؟ ارے بھائی [illegible] اس لئے کہ کوئی ادب دوب نہیں اوڑھ رکھا تھا انہوں [illegible] اس لئے کہ وہ ایک دم سے پھکڑ باباتے پھکڑ بابا [illegible] ... دم کا رم دھوکہ نہ غم۔

انہوں نے پہلی غلطی کی تھی اس ملک میں پیدا ہو کر۔ ان کی دوسری غلطی یہ تھی کہ اس ملک میں بھی انہوں نے بہار کی بے اُنس اور ناقدر شناس سرزمین کو اپنے لئے منتخب کیا اور ان کی تیسری سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ پیشہ انہوں نے [illegible] کر لیا گیسوئے اردو کو سنوارنے کا — تو اس پیشے میں رہ کر اتنے دنوں وہ زندہ ہی کس طرح اور کیوں رہے میرے خیال میں اس پر ریسرچ کی ضرورت ہے۔ یا پھر ریسرچ کا سبجکٹ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے مرنے میں اس قدر تاخیر کیوں کی ؟

میری تو سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ چھوٹا ناگپور اور رانچی کے جنگلوں پہاڑوں میں برسوں اپنے خون جگر سے اردو کی شمع جلانے والے سہیل بھائی کو اتنے دنوں تک آخر کس چیز کا انتظار تھا — کیا وہ اس انتظار میں تھے کہ اردو کو

اس کا حق دلانے کے لئے کیوں وہ اس قدر پریشان تھے ؟ یہ بے چینی کس لئے تھی ان کے اندر ؟ جس اردو کے لئے اور جن اردو والوں کے لئے اپنی زندگی کی آخری سانس تک پھینک گئے کر اپنے جسم کا خاکی پنجرہ الہ آباد سے پٹنہ بھجوا دیا انہوں نے، اردو کے نام نہاد پرستاروں نے آخر کیا دے دیا انہیں؟ صرف منہ پر تعریفوں کے کچھ پھوہڑ شبد اور پیٹھ پیچھے اپنی زلالت اور خباثت ؟ لیکن میں نے تو جب وہ زندہ تھے جب بھی کبھی ان کی تعریف نہیں کی — ارے بھائی، وہ تھے بھی کہاں کسی تعریف کے قابل۔ تعریف کے لائق تو اب صرف دو ہی رہ گئے ہیں۔ ایک خدا صاحب جنہیں ریٹائر منٹ ایج میں پہونچا ہوا سمجھ کر بہت سے لوگوں نے اب یاد تک کرنا چھوڑ دیا ہے دوسرے وہ لوگ جو تعریف و تحسین کے لائق رہ گئے ہیں جو بہت مڑے ریا کار اور چار سو بیس ہیں، جو خوشامدی ہیں چغلخور ہیں۔ بے ضمیر اور بے ایمان ہیں۔ جو ہر طرح کی سیاست میں مکمل دخل رکھتے ہیں — یہاں تک کہ ادب کو بھی سیاست کے بازار میں بھنا کر اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔ مگر وہ جو تھے ہمارے اور آپ کے سہیل عظیم آبادی صاحب، ذرا بتائیے تو کہ ایسا کیا تھا ان میں جو میں ان کی تعریف کرتا ؟ اپنا سرمایہ اپنی جوانی، اپنا خون جگر اور اپنا سب کچھ نثار نے رنگنے کے سوا بھی کچھ کیا انہوں نے ؟

اس لئے میرے بھائی مدیر صاحب! میری بات مان لو۔ ان پر نمبر نکالنے کا کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ سوچو ذرا، جو شخص اپنی تمام عمر میں اپنے لئے کچھ نہیں کر سکا — اب مرنے کے بعد تمہارے لئے وہ کیا کر سکے گا — کیا دے سکے گا تمہیں —؟ جس شخص نے اپنی پوری زندگی کرائے کے چند کمروں میں گذار دی اور جو اپنے بچوں کے لئے ایک چھوٹا سا گھر نہیں بنا سکا، تم کہتے ہو، تمہاری یہ ضد ہے کہ وہ ایک بہت بڑا انسان تھا — وہ ایک نامور ادیب اور ممتاز صحافی تھا ؟ لعنت ہے تمہاری سمجھ پر — تم کس طرح اس شخص کو بڑا کہہ سکتے ہو جو اپنے گھر پریوار کے لئے کتابوں کے ایک جنگل، اپنے حقہ، اپنی عینک، کھادی کے اپنے جوڑے ڈھیلے، بے ڈھلے سفید کرتے اور پاجامے اپنی بچی کچھی تحریروں کے انبار اور صرف آنسوؤں کے بھنڈار چھوڑ کر کسی مجرم کی طرح دھوکر دے کر فرار ہو گیا ہو ؟ جو نکلا ہو کہیں کے لئے اور بھاگ کر کہیں اور جا چھپا ہمیشہ کے لئے — ؟ اس لئے بھائی میرے میری بات مان لو — اس نمبر و مبر کا چکر چھوڑ دو اور جا کر دیکھو تمہارے وہ بہت بڑے افسانہ نگار صاحب مکان مالک کا کرایہ بھی چکا کر گئے ہیں یا نہیں — اوف حد ہو گئی۔ یہ دنیا بھی کیسے کیسے لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ پہچان کا معیار اور مادہ دونوں ہی کسی بال صفا لوشن کے جھٹکے کا شکار ہو کر رہ گیا ہے کہتے ہیں سہیل عظیم آبادی صاحب بہت بڑے، بہت اونچے انسان تھے۔ بہت ہی عظیم فنکار تھے — ارے جناب! یہ مبالغہ چھوڑ دیئے، سہیل صاحب نہ اونچے تھے نہ بڑے بلکہ بہت ہی ناٹے سے تھے۔ اور آپ اپنی اس خوش فہمی کو تو ذرا رفع کیجئے کہ وہ عظیم تھے۔ دراصل وہ عظیم نہیں عظیم آبادی تھے اور چونکہ عظیم آبادی تھے اس لئے عظیم تو وہ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ سنو بھائی صاحب! اردو ادب میں صرف ایک ہی عظیم ادیب پیدا ہوا ہے گلشن نندہ — اور اگر آپ کی یہ ضد ہے کہ وہ ایک ممتاز صحافی تھے تو میں یہ کہوں گا کہ آپ پھر غلطی پر ہیں — وہ ہرگز ایک ممتاز صحافی نہیں تھے ممتاز صحافی تو دہلی والے سلامت علی مہدی، سابق وزیر غلام سرور اور وہ مولانا صاحب ہیں عبدالوحید صدیقی نئی دنیا والے —؟ دیکھ لیجئے، کیا شان ہے، کیا رتبہ کیا مزے اور ٹھاٹ ہیں ؟ ان کی صحافت میں آپ کے لئے کباب سے بڑھ کر ذائقہ ہے۔ ان کے آپ جوم رہے ہیں

ان کی صحافت کی خوراک لے لے کر۔ مگر میرے بھائی! ذرا یہ تو بتلائیے کہ وہ جو تھے آپ کے سہیل عظیم آبادی صاحب انہوں نے آپ کو کون سی ایسی خوراک کبھی دی تھی؟ ارے بھائی، کہاں کس پھیر، کس بھرم میں پڑے ہو کہ وہ کچھ تھے کیوں مرنے کے بعد ادیب بنانے پر تل گئے ہو انہیں۔؟ کہتے ہو بہت بڑے، بہت نامور ادیب تھے۔ حالانکہ اصلیات کو تو صرف میں جانتا ہوں کہ وہ بہت بڑے ادیب کیا بہت چھوٹے ادیب بھی نہیں تھے۔ ... صاحب پوری زندگی کرائے کے چھوٹے سے مکان میں گذار دینے والا کوئی شخص بڑا انسان یا بڑا ادیب کیسے ہو سکتا ہے۔؟ اگر وہ بڑے ادیب ہوتے تو اپنے ہمعصر ادیبوں کی طرح ادبی سیاست کے جوہر دکھا کر کچھ بن نہیں گئے ہوتے۔؟ کب ملا انہیں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ۔ پدم شری ہوتے تو میں بھی تسلیم کر لیتا کہ واقعی وہ بڑے ادیب تھے۔ کبھی امریکہ، روس، جرمنی، جاپان یا کم از کم اسرائیل یا نیپال ہی سے کوئی اعزازی دعوت انہیں ملی ہو تو بتاؤ۔ اس لئے انہیں ادیب مت کہو، مرنے کے بعد بھی یہ دشنام مت دھرو۔ جب تک زندہ رہے جو جی میں آیا کہتے رہے انہیں اور وہ چپ بیٹھے سنتے رہے۔ اب تو بھائی میرے انہیں چین سے رہنے دو۔ اب تو اپنے ایمان کو بیچو اور ان کے متعلق غلط سلط باتیں نہ کرو۔ وہ ادیب نہیں تھے۔ نہیں تھے۔ نہیں تھے۔ ان کے اندر کسی درویش کی، قلندر کی روح حلول کی ہوئی تھی۔ اسی لئے ساری زندگی وہ لاأبالی پن کو اوڑھنا بچھونا بنائے پھرتے رہے۔ وہ سماج میں پھیلے ہوئے افلاس، بےبسی، جہالت، بےچارگی، ناانصافی اور عدم مساوات کی لذت سے اس قدر آشنا تھے کہ انہیں ادیب بن کر ادبی سیاست کی دوکان چمکانے اور سکھ بٹورنے کی لذت اٹھانے کا کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ وہ خیال اگر ہوتا تو کار اور کوٹھی ان کے پاس بھی ہوتی۔ اور چونکہ ان کے پاس نہ کوئی کار تھی نہ کوٹھی۔ چونکہ وہ بہار کے ایک شہر عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور چونکہ ان کا کوئی باقاعدہ ادبی گروہ نہیں تھا جو ان کی عظمت کے ڈھنڈورے پیٹ پیٹ کر ساری دنیا کو حیران و پریشان کر دیتا۔ اس لئے آپ لاکھ سر پٹکیں مگر میں یہ نہیں مانوں گا کہ وہ ایک نامور ادیب تھے۔

... پڑھا ہے آپ نے؟

ضرور پڑھا ہوگا۔ میں نے بھی پڑھا تھا۔

... سچ سنی
جھوٹ مت بول
رب ...

تو بھائی صاحب! میں سچ کہتا ہوں کہ آپ کے جو تھے وہ سہیل عظیم آبادی صاحب دراصل وہ کچھ بھی نہیں تھے اور ادیب تو خیر وہ بالکل ہی نہیں تھے۔ اچھا آپ ضد کر رہے ہیں تو ذرا یہ تو بتائیے کہ دنیا کے بڑے ادیبوں کی طرح انہیں یہ احساس کبھی تھا کہ اگر انہوں نے لکھنا بند کر دیا تو پورا نظام قدرت درہم برہم ہو جائے گا۔؟ اور کچھ نہیں تو کم از کم اردو زبان اور اردو ادب کی تو فوراً موت واقع ہو جائے گی۔ ... نہیں تھا انہیں اس طرح کا کوئی احساس۔؟

ارے بھائی کیسے ہوتا۔ کیوں ہوتا۔ وہ جو ہوتے کچھ تو ہوتا نا؟ کمال ہے۔ عجیب ہٹی آدمی ہیں صاحب آپ بھی۔ اوہ ایڈیٹر ہیں نا۔ آپ تو اپنی ٹر پر رہیں گے ہی۔ مگر میرے بھائی کچھ تو خوف خدا کرو، میں تم سے سینئر ایڈیٹر ہوں۔ تم سے بڑا اور مشہور ایڈیٹر ہوں۔

پھر تو خیال کرو کہ میری باتوں پر یقین کر لینا تمہارے لئے کس قدر ضروری ہے؟ لو — اس پر بھی ناراض ہو گئے کریں آپ سے سینئر اور بڑا ہوں۔ چلئے نہ سہی سینئر اور بڑا — مگر میں ایڈیٹر ہوں یہ تو آپ مانتے ہیں نا؟ تو بھیا دیکھ لو آنکھیں کھول کر۔ دو ایڈیٹروں کی "تُو تُو میں میں" میں حقیقت کا خون ہوا ہے؟ — تمہاری ضد کچھ اور ہے اور میں کچھ اور کہہ رہا ہوں — اچھا تو ایسا کرو۔ ہمارا تمہارا ڈرا رہا۔ فیصلہ تیسرے پر چھوڑ دو — تیسرے ہی نہیں اس میں ایک چوتھے کو بھی شامل کر لو —؟ جاؤ جا کر پوچھ لو لطیف صاحب سے اور شان میاں سے۔ لطیف صاحب ٹریسی کے کسی ڈسپنسری بیوٹر کے یہاں مل جائیں گے — اور شان میاں؟ حد ہو گئی۔ آپ کو یہ بھی پتہ نہیں کہ شان میاں کہاں ملیں گے؟ بھائی وہ ایک جگہ مل جائیں گے۔ محلہ سلطان گنج میں رعنا ہوٹل کی بغل والی اس پان دکان پر [illegible] والی گلی میں سبزی کی دوکان پر آس بوڑھے کونے سے مشغول رہتے ہوتے [illegible] تو خیر میں نے پتہ بتا دیا۔
اب جا کر آپ ان دونوں سے پوچھ لیجئے کہ جو میں کہہ رہا ہوں اور جو آپ سمجھ نہیں رہے ہیں وہی سچ ہے کہ نہیں! ارے بھتیجے جو کچھ ہوتا ہے نا وہ کچھ چھوڑ ہی جاتا ہے مگر وہ کیا چھوڑ گئے آپ کے سہیل عظیم آبادی صاحب — صرف ایک عدد "الاؤ"۔ لیجئے ساری زندگی کچھ تو آپ نے خود [illegible] کی اور اب لطیف صاحب اور شان میاں سارا دھندہ وندہ چھوڑ کر تاپتے رہیں بیٹھ کر۔ ان سے کہئے کہ ہو سکے تو انیس بھائی جان (سید انیس الرحمٰن) شمیم بھائی (مطیع الرحمٰن شمیم) اور انوار بھائی کو بھی اپنے ساتھ کر لیں۔
لیجئے حد ہو گئی — ایک بار جھوٹ اور مبالغے اور خوش فہمیوں کا دھماکہ کر دیا نا آپ نے ——

ارے بھائی، یہ آپ نے کیا فرما دیا کہ وہی ایک "الاؤ" اردو ادب میں ہمیشہ انہیں زندہ رکھے گا اور کہ میں اسی "الاؤ" کی روشنی میں ان کے فن کی تفسیر بیان کروں —— مولانا! دیکھئے برا مت مانئے۔ پٹنے میں ڈاکٹروں کی کوئی کمی تو نہیں ہے، نہ ہو تو حکیم محمد نیاز ہی سے سہی، مگر پلیز آپ اپنے دماغ کا معائنہ ضرور کرا لیجئے۔
ارے صاحب کاہے کو ایڈیٹر بن گئے آپ؟ کس احمق نے یہ سند دے ڈالی آپ کو؟ کسی نے یہ نہیں بتایا آپ کو کہ "الاؤ" کی روشنی روشنی نہیں ہوتی — اس کا دھواں ہوتا ہے دھواں — بہت دور تک پھیلا چوندھیا ڈالنے والا —؟ مگر مشکل یہ ہے کہ اس "الاؤ" یا اس کے دھوئیں سے فن کا نہ تو کوئی رشتہ ہوتا ہے نہ تعلق۔
اور جب "الاؤ" صرف ایک الاؤ ہے تو آپ ہی یہ بتائیے کہ میں اس پر بحث کیا کروں، کیا تفسیر بیان کروں اس کی کہ وہ ہے کیا چیز —؟ اور اس میں سہیل عظیم آبادی صاحب کا فن کن بلندیوں پر پہنچا ہوا ہے — ویسے دیکھئے میں آپ کو بتاتا ہوں۔ "الاؤ" جب کسی عظیم آبادی کا ہو تو اس میں فن وَن بالکل نہیں ہوتا، صرف دھواں ہوتا ہے اور بحث دھوئیں پر نہیں فن پر کی جاتی ہے —— بحث میں کسی یوپی اور پنجاب والے کے فن پر کر سکتا ہوں۔ اس الاؤ پر کیا بحث کروں جس میں نہ کوئی فن ہے نہ حسن ہے کوئی — اور یوں بھی میرے بھائی! یہ بہار والے آپ کے سہیل عظیم آبادی صاحب کب کے فن کار ہوتے؟ یہ سب محض خوش فہمی ہے آپ لوگوں کی۔!
دراصل وہ فنکار تھے ہی نہیں — اگر وہ فنکار ہوتے تو اپنے فن کے بوتے پر کچھ بن جاتے — اس لئے خدا کے لئے آپ میرا یقین کر لیجئے کہ وہ فنکار نہیں تھے — نہیں تھے۔ نہیں تھے — بالکل نہیں تھے ——

[illegible] تو میں ہوں ۔۔۔؟ جب آپ کے سہیل عظیم آبادی صاحب کی تقریباً آدھی عمر اس دشت کی سیاحی میں گذر چکی تھی تو میں پیدا ہوا۔

وا بھنگا کے امیر منزل میں ان کے سر میں چمپی کی ۔ تشتری کے طشتری پان کھلا ئے ۔ دھوبا کے یہاں ان کے کپڑے پہونچا ئے۔ سامنے سے چوکی پیلیں اٹھائی چائے کی پیالیاں بڑھا کر دیں۔ جب وہ پلنگ سے پاؤں نیچے کرنے لگے تو چپلیں سیدھی کر کے دیں۔ ایک بار ان کے ایک پیر میں موچ آگئی تو دیر تک بیٹھ کر تیل کی مالش کی [illegible] مظہر امام صاحب کا حکم ہوا اندر سے آگ لے آؤ اور سینک لگاؤ۔ اور میں اس وقت تک بیٹھا سینکتا رہا جب تک آگ بجھ نہیں گئی ۔۔۔ اور اندر میرے [illegible] کے بھیتر کی گپھاؤں میں ایک دوسری آگ سی دہکنے لگی [illegible] یہ آگ اُن کی محبت، ان کی شفقت اور ان کے سلوک [illegible] کی مہک کی آگ تھی ۔۔۔ میں نے ان سے یہ جانا، ان سے [illegible] سیکھا کہ آدمی لکھتا ہے اور میں بھی لکھ سکتا ہوں ۔۔۔ پھر میں نے بھی قلم تھام لیا ۔ میں نے بھی قلم بازی کو، پتا دیں دا یاں اور اپنا پیشہ بنا لیا۔ اور اس پیشے میں رہ کر اسی [illegible] اور صحافت کی کھیتی سے دھن سنگرہ کر میں نے اپنا ایک گھر بنا لیا۔ گھر بسا لیا میں نے اور آج مزے میں اس گھر [illegible] اس گھر کی گرہستی کو چلا رہا ہوں ۔۔۔ میں نے اپنی زندگی [illegible] کے صرف بارہ برس کرائے کے مکانوں میں گذارے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی گذار دی کرائے کے مکانوں میں [illegible] کیوں ؟

[illegible] اس لئے کہ میں اصل معنی میں فنکار ہوں، [illegible] فن کو اوڑھنے بچھونے کی حد تک سمجھ چکا ہوں جو کسی [illegible] انسان کو ایک گھر اور آسانی سے روزی دے سکتا ہے مگر جب وہ فن سے واقف نہیں تھے۔ جب وہ فنکار نہیں تھے تو آپ کیوں انہیں فنکار کہتے ہیں ۔۔۔؟ یہ فن اور فنکار دونوں کی تذلیل ہے۔ گالی ہے دونوں کو ۔ آپ کہتے ہیں کہ وہ ایک مہاپرش تھے۔ یوگی تھے، سادھو سنیاسی تھے ۔ فقیر تھے، قلندر تھے ۔ آپ نے پانچویں درویش تک کی بابت کتابوں میں پڑھا ہوگا۔ وہ آپ کی اس زمین پر چھٹے درویش تھے۔ آپ نے [illegible] درویش صاحب سے ملاقات [illegible] خون کے رشتے کی طرح تھا [illegible] اُن سے میں لڑ ا بھی کرتا تھا ۔۔۔

جن دنوں آکاشوانی پٹنہ میں وہ اردو پروڈیوسر تھے انہیں دنوں کا ایک واقعہ سن لیجئے ۔۔۔ ایک بار سیفی صاحب (اب ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن) [illegible] اپنے کسی افسانے کی ریکارڈنگ کے سلسلے میں [illegible] وہ بہت غصہ کر کے اپنے ساتھ [illegible] جاتے وقت میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ [illegible] آپ لے تو جا رہے ہیں مجھے مگر دیکھ لیجئے گا اگر جو مجھے ٹوکا انہوں نے تو ایک پتھر دھر دوں گا اور بھاگ آؤں گا۔ شمیم بھائی نے مجھے بہت سمجھایا تھا کہ وہاں میں ایسا کچھ نہیں کروں گا ۔ سہیل بھائی از گریٹ [illegible] بہت ہی پیارے انسان ہیں ۔ مگر جو ہونی تھی سو ہو گئی ۔۔۔؟ [illegible] ہم لوگ ریڈیو اسٹیشن کے ان کے دفتر میں بیٹھے تھے گفتگو کے دوران سہیل بھائی نے کہا "اس کے بعد والے شیڈول میں تمہاری کہانی رکھوں گا۔ کنٹرکٹ تمہارے پاس وقت پر بھیج جائے گا" مگر ادھر انہوں نے بات ختم کی اور اُدھر [illegible] ایک گولہ میں نے داغ دیا "جی نہیں مجھے کنٹرکٹ و نٹرکٹ مت بھیجوائیے گا کیونکہ جب تک آپ اس کرسی پر ہیں میں ریڈیو پروگرام میں شریک نہیں ہوں گا" میرا لہجہ بے حد جارحانہ اور تلخ تھا۔

۔ وہ ہنسنے لگے ۔ " دیکھتے ہو شمیم، یہ لڑکا کتنا بڑا ہو گیا ہے ؟ " انہوں نے کہا اور پھر میری طرف مخاطب ہوتے " عزیزم، آپ جو سمجھ رہے ہیں، بات وہ نہیں ہے۔ دراصل مقامی لوگوں کی بھیڑ بھاڑ میں بھول جاتا ہوں "

۔ مگر جناب خدا کی قسم، ان کی اس خلوص بھری صفائی کا مجھ پر رائی رتی بھر بھی اثر نہیں ہوا۔ جب تک وہ [illegible] ہیڈ ڈپسرر ہے میں نے ہر دعوت رفیوز کیا یہاں تک کہ جب مظہر امام صاحب نے اردو سروس کا چارج لیا تو کچھ دنوں بعد ان کا مجھے ایک خط ملا " اب اگر کوئی پروگرام تمہیں دیا جائے تو تم قبول کروگے یا نہیں ؟ "

تو دیکھ لی نہ آپ نے میری شان : ورمیری اکڑ آج شمیم سیفی صاحب اڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کی کرسی پر بھلے بیٹھے ہوں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی بھانسے اور جھوٹ کے عادی انسان ہیں۔ منہ میں آیا اور کہدیا مجھ سے " سہیل بھائی از گریٹ " : خاک گریٹ تھے وہ ۔ ؟ ارے صاحب گریٹ تو میں ہوں کہ میں نے سامنے بیٹھ کر انہیں پتھر رسید کر دیا اور وہ ایکدم سے سہما کر رہ گئے ۔ مگر جانتے ہیں کیوں ؟ کیونکہ وہ مجھ سے بہت ڈرتے تھے ۔ کیونکہ میں ان کے پاؤں دبا کر اور ان کے سر میں چمپی کر کے بہت بڑا ادیب اور بہت بڑا فنکار بن گیا تھا۔ کیونکہ گورو جی گرو رہ گئے اور چیلا چینی رام بن گیا تھا ۔ اور چینی رام جیسے چیلے سے تو ہر انسان کو ڈرنا ہی پڑتا ہے ۔ ؟ مگر جب میں نے اور شمیم سیفی صاحب نے ہفتہ وار " ہم اور آپ " کا اعلان کیا۔ اور میں نے انہیں خط لکھا کہ آپ فوراً جدیدیت پر ایک عدد مضمون لکھ کر بھیج دیجئے تو مارے ڈر کے فوراً انہوں نے جواب دیا ۔

" دونوں کان ایسے بند ہیں کہ کچھ سن نہیں سکتا اور سر میں مستقل درد سا۔ عجیب حال ہے۔ میں تمہارے لئے ضرور لکھوں گا۔ ذرا موجودہ حال سے نکل لوں ۔ میں نے ایک مضمون جدیدیت پر ضرور لکھا ہے۔ اچھا یا برا۔ اس کا فیصلہ دوسروں کو کرنا ہے۔ اب ضرورت کے لحاظ سے اس میں کسی قدر ترمیم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ ترمیم کر کے بھیج دوں گا ...... تم یقین جانو میں تم سے خفا نہیں ہوں۔ تم مجھے بے حد عزیز ہو۔ تمہاری صلاحیتوں کی قدر کرتا ہوں۔ بس ذرا " نرم " بن جاؤ۔ ہر وقت گرم رہنا اچھا ادب تخلیق کرنے کے لئے یہ بہت ضروری [illegible]

(۲۳ر اکتوبر ۱۹۶۹ء)

دیکھا آپ نے ۔ ؟ مل گیا نہ آپ کو ثبوت کہ گریٹ وہ نہیں تھے میں گریٹ ہوں ۔ ؟ اور چونکہ میں گریٹ تھا ۔ میں گریٹ ہوں۔ اس لئے ان پر میری گریٹنس کا رعب بھی طاری تھا ۔ ورنہ شمیم سیفی صاحب کے بقول اگر سچ مچ وہ گریٹ ہوتے تو مجھ سے کہہ سکتے تھے " میاں شوکت خلیل : ابھی تو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں کہ تم نے قلم پکڑا ہے۔ تمہارے منہ سے ابھی بھی ماں کی چھاتی کے دودھ کی بو آرہی ہے ۔ اور ابھی سے لگے بڑوں پر پتھر پھینکنے ۔ ؟ میاں : پہلے بڑوں کا ادب کرنا سیکھو ۔ پہلے بات کرنے کا سلیقہ پیدا کرو تو پھر ادب کی تخلیق کرتے رہنا [illegible] انہوں نے مجھے ایسا کچھ بھی نہیں کہا خدا کی قسم [illegible]

[illegible] ۱۹۷ ء کی بات ہے۔ ان دنوں وہ اکثر در بھنگہ آتے رہتے تھے اور مجھ سے ضرور ملتے تھے۔ ایک بار بہت جلدی میں تھے۔ مجھ سے ملے بغیر چلے گئے۔ مجھے معلوم ہوا ۔ میں نے فوراً انہیں بذریعہ خط ایک لیٹر رسید کردی۔ ایک ہفتہ بعد جواب ملا " برادرم خفا مت ہوئیے۔ میں بہت جلدی میں تھا اسلئے نہیں مل سکا ۔ "

اس کے بعد پھر وہ دربھنگہ آئے شمیم سیفی کے یہاں ٹھہرے اور آنے کے کچھ ہی دیر بعد انہیں ساتھ لے کر مجھ سے ملنے آئے۔ "دیکھو شمیم، میں اس لڑکے سے بہت ڈرتا ہوں۔ یہ بالکل پٹھان ہے۔ فوراً لٹھ مار دیتا ہے۔"

دیکھا آپ نے؟ اب تو مان گئے نہ کہ وہ کسی بھی راوی سے گریٹ نہیں تھے؟ مجھ سے بڑے فنکار نہیں تھے۔ حد تو یہ کہ مجھ سے بڑے انسان بھی وہ نہیں تھے؟ جو بڑا ہوتا ہے وہ بار بار کی دو کوڑی کی حیثیت والے انسان کو اس کی بے ہودگیوں کو درگزر کر کے گلے لگاتا ہے کیا!

۱۹۷۰ء میں ہی پٹنے سے انہوں نے ہفت روزہ "حال" کا اجرا کیا تھا۔ میرے پاس "حال" کا شمارہ بھجوایا تو میں نے اس پر ایک زبردست قسم کا کمنٹ لکھ کر بھیجا۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے ایک خط مجھے لکھا۔ "برادرم! تمہارا طویل خط مل گیا۔ میں نے سارا خط بڑی دلچسپی کے ساتھ بار بار پڑھا۔ اور لطف اٹھاتا رہا۔ تم نے جو باتیں لکھی ہیں اپنے خیال کے مطابق درست ہی لکھی ہیں۔ تم جوان ہو لہو میں حرارت ہے۔ اب میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔ البتہ اس کا یقین ہے کہ وقت تم کو بھی ایک دن وہیں لا کر کھڑا کر دے گا جہاں آج میں کھڑا ہوں۔" (۱۹ستمبر ۱۹۷۰ء)۔

دیکھا آپ نے؟ ملاحظہ فرمایا نہ اپنے سہیل عظیم آبادی صاحب کی تلخ کلامی کا نمونہ؟ بہت خفا ہوئے اور بہت جھنجھلاتے تو عمر کا طعنہ دے کر کوسنے بیٹھ گئے۔ "... وقت تمہیں بھی ایک دن ......"

مگر میں پوچھتا ہوں آپ سے۔ آپ ہی بتائیے انہوں نے اس دن کا انتظار کیوں نہیں کیا جب وقت مجھے بھی بوڑھا بنا دے گا؟ ذرا تصور تو کیجئے اس وقت کا۔؟ وہ وقت کتنا عظیم بن جاتا جب بوڑھا جارہا شوکت خلیل، بوڑھے، بہت بوڑھے ہو چکے اپنے سہیل بھائی کے سر میں چمپی کر رہا ہوتا۔ جب وہ ان کے موچ لگے پیر میں کوئلے کی آگ پر گرم کئے تیل کی سینک لگا رہا ہوتا اور یہ کہہ رہا ہوتا۔ "آپ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں سہیل بھائی۔ میں نے بہت بہت دل دکھایا آپ کا۔ آپ کے سامنے ہمیشہ میں بڑا منہ چھوٹ بنا رہا۔ مگر آپ یقین کیجئے، خدا کی قسم یقین کیجئے آپ کہ میرے اندر کبھی کوئی اور بات نہیں رہی۔ میں جب بھی آپ سے لڑا، جب بھی میں نے شوخی کی، اس معصوم، شریر اور ہٹی بچے کی طرح کی جو اپنے بے حد شفیق باپ کا چہیتا، بڑا دلارا خود کو محسوس کرتا ہے اور آپ بھی تو ہمیشہ یہی سمجھ کر مجھے معاف کرتے رہے اس بار بھی معاف کر دیجئے نا۔ معاف کر دیجئے نا سہیل بھائی۔ معاف کر دیجئے نا

گذشتہ سال جب میں جیل سے چھٹنے کے بعد پٹنہ گیا اور سہیل بھائی سے ملا تو شبیر (شبیر احمد) کے سامنے ہی انہوں نے میری درگت بنا کے رکھ دی تھی۔ "کتنی بار آپ سے کہا کہ گورنمنٹ اور ایڈمنسٹریشن سے لڑا مت کیجئے۔ ذرا نرم بن جائیے۔ ہمیشہ گرم مت بنے رہئے۔ اس سے حاصل کچھ بھی نہیں ہے نقصان ہی نقصان ہے اس میں۔ مگر آپ تو سمجھتے ہیں ہم بوڑھے لوگ بس یوں ہی بکواس کیا کرتے ہیں۔" ان کی خفگی میں شامل محبت کا اور اپنائیت ملی ہوئی ڈانٹ ڈپٹ کا وہ جو ایک بے حد انوکھا سا انداز تھا، عمر بھر میں کبھی اُسے بھولنا بھی چاہوں تو نہیں بھول سکوں گا۔ وہ انداز جان لیوا بھی تھا اور جسم کے پور پور سے ہوئے پنجرے کو حرارت عطا کرنے والا بھی۔ بول بک کر وہ لگاتار حقہ پئے جارہے تھے۔ پورے کمرے میں ان کے حقے کی

گڑگڑاہٹ کے سوا مکمل خاموشی تھی۔ مگر وہ خاموشی بھی کسی بم کے دھماکے کی طرح اچانک ٹوٹ گئی "لیجئے حقہ پیجئے!"

وہ حقہ کو نے میری طرف بڑھا رہے تھے مگر میری طرف دیکھ نہیں رہے تھے۔ مجھ سے منہ پھیر رکھا تھا انہوں نے — آپ سوچ سکتے ہیں مجھ پر وہ وقت کیسا گذرا ہوگا۔ ساری زندگی میں نے جتنی بھی بے ادبیاں اُن کے ساتھ کی تھیں۔ جتنی جتنی گستاخیوں اور شرارتوں سے اُن کے ساتھ پیش آتا رہا تھا اُن سب کا جیسے یک ساتھ ہی وہ جواب دے رہے تھے میری طرف حقہ بڑھا کر — میں نے گھبرا کر شبیر کی طرف دیکھنا شروع کیا مگر وہ نالائق مجھ سے ہمدردی کرنے کی بجائے اُلٹے میرے حال پر مسکرا رہا تھا۔ جیسے دیکھ رہا ہو "لو بیٹے اچار یہ جی اب ان کے عتاب کو بھگتو بیٹھ کر" مگر جی میں آیا سہیل بھائی کے حقے کی دہکتی ہوئی چلم لے کر اس کی بڑھی ہوئی بدشکل توند پر اُنڈیل دوں مگر اس وقت وہ بھی میں نہیں کر سکا۔ میں نے نظریں نیچی کر لیں۔ دھیرے سے کہا "جی میں حقہ نہیں پیتا سہیل بھائی!" اور اس کے ساتھ ہی اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کی ڈھیر ساری خوشگوار دھوپ پھیل گئی تھی "ٹھیک ہے جو ہوا اس پر زیادہ سوچنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ مگر آئندہ آپ اپنے اخبار کی پالیسی پر لیجئے۔ سب سے لڑنا بھی ٹھیک نہیں ہے"

"جی ہاں۔ آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں" میں نے ہمت کر کے ایک لمحہ کو ان کی طرف دیکھا تھا — وہ ایک ایسے شخص کا چہرہ تھا۔ محبت اور خلوص و وفا کے ہزاروں رنگوں سے نہایا ہوا جس نے تمام عمر ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سبھوں سے یکساں محبت کی تھی۔ جس کے نزدیک سارے لوگ صرف ایک قوم تھے۔ جس نے جنگ آزادی کی تحریک میں حصہ لیا تھا۔ جس نے بابائے اردو کا دست راست بن کر اردو کی تحریک چلائی تھی — جسے پریم چند سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اور کرشن چندر، رضیہ، ڈاکٹر اورینوی، عباس، کنہیا لعل امرت رائے اور رتنا کا وغیرہ جس کے ہمعصر تھے۔ جس کی ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے لے کر انصاری صاحب اور رفضل صاحب تک بڑی عزت کیا کرتے تھے — میرے سامنے اس شخص کے چہرے کے نقوش ہر لمحہ بدلے چلے جا رہے تھے — میں گھبرا رہا تھا کہ اب اور نہ جانے کیا کہیں گے وہ — تب ایک بار پھر سے ان کی آواز ابھری تھی "چلو ٹھیک ہے تمہارے جیسے ایک ادیب، صحافی اور سوشل ورکر کے لئے جیل جانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اب تمہیں جیل کی زندگی کا بھی تجربہ ہو گیا" اور وہ مسکرانے لگے تھے۔

آج سہیل بھائی ہوتے تو میں اُن سے کہتا "سہیل بھائی مجھے جیل کی زندگی کا تجربہ پچھلے برس ہی ہو چکا تھا۔ مگر اس زندگی کا تجربہ نہیں تھا جس میں کسی عظیم فنکار، ممتاز صحافی اور آپ کی سی محبت سے بھرے دل والے بزرگ دوست، رہنما اور بھائی کی جدائی کی اچانک خبر ملتی ہے — جس میں ہمیشہ کے لئے اس کے بچھڑ جانے کا ایک بہت بڑا غم ہوتا ہے — اور ہوتا ہے ایک عجیب سا خالی پن اور اس خالی پنجرے جیسا سونا پن جس کا شو گا اپنی چونچ سے بڑی چالبازی سے پھاٹک کھول کر دور بہت دور آسمانوں میں پرواز کر گیا ہو — بٹ یو آر گریٹ سہیل بھائی، یو ڈاؤٹ — شمیم سیفی صاحب نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ آپ سچ مچ بہت گریٹ تھے — مجھے آپ نے زندگی کے اس اذیت ناک تجربے کی لذت سے بھی آشنا کرا ہی دیا — البتہ اس کا یقین ہے کہ وقت مجھے بھی ایک دن وہاں ضرور پہونچا دے گا جہاں آپ چپکے سے بھاگ کر چلے گئے ہیں — پھر میں وہاں چھوڑوں گا نہیں آپ کو، خوب لڑوں گا اور سر میں چمپی بھی نہ دوں گا۔"

عشرت کرتپوری

بڑے بھائی

ابھی زکی انور کا غم ہلکا بھی نہ ہوا تھا کہ جب [illegible] سہیل عظیم آبادی جنہیں میں ہمیشہ بڑے بھائی کہا کرتا [illegible] اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ سال بڑا منحوس ثابت [illegible]۔ اپریل میں زکی انور، نومبر میں بڑے بھائی اور جب [illegible] یہ تاثرات قلم بند کر رہا ہوں ایک اور عزیزہ بیگم زکی [illegible] کو کھو چکا ہوں۔ مرثیے لکھوں تو کس کس کے۔ لکھوں تو کہاں تک۔ اب تو آنکھوں میں آنسو بھی خشک ہو چلے ہیں ؏

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

۳ر اکتوبر کو بڑے بھائی کا ایک لفافہ ملا [illegible] جس میں زکی انور کے بڑے بچے چنو میاں کے لئے عالی جناب عبدالحمید صاحب واقف متولی ہمدرد دواخانہ سے وظیفہ سے ۱۲ ہوار پر خوشی اور اطمینان کا اظہار — زکی کی قبر کے لئے کتبہ تیار کرا کر روانہ کرنے پر [illegible] سے نوازا تھا۔ اسی لفافہ میں دہلی کا پروگرام بھی تھا [illegible] میں مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں ۱۷، ۱۸ر نومبر کو اردو گھر [illegible] فون کر کے بات چیت کر لوں۔ میرے پاس اردو گھر کا نیا فون نمبر نہیں تھا۔ ۲۲ر کو اہلیہ کے ہمراہ اپنے [illegible] صاحب جو ان دنوں صفدر جنگ ہسپتال میں زیر علاج تھے [illegible] گیا۔ واپسی پر اردو بازار میں ٹھہرا اور ہماری زبان آفس میں ٹیلی فون نمبر معلوم کرنے گیا جیسے ہی میں پلٹا بڑے بھائی اور نثار احمد فاروقی نظر آئے۔ ملاقات ہوئی۔ والد صاحب کی بیماری کے متعلق دریافت فرمایا اور خیریت معلوم کی۔ پندار کے زکی انور نمبر کا بھی ذکر آیا۔ اس نمبر میں سید شمیم احمد شمیم کے مضمون رائیگاں لہو کا بھی ذکر آیا۔ میں [illegible] مضمون کے اس حصہ کی طرف توجہ دلائی جس میں موصوف نے زکی انور کو سچا مسلمان ثابت کرنے کے لئے تحریر فرمایا ہے کہ "وہ اپنی چھوٹی بڑی ضرورتوں کا سامان صرف مسلمان دکانداروں سے خرید تے تھے۔" فرمانے لگے کہ واقعی یہ ایک بڑا الزام ہے۔ میں نے مضمون پڑھا [illegible] پٹنہ جا کر پڑھوں گا [illegible] متعلق لکھوں گا۔ کتبہ کے سلسلے میں بھی بات ہوئی۔ نثار احمد فاروقی کو برہان کے دفتر میں کوئی کام تھا۔ وہ کہنے لگے کہ ہم لوگ وہاں ہو آئیں۔ پھر کسی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پئیں گے وہ تو برہان کے دفتر چلے گئے میں رشید [illegible] میں آکر بیٹھ گیا۔ [illegible] منٹ کے بعد میں نے جا کر [illegible] کے تقریباً تمام ہوٹلوں میں تلاش کیا نہیں ملے۔ یہ تھی آخری ملاقات۔ بالکل پہلی ملاقات کی طرح جو اسی طرح اچانک اور مختصر تھی۔

یہ غالباً ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ میں ایک کام کے سلسلہ میں پٹنہ گیا ہوا تھا۔ میرا قیام سلطانیہ ہوٹل میں تھا۔ اسی کے سامنے ایک تاج ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس دن کچھ زیادہ ہی سردی تھی۔ میں چائے پینے ہوٹل میں پہونچا۔ چائے کا آرڈر دیا۔ اتنے میں میری میز پر ایک صاحب آکر بیٹھے اور چائے کے لئے کہا۔ بیرہ جو میری چائے لے کر گیا تھا وہ چائے میری بجائے ان کے سامنے رکھدی۔ میں نے بیرہ کی اس بات پر اعتراض کیا اور کہا چائے کا آرڈر پہلے میرا تھا۔ بیرہ سے اس بات پر کافی گرما گرمی ہوئی۔ وہ صاحب خاموشی سے تمام باتیں سنتے رہے۔ جب بات زیادہ بڑھی تو ان صاحب نے فرمایا کہ لو بھئی یہ چائے آپ ہی پی لیں میرے لئے اور آجائے گی۔ چونکہ بات اصول کی تھی اس لئے انہوں نے بیرہ کو بڑے پیار سے ڈانٹا اور مجھ سے فرمایا کہ یہ بیرہ کی غلطی تھی۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے اور منگائے لیتے ہیں۔ ان کے پرخلوص سلوک اور لہجہ نے بے حد متاثر کیا۔ تعارف ہوا تو یہ تھے بڑے بھائی سہیل عظیم آبادی۔ میں ان سے غائبانہ طور پر متعارف تھا۔ اور پھر کئی سال بعد غالباً ۱۹۵۲-۵۳ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس میں ملاقات ہوئی اور یہ ملاقات دائمی تعلقات کا سبب بن گئی۔ ان تعلقات کے استحکام میں زکی انور کو بڑا دخل تھا۔ جتنے دن وہ دہلی میں ریڈیو پر رہے۔ دوسرے تیسرے ملاقات ہوتی تھی۔ وہ غریب خانہ پر بھی تشریف لاتے اور میں بھی ان کے یہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ انہوں نے کشمیر یونٹ میں میرے لئے جگہ بھی نکالی تھی۔ مگر میں نے دواخانہ کی ملازمت چھوڑنی پسند نہیں کی۔ یہاں سے جاکر انہوں نے تہذیب نکالا۔ ۱۹۶۴ء میں ایک مقدمہ کے سلسلہ میں بیگو سرائے جانا پڑا۔ واپسی پر ہمدرد کی برانچ میں قیام تھا۔ خاں صاحب منیجر ہمدرد برانچ سے بڑے بھائی کا فون نمبر معلوم کر کے فون کیا۔ فرمایا کہاں ہو۔ میں نے بتایا۔ فرمایا دفتر کے باہر کھڑے ہو جاؤ۔ میں پہونچ رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں پہونچ گئے اور پھر سارے دن اپنے احباب اور ادبی شخصیتوں سے ملاتے پھرے۔ رات کا کھانا گھر پر کھلایا جب رخصت کیا۔ اس کے بعد میری زندگی میں متعدد انقلاب آئے۔ ۱۹۶۶ء میں حیدرآباد تبادلہ ہوگیا اہلیہ کا انتقال ہوا۔ ان انقلابات کے طوفان میں بڑی [illegible] پایا لیکن کئی سال تک اپنا ستم اٹھانے روزگار رہنے کے بعد بھی ان کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ زکی کے ذریعہ ان کی خیریت اور حالات معلوم کرتا رہا۔ مراسلت ختم ہو گئی تھی۔ ۱۹۷۰ء میں میرے نئے مجموعہ کلام شاخ برہنہ پر اتر پردیش اردو اکاڈمی نے انعام سے نوازا تو سب سے پہلا مبارکباد کا خط بڑے بھائی کا آیا۔ اور اس طرح مراسلت پھر شروع ہو گئی۔ ۱۱ر اپریل ۱۹۷۹ء کو میرے اور ان کے درمیان کی کڑی زکی انور ٹوٹ گئی ۱۵ر اپریل کو میں نے انہیں اطلاع دی۔ اتفاق دیکھئے۔ اسی تاریخ کا لکھا ہوا ان کا خط مجھے ۲۰ر اپریل کو ملا۔ وہ زکی کے سلسلہ میں بہت کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن سیاسی حالات کی تبدیلی ناہمواری نے انہیں مجبور کر دیا تھا۔ اس کا شکوہ انہوں نے مجھے لکھے گئے خطوط میں کیا۔ پھر بھی جیسا انہوں نے پسماندگان کے لئے کیا وہ بہت ہے۔ جون ۱۹۷۹ء میں جمشید پور جاتے ہوئے پٹنہ ٹھہرا۔ سہیل بھائی سے ملا۔ پروگرام جمشید پور ساتھ چلنے کا تھا مگر وہ علالت کے باعث ساتھ نہیں دے سکے۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ زکی کے غم نے انہیں گھلا دیا ہے۔

وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئے تھے۔

۳۰۔ ۳۲ سال کے تعلقات کو چند صفحات میں سمیٹنا مشکل ہے پھر بھی میں نے کوشش کی ہے مختصراً کہہ سکتا ہوں بڑے بھائی واقعی ایک بڑے انسان، بڑے ادیب، بڑے صحافی اور بہت بڑے افسانہ نگار تھے۔ وہ پریم چند کے سلسلہ کی آخری کڑی تھے۔ ان کا بڑا پن یہ بھی تھا کہ وہ چھوٹوں سے بھی برابر کی گفتگو کرتے [illegible] مسائل میں دلچسپی لیتے۔ وہ اس لئے بڑے انسان تھے کہ ان سے میں نے آج تک کسی کی برائی نہیں سنی۔

بڑے بھائی کے ادبی مرتبہ کا یقین تو بہت پہلے ہو چکا ہے۔ میں تو اتنا سمجھتا ہوں کہ ایک اچھا انسان ہی بڑا فنکار ہو سکتا ہے وہ ایک اچھے انسان تھے۔ بے ضرر [illegible] تھے غالباً کسی کو نقصان نہیں پہونچا اسی لئے وہ ایک بڑے فنکار تھے۔ !!!

آمر صدیقی

سہیل عظیم آبادی

وہ ایک قطرہ تھا قطرے میں ایک دریا بھی
وہ انجمن تھا مگر انجمن میں تنہا بھی

وہ اپنی ذات سے سنگم تھا دو زمانوں کا
اسے عزیز تھا ماضی بھی اور فردا بھی

اداشناس سیاست کے کج کلاہوں کا
مگر نہ بھیک میں مانگا کسی سے عہدہ بھی

لیا نہ کام کبھی مصلحت پسندی سے
وہ سرخرو بھی ہوا دوستوں میں رسوا بھی

خود اپنے سعی و عمل سے بصد خلوص و نیاز
بڑا اس نے کیا آدمی کا درجہ بھی

اُسے تھا ربط ہریجن سے، آدی باسی سے
اسے پسند تھا گاندھی بھی اور برسا بھی

وہ ایک نام ترقی پسند ادیبوں کا
مگر بھلا نہ سکے گا جدید طبقہ بھی

وہ باشعور صحافی تھا عہدِ حاضر کا
اسے قلم پہ تھا ایمان بھی بھروسہ بھی

گلہ بھی تھا روشِ حامیانِ اردو سے
زباں کے واسطے لڑنے کا تھا سلیقہ بھی

سہیل سہل نگاری کا کوئی نام نہیں
لکھا جو اس نے حقیقت بھی ہے فسانہ بھی

اگرچہ اس نے سفر میں سفر تمام کیا
مگر پہنچ کے وطن آخری قیام کیا

ابوعبیدہ ابدالی
(اسلام پور، نالندہ)

سہیل عظیم آبادی شخصیت کے آئینے میں

ہندوستان میں کئی قابل فخر اور موجب نازش ہستیاں ایسی گذری ہیں جن کی ذات سے اردو ادب کو فروغ ہوا اور یہاں ادبی فضا قائم ہوئی۔ سہیل عظیم آبادی بھی انہیں موجب نازش ہستیوں میں سے ایک تھے۔ سہیل عظیم آبادی ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو علمی، ادبی اور مذہبی اعتبار سے باعث افتخار رہا ہے۔ سہیل عظیم آبادی کا نام مجیب الرحمن تھا لیکن ادبی دنیا میں سہیل عظیم آبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی پیدائش ۱۹۱۱ء میں عظیم آباد میں ہوئی ان کے والد زمیندار ہوتے ہوئے بڑے مخلص اور دل صفت انسان تھے۔ ان کا انداز بیان اتنا دلکش اور مدلل ہوتا تھا کہ بہت جلد لوگ آپ کے مداح بن جاتے۔

سہیل عظیم آبادی کی تعمیر و تشکیل میں ان کے ذی علم ادبی خاندان کا خاصا ہاتھ رہا لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کے اندر خلاقانہ صلاحیت بھی موجود تھی۔ ان کی تعلیم و تربیت والدین کے سایہ عاطفت میں ہوئی اس لئے ان کی زندگی پر والدین کی طبیعت کا گہرا اثر پڑا۔ ان کے والد حبیب الرحمن صاحب کی دلی خواہش تھی کہ سہیل عظیم آبادی حافظ قرآن اور عالم دین بنے۔ اسی مقصد کے تحت انہیں مدرسہ شمس الہدیٰ میں داخل کر دیا۔ لیکن سہیل عظیم آباد کی طبیعت اس طرف مائل نہ تھی۔ سہیل عظیم آبادی کی طبیعت انگریزی تعلیم کی طرف زیادہ مائل تھی اور وہ اسکول میں تعلیم

لگے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مذہبی احکام کی پابندی نہ کرتے ہوئے بھی مذہبی تقدس کا خیال ہمیشہ رہا اور زندگی کے آخری لمحہ میں مذہب کا پیروی کرنے لگے اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہو گئے تھے۔ یہ بات تو منیوٹیہ ... پرکلین نے کہی۔

سہیل عظیم آبادی تعلیم کے سلسلے میں کلکتہ تشریف لے گئے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری تھا کہ ادب اور سیاست سے گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا اور وہ کلکتہ کے اخباروں میں مدیر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ان کو شعر و ادب سے کافی دلچسپی تھی اس لئے شعر کہنے لگے اور ان کی اکثر غزلیں شائع بھی ہوئیں لیکن جلد ہی شاعری کی طرف سے توجہ اپنے احباب ڈاکٹر اسید اور پروفیسر جمیل مظہری کے اشارے پر ترک کر کے ان کے خیالات کا احترام کرتے ہوئے افسانوی دنیا میں قدم رکھا۔ اور ان کا پہلا افسانہ "سحر نغمہ" کے عنوان سے جب شائع ہوا تو ادبی دنیا میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ارباب علم و فن نے اس کی خوب خوب داد دی اور اس کا اثر سہیل عظیم آبادی کی شخصیت پر اس طرح پڑا کہ وہ باضابطہ افسانے لکھنے لگے۔ اسی زمانے میں سہیل عظیم آبادی کو چند عظیم شخصیتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جن میں پریم چند، مولانا ابو الکلام آزاد، آغا حشر کاشمیری اور برج نرائن چکبست وغیرہ شامل ہیں۔ پریم چند کی شخصیت کا اثر سہیل عظیم آبادی

گہرا پڑا اور وہ پریم چند اسکول کے منفرد اور نمائندہ افسانہ نگاروں میں شمار ہونے لگے۔ ڈرامہ نگار کی حیثیت سے آغا حشر کاشمیری اور صحافت نگار کی حیثیت سے ابوالکلام آزاد کی شخصیت نے کافی متاثر کیا۔ سہیل عظیم آبادی ایک سیاسی آدمی بھی تھے۔ کلکتہ کی ادبی اور سیاسی زندگی میں نمایاں خدمات انجام دینے کے بعد ان کی طبیعت بہار کی طرف متوجہ ہوئی اور ادبی خدمات کے فروغ کے لئے خود کو وقف کر دینا ان کی زندگی کا لائحہ عمل ثابت ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۶ء میں کلکتہ سے واپسی کے بعد کانگریس سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے اور ایک سماجی رکن کی حیثیت سے ادب کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اسی زمانہ میں بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی اور ان کے رفقاء کاروں میں شمار کئے جانے لگے۔ عبدالحق صاحب کی نگرانی میں اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور اردو ادب سے روشناس کرانے کے لئے باضابطہ ایک ادارہ رانچی میں قائم کیا جو چھوٹا ناگپور مرکز کے نام سے آج بھی جانا جاتا ہے۔ اس مرکز کے قائم کرنے کی غرض و غایت یہ تھی کہ آدیباسیوں میں اردو زبان کو مقبول عام بنایا جائے اور اس سے دلچسپی پیدا کی جائے۔ اس مقصد میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

قبل عرض کر چکا ہوں کہ سہیل عظیم آبادی صحافت سے بہت قریب آ چکے تھے اسی لئے انہوں نے ۱۹۵۱ء میں پٹنہ آ کر صحافت کی طرف رجوع کیا اور روزنامہ "ساتھی" جاری کیا۔ لیکن جلد ہی اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنے ایک عزیز دوست سابق وزیر عبدالقیوم انصاری مرحوم کے اصرار پر ان کے ساتھ ماہنامہ "تہذیب" جاری کیا جو بے حد مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ رسالہ نکالے مثلاً چندا سے لے کر ہندوستانی کہانی وغیرہ ـــ لیکن متحرک شخصیت کو ایک جگہ سکون کہاں پھر سہیل عظیم آبادی نے ۱۹۵۶ء میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کر لی اور کشمیر چلے گئے۔ وہاں رہ کر بھی اردو ادب کی خدمت کرتے رہے اور اردو دنیا سے خراج تحسین وصول کرتے رہے۔ کشمیر سے تبدیل ہو کر وہ دہلی تشریف لائے اور یہاں بھی اپنی فنکارانہ صلاحیت اور انسان دوستی کی حیثیت سے کافی مقبول ہوئے۔ دہلی سے پھر پٹنہ آئے۔ ۱۹۷۰ء میں آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ انہوں نے ایک ہفتہ وار اخبار "حال" نکالا لیکن وہ چند ہی مہینوں کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے علاوہ اردو مجلس عاملہ کے وہ پہلے بہاری ممبر تھے جو انتخاب کے ذریعہ چنے گئے۔ انہوں نے اب تک تقریباً ڈھائی تین سو کہانیاں جو ہندوپاک کے مشہور جرائد اور رسالے میں شائع ہوئیں اور بے حد مقبول ہوئیں۔ ان کے علاوہ روس، فرانس، چیکوسلواکیہ اور دوسرے ملکوں میں بھی کتابیں شائع ہوئیں۔ امریکہ میں اردو ادیبوں کی کہانیوں کی ایک انتھولوجی چند سال قبل شائع ہوئی ہے۔ ان میں سہیل عظیم آبادی کی کہانی 'ناک' بھی شامل ہے۔

سہیل عظیم آبادی کے افسانوں کے کئی مجموعے اب تک اشاعت پذیر ہو چکے ہیں جن میں "الاؤ"، "نئے پرانے" اور "چار چہرے" کو ادبی دنیا میں کافی مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ناولٹ "بے جڑ کے پودے" اپنی نوعیت کا واحد ناولٹ ہے۔ اس ناولٹ کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ بہار کی کئی یونیورسٹیوں نے اسے ایم اے کے نصاب میں داخل کیا۔ اتر پردیش اکاڈمی نے ایوارڈ سے نوازا اور پروفیسر عبدالمغنی نے اس پر ایک جامع اور مؤثر تبصرہ رسالہ کتاب کے ذریعہ کیا اور اردو دنیا کو اس کی فنی تکنیک سے روشناس

کرتے ہوئے ایک اضافہ قرار دیا۔ "چار چہرے" بھی اپنی نوعیت کا شاہکار افسانہ ہے جس پر اہلِ قلم نے بہت کچھ لکھا ہے
سہیل عظیم آبادی افسانوں اور ناولوں کے علاوہ ادبی و سیاسی مضامین، شخصی خاکے، ڈرامے۔ فیچر، مزاحیہ خاکے، بچوں کی کہانیاں، شعری تخلیقات کافی لکھ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو ڈرامے بھی کافی لکھ چکے ہیں ان میں بہت سے ڈرامے نشر ہو کر کافی مقبولِ عام ہوئے۔ خاص کر دارا شکوہ، جہاں آرا، ملینا جوگن، انارکلی، شیر شاہ بہادر، روشنی، مرزا مچھو کافی شہرت کے حامل رہے۔
سہیل عظیم آبادی کی مندرجہ بالا فنی تخلیقات کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک عظیم فنکار تھے۔ لیکن ان چند سطروں میں نہ تو مجھے ان کے افسانوں کا جائزہ لینا ہے اور نہ ان کی خوبیوں کو دہرانا ہے بلکہ میں نے انہیں جیسا دیکھا اور ارباب علم و فن سے جو کچھ سنا اسی کی روشنی میں ان کی شخصیت کا ایک ہلکا سا عکس پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اس لئے سوچتا ہوں کہ اس سلسلہ میں کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں ـــــ ایسی عظیم المرتبت شخصیت کے متعلق صرف چند باتیں کہہ کر اپنی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتا۔ جن کی زندگی انسان دوستی اور اردو ادب کی خدمت کے لئے وقف ہو چکی تھی۔
سہیل عظیم آبادی کی علمی و ادبی زندگی کا جائزہ لینے کے لئے ایک فرصت کی ضرورت ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سہیل عظیم آبادی کی شخصیت کو ان کی علمی و ادبی زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک عظیم فنکار تھے اور منفرد اہمیت کے حامل تھے۔ جامعیت کے لحاظ سے دیکھئے تو وہ بیک وقت شاعر بھی تھے اور ادیب بھی، افسانہ نگار بھی تھے ناول نگار بھی، ناقد بھی تھے اور زبان دان بھی، صحافی بھی تھے اور مصلحِ قوم بھی۔

جوانی کا حال تو مجھے معلوم نہیں لیکن بوڑھاپے میں خود میں نے دیکھا کہ بیماری کی وجہ سے صحت جواب دے رہی تھی لیکن پڑھنے لکھنے کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ غرض مرتے دم تک یک لخت علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ قلم ہمیشہ ان کا رفیق کار رہا اور زندگی کا سہارا بھی۔
سہیل عظیم آبادی یوں تو ہمارے چچا تھے لیکن قریب سے دیکھنے اور صحبت میں بیٹھنے کا موقع اس وقت ملا جب میں اپنے ریسرچ کے سلسلے میں عظیم آباد پہونچا۔ اکثر ان کے گھر پر جاتا اور دشواریوں کا تذکرہ کرتا۔ وہ ایک مخلص انسان تھے اس لئے ساری باتوں کو سنتے اور نیک مشورے سے نوازتے رہتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ چچا سے زیادہ سہیل عظیم آبادی کے پیکر میں ایک خلیق ملنسار، ہمدرد، محبت شعار اور دور اندیش سہیل کو دیکھا۔
سہیل عظیم آبادی کی شخصیت بے باک، حق اور انسان پسند تھی اور سادگی، بے نیازی اور ایثار تو ان کی سیرت کی اہم خصوصیات تھیں جو ملنے والوں کو اپنا گرویدہ بنائے بغیر نہ رہتیں ـــ یہ وہ سرمایہ خلوص تھا جس نے سہیل عظیم آبادی کے مزاج و عمل کی رہنمائی کی۔ اور یہی وہ قوت تھی جس کے سہارے سہیل عظیم آبادی نے سخت حالات کا مقابلہ مردانہ وار کیا۔ ان کی شخصیت میں صداقت جذبہ، بے نیازانہ مزاج اور مخلصانہ سادگی کے عناصر نمایاں تھے۔ وہ پرانی تہذیب اور روشنی کے زندہ پیکر تھے۔ وہ بے حد پُر خلوص اور غایت ملنسار انسان تھے۔ چھوٹے بڑے کا آپ کے نزدیک امتیاز نہ تھا سبھوں سے خلوص و محبت سے ملتے تھے۔
سہیل عظیم آبادی خود غرضی، تنگ نظری سے دور بھاگتے تھے اس لئے ان کی شخصیت میں وطن دوستی اور

...دونوں قسم کے جذبات موجود تھے۔ نہ وہ صرف اردو ادبی حلقہ میں مشہور تھے بلکہ ہندی داں طبقہ بھی آپ کا شیدا اور دلدادہ تھا اور ہے۔ عوام میں جس قدر سہیل عظیم آبادی مقبول ہیں شاید ہی کوئی دوسرا ان کا مقابلہ کر سکے۔ وہ اردو کے دلدادہ تھے اس لئے خاموش خدمت کرنا پسند کرتے تھے۔ جو کچھ بھی کیا وہ نعرہ بازی اور پروپیگنڈہ بازی سے الگ رہ کر کیا۔

سہیل عظیم آبادی کی ننہال شاندار روایت کی حامل رہی ہے۔ انہوں نے سلامت روی، شائستگی اپنے بزرگوں سے سیکھی اور متانت و شرافت اور پُر خلوص رسم و رواج گویا ان کا حصہ تھا۔ ان کی نگاہ اتنی تیز اور ذہن اتنا بالغ و بیدار تھا کہ جس سے ایک بار ملتے اسے پھر کبھی نہیں بھولتے۔ اپنے حلقہ تعارف اور دوستوں کی صحبتوں میں جب آتے تھے تو نہ یہ کہ کوئی امتیاز گوارہ کرتے بلکہ اپنی شخصیت کو ایک قلم تہہ کر کے ملتے تھے۔ ان کے رہن سہن، چال ڈھال، طور طریقے اور تمام انداز گفتار اعلیٰ ظرفی، بلند حوصلگی اور خاندانی شرافت و عظمت کی ترجمان تھی۔ ممکن ہے کہ یہاں پر کوئی صاحب یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں ان کا نثری قصیدہ لکھنے بیٹھ گیا ہوں جس کی تشبیب ہے، تو میں بلا جھجک یہ کہوں گا کہ میرا جذبۂ خلوص ان کی شخصیت کے بارے میں اس کا متقاضی تھا گر میں سچ کہتا ہوں کہ میرا قلم ان کے محاسن شخصیت کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے — !!!

مناظر حسن شاہین

تیرے بعد

سہیل عظیم آبادی کی یاد میں

شب و روز آئے گی پت جھڑ کی صدا تیرے بعد
کون لائے گا بہاروں کا پتا تیرے بعد

جس سے روشن تھے خیالات کے سب گھر آنگن
ہو گیا گل وہ محبت کا دیا تیرے بعد

اب کہاں نکہتِ رنگین کی وہ باراتیں
منہ چھپائے ہوئے پھرتی ہے صبا تیرے بعد

رقص کرتی ہیں جفائیں میرے ویرانے میں
کتنی بے کیف ہے دنیائے وفا تیرے بعد

جب بھی افسانوں کی تاریخ لکھی جائے گی
یاد آئے گی بہت تیری ادا تیرے بعد

عرشی صہبائی

پہلی اور آخری ملاقات

جون ۱۹۶۲ء کا ذکر ہے۔ میں طویل علالت کے بعد ہسپتال سے گھر آیا تھا۔ اگرچہ ایسی کوئی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ عزیز و اقارب میری زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ بالفاظ دیگر مجھے دوسری زندگی نصیب ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق مجھے ابھی آرام کی ضرورت تھی۔

اس روز مہینے کا دوسرا سنیچر وار تھا۔ دوپہر کے بعد ریڈیو اسٹیشن سے ایک صاحب تشریف لائے۔ ان سے معلوم ہوا کہ سری نگر سے سہیل عظیم آبادی صاحب تشریف لائے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ نقاہت کے باوجود میں آہستہ آہستہ ریڈیو اسٹیشن پہونچا۔ سہیل صاحب میرے منتظر تھے۔ بغلگیر ہوئے۔ ایسا محسوس ہوا کہ برسوں کی جان پہچان ہے۔ میری صحت کے بارے میں اظہار تشویش کیا۔ خفا بھی ہوئے کہ اس عالم میں آنے کی تکلیف کیوں کی لیکن ان سے ملنے کے بعد مجھے قطعاً اس بات کا احساس نہیں رہا کہ میں صاحب فراش ہوں۔

میرے استفسار کے بغیر ہی فرمانے لگے "پٹنہ ریڈیو اسٹیشن سے سٹوڈیوز میں کچھ غزلوں کی صدا بندی سن رہا تھا۔ جب معلوم ہوا کہ آپ کا کلام ہے تو ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا۔ سری نگر سے پٹنہ واپس جا رہا تھا۔ آپ کے لئے رکنا پڑا۔" ان کی باتوں میں کتنی محبت تھی، کتنا خلوص تھا کتنا اپنا پن تھا۔

انھوں نے موہن یاور سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس زمانے میں جموں ایک بڑا شہر نہیں تھا ٹیکسی اور سکوٹر وغیرہ بھی بہت کم تھے۔ اس روز گاندھی بھون میں ایک نیم ادبی تقریب تھی۔ ہم باتیں کرتے کرتے وہاں تک آ گئے اندازہ تھا کہ موہن یاور اس تقریب میں شامل ہوں گے لیکن مایوسی ہوئی۔ (یاور صاحب اسی زمانے سے "رفتار" کے نام سے ایک ہفتہ وار نکالتے ہیں) ان کے دفتر پہونچے حضرت وہاں موجود تھے۔ چائے وغیرہ آگئی اور دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ سہیل صاحب گفتگو کے دوران کبھی کبھی پریشان ہو جاتے۔ میں ان کی پریشانی کو بخوبی سمجھتا تھا۔ انہوں نے مجھے اس انداز سے دیکھا جس کا مقصد تھا کہ اب اجازت حاصل کی جائے۔ دوسرے لمحہ ہم "رفتار" کے دفتر کے باہر تھے۔

میں نے بغیر کسی جھجک کے ان سے سوال کیا۔

"آپ یاور صاحب کی بات چیت سے متاثر نہیں ہوئے؟"

"میں قدرے پریشان ہوا ہوں۔"

"دراصل یہاں کی مقامی بولی ڈوگری ہے (جو اب سیاست یا جہالت کے باعث زبان گردانی گئی ہے) یاور صاحب بات چیت میں ڈوگری کا استعمال بھی کر جاتے ہیں۔"

"میری پریشانی کی یہی وجہ ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کا اعتراف کیا۔

اگر وہ آج یہاں آتے تو دیکھتے کہ کس طرح اردو زبان کو دبایا کیا جا رہا ہے۔ اور ڈوگری بولی کو جو پنجابی کی

بگڑی ہوئی ایک صورت ہے۔ ہر قسم کی مراعات سے نوازا جا رہا ہے یہاں تک کہ ڈوگری کو ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ دیا جاتا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ایوارڈ دینے والے اس بولی سے نابلد ہیں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ یہاں کی کلچرل اکاڈمی نے نمایاں پارٹ ادا کیا ہے۔ میرا نظریہ ہے کہ اگر کسی زبان، تہذیب یا فن کو ختم کرنا مقصود ہو تو اس کے نام پر ایک کلچرل اکادمی قائم کر دیجئے جس کا ان چیزوں سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ آپ یقیناً اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ تجربہ ہمارے یہاں بے حد کامیاب رہا ہے۔ یہاں کی کلچرل اکادمی نے ایک شاعر کو اس بنا پر ……… سے نوازا کہ اس نے ۱۹۳۵ء میں سیماب مرحوم کے ساتھ ایک نمائش کے مشاعرہ میں شرکت "فرمائی" تھی۔ دوسرے یہ کہ اس کا مجموعۂ کلام زیر ترتیب تھا جو خدا کے فضل سے آج تک شائع نہیں ہوا۔ اس کلچرل اکادمی کے قربان جائیے۔ خدا اس کلچرل اکادمی کے اراکین پر رحم فرمائے۔

سہیل صاحب سے اس ملاقات کے بعد دیر تک سلسلۂ خط و کتابت جاری رہا۔ یہ مراسم اس لئے بھی بڑھتے گئے کہ ہم دونوں کی ذہنی سطح ایک سی تھی۔ زندگی کا نظریہ ایک تھا۔ خطوط میں کبھی کوئی ادبی بحث ہوتی تو کبھی ملک میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات پر اظہار خیال ہوتا۔ ان کے خطوط میں ہمیشہ تازگی اور شگفتگی ہوتی — وہ عظیم آبادی نہیں تھے بلکہ عظیم تھے۔ ان سے یہ مختصر سی ملاقات دوسری ہزار ملاقاتوں پر قربان کی جا سکتی ہے۔ میں زندگی بھر اس پہلی اور آخری ملاقات کو فراموش نہیں کر سکوں گا ؎

وہ بھی کیا لوگ تھے حاصل تھی رفاقت جن کی
کیا مناظر تھے نگاہوں سے جو روپوش ہوئے

بقیہ: ساوتری

لیتی چلی گئی ……

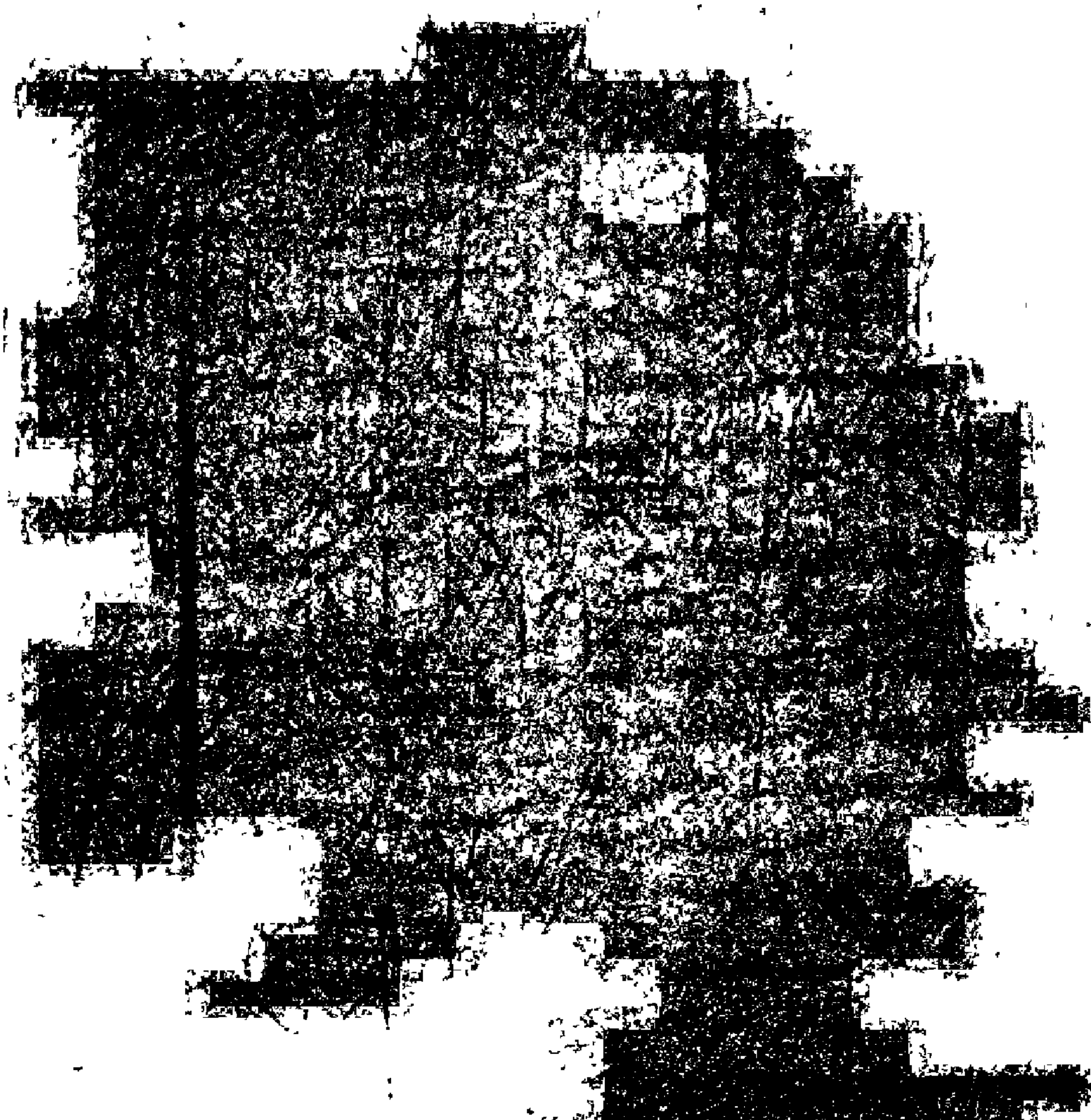
یہ کہہ رہی ہوں۔ اب میں دوسرے کی پتنی ہوں۔ اس کو دھوکا دینا نہیں چاہتی۔ ڈرتی ہوں اگر تم اتنے لیے تو ……

راجیش چپ چاپ اس کے مکان سے باہر نکل آیا۔

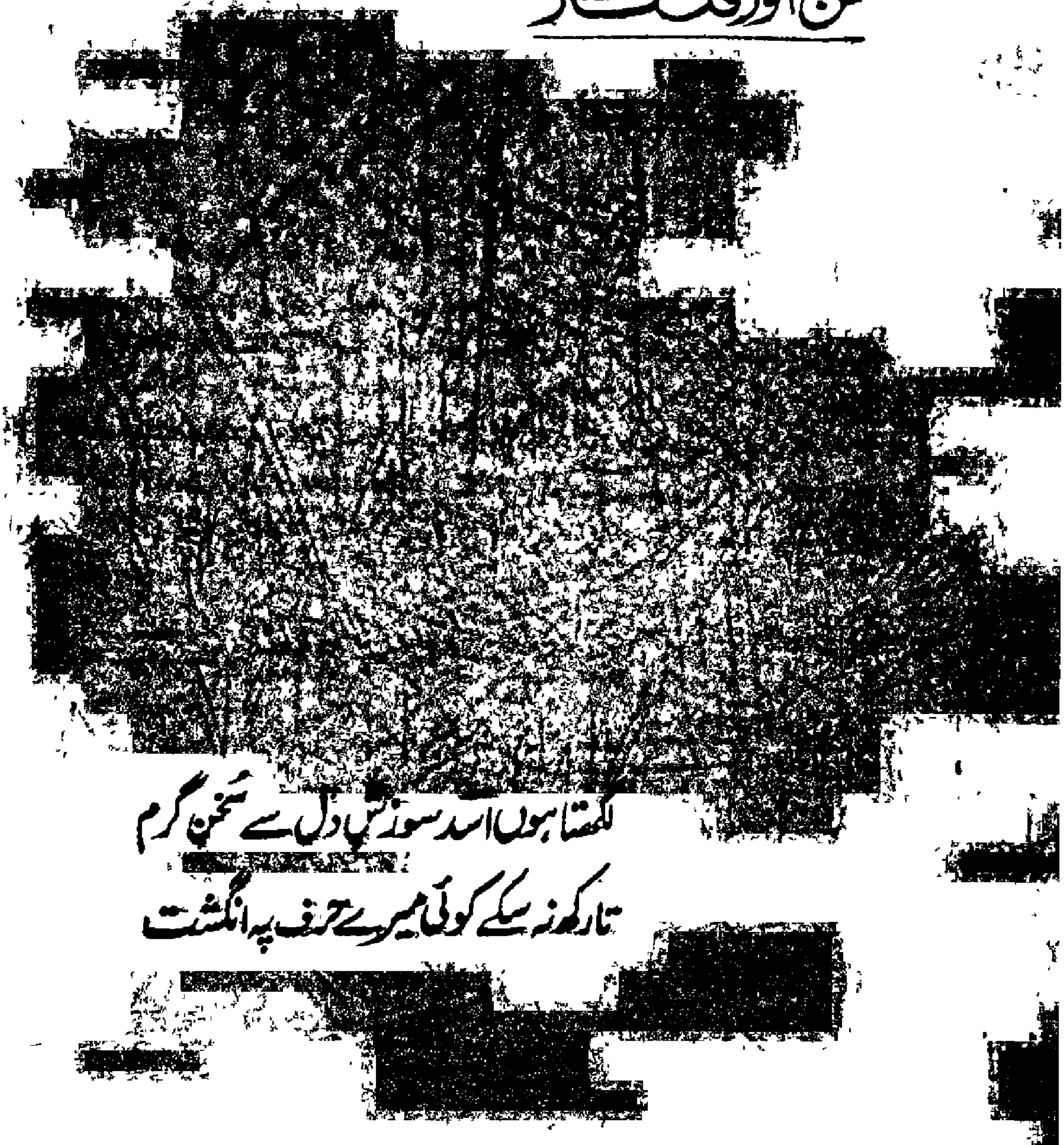
یوں کہانی کا اختتام چونکا دینے والا ضرور ہے لیکن منطقی بھی۔ ایک طوائف کا ایثار ہمیں جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ظاہری حسن اور مصنوعی نفاست زمینی کا دلدادہ سماج اس کی شفاف و بالیدہ روح کو طرح طرح سے کچوکے لگاتا ہے۔ کیونکہ اس کی شریانوں میں چلتے محبت و اخوت سے سرشار چشمے کا قدر داں نہیں ملتا۔ اور جب اسے سہارا ملتا ہے تو اس کا ایثار آج کے خود غرض پراگندہ معاشرے کے لئے مثالی بن جاتا ہے۔

سہیل عظیم آبادی کی کہانیوں میں اصلاحی جذبہ زیریں لہر بن کر تو سامنے آتا ہے۔ لیکن وہ پریم چند کی طرح درس عبرت نہیں دیتے! اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سہیل عظیم آبادی نے اپنے عصری کرب کو ملحوظ رکھتے ہوئے پریم چند کے فن کی توسیع کی ہے۔ اب اس تعصب کا کیا جواب کہ افسانوی انتخاب شائع ہو تو اس میں سہیل عظیم آبادی کی کہانی شامل نہ کی جائے۔

سہیل صاحب جتنے بڑے فنکار تھے اتنے ہی عظیم انسان بھی۔ ان کی حب الوطنی، انسان دوستی، عالی ظرفی اور بیراہ روی ہمالیہ میں کبھی عمل پیہم اور جہد مسلسل کی امر قدریں سے ہم جس قدر مستفیض ہو سکیں۔ یہی ہماری تا دم حیات ان کے لئے خراج عقیدت ہے!!



فن اور فنکار


لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی میرے حرف پہ انگشت



افسانہ لکھنے کا فن کیا ہے ؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے دوسرا سوال کیا جاسکتا ہے۔" زندہ رہنے کا فن کیا ہے ؟" زندہ رہنے کے فن کو کسی چوکھٹے یا کٹہرے میں بند نہیں کیا جاسکتا۔ حالات اور واقعات زندگی کے رُخ کو موڑتے رہتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح افسانہ نویسی کے فن کو دو اور دو چار کی طرح حساب کر کے بتایا نہیں جاسکتا۔ افسانہ نویس کے مشاہدے، مطالعے اور اخذ کئے ہوئے نتیجے اس کی شکل بدلتے رہتے ہیں۔ مکمل اور کامیاب افسانہ وہی ہے جو پڑھنے والوں کے مشاہدے اور مطالعہ یا تصور سے ہم آہنگ ہو کر اسے محسوس کرنے پر مجبور کر دے کہ یہ اس کا اپنا مشاہدہ، مطالعہ یا اس کے اپنے احساسات ہیں۔



ڈاکٹر ممتاز احمد
صدر شعبۂ اردو، پٹنہ کالج

چار چہرے اور بے جڑ کے پودے ۔ ایک جائزہ

سہیل عظیم آبادی اردو کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے اردو کو چند بہت خوبصورت افسانے دیئے جس کا ذکر آگے ہوگا۔ افسوس ہے کہ ۲۹ تاریخ ماہ نومبر ۱۹۷۹ء کے سوا چھ بجے صبح میں ان کا انتقال پریم چند کے لڑکے امرت رائے کے مکان پر دل کا دوسرا دورہ پڑنے سے اسپتال جا کر ہو گیا۔

سہیل عظیم آبادی دراصل پریم چند کے معتقد تھے اور ان کی تخلیقات اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ سہیل عظیم آبادی نے پریم چند سے بہت کچھ سیکھا۔ سہیل عظیم آبادی کا تعلق عظیم آباد کے دیہات کے ایک زمیندار گھرانہ سے تھا۔ لیکن میں ذاتی تجربے کی بناء پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ انہیں زمینداروں کے اطوار و عادات سے سخت نفرت تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کے یہاں کسی مذہب و ملت کی بناء پر کسی شخص کو ترجیح دینے کا کوئی سوال نہ تھا۔ اس معاملے میں ان کی شخصیت ایک اتھاہ محبت تھی۔ وہ ہر طبقہ، ہر پیشہ، ہر عمر اور ہر مکتبۂ خیال کے لوگوں سے ٹوٹ کر ملتے تھے اور ان کی ملاقات سے ان کے خلوص کی خوشبو محسوس کی جا سکتی تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ انسان میں کمزوریاں ہوتی ہیں اور اسے جنس اور غذا دونوں کی بھوک ستاتی ہے۔ اس معاملے میں وہ انسان کے ہر عمل کو اسی تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی یہ وسیع النظری اس بات کا نتیجہ تھی کہ انہوں نے ایک فنکار کی حیثیت سے انسان کے عمل کا ہر رنگ میں منصفانہ مطالعہ کیا تھا۔

ہم نے ابھی کہا ہے کہ سہیل عظیم آبادی نے اردو کو چند بہت خوبصورت افسانے دیئے لیکن افسانوں کے علاوہ انہوں نے ڈرامے، ناول، اور ناولٹ بھی لکھے۔ ان کے ڈرامے رسالوں اور مجموعوں سے نشر ہو گئے ہیں لیکن ان کے ناول میں سے ایک ناول "اونچی نیچی لہریں" غیر مطبوعہ ہے۔ دو تین ناول ایسے ہیں جو ادھورے ہیں۔ اور ان کا ایک ناولٹ "بے جڑ کے پودے" شائع ہو چکا ہے۔ ناول کی طرح ناولٹ بھی ایک فن ہے۔ اور جس طرح ایک ناول میں ایک ناول نگار اپنی ایک دنیا تخلیق کرتا ہے اور ان میں مختلف کرداروں کو جنم دیتا ہے انہیں موقع اور محل کی مناسبت اور موزونیت کے لحاظ سے زندہ رکھتا ہے اور مارتا ہے۔ گویا وہ اپنے نقطۂ نظر سے ایک ایسی دنیا تخلیق کرتا ہے جس کا وہ پروردگار ہوتا ہے۔ ناولٹ بھی دراصل ناول کی مختصر شکل ہے۔ لیکن اس کی تکنیک بالکل وہی ہے جو ایک ناول کی ہوتی ہے یعنی اس میں وحدتِ تاثر کے عوض تاثرات ہوتے ہیں اور زندگی کے کسی ایک پہلو کے عوض پوری زندگی ہوتی ہے۔ لیکن غور یہ کرنا ہوتا ہے کہ فنکار نے جو دنیا تخلیق کی ہے اس میں تازگی ہے یا نہیں اور جو قصے بیان کئے گئے ہیں ان میں فنکار دلچسپی قائم رکھ سکا ہے یا نہیں اور اسی کے ساتھ یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ جو قصے بیان ہوئے ہیں وہ قصے کہنے کے لائق ہیں یا نہیں۔ ناولوں کے خالق کے بارے میں یہ باتیں عام طور سے کہی جاتی ہیں کہ ناول

فنکار کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے انسانی فطرت کی مکمل معلومات حاصل ہو۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہ جو معلومات ہوں ان کی ترکیب اور ترتیب و تنظیم فنکار عمدہ طریقے سے کر سکے۔ اور پھر یہ بھی کہ اسے اس کی بھی قدرت ہو کہ وہ اپنی معلومات کو بہترین زبان میں ادا کرے۔

سہیل عظیم آبادی نے اپنے ناولٹ "بے جڑ کے پودے" میں صفحہ ۳۳ پر ارلنسٹ کی زبانی یہ کہلوایا ہے کہ وہ اب بہت دنوں تک پنجڑے کا پنچھی بنکر نہ رہے گا۔ آزاد رہے گا۔ اگر اس سے بازوؤں میں طاقت آئے گی۔ کچھ تجربے ہوں گے۔ کچھ سیکھونگا

سہیل عظیم آبادی نے بھی کم عمری ہی میں بہت زیادہ مسافرت کی اور اس طرح انہوں نے بھی تجربات حاصل کئے اور ان کے بازوؤں میں طاقت آئی۔ چنانچہ ان کی تخلیقات میں ان کے ذاتی تجربے کا نچوڑ اور ان کی کشش بہت زیادہ ملتی ہے۔

ناولٹ "بے جڑ کے پودے" کی عقبی زمین رانچی ہے۔ اور اسی عقبی زمین میں ناولٹ "بے جڑ کے پودے" کی سہیل عظیم آبادی نے اساس رکھی ہے۔ البتہ موضوع ایسا ہے جس کے لئے کشمیر ہی کی عقبی زمین منتخب کی جاسکتی تھی۔ ناولٹ "بے جڑ کے پودے" میں مختصراً قصہ یہ ہے کہ مسٹر سنہا لندن سے اپنی ایک انگریز بیوی روزی کو لاتے ہیں۔ روزی کا مردہ بچہ پیدا ہونے سے انتقال ہو جاتا ہے۔ مسٹر سنہا کو دایہ پونجی سے دو ناجائز بچے یعنی ارلنسٹ اور لورا پیدا ہوتے ہیں اور ان دونوں کی پرورش مس گرین اپنے ڈورمیٹری میں کرتی ہے لیکن لورا اور آرلنسٹ چونکہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ وہ بھائی بہن ہیں۔ اس لئے ان دونوں میں محبت ہو گئی۔ جس پر سے ناولٹ کے آخر میں سہیل عظیم آبادی نے بڑے ڈرامائی طور پر پردہ اٹھایا ہے کہ وہ دونوں مسٹر سنہا اور پونجی کے ناجائز اولاد تھے۔ اور اس طرح ایک بڑا المیہ وقوع پذیر ہونے سے رک جاتا ہے۔ اس لئے اس ناولٹ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا اختتام ڈرامائی بھی ہے اور فطری بھی۔ جہاں تک سہیل عظیم آبادی کے انداز بیان کا تعلق ہے ان کی نثر کو ہم سہل ممتنع کہہ سکتے ہیں کرشن چندر کی نثر کو ڈاکٹر ملک راج آنند نے گاتی ہوئی نثر کہا ہے۔ لیکن سہیل عظیم آبادی کی نثر سادہ دیدہ کار، تیز و برّاں اور غیر معمولی طور پر رواں ہے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جملے بے حد مؤثر ہیں۔ اور چونکہ ان کی نثر سادگی کے ساتھ ساتھ فطری بھی ہے۔ اس لئے ان کی نثر کی جسے ہم نثری ادا کہیں گے وہ دلوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جہاں تک ناولٹ "بے جڑ کے پودے" میں کردار نگاری اور مکالمے کا تعلق ہے کرداروں میں فریڈی، مرتھا، سولومن پادری، مس گرین، جوزف، مسٹر سنہا، روزی، لورا، ارلنسٹ، آرتھر، انجم، بشوپ، سبھی کردار اپنی جگہ پر اہم ہیں اور اپنا تاثر قاری پر قائم کرتے ہیں۔ مسٹر سنہا اور مس گرین کے کردار انمٹ نقوش قاری پر چھوڑتے ہیں۔ مکالمے روزمرہ کی زندگی کی طرح مختصر، فطری اور دلچسپ ہیں۔ اور کہیں کہیں سہیل عظیم آبادی کی مکالمہ نگاری اس ناولٹ "بے جڑ کے پودے" میں عروج پر نظر آتی ہے جیسے صفحہ ۳۴ پر مس گرین اور آرلنسٹ کے مکالمے غرضکہ یہ کہ سہیل عظیم آبادی کا ناولٹ بے جڑ کے پودے اردو کے ناولٹ میں ایک اہم ادبی حیثیت رکھتا ہے۔ "بے جڑ کے پودے" ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے نصرت پبلشرز لکھنؤ نے اکتوبر ۱۹۶۷ء میں شائع کیا ہے۔ گرد پوش، دیدہ زیب اور کتابت عمدہ ہے۔ اس کی لمبائی سات انچ اور چوڑائی ساڑھے چار انچ ہے۔ لیکن پرنٹنگ کی طرف سے توجہی برتی گئی ہے۔ اسے نذر امام کے نام معنون کیا گیا ہے۔ "بے جڑ کے پودے" کی قیمت پانچ روپے ہے۔

"چار چہرے" سہیل عظیم آبادی کے چار طویل مختصر افسانوں یعنی "بدصورت"، "گنگا"، "جاترا"، "گرم راکھ" اور "کانچی" کا مجموعہ ہے۔ اسے نصرت پبلشرز کچہری روڈ مارکیٹ لکھنؤ نے

پہلی بار ۱۹۷۷ء میں شائع کیا ہے۔ اس کی قیمت آٹھ روپئے ہے۔ اور یہ [illegible] پر مشتمل ہے گرد پوش کو مصوری کے جدید آرٹ کے تحت چار چہروں میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کی لمبائی ۷، [illegible] چوڑائی ہے ۴ انچ ہے۔ سہیل عظیم آبادی نے ۷۰ برس کی عمر میں اپنے اس چار طویل افسانوں کے مجموعے چار چہرے کو اپنے والد مرحوم سید حبیب الرحمٰن صاحب کے نام معنون کیا ہے۔ اور معنون کرتے ہوئے اپنے والد کے متعلق یہ جملے لکھے ہیں کہ "جن کی بے پایاں محبتوں نے ہر قدم پر میرا حوصلہ بڑھایا اور جن کی نصیحتیں میرے لئے آج بھی مشعلِ راہ ہیں اور آئندہ بھی رہیں گی۔" ان جملوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سہیل عظیم آبادی کے یہاں پرانی قدروں کی بڑی قدر تھی۔

زیر نظر مجموعۂ "چار چہرے" دراصل چار لڑکیوں کے مسائل سے [illegible] والے چار گوشے اور زاوئے ہیں جن کو سہیل عظیم آبادی نے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ان کا مطالعہ جزویاتی طور پر گہرے طریقے سے کیا ہے۔ اردو کے طویل مختصر افسانوں میں کرشن چندر کا افسانہ "زندگی کے موڑ پر"، "بالکونی"، "ان داتا" خاصے مشہور افسانے ہیں۔ انتظار حسین اور احمد ندیم قاسمی نے بھی خوبصورت طویل مختصر افسانے لکھے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی کے یہ چار طویل مختصر افسانے ان کے فن کے نقطۂ عروج کا پتہ دیتے ہیں۔ ان افسانوں کا بغور مطالعہ کرنے سے صرف یہی احساس نہیں ہوتا کہ ان کے افسانے کی ایک مخصوص خصوصیت [illegible] کا ذکر وقار عظیم نے کیا ہے کہ سہیل عظیم آبادی کا افسانہ [illegible] ایک بیک ایک ڈرامائی موڑ لے [illegible]۔ بلاشبہ سہیل عظیم آبادی کے افسانوں کی یہ [illegible] ہے لیکن یہ خصوصیت منٹو، بیدی اور عصمت چغتائی میں بھی ہے۔

چار چہرے کا پہلا افسانہ بدصورت لڑکی ہے۔ یہ افسانہ [illegible] سے پُر ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس افسانے میں ایک ناول کا کچھ حصہ بیان ہوتا ہے اور پھر اس ناول کے حوالے سے چندرا کی زندگی قاری کے سامنے لائی جاتی ہے۔ چندرا ایک بدصورت لڑکی ہے۔ اس کی ساری بہنوں کی شادی ہو جاتی ہے لیکن باوجودیکہ وہ بہنوں میں سب سے بڑی بہن ہے لیکن بدصورت ہے۔ افسانہ نگار کی زبان میں کالا کلوٹا رنگ، چہرے پر چیچک کے بڑے بڑے چمکیلے داغ، چھوٹی پیشانی، چپٹی ناک، چھوٹی چھوٹی دھنسی ہوئی آنکھیں، موٹے موٹے اور کچھ الٹے ہوئے ہونٹ۔ ظاہر ہے کہ ایسی لڑکی کی شادی ایک مشکل امر ہے۔ لیکن زندگی میں قدرت صرف تاریکی ہی نہیں دیتی روشنی بھی دیتی ہے۔ چندرا کی دوست کُسُم مر جاتی ہے۔ کُسُم کے شوہر مراری بابو اپنی بیوی کی موت کے بعد اپنے بچے نولو، اور پولوٹ کے لئے چندرا کے قریب آتے ہیں۔ لیکن مراری بابو کی ماں افسانہ کے آخر میں یہ کہتی ہیں کہ چندرا اس کی بہن کی طرح ہے۔ مراری بابو بھی یہی سمجھتے ہیں۔ افسانہ ختم ہو جاتا ہے۔ سہیل عظیم آبادی نے اس افسانے میں اس نکتہ کو بیان کیا ہے کہ بھیانک زندگی میں جب کبھی سہانی رات کے آنے کا تھوڑا امکان ہوتا ہے تو کچھ نہ کچھ ذاتی خود انسان کا کوئی نہ کوئی قدم اٹھ جاتا ہے کہ زندگی پھر اندھیرے غار میں ڈھکیل دی جاتی ہے۔

"چار چہرے" کا دوسرا طویل مختصر افسانہ "ساوتری" ہے۔ اس طویل مختصر افسانے میں سہیل عظیم آبادی نے "سوناگاچی" کی ایک طوائف ساوتری کا کردار پیش کیا ہے۔ ساوتری کو راجیش سوناگاچی کی اس جہنم سے نکال کر رانچی لے آیا۔ اور اس کی شادی مانک سے کرا دی۔ اور شادی کے بعد جب راجیش ساوتری سے ملنے کے لئے مانک کے گھر جانے لگا تو ایک دن ساوتری نے راجیش سے کہا کہ وہ اس کے یہاں نہ آیا کرے۔ اس لئے کہ میری محبت کہیں تمہاری گھریلو زندگی کو برباد نہ کر دے۔ اور اس طرح افسانے

ختم ہو جاتا ہے۔ سہیل عظیم آبادی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ساوتری جیسی خوالف کے دل میں بھی احسان چکانے کا مستحق حوصلہ ہوتا ہے۔

" چار چہرے " کا تیسرا طویل مختصر افسانہ "گرم راکھ" ہے۔ اس طویل مختصر افسانہ میں سہیل عظیم آبادی نے ردھیا کی بیوگی کا نقشہ پیش کیا ہے۔ ردھیا ۳۳ سال کی بیوہ ہے اور اپنی بیٹی پارو کی شادی میں جب وہ کلکتہ سے آئے ہوئے اپنے بہنوئی کو دیکھتی ہے تو اسے یاد آتا ہے کہ اس کے بہنوئی نے شادی کرنے کے لئے کہا تھا۔ اس وقت اپنی بیٹی پارو کی شادی کی فکر تھی۔ آج جب پارو کی شادی کے بعد اپنے بہنوئی سے اس نے شادی کی بات سوچی اور رات کے سناٹے کا وقت منتخب کیا۔ کیونکہ دوسری صبح اس کا بہنوئی کلکتہ واپس ہونے والا تھا۔ لیکن ہوا یوں کہ ردھیا کی ساس جاگ گئی۔ اور اسے اپنے پاس ہی سلایا۔ ردھیا کی بات دل ہی میں رہی۔ بہنوئی کلکتہ واپس ہو گیا۔ ردھیا گرم راکھ ہو کر رہ گئی۔

" چار چہرے " کا چوتھا اور آخری طویل مختصر افسانہ "کانچی" ہے۔ اس طویل مختصر افسانہ میں سہیل عظیم آبادی نے سلی گوڑی اور دارجلنگ کی چائے کے باغات کے ایک افسر منیش کا اور کانچی جو ایک پہاڑی لڑکی ہے اس کا نقشہ پیش کیا ہے۔ کانچی لال بہادر کی لڑکی ہے جس نے ایک انگریز مسٹر واٹسن کی بیوی مسز واٹسن نے میٹرک کلاس تک انگریزی پڑھائی تھی اور جب مسز واٹسن کا انتقال ہو گیا تو مسٹر واٹسن اپنی ملازمت سے استعفا دے کر لندن چلے گئے۔ اس مختصر طویل افسانہ میں سہیل عظیم آبادی نے یہ دکھایا ہے کہ محبت کے عجیب روپ ہیں۔ کانچی منیش کی ہر طرح خدمت کرتی ہے اور بار بار منیش کو غلط راستوں سے بچاتی ہے اور یہ بھی سمجھاتی ہے کہ منیش کا دل پاک ہے اس لئے وہ تنہائی میں آکر اس کے گھر کا سارا کام کاج کر دیتی ہے۔ وہ منیش کو مشورہ بھی دیتی ہے کہ کسی اچھی جگہ شادی کرے۔ لیکن جب منیش کی ماں منیش کا رشتہ ایک جگہ طے کر دیتی ہے تو وہ ہیجان میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ منیش کو جب یہ خبر کانچی کا باپ لال بہادر دیتا ہے تو منیش اپنی شادی کا ارادہ ترک کر کے کانچی کو اپنانے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔

سہیل عظیم آبادی کے چار طویل مختصر افسانوں کا یہ مجموعہ دراصل زندگی کی چار مختلف طرح کی مشکلات یا مسائل کا ایک افسانوی مطالعہ اور ایک افسانوی پیشکش ہے۔ ان چاروں افسانوں میں سہیل عظیم آبادی نے جس طرح جذباتی تصویر الفاظ میں اتاری ہے اس میں بعض اوقات تو یہ تصویریں اتنی مؤثر ہو جاتی ہیں اور سہیل عظیم آبادی کی جزئیات نگاری کی نازک قلم کاری ایک سیل رواں کی مانند رگ و پے میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سہیل عظیم آبادی کے چار طویل مختصر افسانوں کا مجموعہ " چار چہرے " دراصل اردو کے بہت قیمتی طویل مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جو سہیل عظیم آبادی کو اردو کے طویل مختصر افسانوں کی دنیا میں حیاتِ دوام بخشنے کا ضامن ہے۔

شکریہ آل انڈیا ریڈیو پٹنہ)

ظہیر غازی پوری

غزل

(سہیل عظیم آبادی کی نذر)

وہ میں اپنے ہنسا کر گزرا
اس کا احساس یہ کیسا کر گزرا
وہی تھا وہ مگر دنیا سے
اپنا ہر نقش مٹا کر گزرا
کبھی وہ جسم و شب تاب رہا
کبھی قندیل جلا کر گزرا
کبھی بے عکس و نشاں آیا نظر
کبھی آئینہ دکھا کر گزرا
کبھی ساکت رہا پتھر کی طرح
کبھی خود دھول اڑا کر گزرا
کبھی آزار کا پیکر سا لگا
کبھی دنیا کو ہنسا کر گزرا
کبھی مرنے کی تمنائیں کیں
کبھی جینے کی دعا کر گزرا
کبھی قدروں کو امانت سمجھا
کبھی کتبوں کو مٹا کر گزرا
کبھی بے رشتۂ انفاس لگا
کبھی اعصاب پہ چھا کر گزرا
وہ تھا انسان مگر ساری عمر
اپنے لاشے کو اٹھا کر گزرا

"ستارہ"

(بنام سہیل عظیم آبادی)

زمین اس پہ سخت تھی
کہ تشنہ کام آرزو کے جسم پر
تھکن کا ارتعاش تھا
وہ دائروں کو توڑ کر
نکل گیا
کا عتاب
سرد پڑ گیا
غیور روشنی کے ہاتھ کٹ گئے
وہ رفتہ رفتہ
پھیلتا گیا
حدودِ ذات سے پرے
ہوا کی ہمسری میں آسماں کو چھو لیا
انا پسند عظمتوں کو
اس پہ کتنا ناز تھا

ظہیر غازی پوری

قمر اعظم ہاشمی

"چوکیدار" کا تنقیدی مطالعہ

چوکیداری کا پیشہ ہماری سماجی زندگی میں آج بھی رائج ہے شہر اور گاؤں دونوں ہی میں چوکیداری کی جاتی ہے۔ البتہ اس کام اج دونوں ہی ماحول میں الگ الگ نوعیت کا حامل ہے سہیل عظیم آبادی کا یہ افسانہ "چوکیدار" گاؤں کی زندگی کی مرقع کشی کرتا ہے۔ فطری طور پر یہ گاؤں ہماری گاؤں کے رنگ ڈھنگ، طور طریق، بول چال اور رہن سہن کی آئینہ داری کرتا ہے یہ افسانہ کم و بیش تیس برس پہلے تخلیق کیا گیا ہے کہ جب اردو میں افسانہ نگاری کا شعور پریم چند کی افسانوی روایتوں کے زیر اثر یا ترقی پسندانہ میلان کے زیر اثر پروان چڑھ رہا تھا چنانچہ افسانہ کے موجودہ ترقی یافتہ فنی شعور کے پس منظر میں اس کا مطالعہ نہیں کیا جانا چاہیے۔ سہیل عظیم آبادی یوں بھی افسانہ نگاروں کی اس صف میں ہیں جو پریم چند کے بعد مگر ان کے ساتھ ساتھ منظر عام پر آئی تھی۔ ہمارے نئے عہد میں سہیل عظیم آبادی زندہ تو تھے مگر اس سے ان کی کوئی ذہنی مطابقت نہ تھی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نئے عہد میں زندہ رہنے کے لئے انہیں کچھ مشکل سی ہو رہی تھی۔ وہ اس ہم آہنگی سے قریب تر ہونے کی کوششوں میں تا حیات لگے رہے جو ہر لمحہ ان سے دور تر ہوتی گئی۔ نئے تقاضوں سے پرخلوص رفاقت کے لئے انہوں نے جی کھول کر فراخدلی دکھلائی، مایوسی ہوئی تو آخر دنوں میں اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گئے۔

سہیل عظیم آبادی ترقی پسندانہ خیالات کے کھوکھلے رفیق (کامریڈ) نہ تھے۔ اور نہ کبھی ترقی پسند کہلانے میں کوئی خوشی انہوں نے محسوس کی۔ ان کے فکری رہبر پریم چند ہی تھے مگر پریم چند کی "تقلید محض" بھی انہوں نے نہیں کی۔ غریبوں، مزدوروں اور محنت کشوں سے ان کی ہمدردی گہری اور سچی تھی اس میں مکاری کا عنصر نہیں ملتا اور نہ نمائش کا کوئی شائبہ دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے اونچے ایوانوں سے عام لوگوں کے مسائل کی ہمدردی میں لفظی پھول نہیں برسائے اور نہ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ٹیلی ویژن سیٹوں سے غریبوں کے دکھ سکھ کا انہوں نے مشاہدہ کیا تھا۔ وہ خود عام لوگوں میں تھے۔ کبھی خاص نہیں بن سکے اور نہ خاص طبقہ میں شامل ہونے کی تمنا رکھتے تھے۔ تمنا رہی بھی ہو تو اس کا اظہار انہوں نے نہیں کیا۔ چونکہ وہ عام لوگوں کی صف میں تھے اور اس پر انہیں کوئی تکلیف نہ تھی، کوئی پشیمانی یا شرمندگی نہ تھی، اس لئے ان کی شخصیت میں بڑی پرکشش سادگی اور بے ریا خاکساری جو عام لوگوں میں ہوا کرتی ہے۔ یہ خصوصیت ان کے افسانوں میں بھی ایک فطری حسن بن کے نمایاں ہے "چوکیدار" میں بھی یہ پرکشش انگیز توانائی بدرجہ اتم موجود ہے۔

یہ کہانی رام لال کی ہے۔ رام لال بیس برسوں سے

گاؤں کا چوکیدار ہے اور یہاں کے زمیندار رام نرائن بابو کے گھر سے وفادارانہ رابطہ رکھتا ہے۔ جاڑا ہو، گرمی یا برسات اس نے نہایت مستعدی اور تندہی سے راتوں کو جاگ جاگ کر چوکیداری کا فرض انجام دیا ہے اور اس کی اس ادائیگی فرض نے گاؤں کے گھروں کو چوروں، ڈاکوؤں سے ہمیشہ بچائے رکھا ہے کئی بار تو چوکیدار رام لال پٹتے بھی ہوتے مگر اس نے حملہ آوروں کا مردانہ وار اور کامیاب مقابلہ کرکے اپنی دھاک بٹھا لی تھی۔ گاؤں کے زمیندار رام نرائن بابو کے بیٹے رام چندر بابو کو اس نے گود میں کھلایا ہے، اس کی پرورش میں ہاتھ بٹایا ہے اور اس کے معصوم بچپن کو اس نے اپنی پرخلوص محبت اور شفقت دی ہے۔ چنانچہ رام چندر پڑھ لکھ کر ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر بحال ہوتا ہے تو زمیندار صاحب سے کم خوشی رام لال کو نہیں ہوتی۔ وہ اس لئے مسرور نہیں ہے کہ اس کے گاؤں کے زمیندار صاحب کے بیٹے کو ڈپٹی مجسٹریٹی کا عہدہ ملا ہے۔ وہ خوش اس لئے ہے کہ ڈپٹی مجسٹریٹ وہی رام چندر بابو ہوتے ہیں جنہیں بچپن میں اس نے گود میں کھلایا ہے اور شفقتوں کا بھرا پیار دیا ہے۔ اس کی سادگی کا عالم یہ ہے کہ وہ اب خود کو دوسرے چوکیداروں سے زیادہ اہم شخصیت کا مالک سمجھتا ہے۔

وہ نہایت ہی فخر کے ساتھ لوگوں سے کہا کرتا۔ ڈپٹی صاحب تو میری گود کے کھلائے ہوئے ہیں۔ اب میں جمعدار ضرور ہو جاؤں گا۔ دوسرے چوکیدار اس کی باتوں کو سنتے اور ایک سانس لے کر رہ جاتے تھے۔ سب کو یقین تھا کہ رام لال ضرور دفعدار ہو جائے گا۔"

رام لال نے اپنے خیالوں میں ایک جنت سی سجا لی تھی۔ رام چندر کے ڈپٹی مجسٹریٹ ہونے ہی رام لال نے اپنے اردگرد خوبصورت تصورات کی ایک حسین و جمیل دیوار اٹھا لی تھی جس کا سایہ اس کے لئے فرحت انگیز بھی تھا اور سکون بخش بھی۔ ڈپٹی مجسٹریٹ ہونے کے بعد ابھی تک رام چندر بابو گاؤں میں نہیں آئے تھے۔ رام لال ہی وہ شخص تھا جسے رام چندر بابو کے گاؤں میں آنے کا سب سے زیادہ انتظار تھا۔ اس کے روز و شب کا ہر لمحہ گویا لمحۂ انتظار تھا اور پھر رام لال کو درگا پوجا کی چھٹیوں میں رام چندر بابو کے گاؤں آنے کی خبر ملی تو وہ مسرتوں سے سرشار ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے خوابوں کا لطیف و جمیل مرحلہ تعبیر کے قریب پہونچ چکا ہے، اس کی مرادیں اب پوری ہوں گی، اس کے خیالوں کو اب مفہوم کی روشنی ملے گی۔ پھر اس نے اپنی وردی پہنی اور اپنے مرکز خواب و خیال، رام چندر بابو ڈپٹی مجسٹریٹ کو سلام کرنے کی نیت سے گھر سے نکل پڑا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا جاتا، اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جاتی اور اس کے تصوروں کی ہلچل بڑھتی چلی جاتی۔ وہ کیسے سلام کرے گا؟ ڈپٹی صاحب کیسے جواب دیں گے؟ کیا کیا پوچھیں گے؟ وہ کیا کیا کہے گا۔؟ رام لال انبساط و مسرت کی کیفیتوں میں سرشار، زمیندار صاحب کے گھر پہونچا۔ اس نے ڈپٹی مجسٹریٹ سے متعلق معلومات حاصل کی۔ خبر ملی کہ ابھی آئے ہیں، تھک گئے ہیں، سوئے ہوں گے۔ رام لال اشتیاق ملاقات کا مارا، اپنے جذبۂ بیتاب میں مبتلا انتظار کرتا رہا۔ صبح سے شام ہونے کو آئی تو ڈپٹی صاحب گھر سے برآمد ہوئے۔ رام لال کو انہوں نے دیکھا مگر متوجہ نہ ہو سکے۔ رام لال نے سوچا ممکن ہے بھول رہے ہوں سلام کروں گا تو آواز سے ضرور پہچان لیں گے۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے سلام کیا۔ ڈپٹی صاحب نے سلام کو بھی نظر انداز کیا۔ اس کی شخصیت چھوٹی موٹی معصوم شخصیت کا شیشہ چٹک گیا۔ مگر رام لال ابھی مایوس نہیں تھا۔ ڈپٹی صاحب رشتہ داروں سے مصروف گفتگو رہے اور وہ چپ چاپ

گھبرا رہا۔ اسے اب بھی کچھ کچھ یقین تھا کہ ڈپٹی صاحب مصروفیت کے کم ہوتے ہی متوجہ ہوں گے۔ رام لال اپنی شخصیت کے شیشے کو بچانے کی کوشش تو کر رہا تھا مگر یہ اس وقت چھناک سے ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا جب وہ اس انداز میں مخاطب ہوئے۔

"ڈپٹی صاحب نے بڑے سوکھے انداز میں کہا: "کیا مانگتا ہے؟" رام لال کا دل بڑھ گیا اور خوش ہو کر بولا —

"حضور، حاضری دینے آئے تھے۔"

ڈپٹی صاحب بولے۔ "دیکھ لیا تم زندہ ہے، جاؤ اب۔"

یہ انہیں ڈپٹی صاحب کے جملے تھے جو اپنے بچپن میں رام لال سے طرح طرح کی فرمائشات کیا کرتے تھے اور جن کی تکمیل میں رام لال سخت آزمائشوں سے بھی ہنستے کھیلتے گزرتا تھا — رام لال کو انہوں نے اپنی تعلیم کے دوران کہا بھی تھا کہ وہ ڈپٹی مجسٹریٹ ہو گئے تو رام لال کو اپنا چپراسی بنا لیں گے۔ چپراسی بننے کی اس ننھی سی تمنا نے رام لال کے بہت بڑے انسانی وجود کو پارہ پارہ کر دیا۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں اور بوجھل قدموں سے گھر واپس آ گیا۔ جانے کے وقت وہ کس طرح پہونچ گیا تھا، اس کی اسے خبر بھی نہ ہوئی تھی۔ واپسی میں ایک ایک قدم سو سو من کے بوجھ میں دبا تھا۔ رات ہوئی اور لوگ آرام سے سو گئے تو رام لال حسب معمول "چوکیداری" میں نکلا۔ رات بھر کچھ زیادہ ہی مستعدی سے اپنا فرض ادا کرتا رہا۔ صبح ہوئی تو وہ اپنی ضروریات سے فارغ ہو کر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ زمیندار صاحب کے یہاں سے طلبی ہوئی۔ وہ کھل اٹھا، لگتا ہے اس کی فرض شناسی سے ڈپٹی صاحب خوش ہو گئے۔ اس نے سوچا کہ کل کی ان کی بے رخی بے سبب نہ رہی ہوگی۔ ضرور کسی بدخواہ نے کوئی جھوٹی شکایت کی ہوگی۔ اب آج پرانے خواب کی تعبیر ملے گی۔ وہ تیزی سے زمیندار صاحب کے گھر پہونچا۔ یہاں پہنچتے ہی اس کے شکستہ وجود پر ڈپٹی صاحب نے ایک اور

چوٹ لگائی۔ "تم بوڑھا ہو گیا مگر بالکل گدھا ہے۔ رات کو کاہے کو چلاتا ہے، کوئی ڈاکہ والا تھوڑا ہی بیٹھا ہے۔" حاصل کلام ان کا یہ تھا کہ راتوں میں چلانا بند کرو، نیند خراب ہوتی ہے۔ رام لال چوکیداری کا خوگر ہو چکا تھا۔ دو برسوں سے یہ خدمت انجام دے رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب کے خوف سے اس نے "شب بیداری" بند کر دی۔ دو چار دنوں کے اندر ہی ڈپٹی صاحب کے گھر چوری ہو گئی۔ زمیندار صاحب کے ہاں سے پھر طلبی ہوئی۔ رام لال پہونچا تو جو کسر رہ گئی تھی پوری ہو گئی۔ ڈپٹی صاحب نے جی بھر کے گالیاں بھی دیں اور دو چار ہاتھ بھی جھاڑ دیئے۔ پولیس آئی تو رام لال کی شکایت انہوں نے کی اور یوں اس کی نوکری بھی جاتی رہی۔

یہ ہے "چوکیدار" کا مکمل پلاٹ۔ صاف و سادہ اکہرا اور غیر پیچیدہ۔ واقعات مربوط ہیں جیسے زنجیر کی کڑیاں۔ واقعات ایک کے بعد ایک اس انداز میں رونما ہوتے جاتے ہیں کہ افسانے کا بنیادی اور مرکزی کردار رام لال اپنے تمام شخصی کوائف و خصائص کے ساتھ روشنی میں آ جاتا ہے۔ رام لال جانا پہچانا اور ہم سے مانوس کردار ہے۔ اس کے خال و خط میں کسی طرح کی اجنبیت نہیں ہے۔ اس کی تصویر میں ایسا "میک اپ" نہیں ہے کہ جس سے اس کا چہرہ مصنوعی معلوم ہو۔ اس کے اندر دیہاتی زندگی کی وہ بو باس ہے جس سے ہم پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ اس کی سادگی، سادہ لوحی اور معصومیت ہماری دیہاتی زندگی میں آج بھی کچھ نہ کچھ مل جاتی ہے۔ اگرچہ ہمارا دیہاتی ماحول سیاسی طور پر اب "کرپٹ" ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود رام لال کا کردار زندہ اور جاندار کردار ہے اور اس کے خال و خط کو ابھی بالکل فراموش نہیں کیا جا سکا ہے۔ اس کے احساسات میں سچائی بھی ہے اور خلوص بھی۔ افسانہ نگار نے

محبت بھا بکہ سستی اور فنکارانہ خوش اسلوبی سے واضح کیا ہے کہ معاشرے کے طبقاتی ڈھانچے میں امیر، امیر ہے اور غریب، غریب۔ انسان منقسم ہے۔ اس کا سالم وجود امارت و غربت کے پیمانوں میں دو الگ الگ ٹکڑے بن چکا ہے۔ زمیندار اور چوکیدار میں کوئی مناسبت نہیں ہے اور نہ یکساں رابطے کی کوئی سطح۔ چوکیدار اپنی محبتوں میں خواہ کتنا ہی مخلص ہو اس کے احساس کتنے ہی سچے ہوں "اونچے لوگ" اس کا خیر مقدم کرنے سے معذور ہیں۔ رام لال غریب چوکیدار ہے اس کا وجود مسرتوں سے سرشار ہو جاتا ہے جب اسے رام چندر بابو کے ڈپٹی مجسٹریٹ ہونے کی خبر ملتی ہے۔ دوسری طرف رام چندر بابو کا زمیندارانہ مزاج ہے کہ جس نے رام لال کی شخصیت کو انتہائی بے مروتی بلکہ بے دردی کے ساتھ کچل کر رکھ دیا۔ وہ اپنے خوابوں اور تمناؤں کی "میت" کو سنبھالے ہوئے جس کرب و اندوہ کے ساتھ زمیندار صاحب کے گھر سے واپس آتا ہے اس کی تصویر کشی میں سہیل عظیم آبادی نے اپنی تخلیقی بصیرت کا کمال دکھلایا ہے۔ قارئین کے دلوں میں رام لال سے ہمدردی کا بے ساختہ اور فطری جذبہ جاگتا ہے۔ وہ اس کی مظلومی، بے چارگی، شکستگی احساس اور زخمی وجود سے شدید اپنائیت سی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ افسانے کی یہی صفت اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ سہیل عظیم آبادی کے افسانوی طرز کی سادگی اور سیاسی انداز کی صفائی نے افسانے میں ایک فطری کشش سی پیدا کر دی ہے جسے افسانے کا انجام اور تیز کر دیتا ہے۔ وحدت اثر بھی شدید ہے۔ رام لال کے مقابلے میں زمیندار کے بیٹے اور ڈپٹی مجسٹریٹ رام چندر کا کردار ہے۔ "زمینداری" اور "ڈپٹی مجسٹریٹی" نے اس کے کردار کو نہایت کمزور بنا دیا ہے انسانیت کی رمق اس میں بہ مشکل دکھائی دیتی ہے۔ وہ پہلے ڈپٹی مجسٹریٹ ہے اور تب انسان۔ رام لال کا کردار دراصل اسی منفی کردار کے تعلق سے روشن ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر سہیل عظیم آبادی کا یہ افسانہ اپنے دور کا ایک نمائندہ افسانہ ہے۔ سہیل عظیم آبادی کی حقیقت نگاری کسی طرح رسمی یا کھوکھلی نہیں ہے۔ انہوں نے اس افسانے میں جس ماحول کی آئینہ داری اور جن طبقات کے کرداروں کی پیش کش کی ہے اُن سے افسانہ نگار کی گہری اور سچی واقفیت اور اپنائیت بھی ہے۔ افسانے میں جانبداری روشنی کہیں پر نظر نہیں آتی ہے۔ مگر واقعیت پسندانہ شعور نے کہیں واعظانہ رنگ بھی اختیار نہیں کیا ہے، جوشِ بیان بھی نہیں ہے۔ حقیقت نگاری کی ایک سنبھلی ہوئی روش موجود ہے۔ ترقی پسند تحریک کے دورِ شباب میں توازنِ تحریر اور سلامتیِ فکر و احساس کو برقرار رکھنا بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ دراصل زندگی سے پُرخلوص رابطے ہی کا فیض ہے۔

محمد عین الہدیٰ جنبش گنج ہزاری باغ

قطعہ

خود بھی قصہ ہوئے تم کتنی کہانی دیکر
زندگی گذری بھی تو فن کو نشانی دیکر
ہو گئے اردو سے بھرا تھا ترا دل کتنا سہیل
زندہ اردو کو کیا تم نے جوانی دیکر

منظر کاظمی

الاؤ — ایک تجزیہ

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ سہیل عظیم آبادی نے پریم چند کی روایت کو کس حد تک آگے بڑھایا۔ لیکن اس میں کوئی تامل نہیں کہ انہوں نے اسی راہ پر اپنا سفر شروع کیا۔ اور پریم چند اسکول کے اہم افسانہ نگاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ پریم چند نے کسان، مزدور، مظلوم اور ہندوستان کے مفلوک الحال طبقہ کو ایک دردمند کی نظر سے دیکھا اور اپنے افسانوں میں انہیں برتا۔ سہیل عظیم آبادی کو بھی اپنے ابتدائی ادبی سفر میں وہ ہندوستان ملا ہے جو انگریزی حکومت کا دورِ آخر ہے۔ انگریزوں کے خلاف قومی تحریک، شہروں سے نکل کر دیہاتوں میں پھیل گیا ہے جہاں کسانوں کو براہ راست انگریزوں سے نہیں بلکہ اُن روئیوں سے پالا پڑتا ہے جو زمیندار اور جاگیردار کی شکل میں کھیت کھلیانوں پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔ الاؤ میں "ہندوستان چھوڑو" تحریک کے دوران کسانوں کی اسی بیداری کی جھلک ملتی ہے جو اس تحریک کے ابتدائی نقوش کو بھی واضح کرتی ہے۔ سہیل عظیم آبادی نے کئی یادگار افسانے لکھے۔ لیکن جو شہرت اور مقبولیت "الاؤ" کو ملی وہ ان کے کسی دوسرے افسانے کو نصیب نہیں ہوئی۔ بلکہ الاؤ کی مقبولیت کا وہ عالم اور جادو گری ہے کہ اُس کے سامنے ان کے بعض دوسرے اور زیادہ بہتر افسانے بھی دب کر رہ گئے ہیں۔ یہ افسانہ غالباً [illegible] یا [illegible] میں لکھا گیا تھا اور اُن کے پہلے افسانوی مجموعہ (الاؤ ۱۹۴۲ء) میں شریک ہوا۔ سہیل کی مقبولیت اور شہرت کا دور اسی مجموعہ بلکہ اسی افسانے سے شروع ہوا اور بعد میں تقریباً نصف صدی کی ادبی زندگی میں سینکڑوں افسانے لکھنے کے بعد بھی اس کی حیثیت اپنی جگہ مسلم رہی۔ اس حد تک کہ اس افسانہ کو تسلیم نہ کرنا اپنے آپ کو رد کرنے کے برابر ہے۔ خاص طور پر پریم چند اسکول کے عاشقین یا اس روایت کے ناقدین سہیل عظیم آبادی پر گفتگو کرتے وقت "الاؤ" کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ لیکن اس افسانہ کی خوبی یا خرابی کہئے کہ ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں جنہوں نے یہ افسانہ کبھی نہیں پڑھا پھر بھی انہوں نے اپنی ادبی ڈائری میں اس کا نام ضرور لکھ چھوڑا ہے۔ اس لئے بھی ضروری ہے کہ عام قارئین کے اس افسانے کا ایک تعارف پیش کر دیا جائے۔

کہانی ایک گاؤں کی ہے جس کی آبادی کسانوں پر مشتمل ہے اور جو کسی نہ کسی طور پر اپنے زمیندار کے

دن رات محنت مزدوری کرتی ہے۔ پٹواری زمیندار کا نمائندہ ہے اور اپنے آقا کے حکم کی تعمیل میں پورے طور پر فرمانبردار ہے پابندی سے لگان وصول کرتا ہے غلہ تقسیم کرالیتا ہے۔ کھیتی کے لئے دیئے جانے والے قرض ہر حالت میں واپس لے لیتا ہے۔ یوں دن رات [illegible] کے بعد بھی زمین کے سینے سے غلہ پیدا کرنے والے جالے دو وقت کی روٹی کے لئے ترستے رہتے ہیں۔ استحصال کا یہ سلسلہ یہاں بھی بند نہیں ہوتا کسان پٹواری کا بیگار بھی کرتے ہیں کہ بہرحال کھیتی کے لئے اُس سے دوبارہ قرض بھی لینا ہوتا ہے۔

"الاؤ" میں کردار کی بھرمار ہے۔ لیکن ان کی موجودگی واقعات کو کوئی رُخ دینے یا پلاٹ کی ترتیب و تنظیم میں کوئی فعال حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ تو بس گاؤں کی محدود فضا میں ایک ساتھ جینے مرنے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہنے کی دیہی روایت [illegible] سامنے آتے جاتے رہتے ہیں۔ بلاشبہ ان کی موجودگی کسانوں کی طرزِ زندگی اور اُن کے روزمرہ کے مسائل کو ضرور سامنے لاتی ہے۔ مگر افسانہ "الاؤ" کی تخلیقی ساخت میں دراصل بھاگو، دتو اور سانولی کا کردار اہم ہے۔ تینوں کے جذبے یکساں ہیں۔ مگر شعور کی سطح پر اُن کے رویے میں خاص فرق ہے۔ لیکن تینوں کا یہ فرق انہیں ایک دوسرے سے دور کرنے کی بجائے یگانگت کی تثلیث میں بدل دیتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ تینوں کے مسائل ایک ہیں ــــ زمیندار اور پٹواری کا استحصال اور ظلم ــــ

بھاگو اپنی بہن کی سسرال سے واپس لوٹتے ہوئے جہاں اس نے کسی سبھا میں حصہ لیا ہے اور اس موقع پر ہونے والی تقریروں کو سنا ہے۔ وہاں سے واپسی کے وقت اُس کے بہنوئی نے تحفہ کے طور پر اُسے ایک لاٹھی دی ہے جس کی خیدگی کو دور کرنے کے لئے وہ گاؤں کے باہر کے میدان میں اسے الاؤ سینک رہا ہے ــــ افسانہ یہیں سے شروع ہوتا ہے بھاگو جب اپنے گاؤں لوٹا ہے تو اس کی شخصیت بدل چکا ہے۔ ظلم کا تجربہ تو اُسے پہلے سے ہے مگر اس کے خلاف کوئی اقدام کیا جا سکتا ہے یہ بات اس نے پہلی بار سنی ہے۔ اُس کا دل و دماغ اُن خیالات سے متصادم ہے جو اُس نے اپنی بہن کی سسرال میں [illegible] کے [illegible] ہوئے سنی ہے وہ بھی [illegible] ہے۔ ظلم کے خلاف جنگ میں طاقت کا استعمال ناگزیر ہے۔ دن رات ہونے والے مظالم کی اصل ہیئت ابھی اس پر واضح نہیں۔ ان کا سلسلہ بند ہونا چاہیئے، یہ تو وہ بھی چاہتا ہے۔ [illegible] کی شکل کیا ہو، ابھی بھاگو پر وہ طریقہ کار روشن نہیں۔ اس کی تو بس ایک خواہش ہے کہ ایک سبھا اُس کے گاؤں میں بھی ہونی چاہیئے یہ سارا کچھ تقریباً غیر شعوری سطح پر ہے ــــ یہاں انقلاب نہیں، انقلاب کی دھمک ہے۔ تبدیلی کا [illegible] جذبہ کوئی چھتنار درخت نہیں بنتا، صرف ایک [illegible] کونپل پھوٹی ہے [illegible]

لاٹھی تو خوب ہے۔ لیکن اسے ایک گڑا سا [illegible] ایک ساتھی [illegible] ہے اور [illegible] اصلی چیز ہے۔ [illegible] خواہش تبدیلی کی ہے۔ تبدیلی کے لئے احتجاج ضروری ہے اور احتجاج تصادم کی راہیں ہموار کرتا ہے اور یہی راستہ انقلاب کے قدموں پر

بھکا اپنا سفر ختم کرتا ہے۔

بھاگو کے بعد سانول اور دلّو کا کردار اس صداقت کی مزید تشریح کر دیتا ہے۔ سانول ایک جذباتی نوجوان ہے۔ اس کے یہاں جوش ہے، ولولہ ہے۔ احتجاج کی آواز ہے۔ فوری تاثر اور ردّ عمل اس کے کردار کی خصوصیت ہے۔ وہ ہمیشہ کچھ کر گذرنا چاہتا ہے نتائج سے بے پروا ہوکر۔ کردار کے اس ۲۰۱۵ میں تیسرا نام دلّو کا ہے۔ یہ نوجوان کلکتہ گھوم آیا ہے اور وہاں مزدوروں کے درمیان رہ کر اُن کے مسائل اور اُن سے نپٹنے کے طریقۂ کار سے تھوڑا بہت واقف ہو گیا ہے۔ دلّو کے یہاں ٹریڈ یونین لیڈر کی طرح ایک احتیاط بھی پائی جاتی ہے۔ گویا بھاگو کے اندر ایک تبدیلی کی خواہش، سانول کے یہاں اس کی تکمیل کا بے پناہ جذبہ اور دلّو کے یہاں احتیاطی تدبر ہے۔ جب تینوں ایک ساتھ ملتے ہیں تو ایک ایسے کردار کا تصور ابھرتا ہے جو مختلف مرحلوں پر مختلف رویّوں کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

" ..... ہاں بہت بڑی سبھا ہوئی تھی۔ ایک سادھو جی آئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ سب کسان ایک ہو جائیں۔ آپس میں مل جل کر رہیں تب ہی زمیندار کے ظلم سے بچ سکتے ہیں" بھاگو۔

" ..... بھیا بات سچ کی ہے۔ ہم لوگوں پر جتنا ظلم ہوتا ہے اُسے کون جانے۔ سال بھر محنت کر کے اُپجاتے ہیں اور ہمارے ہی بال بچے بھوکوں مرتے ہیں" سانول۔

اور تب یہ فیصلہ ہوتا ہے،

" ..... زمیندار کو بیگار نہیں دیا جائے گی ناجائز دباؤ نہیں سہیں گے۔ پٹواری جی کو رسیدانہ نہ دیا جائے۔ دباؤ ڈال کر دودھ گھی وصول کر لیتے ہیں۔ وہ بھی بند اور بیگاری آخری طور پر ختم ہے"

اور جب یہ فیصلہ ہو جاتا ہے تو کردار کے اس ۲۰۱۵ کا روپ اس نہج پر سامنے آتا ہے

" ..... تب دلّو ٹھیک ہے نا؟" سانول

" ..... پکّا بات ہے بھائی۔ مرد بات سے نہیں ہٹتا" دلّو

" ..... بالکل ٹھیک" بھاگو

اس کے بعد گاؤں کی صورت حال جیسے بدلتی ہے۔

" ..... دوسرے دن صبح سے سارے گاؤں میں ہلچل تھی۔ بوڑھے، بچے اور جوان سب کچھ اس قسم کی باتیں دروازے پر کہتے پھرتے آج سبھا ہوگی۔ بچے تماشہ سمجھ رہے تھے۔ اور بوڑھے نتیجہ پر غور کر رہے تھے کہ کچھ ہی ہنگامہ ہوگا۔ پٹواری نے اندر ستوں اور طوطا رام کو بلا کر خوب ڈانٹا، گالیاں دیں اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اس سال تم لوگوں نے بقایا بے باق نہیں کر دیا تو کھلیان سے ایک دانہ بھی اٹھا کر نہ لے جا سکے گا۔ اس سے جوش اور بھی بڑھ گیا۔"

پٹواری کی دھمکی اور سازش، زمیندار کا خوف، نقصان کا اندیشہ، جوانوں کی ناتجربہ کاری اور اپنے ہی بیچ گھسے ہوئے مخبروں نے سبھا کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ جھپٹو دھوبی نام کے ایک آدمی نے پٹواری کو سارے پروگرام سے باخبر کر دیا۔

" دوسالے کو پکڑ کر چار لاٹھی۔ ہم لوگ سے کھود کھود کر بات پوچھتا ہے اور اپنے باوا کو جاکر کہتا ہے۔ حرامی ـــ"

"[illegible] کرنے کی بات نہیں سانول۔ کام کرنا ہے۔
دیر ہے سے کام کرنا ہوگا۔" دلّو
"ایسے سالوں کو سزا ضرور ملنی چاہئے۔" سانول
سانول مرنے مارنے پر آمادہ ہے۔ پھر ایک تھام کے
[illegible] آپے سے باہر ہونے لگتا ہے تو دلّو انتہائی
تحمل اور مصلحت سے کام لیتے ہوئے اسے ایک کمرے
میں بند کر دیتا ہے۔

"اب کیا ہوگا دلّو بھائی۔" بھاگو
دلّو کلکتہ میں مزدوروں کے درمیان رہ کر ان کے
احتجاجی رویوں کو جان چکا ہے۔ اس لئے اب جبکہ احتجاج
کی آواز بلند ہو چکی ہے، وہ نتائج کو حالات کے حوالے
چھوڑ دیتا ہے۔
"دیکھا جائے گا۔"
بہر حال سازش کامیاب ہوتی ہے اور دلّو اور سانول
اور بھاگو سب کسی نہ کسی جرم میں ملوث کر دیئے جاتے ہیں
اور گرفتار ہوتے ہیں۔ عین اس موقع پر فصل کی کٹائی
شروع ہو چکی ہے۔
"کھلیان بھرتا جا رہا تھا۔ لیکن اب کھلیان میں کسانوں
سے زیادہ پولیس کے سپاہی نظر آ رہے تھے
جو کھلیان کی حفاظت کرتی تھی۔"
غلہ پیدا کرنے کے ابتدائی مرحلے سے لے کر
کھلیان سے غلّے کی آخری بوری اٹھ جانے تک ایک
کسان کی زندگی کتنے پیچ و خم سے گذرتی ہے، کیسے
کیسے طوفان سے آشنا ہوتی ہے۔ کتنے بدلتے ہوئے
موسم کو جھیلتی ہے، دکھ درد برداشت کرتی ہے
اور دہیم کی کتنی ناہموار کیفیتوں سے دوچار ہوتی ہے
اور کیسا صبر کرنا پڑتا ہے۔ اور ان سب باتوں کے
باوجود اگر کھلیان میں کسانوں کی بجائے پولیس کے سپاہی
نظر آتے ہوں تو دیہی معاشرے کے لئے اس سے
بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا ہے — "الاؤ" اسی المیہ کی
ایک بازگشت ہے۔

افسانہ کا آخری حصہ اس تاثر کو اور بھی شدید
کر دیتا ہے

[— پوس کا مہینہ تھا۔ کڑاکے کی سردی
پڑ رہی تھی۔ کھلیان کی حفاظت کرنے والے سپاہی
اپنے گرم کوٹوں کے باوجود ٹھنڈک سے سکڑے جاتے
تھے۔ سب نے مل کر ایک بڑا سا الاؤ جلایا۔ آگ تاپ
رہے تھے اور کہانیاں کہی جا رہی تھیں۔ الاؤ بجھنے لگا
تو ایک سپاہی اٹھتے ہوئے بولا
"ایک دن ساری چیزیں اسی طرح ختم ہو جائیں گی"
"[illegible] پٹواری کا کمرہ۔ ادھر لالٹین میں کیسے
آرام میں ادھ ہیں اس وقت۔"
اس کے اٹھتے ہی دوسرے سپاہی بھی اٹھ کر
جھونپڑے میں چلے گئے اور الاؤ بجھ گیا۔ کھلیان میں
سپاہیوں کا شور گاؤں کے سناٹے میں مل گیا —]
افسانہ اپنے اختتام پر ایک ایسے سناٹے
کو جنم دیتا ہے جو کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ
ہو سکتا ہے۔ جلتے اور کبھی بجھتے ہوئے الاؤ کے
گرد بیٹھ کر کہی جانے والی کہانی کی آواز ظلم اور
استحصال کی حصار بندی سے آگے نہیں نکل پاتی اور
کہانی بیان کرنے والے کے حلقوم تک لوٹ آتی ہے
[illegible] لیکن جنگ آزادی کی مختلف تحریکوں کے نتیجے میں
عوامی شعور کی بیداری ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے
خصوصی طور پر ہندوستان کے مظلوم طبقوں میں
ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف نبرد آزما ہونے کی
جرأت و جسارت تجزیاتی مرحلوں سے نہیں گذری ہے

لیکن صدیوں کی غلامی اور بے دست و پائی کا احساس کروٹیں لینے لگا ہے۔ الاؤ دیہی معاشرہ میں ایک خاص سماجی علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے گرد دیہات کے لوگ اپنی محدود اور مختصر زندگی کے مختلف مسائل پر تبصرے کرتے ہیں یا قصے کہانیوں اور خوش گپیوں میں اپنی محرومیوں کو لاشعوری طور پر خاکستر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک اعتبار سے الاؤ کا تصور رومانی رجحان رکھتا ہے۔ اس رومانی فضا کو سہیل عظیم آبادی نے دلوں میں سلگتی ہوئی چنگاریوں سے ہم آہنگ کر کے عوامی احتجاج کے رویوں کو ڈرامائی عمل کے سہارے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ احتجاجی رویہ ابھی اپنے ابتدائی مرحلے میں ہے لیکن اس کی طاقت و توانائی سالو، ولو اور بھاگو کے دبے دبے باغیانہ کرداروں کے ذریعے فنکارانہ سطح پر اپنا اظہار اثر و تاثر کے ساتھ کرتا ہے جس سے کہانی کا مرکزی مفہوم اور کرداروں کے متعلق روابط ایک دوسرے سے مرکب اور ممتزج ہو جاتے ہیں اور اس طرح کہانی میں ایک تخلیقی جمالیاتی تجربے کی شکل میں ڈھل جاتی ہے۔ اپنے مخصوص موضوعاتی اور فنی دائرے میں سہیل عظیم آبادی کا یہ افسانہ پریم چند کی افسانوی روایت کو معتبر بناتی ہے اور یہی اس افسانہ کا سب سے بڑا حسن ہے۔

* * *

پریم چند کی آنکھوں کے آنسوؤں کی لکیر
سہیل آہ کہ تم سے تھی انجمن روشن
جہانِ فہم و فراست، جہانِ فکر و سخن
پریم چند کے دیرینہ خواب کی تعبیر

تمہاری حبِ دلی اور وسعتِ فکری
تمہارا حوصلہ، ہمت، یقین و عزمِ صمیم
طبیبِ گردشِ دوراں، غمِ جہاں کے حکیم
زباں زد ہے اے عیسیٰ تمہاری عیسیٰ گری

سہیل آہ کہ تصنیف تیری فکر نے کی
کتاب "اردو کی تاریخ ارتقا و بقا"
"معاشرے کا یہ مفلس غریب طبقہ"
"فروغ نکہت فطرت بقدر دیدہ وری"

سہیل

سہیل واصل حق ہو گیا یہ کہتا ہوا
کہ ہر نفس کے مقدر میں ہے فنا ہونا

ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی

کلا ۔ کلاکار ۔ ایک تجزیہ

سہیل عظیم آبادی کے انتقال سے پریم چند اسکول کی آخری یادگار بھی ختم ہو گئی۔ مرحوم نے اسی آفتاب فکر و فن کی روشنی میں اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کیا تھا۔ بہت سے دوسرے افسانہ نگار بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ان میں سدرشن، بالی، اعظم کریوی اور علی عباس حسینی قابل ذکر ہیں۔ علی عباس حسینی نے پریم چند کی فنی اور فکری روایت کو مسلم معاشرہ میں تلاش کیا ہے۔ اسی طرح سدرشن، بالی اور اعظم کریوی کا راہ عمل بھی مخصوص اور محدود رہا ہے۔ لیکن سہیل صاحب کا دائرہ عمل بے حد وسیع ہے۔ انہوں نے اپنی افسانہ نگاری کے ذریعہ نہ صرف پریم چند کے افسانے کی روایت کو قائم رکھا ہے بلکہ بڑھایا ہے اور اس کو فکری اور فنی وسعت عطا کی ہے۔

سہیل صاحب نے پریم چند کے عہد میں بھی افسانے لکھے ہیں جب ہندوستان انگریزوں کا غلام تھا اور جد و جہد آزادی سے گذر رہا تھا اور آزاد ہندوستان میں بھی تیس پینتیس سال کے ایک لمبے عرصے تک افسانے لکھتے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ ان کی زندگی کے آخر تک چلتا رہا ہے۔ اس طرح اُن کی افسانہ نگاری کا عہد ایک طویل عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس دوران میں انہوں نے بے شمار افسانے لکھے اور متعدد ناول تصنیف کئے۔ سہیل صاحب کے ان تمام کارناموں کو ایک مختصر سے مضمون میں سمیٹا نہیں جا سکتا۔ اس کے لئے تو ایک بھرپور تحقیقی مقالہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے راقم الحروف نے یہاں اپنے کو ان کے صرف ایک افسانہ "کلا ۔ کلاکار" تک محدود رکھا ہے۔ جو پہلی مرتبہ ماہنامہ [illegible] نومبر ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔

"کلا ۔ کلاکار" میں سہیل صاحب نے ایک صنم ساز کی حیات سے پلاٹ کی تشکیل کی ہے۔ صنم سازی اس کو وراثت میں ملی تھی۔ اس نے ہوش سنبھالا تو اس کا دادا ابھی مورتیاں بناتا تھا اور اس کا باپ بھی مورتی بنانے میں مصروف تھا۔ انجام کار وہ بھی چھینی ہتھوڑی سے کھیلنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کو ابھی زندگی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس لئے اس پیشے کے سود و زیاں سے اس کو کوئی واقفیت نہیں تھی لیکن اس کے بزرگوں کو تو یہی کرتے زندگی گذر رہی تھی۔ اس لئے انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ سودا گھاٹے کا سودا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے باپ نے اس پیشہ کو اختیار کرنے سے منع کیا اور اس کو اسکول میں داخل کر دیا تاکہ وہ پڑھ لکھ کر کوئی اچھا سا روزگار تلاش کرنے کے لائق ہو جائے اور اس کو زندگی کا یہ عذاب نہ جھیلنا پڑے جو اس کا خاندان کئی پشتوں سے جھیل رہا تھا۔ لیکن چھینی ہتھوڑی اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتی۔

"کلا ۔ کلاکار" میں سنگ تراشی کو موضوع بنایا گیا ہے

لیکن اس سے کوئی بھی فن مراد لیا جا سکتا ہے۔ افسانہ نگار کو خود بھی اپنی زندگی کا تجربہ تھا کہ فنکار اس ملک میں تباہ حال زندگی گذارتا ہے۔ میر کی شکل میں ایک شاعر کو بھی اسی حقیقت کا شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے ؎

مفلسی میں سب خواہ انساں جلد ہوں میں کیا

ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے (میر)

شاعر، مصور، صنم تراش، موسیقار ہر طرح کے فن کار زندگی میں اکثر و بیشتر تباہ و برباد رہتے ہیں۔ ان کی زندگی عسرت اور فاقہ مستی میں گزرتی ہے ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن (غالب)

زیر بحث افسانہ میں اس کا خاص سبب یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں اچھے فن کے قدرداں بہت کم ہوتے ہیں۔ فن کے محرم راز بہت کم ہوتے ہیں۔ غالب کو زندگی بھر ناقدری کی شکایت کرتے رہے۔ قمطراز حالی کے شکوے سے ان کی تحریریں بھری پڑی ہیں۔ حالی کو بھی ایک ایسے محرم راز کی تلاش تھی جو ان کے فن کی زبان کو سمجھ سکے ؎

کوئی ملتا نہیں محرم جہاں میں

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

اکثر دیکھا گیا ہے کہ اعلیٰ فنی تخلیق اپنے دور میں ناقابل فہم رہی ہے۔ اس لئے اس کے فنکار کو اپنے عہد میں وہ عظمت حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ غالب کی مثال سامنے ہے۔ جو قدر غالب کے فن کی اس زمانے میں ہے ان کے زمانے میں نہیں تھی۔ افسانہ نگار کو یہ خیال غالباً اپنی ہی زندگی سے ملا ہے کیونکہ ان کے فن کی قدر نہیں ہوئی جو ہونی چاہئے تھی۔

افسانہ میں فن کی ناقدری کی طرف [illegible] اشارہ کیا گیا ہے۔ نیمو (صنم ساز کا نام) نے دیکھا کہ اس کے دادا اور باپ کی گڑھی ہوئی مورتیوں کا ایک بڑا انبار پڑا ہوا گرد کھا رہا ہے۔ ان کو پوچھنے والا کوئی نہیں ہے۔ لوگ دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں بناتے تھے۔ ہندوستان جیسے مذہب پسند ملک میں ان کی بھی وہ قدر نہیں تھی جو ہونی چاہئے تھی۔ اس سے افسانہ نگار کا اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ [illegible] میں لا مذہبی رجحان اور ترقی پسند خیالات بڑھ رہے ہیں۔ فن کی ناقدری کے علاوہ لامذہبی انقلاب سے بھی یہ مورتیاں اکٹھا ہو گئی ہوں گی۔

یہ حقیقت ہر طرح کے فن اور آرٹ کے لئے ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ بڑے سے بڑے شاعر کے شعری مجموعے اور بڑے سے بڑے ادیب کی کتابیں ان کی الماریوں میں پڑی سڑتی رہتی ہیں۔ ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ انجام کار انہیں محفوظ طریقے سے رکھنے کا ایک اہم مسئلہ ان کے در پیش ہوتا ہے۔ چھوٹے فنکار اور ادیب کی حالت تو اور بھی خستہ ہوتی ہے۔ ہندوستان پر صدیوں سے ایسی ہی حالت تو چلی آ رہی ہے۔ اکثر و بیشتر قلمکاروں اور فنکاروں کو اسی قسم کے تجربات سے گزرنا پڑتا ہے۔

افسانہ میں یہ حقیقت نیمو کے سامنے ہے پھر بھی وہ چھینی ہتھوڑی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ سب کچھ سمجھتے اور جانتے ہوئے بھی بہر حال وہ اس پیشہ کو اختیار کرتا ہے۔ اس واقعہ سے فنکار کی [illegible] پر روشنی پڑتی ہے۔ فنکار اگر واقعی نفع و نقصان کے بارے میں سوچنے لگے تو اس کا شوق کبھی جنون کی شکل اختیار نہیں کر سکتا اور فن میں وہ انہماک پیدا نہیں ہو سکتا جو کسی اعلیٰ فنی تخلیق کے لئے [illegible]۔

سہیل صاحب نے [illegible] دوسرے افسانہ "لاابالی" مطبوعہ ماہنامہ کتاب [illegible] میں کہا

ایک فنکار کو موضوع بنایا ہے۔ اس کا مرکزی کردار "سامی" ایک مصور ہے جو خوبصورت تصویریں بناتا ہے۔ ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے وہ دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرتا ہے۔ اس کو اپنی تصویروں سے کبھی بڑی [illegible] قیمتیں وصول ہوتی رہتی ہیں لیکن وہ ویسی ہی فاقہ مست اور پھٹے حال رہتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں روپیہ ٹکتا نہیں ایسی ہی ایک مثال غالب کی شخصیت میں بھی ملتی ہے۔ ان کو [illegible] مختلف ذرائع سے اتنی رقمیں مل جایا کرتی تھیں کہ اگر وہ چاہتے تو ایک کامیاب زندگی گزار سکتے تھے اور آرام سے رہ سکتے تھے لیکن ان کا ضمیر سکون اور اطمینان سے نہیں بلکہ اضطراب [illegible] ہیجان سے بنایا گیا تھا۔ اس لحاظ سے فنکار کی حالت ایک چیل کی ہوتی ہے جس کے گھونسلے میں ماس کا ملنا [illegible] فضول ہے۔

چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

فنکار کو زر پرستی سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ دولت کی [illegible] اس کی فطرت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے دولت بھی اس کے گھر سے نکل جاتی ہے۔ توبۃ النصوح میں کلیم کو جب دولت ملتی ہے تو اسی طرح بے دریغ جلسہ جلوس میں اڑا دیتا ہے۔ نذیر احمد نے بھی اپنی زندگی کے آخری حصہ میں اپنی زندگی بھر کی کمائی کو اسی طرح اڑا دیئے ہیں۔ ان کی [illegible] فطرت زندگی کے دوسرے حصہ میں کسی خارجی دباؤ [illegible] سامنے آتی ہے۔

لیکن "[illegible]" [illegible] میں دولت کی آمد نہیں [illegible] کے باپ اور دادا کی زندگی تنگی [illegible] جو چیز پاس میں نہیں ہے اس کو [illegible] پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے [illegible] کے بعد [illegible] کے باپ کو ایک زمیندار کی [illegible] حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ ان کی بنائی ہوئی تمام

مورتیوں کو اپنے کلامندر میں منتقل کرا لیتا ہے اور اس کے باپ کو ان کی دیکھ بھال کے لئے رکھ لیتا ہے۔ اسی طرح ان کی بنائی ہوئی مورتیوں کو جگہ مل جاتی ہے اور ان کو بھی زندگی بسر کرنے کا ایک مستقل وسیلہ ہاتھ آجاتا ہے اس کے بعد فنکار کا باپ کلامندر کی نگرانی کرنے لگا اور اس کے لئے نئی نئی مورتیاں بنانے لگا اور نیمو کو بھی اسکول چھڑا کر اسی مندر کے لئے مورتیاں بنانے پر لگا دیا۔ اس کلامندر سے وابستہ ہو جانے پر ان کو ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے فن کی شہرت دور دور پھیلنے لگی اور لوگ کلامندر میں ان مورتیوں کو دیکھنے اور خریدنے کے لئے آنے لگے

[illegible] زمیندار (اس طبقہ کی نئی نسل) خاندانی حالات کے تحت دیہات کی سکونت چھوڑ کر مستقل طور پر شہر میں آباد ہو گیا تھا۔ اسی جگہ اس نے اپنے مکان (جو پہلے ہی سے شہر میں موجود تھا) کے ایک حصہ میں کلامندر قائم کیا تھا۔ — افسانہ کا یہ موڑ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ دیہات کی آبادی کس طرح اور کن حالات میں دیہات سے شہر میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ دیہات کی آبادی روز بروز پھیلتی ہے اور اس کے بعض حصے ٹوٹ کر شہر سے ملتے ہیں۔ شہر میں منتقل ہونے والوں میں اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ افسانہ میں زمیندار کے ساتھ فنکار بھی منتقل ہوتا ہے جس کی ایک حیثیت عام انسان اور محنت کش مزدور کی بھی ہوتی ہے — "گئودان" میں بھی اسی طرح کا خیال گوبر اور زمیندار کے کردار کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ گوبر صرف کسان یا مزدور ہے فنکار نہیں ہے [illegible] زمیندار کی ایک کوٹھی یا بنگلہ بھی شہر میں بنا ہے اور اس نے مستقل طور پر وہاں سکونت اختیار کر لی [illegible]

ابھی جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ یا مہاجنی نظام میں رشتہ قائم ہوتا ہے۔ وہ قربت حاصل نہیں ہوتی ہے جو دو پڑوسیوں کے مابین ہوتی ہے۔ سہیل صاحب کا اس بہت میں یہ اگلا قدم ہے گو بر بھی جاگیردارانہ نظام سے سرمایہ دارانہ نظام کی طرف پیش قدمی کرتا ہے بلکہ اس کے اندر بھی سرمایہ پرستی کی کچھ خصوصیات پیدا ہونے لگتی ہیں۔ یہ تمام امور سماجی حقائق کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انسانی سماج اسی انداز کا ہے ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف اپنا قدم بڑھاتا رہتا ہے اس واقعہ سے افسانہ نگار کا سماجی شعور ظاہر ہوتا ہے۔

شہر میں نیمو کو زمیندار سرپرست کے توسل سے ایک سرمایہ دار سرپرست رام داس ملا۔ لیکن افسانہ میں ان دونوں موڑ کے درمیان متعدد سطور اور بین السطور میں بہت سے نشیب و فراز سامنے آتے ہیں۔ نیمو چھوٹے سے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ مگر جوان ہوا کلامندر کے ماحول میں۔ وہاں اس کو مختلف طرح کے لوگ ملے۔ جن کے خیالات اور سوچنے کے انداز مختلف تھے۔ جن کی باتیں مختلف تھیں اس بدلے ہوئے ماحول میں زمیندار کے لڑکے کی شادی کے موقع پر جس میں شرکت کے لئے بہت سے لوگ کلکتہ جیسے بڑے شہر سے آئے ہوئے تھے، نیمو کو فن کا ایک نیا شعور حاصل ہوتا ہے۔ کلکتہ انگریزوں کے زمانے میں جدید ادبی افکار اور نظریات کا سرچشمہ رہا ہے مغربی ادبی اور فنی تصورات اسی شہر سے شمالی ہندوستان میں پھیلے اور اردو قصہ کو اسی جگہ سے نئی زبان اور نیا فن ملا۔ افسانہ نگار اس حقیقت سے آگاہ معلوم ہوتا ہے اسی لئے وہ نیمو کی سنگ تراشی میں ایک نیا گوشہ کلکتہ ہی کے تعلق سے پیدا کرتا ہے۔ نیمو کو کلکتہ کے مہمانوں سے معلوم ہوا کہ سنگ تراشی کا فن صرف دیوی اور دیوتاؤں کی مورتیاں بنانے تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس خیال سے اس کے اندر قدیم روایات کے خلاف بغاوت کا ایک رجحان پیدا ہوتا ہے۔ زمیندار جو جاگیردارانہ نظام کی ایک دھندلی سی علامت یا یادگار ہے جو استداد زمانہ کے اثر سے ابھی باقی رہ گئی ہے۔ نیمو کی نئی قسم کی سنگ تراشی کو اپنے کلامندر میں جگہ نہیں دیتا۔ کیونکہ اس کا یہ فنی رویہ جاگیردارانہ نظام کی اقدار اور روایات کے خلاف ایک طرح کی بغاوت معلوم ہوتا ہے اور وہ اسی کا بچا ہوا ایک حصہ تھا — لیکن فنکار اپنے فن پر کسی طرح کی پابندی قبول نہیں کرسکتا۔ اس لئے نیمو اپنے نئے فنی نمونے کو اپنے گھر میں محفوظ کرتا جاتا ہے اور جب سیٹھ رام داس کی شکل میں اس کو ایک دوسری منزل کے نشانات دکھائی پڑتے ہیں تو وہ خاموشی سے اس کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ اپنے نئے فنی نمونے سیٹھ کو اپنے گھر لے جاکر دکھاتا ہے اور اس کے کہنے پر اپنے فن کے لئے ایک وسیع میدان کی تلاش میں اس کے ہمراہ کلکتہ چلا جاتا ہے جہاں اس کو اپنے فن کے نئے قدردان ملتے ہیں جس سے اس کے فن کی قدر و قیمت میں کئی گنا اضافہ ہوتا ہے۔ سیٹھ رام داس اپنے ایک دوست کے توسط سے نیمو کی فنی کاوشوں کو زیادہ سے زیادہ قیمت پر فروخت کرتا ہے۔ نیمو کو پہلے کے مقابلے میں کئی گنا فائدہ ہونے لگتا ہے اور سیٹھ بھی اس کاروبار سے کثیر رقم حاصل کرتا ہے۔ اس کاروبار سے فنکار اور سرمایہ دار دونوں خوش نظر آتے ہیں۔

افسانہ کے اس موڑ پر اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ فن کے میدان میں رفتہ رفتہ شہرت اور اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اپنے کو روشناس کرانے اور اس کا لوہا منوانے میں کتنی کی زندگیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ قدر نگاری میں سجاد حیدر یلدرم کو اہمیت حاصل ہے لیکن اتنی نہیں

جتنی قرۃ العین حیدر کو حاصل ہوگئی ہے۔ پریم چند بھی اپنے دور میں کم سے کم اردو میں وہ اہمیت حاصل نہ کر سکے تھے جو اسے حاصل ہے۔ اس موڑ پر ایک اور اہم نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ فنکار کو زمانے کے ساتھ چلنا چاہئے۔ اس میں تبدیلی اور نئے فنی شعور کا بیدار ہونا ضروری ہے۔ بغیر اس کے وہ فنی اہمیت اور عظمت حاصل نہیں کر سکتا۔ غالب بھی اپنے جدید اور ترقی پسند فنی رویہ ہی کے ذریعہ اپنے عہد کے تمام شعراء میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر سکے تھے۔

افسانے کے اس موڑ پر نیمو کے دل میں اپنے فن کی زیادہ سے زیادہ قیمت لگانے کا خیال ترقی کرتا جاتا ہے پہلے وہ کم میں خوش تھا لیکن اب ہزاروں میں اس کے فن کا معاوضہ مل رہا ہے۔ لیکن اس کو اتنی خوشی نہیں ہوتی ۔۔۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ قناعت کا دامن ہاتھ سے چھوٹا تو کسی چیز کی کوئی حد نہیں ہے۔ انسانی ذہن کی اسی نفسیاتی حقیقت پر یہاں روشنی ڈالی گئی ہے۔ فنکار بھی ایک انسان ہوتا ہے اس کے اندر بھی اس انسانی خصوصیت کا ہونا لازمی ہے لیکن فنکار ہونے کی حیثیت سے نیمو کو اس بات کا زیادہ رنج ہوتا ہے کہ اس کے فن سے جو حاصل ہوتا ہے اس میں سے اس کو بہت کم حصہ ملتا ہے۔ بلکہ اس کا اصل غم یہ ہے کہ اس کے فن کو اس کی اصل شکل میں پیش نہیں کیا جا رہا ہے۔ سچا فنکار ہر چیز برداشت کر سکتا ہے لیکن اپنے فن کی پامالی برداشت نہیں کر سکتا۔

افسانہ میں اس حقیقت کو اس طرح پیش کیا گیا ہے [illegible]س اور اس کے دوست اس کے گڑھے ہوئے بتوں [illegible] طرح سے مسخ کرتے تھے اور ان کو زمین کے اندر [illegible] دیتے تھے تاکہ وہ آثار قدیمہ کی چیز بنا ثابت کی جا سکیں [illegible] دھوکا اور فریب کاری اس زمانے میں [illegible] افسانہ میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

افسانہ "کلا۔ کلاکار" کا یہ آخری موڑ ہے جس کے ذریعہ سرمایہ دارانہ نظام میں یا ہر زمانے میں فن اور فنکار کے استحصال کی بات سامنے آتی ہے ۔۔۔ آج بھی فنکار بھوکوں مرتے ہیں اور ان کے فن کی بدولت سرمایہ دار دادِ عیش دیتے ہیں۔ سب سے بڑے کلاکار تو وہ ہوتے ہیں جو کرتے کچھ نہیں لیکن عیش کرتے ہیں۔ خون پسینہ کوئی بہاتا ہے۔ عرق ریزی اور دماغ سوزی کوئی کرتا ہے لیکن دل میں ٹھنڈک کسی کے پڑتی ہے ۔۔۔ قندیل میں خون کسی کا جلتا ہے اور روشنی کسی کے گھر ہوتی [illegible] ہے

روشنی کرتی ہے کس گھر کا طواف
خون کس کا جلتا ہے قندیل میں

اس طرح یہ افسانہ فن اور فنکار کے استحصال پر ختم ہوتا ہے۔ لیکن نیمو کی شکل میں افسانہ نگار کسی طرح بھی نہیں چاہتا کہ سماج میں اس طرح کا ظلم و جبر برقرار رہے۔ وہ سماجی نظام کی اس طرح کی خرابی کو بہر حال ختم کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے افسانہ کے آخر میں نیمو سماج کے ان بڑے کلاکاروں یعنی سرمایہ پرستوں سے قطع تعلق کر لینے کا مصمم ارادہ کر لیتا ہے اور سیٹھ رام داس اور اس کے دوست کو اپنی بنائی ہوئی مورتیاں دینے سے بالکل انکار کر دیتا ہے۔ وہ اس کی کوئی پروا نہیں کرتا کہ اس کے اس اقدام سے اس کو پہلے کی طرح بھوکوں مرنا پڑے گا۔

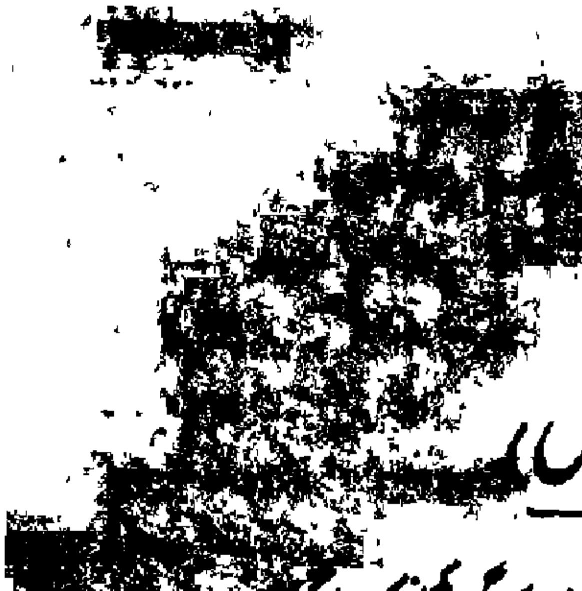
افسانہ بالکل صاف ہے۔ اس میں نہ تو جدید افسانوں کی طرح کا ناروا ابہام اور گنجلک خیالات ہی ملتے ہیں کہ ان کے سر اور پیر کا کوئی پتہ ہی نہ چلے اور نہ بالکل سرسری ہی کہا جا سکتا ہے جس پر سطحیت اور

سپاٹ پن کا عیب لگایا جا سکے۔ اس پر علامتوں کا ہلکا سا اثر ملتا ہے لیکن وہ کافی واضح ہیں۔ اس سے افسانہ نگار کی قلم کی پختگی ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح سہیل صاحب کے افسانہ "لاابالی" میں بھی تمام خیالات واضح ہیں۔ اس میں بھی خاص کردار ایک فنکار ہی ہے۔ لیکن اس کا مرکزی خیال دوسرا ہے۔ یہ استحصال کے بجائے سیکولر انداز حیات کو موضوع بناتا ہے۔ سہیل صاحب کے ان افسانوں پر کسی قسم کا کوئی لیبل نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ صدیوں سے انسانی فکر کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں پریم چند کی طرح افسانے کے اجزائے ترکیبی میں سے ہر عنصر کی موجودگی کا احساس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی ایک خاص فضا ہوتی ہے۔ کردار، پلاٹ، فلسفۂ حیات، خوبصورت پیش رفت اور قصہ پن، ان کے اندر روایتی افسانہ کی ہر چیز ملتی ہے اور خوبصورت اسلوب تحریر بھی۔ "کلا۔ کلاکار" میں پریم چند کے بہت سے افسانوں کی طرح ہندوستانی دیہات اور شہر دونوں جگہوں کی زندگی کا اثر ملتا ہے جب کہ جدید افسانے عموماً شہری زندگی کو موضوع بناتے ہیں۔ چونکہ بقول گاندھی جی ہندوستان کی ۸۳ فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے اس لئے کوئی فنکار ملک کی اجتماعی زندگی کے اتنے بڑے حصّہ کو نظر انداز کر کے بڑا فنکار نہیں ہو سکتا۔ قصہ نگار کے لئے یہ قول تو اور بھی صادق آتا ہے۔ کرشن، بیدی، عصمت اور بہت سے جدید افسانہ نگار فنی اعتبار سے بہتر ہو سکتے ہیں لیکن پریم چند کی طرح بڑے اور عظیم افسانہ نگار نہیں ہو سکتے۔ بقول قاضی عبدالستار پریم چند کی عظمت کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ ملک کی زندگی کے اس بڑے حصہ کو خاص طور پر موضوع بناتے ہیں۔

(ماہنامہ کتاب جولائی ۶۲ء ص ۱۶)

افسانہ نگاری کے سلسلے میں کم و بیش یہی رویہ سہیل عظیم آبادی کا بھی رہا ہے۔ انہوں نے بھی اردو میں ایک سے ایک شاہکار افسانے لکھے ہیں۔ ان میں "رام اور راون" تو خاص طور پر اہم ہے ــــ لیکن ان کے کم اہم افسانوں میں بھی اسی طرح کی فنی عظمت کے نشانات ملتے ہیں جیسے کہ پریم چند کے یہاں۔ لیکن ان کو ادب میں وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کی طرف سے بالکل بے نیاز رہے ہیں۔ ان کو اپنی عظمت کا سکہ بٹھانے کے لئے ہر طرح کے وسائل حاصل تھے۔ وہ بہت سے اہم اردو اداروں سے وابستہ تھے۔ کئی اہم جریدوں کے مدیر رہ چکے تھے اور بہت سے رسالوں کے سرپرست ادبی تحریکوں کے روح رواں رہے تھے۔ اس لئے وہ چاہتے تو ان پر ایک سے ایک یادگار نمبر نکل سکتے تھے۔ ایک سے ایک گوشے شائع ہو سکتے تھے۔ لیکن شاید ایک بھی شائع نہ ہوا ــــ وہ ایک سچے ادیب اور فنکار تھے جو ان تمام چیزوں سے بلند ہوتے ہیں شہرت اور عظمت کے پیچھے وہ نہیں بھاگتے۔ یہ خود ان کے پیچھے بھاگتی ہے۔ وہ تو اپنی عظمتوں کے نشانات چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کو خود تلاش کریں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو یہ ادبی بددیانتی اور اردو افسانہ اور ناول پر ظلم ہوگا۔

ظفر حبیب
شعبۂ اردو اے۔ بی۔ ایس۔ ایم کالج
[illegible]



سہیل عظیم آبادی
(بحیثیت ناولٹ نویس)

سید مجیب الرحمٰن سہیل عظیم آبادی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو اردو زبان و ادب سے معمولی سی واقفیت رکھنے والے کے لئے بھی شناسا ہے۔ سہیل عظیم آبادی مرحوم اُن خوش نصیب لوگوں میں تھے جنہیں ان کی حیات میں ہی خوب خوب شہرت بھی ملی اور قدر و منزلت بھی نصیب ہوئی۔ ادبی دنیا میں اردو کے معتبر اور مستند افسانہ نویس اور ناول نگار میں ان کا شمار ہوا۔ اردو کے اعلیٰ پایہ کے جریدے ان کی تخلیقات کو اپنے صفحات پر جگہ دے کر فخر سے اپنی گردن تان لیا کرتے تھے۔

فنکار ہمیشہ زمانہ کی ناقدری کا شکار رہا ہے۔ اگر کسی فنکار نے اپنے زمانہ سے اپنا لوہا منوالیا ہے اور بلاخوف و خطر خود کو سکۂ رائج الوقت بنالیا ہے تو یہ اس کی دیوتائی کا ثبوت ہے۔ بلاشبہ اردو کہانوی ادب میں سہیل ایک دیو پیکر شخصیت کا نام ہے۔ ایسی حالت میں ان کے فکر و فن پر قلم آزمائی کی کوشش اپنے طالب علمانہ ذوق کی تسکین اور اس عظیم شخصیت سے اپنا رشتہ جوڑنے کی تمنا کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

سہیل صاحب اردو کی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ پریم چند سے انہیں گہری عقیدت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کہاں سے کہاں اُن کی روح اپنے آخری سفر پر روانہ ہونے کے لئے انہیں پریم چند کے گھر کھینچ کر لے گئی۔

پریم چند کے طرزِ تحریر سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا تھا لیکن پریم چند کے افکار و نظریات سے انہیں کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ:

پریم چند کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے ... ان کو دوسرے افسانہ نگاروں کے ساتھ ایک صف میں کھڑا کرنا میرے خیال میں درست نہیں۔ ان کی حیثیت دوسرے افسانہ نگاروں سے میرے خیال میں بالکل مختلف ... ان کی حیثیت اردو افسانوں میں حقیقت نگاری کے جنم داتا کی ہے ...

... افسانوں میں حقیقت نگاری کا تصور پریم چند کی ذات سے وابستہ ہے۔ ورنہ افسانہ کے معنی ہی غیر حقیقی حقائق کا دلچسپ اور حیرت انگیز اظہار سمجھا جاتا تھا۔ کسی بات کی سچائی پر اگر شبہ کا اظہار کرنا ہوتا تو لوگ کہتے - "بھئی یہ حقیقت ہے یا افسانہ؟" بالفاظ دیگر افسانہ حقیقت ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو حقیقت کی ضد ہے۔ ایسی حالت میں پریم چند نے زندگی کے ہر گوشہ افسانہ کو لاکر کھڑا کر دیا۔ یہ ان کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔ سہیل کے نزدیک پریم چند کا یہی عظیم کارنامہ قابلِ التفات اور لائقِ تقلید ہے ... میں اس وقت دانستہ

طور پر اس بحث سے اعراض برت رہا ہوں کہ سہیل کے افکار پر پریم چند کے افکار کی چھاپ تھی یا نہیں؟ اس لئے کہ تمام لوگ آنکھ موند کر یہ کہتے چلے گئے ہیں کہ سہیل پریم چند کی سچی نقل (TRUE COPY) تھے۔ جبکہ میرے نزدیک سہیل نے پریم چند سے حقیقت نگاری کے سوا اور کچھ نہیں لیا۔ سہیل کی حقیقت نگاری کے ثبوت کے لئے میں ان کے معرکتہ الآرا ناولٹ "بے جڑ کے پودے" کو پیش کروں گا۔ اور اس وقت اسی ناولٹ کے اجزائے ترکیبی پر گفتگو کر کے اپنی بات بھی ختم کر دوں گا۔

ناولٹ، ناول اور افسانہ کے مابین معلق ایک تیسری صنف ادب کا نام ہے۔ یعنی اس میں ناول کی طرح پلاٹ، کردار، مکالمہ، پس منظر، مقصد حیات اور طرز بیان سب کچھ ہوتا ہے پھر بھی اس میں وہ وسعت اور پھیلاؤ نہیں ہوتا جو کسی بھی اچھے ناول کا طرۂ امتیاز ہوا کرتا ہے۔ جہاں تک پلاٹ کی بات ہے ناولٹ میں پلاٹ ہوتا ہے بلکہ کئی حیثیتوں سے ناول سے زیادہ رچا ہوا اور گٹھا ہوا پلاٹ ہوتا ہے۔ لیکن کردار، مکالمہ اور پس منظر کا بس ایک موہوم اور مبہم سا تصور ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی تنگئ دامانی کرداروں کی پہلو داریوں کو اپنے اندر جگہ دینے کی متحمل نہیں ہوا کرتی۔ اسی طرح مکالموں کی گنجائش بھی کم ہی نکل پاتی ہے اور پس منظر اور پیش بندیوں کا گذر تو لگ بھگ ناممکنات میں سے ہوتا ہے۔ لے دے کے قلم کار کرداروں کے سہارے اپنا مقصد حیات اپنے مخصوص طرز بیان کے سہارے پیش کرنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ اس طرح اس کا سمٹا سمٹایا پلاٹ اسے طویل مختصر افسانہ کی صنف میں لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔

سہیل عظیم آبادی کا یہ ناولٹ گٹھے ہوئے پلاٹ کا ایک خوبصورت کہانوی پیکر ہے۔ جس میں انہوں نے دو لاوارث بچوں ارنسٹ اور نورا کی پرورش و پرداخت اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے پرورش پانے والے لطیف جذبات کی انتہائی دلنشین پیرایہ میں پیشکش کی ہے۔

ارنسٹ اور نورا دونوں نطفۂ ناتحقیق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک مشن میں دونوں کی پرورش و پرداخت ایک بوڑھی انگریز خاتون مسز گرین کے ہاتھوں ہوتی ہے دونوں جوان ہوتے ہیں۔ بچپن سے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن ان کی محبت خالص عاشقانہ انداز رکھنے کے باوجود جنسی تلذذ کی منزل تک نہیں پہونچتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے شادی کر لینے کی تمنا دل میں پالتے رہتے ہیں۔ نورا پر ایک آدیباسی کرسچین نوجوان جو اسی مشن میں رہتا ہے، عاشق ہو گیا ہے۔ لیکن نورا اسے پسند نہیں کرتی ہے۔ ارنسٹ کو اس آدی باسی کرسچین نوجوان آرتھر کی اس حرکت کا علم ہو جاتا ہے۔ وہ آرتھر کو ایک رقیب کی صورت میں دیکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آرتھر اپنی حرکت سے باز آ جائے۔ لیکن اس کا الٹا یہ ہوتا ہے مشن کا سرخیل بشپ ارنسٹ کو ہی آرتھر کی راہ سے ہٹا دینا چاہتا ہے۔ نورا اور مسز گرین دونوں کو اس کا صدمہ [illegible] ارنسٹ بغاوت کر جاتا ہے۔ مشن سے نکل جاتا ہے اور ایک معزز وکیل مسٹر سنہا کے یہاں رہنے لگتا ہے۔ مسٹر سنہا ارنسٹ کو ایم۔ اے کرنے کے لئے پٹنہ بھیج دیتے ہیں۔ بعد میں وہ نورا کو بھی اپنے یہاں بلا لیتے ہیں اور اسے بھی پڑھنے کے لئے ایک دوسرے شہر بھیج دیتے ہیں۔ دونوں اپنے اپنے طور پر مگن ہیں کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ مسٹر سنہا ان دونوں کے لئے فرشتۂ رحمت

بھگتنا نازل ہوتے ہیں۔ لیکن دونوں کی محبت ایک دوسرا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ مسٹر سنہا مرنے سے پہلے ارنسٹ اور نورا کو مسز گرین کی موجودگی میں یہ بتاتے ہیں کہ وہ دونوں مسٹر سنہا کی اولاد ہیں اور بھائی بہن ہیں۔

ناولٹ کا یہ چونکا دینے والا کلائمکس (نقطۂ عروج) معصومیت اور ملکوتیت پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ گرچہ قاری اس کے لئے تیار نہیں ہے لیکن اسے اس انجام کو قبول کر لینا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں پاکیزگی ہے شرافت ہے اور برجستگی ہے۔ سہیل صاحب کہانی میں کہانی پن کے قائل ہیں اور اس ناولٹ میں کہانی پن اپنی تمام تر صفات کے ساتھ موجود ہے۔ پورا ناولٹ دلچسپیوں سے بھرا ہے اور یہ دلچسپیاں صرف اس لئے ہیں کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب انسانی معاشرہ کا جیتا جاگتا منظر ہے۔ یہی وہ حقیقت نگاری ہے جو سہیل نے پریم چند سے حاصل کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں متضاد صنفیں غلط ڈھنگ سے ایک دوسرے کے قریب ہو جاتی ہیں اور اسے عشق کا نام دے دیا جاتا ہے یہ عشق جنسیت تک پہونچ کر دم لیتی ہے انجام کار دو جسموں کا اتصال نئے جسم کے وجود کا سبب بنتا ہے۔ لیکن پھر یہ عشق کرنے والے لوگ اتنی [illegible] ہمت نہیں رکھتے کہ اس نو زائیدہ کو اپنا سکیں۔ اپنے گناہ کا بوجھ اپنے سر پر ڈھو سکیں۔ بلکہ اس کے برخلاف اپنے گناہ کی سزا معصوم اور پاک روحوں کو دے دیا کرتے ہیں۔ ارنسٹ اور نورا ویسی ہی دو معصوم روحیں ہیں جو اپنے والدین کے گناہ کی سزا میں تنہائیوں سے بھر پور مشقت کی زندگی گزارتی ہیں۔ اگر بروقت ان کی ملاقات مسٹر سنہا سے نہیں ہو گئی ہوتی تو شاید یہ لوگ اس سے بھی زیادہ بھیانک انجام کو پہونچتے ماں جایا بھائی بہن ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بیاہ کر سکتا اور افزائش نسل کا ذریعہ بنتے ——

سہیل عظیم آبادی نے فطرت انسانی (مسٹر سنہا جیسی) کے اس بچھورے پن پر کاری ضرب لگانے کے ساتھ ساتھ عزم و حوصلہ پیدا کرنے اور اپنے گناہوں کی سزا میں خود جہنم رسید ہونے کا مزاج پیدا کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی بتانا چاہا ہے کہ جرم کی پردہ داری کتنا بھیانک روپ اختیار کر لیتی ہے۔ سہیل ایک انسان دوست فنکار تھے۔ علامہ اقبال [illegible]

[illegible] از گردوں مقام آدم است
[illegible] احترام آدم است

کے قائل تھے۔ انسانیت جس رنگ و روپ میں بھی ان کے سامنے آئی اس کی انہوں نے قدر کی۔ ڈاکٹر محمد حسن نے صحیح کہا ہے کہ "سہیل عظیم آبادی ایک عظیم افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان بھی تھے"۔ [illegible] والے لوگ گرچہ اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں اور ان کی ساری بھاگ دوڑ کا ماحصل پریشان حال لوگوں کو تبدیلیٔ مذہب کے لئے آمادہ کرنا ہوا کرتا ہے اس مقصد کے حصول کے لئے ہی سہی لیکن انسانوں کی خدمت کا جو مزاج ان لوگوں کے اندر پایا جاتا ہے، سہیل کی نظر میں وہ بیحد قابل قدر اور لائق تقلید ہے ——

ارنسٹ مسز گرین کے ساتھ بنگلے پر ہوتا۔ بنگلہ [illegible] بڑا تھا۔ مسز گرین اکیلی نہیں رہتی تھیں ان کے پاس کا ایک ہی کمرہ تھا۔ دوسرے کمروں میں دوسری مشنری عورتیں رہتی تھیں۔ ایک کمرے میں مس بوتی لیڈی ڈاکٹر رہتی تھی۔ دوسرے کمرے میں لڑکیوں کے ہائی اسکول کی پرنسپل مس جون، ایک کمرے میں مس [illegible]

رہتی تھی۔ وہ گونگے بہرے بچوں کا اسکول چلاتی تھی۔ ایک کرہ مس کیپلے کا تھا وہ اندھے بچوں کا اسکول چلاتی تھی۔ اور ایک کمرے میں مس وائلٹ رہتی تھی وہ لڑکیوں کے لئے دستکاری کا اسکول چلاتی تھی۔"

یہ سب کیا ہے؟ صرف یہ بتانے کی کوشش کہ انسانیت کے لئے کام کرنے کے یہ سارے پہلو ہیں۔ سہیل صاحب مستقل طور پر متحرک اور باعمل رہنا ہی شیوہ مردانگی سمجھتے تھے۔ ع

اسے زفرصت بے خبر [illegible]

یہی پیغام تھا سہیل عظیم آبادی کی زندگی کا — سب سب دن رات اپنے کاموں میں لگی رہتی تھیں۔ صرف چائے اور کھانے کے وقت ملاقات ہوتی تھی، ورنہ ایک بنگلے میں رہ کر بھی ایک دوسرے سے اتنی دور تھیں جیسے الگ الگ محلوں میں رہتی ہوں۔ بس خاص خاص موقعوں پر آپس میں مل کر بیٹھتیں اور مشورہ کر [illegible] آ تیں تھیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا سہیل ایک انسان دوست فنکار تھے۔ وہ تفریق مذہب و ملت کے قائل نہیں تھے جہاں انہیں اچھائی نظر آئی اس کی انہوں نے قدر کی۔ ترقی پسندوں کے جرگہ میں رہ کر بھی مذہب سے انہیں نفرت محسوس نہیں ہوتی بلکہ مذہبی گروہ بھی اگر انسانی بھلائی کے کاموں میں [illegible] لگا ہوا نظر آیا تو انہوں نے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ " مسٹر سنہا بہت سی باتیں کہتے رہے...... عیسائی مشنریوں کی تعریف کرتے رہے یہ کیسے اچھے لوگ ہیں جو اپنی ساری زندگی ایک کام کے لئے وقف کر دیتے ہیں اور اپنے لئے کچھ بھی نہیں کرتے" — مس گریس جب آئی تو لڑکیوں کے ہائی اسکول میں پڑھاتی تھی۔ اس وقت اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ لیکن پڑھانے کے کام میں اس کا جی نہ لگتا تھا — وہ ایسا کام کرنا چاہتی تھی جس میں سارا دن الجھی رہے اور نئے عیسائی بنا سکے۔" سہیل صاحب کی نظر میں یہ لوگ صرف اس لئے قابل قدر تھے کہ ان کے مقاصد نیک تھے اور نیک مقاصد میں مذہب پسندی بھی شامل ہے —

امتیاز مذہب و ملت سے وہ اوپر تھے۔ ہر مذہب کا ماننے والا ان کی نگاہ میں یکساں قدر و منزلت کا حامل تھا۔ کسی کے لئے ان کے دل میں نہ خصوصی التفات تھا اور نہ کسی کے لئے کوئی مخصوص مراعت۔ یہ اُن کے کردار کا مومنانہ پہلو تھا (سیکولرزم نہیں — اس لئے کہ سیکولرزم تو مکاری کا دوسرا نام ہے جو دوسروں سے نفرت کرنا سکھاتا ہے)

[illegible] مسٹر سنہا کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ " سارے رشتہ دار اُن کی آزاد [illegible] خیالی سے ناراض تھے اور کوئی اُن کے یہاں آتا جاتا نہ تھا۔ — ان کے نوکر مسلمان تھے، عیسائی تھے، آدیباسی تھے اور ان کے رشتہ دار ہندو تھے۔ سب کو اپنا مذہب پیارا تھا۔ مسٹر سنہا سے ملنے جلنے یا ان کو اپنا بچہ دیدینے کا مطلب اسے بھی مسٹر سنہا کی طرح بے ذات اور بے مذہب بنانا تھا۔" یہ مذہب پسندی کے نام پر مروجہ نفرت پسندی پر گہری چوٹ ہے۔ سہیل صاحب قائل تھے اس بات کے کہ ع

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

انسان آدم کی اولاد اور اللہ کا بندہ ہونے کے ناتے تفریق، تعصب اور آپسی تصادم کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا۔

ناولٹ کی محدود بساط پر کردار نگاری کے جوہر دکھانے کے مواقع کم ہی نصیب ہوتے ہیں اس لئے اگر فنکار فنی چابکدستی کا مظاہرہ نہ کرے تو پلاٹ میں

ختم پیدا ہو جائے گا۔ سہیل صاحب سے اس سلسلہ میں ذرا سی چوک نہیں ہوئی ہے۔ انہوں نے چادر دیکھ کر پیر پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ مگر چادروں پر اتنا ہی جتا تنا ہے کیا ہے کہ بات بھی ہو گئی ہے اور فن بھی مجروح نہیں ہونے پایا ہے۔

"[illegible] نے دل ہلکا محسوس کیا۔ اس کی دو ہی تمنائیں تھیں۔ ایک ایم۔ اے کرنے کے بعد لکچرار بننا اور دوسرے [illegible] بیاہ .... اس نے خود کو ایسا ہی محسوس کیا جو [illegible] ہار اتھا۔ مگر جس کی جڑ تھی ہی نہیں۔ ایسی بیل کی طرح جو دوسرے پیڑوں پر پھیل جاتی ہے اور اس کی جڑ کہیں نہیں ہوتی" ایسے ترشے تراشے جملوں کے ذریعہ اجمال میں تفصیل کو جگہ دے دینا سہیل صاحب کی فنکارانہ صلاحیتوں کا نمونہ ہے۔

سہیل صاحب کے جملے چھوٹے چھوٹے اور ہلکے پھلکے ہیں۔ جس طرح جملوں کو توڑ توڑ کر اور لفظوں کو اچھال اچھال کر وہ گفتگو کرتے تھے وہی انداز انہوں نے اس ناولٹ میں اختیار کیا ہے۔ پھر بھی اس کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ کوئی قاری جب اسے شروع کر دیتا ہے تو اسے ختم کر کے ہی دم لیتا ہے۔ کہانی میں ڈوب جانا اور ڈوب کر خود کو کھو دینا سہیل صاحب کے دلنشین اسلوب کا نمایاں پہلو ہے بلاشبہ اس ناولٹ کی تخلیق کے لئے وہ ہمیشہ قدر و استحسان کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔

آہ! سہیل عظیم آبادی

نہ ہم کو بقا ہے نہ تم کو بقا ہے — زمانے میں ہر شئے کی آخر فنا ہے
نہ وہ رنگ محفل نہ اب وہ مزا ہے — وہی جام و مینا وہی میکدہ ہے
کسی کو مشیت میں چارہ ہی کیا ہے — کہ ہر زیست کے ساتھ شرطِ قضا ہے
فسردہ ہیں علم و ادب کی فضائیں — جدھر دیکھیے ایک ماتم بپا ہے
تری یاد میں اے سہیل گرامی — ہر اک اہل فن آج محوِ بکا ہے
یہ دنیا مرقع ہے غم اور خوشی کا — یہاں ہنسنا رونا ہمیشہ لگا ہے
یوں ہی لوگ جی جی کے مرتے رہیں گے — یہ ہوتا رہے گا یہ ہوتا رہا ہے
عجب ہے یہ دستور بزم جہاں کا — کوئی آکے بیٹھا کوئی اٹھ گیا ہے

سہیل گرامی کا گھر خلد میں ہو
یہی عاصیؔ غم زدہ کی دعا ہے

مختار احمد عاصی

تاج پیامی
دارالادب، بہادر پور محلہ
آرہ، بہار

سہیل عظیم آبادی اور ان کا ناولٹ "بے جڑ کے پودے"

سہیل عظیم آبادی ایک مایہ ناز افسانہ نگار تھے ان کا سانحۂ ارتحال اردو زبان کی دنیا میں اور افسانوی ادب کے لئے ایک المناک حادثۂ عظیم ہے۔ انہوں نے افسانوی ادب کو ایک خاص زبان دی اور اسے مخصوص اسلوب عطا کیا۔ اسے عام فہم اور دلنواز بنایا۔ سادگی میں پرکاری پیدا کی۔

سہیل عظیم آبادی جس قدر اچھے افسانہ نگار تھے اسی قدر اچھے انسان بھی تھے۔ وہ بڑے با اخلاق اور ملنسار شخص تھے سب سے خوش اخلاقی سے ملتے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور انہیں آگے بڑھنے کا موقع فراہم کرتے۔ ان سے ملنے کا مجھے کئی بار موقع ملا اور ہر بار میں نے انہیں با اخلاق پایا۔ انہوں نے کبھی یہ تاثر نہیں دیا کہ وہ ایک بڑے اور مشہور افسانہ نگار ہیں۔

ان کے افسانے بھی ان کی شخصیت ہی کی طرح دلنواز ہیں۔ وہ پریم چند کے سچے جانشین ہیں۔ ان کے افسانوں کا پس منظر اور کردار بھی پریم چند ہی کی طرح دیہات سے تعلق رکھتے ہیں۔ آزاد فضا میں معتقد لوگ، امیر و غریب، ظالم و مظلوم، جاگیردار اور بے گار، کسان اور مزدور اور بہت سارے لوگ ہمارے افسانہ نگار کے نگار خانے میں جلوہ نما ہوتے ہیں۔ ان کی سچی تصویریں ہمیں حیرت زدہ کر دیتی ہیں اور ہمیں افسانہ نگار کی باریک بینی اور اپنے تجربات کے اظہار کی قدرت پر مسرت آمیز اور تحسین انگیز خیالات کا اظہار کرنا ہی پڑتا ہے۔

لیکن پریم چند اور سہیل عظیم آبادی میں کچھ تفاوت بھی ہے۔ وہ ہے اسلوب اور نقطۂ نظر کا۔ سہیل عظیم آبادی کا اسلوب بیان پریم چند سے زیادہ سادہ ہے اور زبان کہیں سہل اور عام فہم ہے۔ کبھی کبھی پریم چند اپنے تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ ایک دو جملوں میں پیش کر دیتے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی کے یہاں ایسے جملوں کی کمی سختی سے محسوس کی جاتی ہے جنہیں [illegible] کے طور پر پیش کیا جا سکے۔

پریم چند کے یہاں جس طرح غریب، مظلوم اور کسان ہمارے رحم کے جذبات کو ابھارتے ہیں اسی طرح ان کے کردار امیر، ظالم اور جاگیردار پر بھی ہمیں ترس آتا ہے سہیل عظیم آبادی کے یہاں ہم مظلوم پر رحم تو کھاتے ہیں لیکن ظالم کے خلاف بغاوت کا جذبہ بھی محسوس کرتے ہیں۔ پریم چند اور سہیل عظیم آبادی کے درمیان یہ فرق نظریہ کا پیدا کردہ ہے۔ پریم چند کی شخصیت میں مذہب کی روح کار فرما تھی۔ انہیں اس بات پر افسوس ہوتا ہے کہ کوئی سرمایہ دار یا زمیندار انسان ہو کر اتنا ظالم کیوں ہے اور اس طرح وہ اپنا دین اور اپنی دنیا دونوں خراب کرتا ہے۔ جب کہ سہیل عظیم آبادی کسی جاگیردار یا سرمایہ دار کو ظلم کرتے دیکھ کر اپنے ذہن میں الاؤ کے شعلے بھڑکتے محسوس کرتے ہیں۔ پریم چند چاہتے ہیں کوئی دولت مند صاحب حق یا

زمیندار کسی غریب کسان پر ظلم نہ کرے وہ بھی نیک اور منصفانہ زندگی بسر کرے۔

سہیل عظیم آبادی ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے، وہ چاہتے ہیں مظلوم، ظلم کے خلاف بغاوت بلند کرے۔ لیکن مظلوم ایسا نہیں کرتا اسے وہ اچھا نہیں سمجھتے۔ یہ بات سہیل عظیم آبادی کے افسانے الاؤ اور چوکیدار پڑھ کر بہتر طور پر سمجھی جا سکتی ہے۔

کچھ ایسی ہی بات سہیل عظیم آبادی کے ناولٹ "بے جڑ کے پودے" میں بھی ہے جس طرح گاؤں کے سادہ لوح عوام غیر ملکی حکومت کے خلاف الاؤ کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے بغاوت کے شعلے اپنے ذہن میں اٹھتے ہوئے محسوس کرتے ہیں، اور گاؤں کا چوکیدار اپنی اہترکار کردگی کے باوجود مجسٹریٹ صاحب کی ڈانٹ پھٹکار سن کر صرف بھونچکا رہ جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح "بے جڑ کے پودے" میں سنہا صاحب اپنے ترقی پسند نظریہ کے باوجود سماج کے خوف سے یہ اعلان کرنے سے ہچکچاتے ہیں کہ ارنسٹ اور نورا ان کے اپنے "حرامی" بچے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی چاہتے ہیں کہ چوکیدار مجسٹریٹ صاحب کے خلاف آواز بلند کرے اور سنہا صاحب اپنے خیال کا اظہار برسر عام کریں کہ "حرامی" بچوں کو بھی سماج میں وہی مقام ملنا چاہیئے جو جائز بچوں کو ملتا ہے۔ یہ بات سہیل عظیم آبادی کے ترقی پسند نظریہ کے عین مطابق ہے۔ مگر وہ ابھی اس کے لئے حالات کو سازگار نہیں سمجھتے۔

اس کے علاوہ سب سے اہم بات ادیب کی اپنی شخصیت ہے اس کا اثر اس کی تخلیق پر بھی نمایاں ہوتا ہے۔ ان کے خیالات باغیانہ ضرور ہیں لیکن موجودہ سماج میں ان کے بروئے کار آنے سے افراط و انتشار پھیلنے کا امکان قوی ہے۔ اس سے ادیب کی ہنگاموں سے بچنے والی طبیعت گریز کرتی ہے۔

"بے جڑ کے پودے" کی مختصر کہانی کچھ اس طرح ہے۔ مسٹر ایچ کے سنہا شہر کے بڑے آدمی تھے۔ وہ بیرسٹری پڑھنے لندن گئے تھے تو وہیں روزی سے محبت ہو گئی۔ اپنے والدین کی مرضی کے خلاف انہوں نے اس سے شادی کر لی۔ لندن سے آنے کے چار سال بعد روزی کو مرا ہوا بچہ پیدا ہوا اور وہ بھی زندہ نہ بچ سکی۔ بوبی کہنے کو آیا تھی مگر روزی سنہا اُسے بہت مانتی تھی۔ مسٹر سنہا نے اس کی شادی ایک عیسائی لڑکے سے کر دی تھی لیکن وہ شرابی اور ناکارہ تھا۔ ایک دن اُسے مسٹر سنہا نے ڈانٹا تو روپے چرا کر بھاگ گیا۔ بوبی سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا وہ مسٹر سنہا کے ساتھ رہ گئی۔ ارنسٹ اور نورا مسٹر سنہا سے حرامی بچے تھے جو بوبی سے پیدا ہوئے۔ ان دونوں نے مس گرین کی زیر نگرانی مشن میں پرورش پائی۔ ارنسٹ بی۔ اے پاس کر لیتا ہے۔ فریڈی پادری ہے اور وہ نورا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ارنسٹ اسے ناپسند کرتا ہے فریڈی کی شکایت پر بشپ ارنسٹ کو مشن سے نکال دیتا ہے اور وہ مسٹر سنہا کے یہاں آکر رہنے لگتا ہے۔ آخر کار نورا بھی نکال دی جاتی ہے، وہ بھی مسٹر سنہا کے ساتھ رہنے لگتی ہے۔ ارنسٹ ایم اے کرنے کلکتہ چلا جاتا ہے۔ یک بیک اسے تار ملتا ہے کہ مسٹر سنہا سخت بیمار ہیں۔ وہ رانچی لوٹ آتا ہے۔ یہاں مسٹر سنہا مس گرین کے سامنے بند کمرہ میں انکشاف کرتے ہیں کہ ارنسٹ اور نورا اپنے بھائی بہن ہیں۔ ان دونوں کی آپس میں شادی نہیں ہو سکتی اور یہ کہ دونوں انہیں کے بچے ہیں۔ مسٹر سنہا کہتے ہیں "مجھ میں ہمت نہ تھی کہ دونوں کو ساتھ رکھوں اور میں ان دونوں کے لئے سارے بچوں کی مدد کرتا رہا کہ یہ دونوں اچھی حالت میں اور آرام سے رہیں۔"

جناب سہیل عظیم آبادی کے ترقی پسند نظریہ کا تقاضا تو

یہ تھا کہ مسٹر سنہا میں اتنی ہمت ہوتی کہ وہ دونوں کو اپنا بچہ کہتے اور دونوں کو خوشی سے اپنے ساتھ رکھتے، لیکن ایک طرف تو ابھی ہندوستان کا سماج اس ہمت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ دوسرے ادیب کی فطرت بھی سماجی ڈھانچہ میں کسی بڑی تبدیلی سے پیدا شدہ انتشار اور ہنگاموں سے گریز کرتی ہے۔

مسٹر سنہا حرامی بچوں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ایک خط کے ذریعہ کرتے ہیں جسے انہوں نے اپنے دوست اظہر کو لکھا تھا۔

" میں کہنا چاہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں نقطۂ نظر کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا سماج کسی سرمایہ دار سے نہیں پوچھتا کہ اتنی دولت کہاں سے لایا۔ حالانکہ یقین ہے کہ سرمایہ دار نے دوسروں کو لوٹا ہے تو یہ کیوں پوچھتا ہے کہ عورت بچہ کہاں سے لائی۔ حالانکہ عورت نے کسی کو لوٹا نہیں اس کا فعل صرف دو افراد سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر اس نے کسی مرد کی زبردستی کے خلاف احتجاج نہیں کیا تو پھر اس کی پسند اور خواہش کے مطابق ہے۔ سماج صرف اقرار اور اعلان ہی تو چاہتا ہے اس کے بعد بچہ جائز ہو جاتا ہے۔ اعلان نہ ہونے کی شکل میں اسے جرم کیوں سمجھا جائے۔ بچے کو "حرامی" کیوں کہا جائے۔ زیادہ سے زیادہ مرد اور عورت پر بزدلی کا الزام آ سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے جنسی تعلقات کا اعلان نہیں کیا۔ میرے خیال میں بچے کے لئے "حرامی" کا لفظ بے معنی ہے اور اسے لغت سے خارج کر دینا چاہئے۔ موجودہ قانون میں ترمیم کی سخت ضرورت ہے"

اپنے اس نظریہ کی پختگی کے باوجود مسٹر سنہا نے پہل نہیں کی۔ وہ اپنے والدین کی مخالفت کے باوجود ایک عیسائی عورت روزیمی سے شادی کر لیتے ہیں۔ پتہ نہیں انہیں لوبجی سے شادی کر لینے سے کس چیز نے باز رکھا؟ اور اس سے پیدا شدہ بچوں کو اپنا کہنے سے کس نے روکا۔ کیا سماج کے فرسودہ نظام نے؟ اسے تو وہ بدلنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کیوں نہیں بدلا؟ وہ ایک ماہر قانون تھے انہیں موجودہ قانون میں ترمیم کی حمایت میں آواز بلند کرنی چاہئے تھی۔ پتہ نہیں وہ خاموش کیوں رہ گئے۔ اسی طرح کئی سوالات کا جواب "بے جڑ کے پودے" سے نہیں ملتا۔ شاید مصنف کی سادہ اور امن پسند فطرت نے مسٹر سنہا کو ایسے حرامی بچوں کو اپنا کہنے سے باز رکھا۔ کہیں ایسا نہ ہو سماج کے فرسودہ نظام میں انتشار پیدا ہو جائے اور سب سے بڑھ کر مسٹر سنہا جیسے بڑے آدمی کی طرف سماج کی انگلیاں نہ اٹھنے لگیں اور ان کی عزت خاک میں نہ مل جائے۔

مسٹر سنہا نے اظہر کے نام اپنے خط میں مارکس اور فرائڈ کے نظریہ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور بھوک اور جنس کی اہمیت کو بتلایا ہے۔ ان کا کہنا ہے:۔

" بھوک کا مسئلہ بعض ممالک میں حل کیا جا چکا ہے لیکن ابھی تک جنس کا مسئلہ حل نہیں ہوا ہے اور اسی کے ساتھ وہ حرامی بچوں کو جائز بچوں کی طرح اپنا لینے کی حمایت کرتے ہیں۔ لیکن اس پر عمل کرنے سے ایک منظم سماج میں جو انتشار پیدا ہوگا اس کا کہیں ذکر نہیں۔ ناول میں اس موضوع پر بحث کی کافی گنجائش تھی "

مذہب کے ماننے والے خواہ کتنے ہی آزاد خیال ہوں، حرامی بچوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ عورت مرد کا ناجائز اختلاط مذہب، اخلاق اور مہذب معاشرہ اچھا نہیں سمجھتا۔ یہ تو اس وقت روا تھا جب انسان میں اچھے برے کی تمیز نہیں تھی۔ انسان غیر مہذب تھا۔ اخلاقی قدروں سے واقف نہیں تھا اور مذہب نے اس پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی تھی۔ ہزاروں لاکھ

ہے تجربات اور مشاہدات کے بعد آج اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ایک [illegible] کو برقرار رکھنے کے لئے اس کے افراد کو مذہب اور اخلاقی قدروں کا پابند ہونا ہی چاہئے۔

انگریز ایک مہذب قوم ہے، ترقی یافتہ اور آزاد خیال وہ بھی حرامی بچوں کو جائز قرار نہیں دیتی۔ اس قوم کے کچھ لوگ پہلے پہ مشن کو ملنے والی خیرات پر "حرامی" بچوں کی [illegible] کرتے ہیں۔ مثلاً مس گرین جو مشن میں رہ کر ارنسٹ اور نورا کے ساتھ اسی قسم کے دوسرے بچوں کی پرورش کرتی ہیں مگر اس مشن کے دوسرے افراد آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں۔ بشپ اس مشن کے لڑکے لڑکیوں کو آزادانہ ملنے جلنے پر پابندی عائد کرتا ہے۔ وہ بھی اتنا آزاد خیال نہیں کہ وہ انہیں کھلی چھوٹ دے دے اور اسے بہتر اور جائز سمجھے کہ جوان لڑکے اور لڑکیاں آپس میں بغیر شادی کے ناجائز تعلقات قائم کریں اور "حرامی" [illegible] مشن ان کی پرورش کرے۔

مسٹر سنہا محض اپنے گناہ کو حق بجانب ٹھہرانے کے "حرامی" بچوں کو اپنانے کی وکالت کرتے ہیں لیکن وہ بھی اتنے آزاد خیال اور ترقی پسند نہیں کہ اعلان اور اقرار کرکے انہیں اپنا لیں۔

مسٹر سنہا کی ترقی پسندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ ارنسٹ اور نورا کو آزادانہ ملنے دیتے۔ وہ آپس میں بھائی بہن ہوئے تو کیا؟ جب حرامی ہی بچے پیدا کرنا ہے تو بہن بھائی کی بھی قید کیسی؟۔ مسٹر سنہا کہتے ہیں:۔ "حرامی" کا لفظ میرے خیال میں بے معنی ہے۔ بچہ مرد اور عورت کے جنسی تعلقات سے پیدا ہوتا ہے۔ اس مفروضہ کے تحت بہن اور بھائی بھی تو عورت مرد ہیں۔ انہیں بھی جنسی تعلقات قائم کرنے اور حرامی بچے پیدا کرنے کی آزادی ہونی چاہئے۔ صرف اس تعلق کا اقرار اور اعلان چاہئے۔ عورت ماں بن جاتی ہے تو اس کا اعلان ہو جاتا ہے۔ مرد میں اتنی "ہمت" ہونی چاہئے کہ وہ اس کا اقرار کرے۔ یہی ہمت مسٹر سنہا میں نہیں۔

موجودہ سماج کا ڈھانچہ جسے وہ "فرسودہ" کہتے ہیں، بہن بھائی کے ناجائز اختلاط پر پابندی تو لگاتا ہی ہے ان کی شادی کو بھی ناجائز سمجھتا ہے۔ مسٹر سنہا بھی اسی فرسودگی کا شکار ہیں۔ جب انہیں یقین ہو چلا کہ ارنسٹ اور نورا آپس میں شادی کر لیں گے تو انہوں نے ان پر یہ راز افشا کیا کہ وہ اپنے بھائی بہن ہیں تاکہ وہ جذبۂ محبت سے مجبور ہو کر شادی نہ کر لیں۔

بہر کیف "بے جڑ کے پودے" ایک ایسے ماحول کی کہانی ہے جہاں "حرامی" بچے پیدا کئے جاتے ہیں اور ان کی پرورش بھی کی جاتی ہے۔ اب سوال ان کے مستقبل کا ہے اور موجودہ سماج میں ان کی حیثیت متعین کرنے کا بھی۔ اس سلسلے میں یہ ناول کوئی رہنمائی نہیں کرتا

"بے جڑ کے پودے" مشن کی خوبیوں اور خامیوں پر بڑی حد تک روشنی ڈالتا ہے۔ باہر سے یہ جتنا ہی چمکیلا ہے اندر سے اتنا ہی دھندلا ہے۔ عیسیٰؑ کے نقش قدم پر چلنے کا دعویٰ کرنے والے عیسائی، پادری اور بشپ بھی عام انسانوں کی طرح مکار، فریبی اور سازشی ہیں۔ مشن کے اندر کی گندگی کو اوپر کی صفائی سے کہیں بہتر طور پر پیش کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر سہیل عظیم آبادی مرحوم کا ناولٹ "بے جڑ کے پودے" اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک جرأت مندانہ قدم ہے۔ !!!

سید احمد قادری۔ گیا

سہیل عظیم آبادی

"شخصیت اور فن"

۹ نومبر ہی وہ منحوس دن ہے۔ جب مجھے پہلی بار میرے چھوٹے بھائی سید اشرف قادری نے یہ جانکاہ اطلاع دی کہ سہیل عظیم آبادی کا انتقال ہو گیا۔ سنتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے جسم پر برقی تار رکھ دیا ہو۔ چند لمحوں کے لئے میرے ہوش اڑ گئے، یقین نہیں آ رہا تھا، کہ ابھی پچھلے دنوں جس سہیل عظیم آبادی سے ملا ہوں، وہ اب نہیں رہے، لیکن جب آکاشں وانی نے بھی اس خبر کی تصدیق کر دی تو میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

سہیل عظیم آبادی سے میری بہت کم ملاقاتیں رہی ہیں، لیکن ان ملاقاتوں میں ہی ان کی عظیم شخصیت، ان کی شفقت، اور ان کے خلوص نے مجھے ان سے بہت قریب کر دیا تھا۔ جب بھی ملتے، اتنی محبت، اتنی اپنائیت سے ملتے کہ یقین نہیں آتا کہ میرے سامنے یہ وہی سہیل عظیم آبادی ہیں جن کی افسانہ نگاری کی دھوم ہندوستان و پاکستان کے علاوہ بیرون ممالک میں بھی ہو رہی ہے۔ یہ وہی سہیل عظیم آبادی ہیں جنہوں نے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے بہار، کلکتہ، کشمیر، دلی اور چھوٹا ناگپور کی خاک چھانی، یہ وہی سہیل عظیم آبادی ہیں جنہوں نے زندگی بھر علم و ادب کی دولت لٹائی، خود کبھی کچھ نہ پایا۔ اور نہ پانے کی کبھی تمنا کی۔

سہیل عظیم آبادی کی تنہا شخصیت میں اتنے سارے پہلو مدغم تھے کہ اگر ان کا صحیح طور پر جائزہ لیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ اس میں برسوں لگ جائیں گے۔ سہیل عظیم آبادی ایک عظیم اور پیاری شخصیت ہی کا نام نہیں بلکہ ایک بڑے اور کامیاب افسانہ نگار و ناول نگار کا نام تھا۔ ایک تجربہ کار صحافی اور ڈرامہ نگار کا نام تھا۔ تحریک آزادی کے ایک سپاہی اور پریم چند اسکول کے ایک اہم ستون کا نام تھا۔ بہار کے چھوٹا ناگپور جیسے سنگلاخ علاقے میں اردو کا نرم و نازک پودا لگانے والے اور ترقی پسند تحریک کے علمبردار کا نام تھا۔ ایسی شخصیتیں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ صوبہ بہار کے لوگوں کو یقیناً ان پر فخر تھا، کیونکہ یہی وہ سہیل عظیم آبادی ہیں جنہوں نے اپنے افسانے، اپنے ناول سے اپنے ڈرامے سے، اپنی صحافت سے اور اپنی پیاری شخصیت سے صوبہ بہار کا نام روشن کیا، اس کی عظمت میں چار چاند لگائے۔ علامہ اقبال نے یقیناً سہیل عظیم آبادی جیسی شخصیت ہی کے لئے یہ کہا تھا ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

سہیل صاحب کو میں نے پہلی بار پٹنہ کے سبزی باغ میں دیکھا تھا۔ ان کے افسانے میں ہمیشہ پڑھتا تھا اور ان کی عظمت کا پہلے ہی معترف تھا اور سوچتا رہتا تھا۔ کیسے ہوں گے سہیل صاحب کاش ایک بار ان سے ملاقات ہو جاتی اور جب ملاقات ہوئی تو میں انہیں بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اتنے سادہ، ہنس مکھ، ملنسار اور پیارے آدمی کا نام سہیل عظیم آبادی ہے؟ دوسری ملاقات بہار اردو اکاڈمی کے دفتر میں ہوئی، جب میں اپنے والد جناب

جلنا ورنسہ آبادی کے افسانوی مجموعہ "لالچی" اکاڈمی میں جمع کرنے رضوان احمد، مدیر عظیم آباد ایکسپریس کے ساتھ گیا تھا۔ اسی دن پہلی بار [illegible] رضوان احمد نے میرا تعارف کرایا۔ سہیل صاحب نے مجھ سے [illegible] اظہار کیا اور پھر بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اور اس طرح سے ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ کئی بار ملاقات ہوئی، ہر مرتبہ وہ بے انتہا خلوص و پیار سے ملتے۔ آخری ملاقات ابھی حال ہی میں ہوئی تھی۔ میں ان سے ایک انٹرویو لینا چاہتا تھا، سوالنامہ ان کے پاس روانہ کر دیا تھا۔ ساتھ میں یہ گزارش بھی کہ براہ کرم جتنا جلد ممکن ہو، جواب روانہ کرنے کی زحمت گوارہ کریں۔ میرے خط کا جواب انھوں نے اپنی عادت کے مطابق فوراً ہی دیا۔ جس میں انھوں نے اپنی بیماری اور پریشانیوں کا ذکر کیا، ساتھ ہی وعدہ بھی کیا کہ وہ جلد ہی سوالوں کے جواب بھیج دیں گے۔ خط ملنے کے چند ہفتوں بعد میں پٹنہ ریڈیو اسٹیشن ریکارڈنگ کے لئے گیا ہوا تھا کہ اچانک شمیم فاروقی کے چیمبر میں ان سے ملاقات ہو گئی۔ بڑے تپاک سے ملے۔ خیریت پوچھی اور تھوڑی ہی دیر بعد اپنی عادت کے مطابق چائے کی دعوت دی۔ اور اس دوران بہت ساری باتوں کے علاوہ مجھ سے یہ وعدہ کیا کہ وہ ۳۰ دسمبر تک ضرور جواب روانہ کر دیں گے۔ لیکن افسوس کہ وہ ۳۰ تاریخ اب کبھی نہیں آئے گی، جس کا مجھے انتظار تھا۔

سہیل عظیم آبادی کا افسانوی سفر، "سحر نغمہ" (ماہنامہ "نگار" ۱۹۳۱ء) سے "افسانہ نگار" (ماہنامہ "تیز گام" اکتوبر ۷۹ء) تک طویل رہا ہے۔ اس طویل سفر میں سہیل صاحب کو کتنے مشکل، پُر پیچ اور کٹیلے راستوں سے گزرنا پڑا ہے۔ اس کا اندازہ ان کی تخلیقات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

سہیل عظیم آبادی کا افسانوی سرمایہ "الاؤ"، "نئے پرانے" اور "چار چہرے" افسانوی مجموعوں کے علاوہ لاتعداد افسانوں کی شکل میں موجود ہے۔ جن کے مطالعہ کے بعد صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سہیل صاحب کو غریب و مزدور طبقہ سے خاص ہمدردی و محبت تھی۔ اور سرمایہ داروں اور زمینداروں سے بے انتہا نفرت۔ ان کے بیشتر افسانوں میں دیہی علاقوں کے مجبور و بے بس کسانوں و مزدوروں کی کہانیاں ملتی ہیں۔ ان کی سسکتی و کراہتی زندگی اور زمینداروں و سرمایہ داروں کے ظلم و تشدد کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

سہیل عظیم آبادی نے پریم چند کا خاص اثر قبول کیا تھا۔ جس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ پریم چند کی طرح ان کا بچپن بھی گاؤں میں گزرا تھا۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ کسانوں اور مزدوروں کی زندگی کتنی مجبور اور بے بس ہوتی ہے اور ان کی محنت پر ہی زمیندار و سرمایہ دار عیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں غریب کسان اور مزدور طبقہ سے بنیادی طور پر ہمدردی پیدا ہو گئی، ان کے دکھ درد کو لوگوں تک افسانوں کی شکل میں پہنچانے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں ہم سہیل صاحب کے کئی اہم افسانوں کا نام پیش کر سکتے ہیں۔ جن میں "دوستی"، "الاؤ"، "مزدور"، "جینے کے لئے"، "وقت کی بات"، "چوکیدار" اور "نئے پرانے" وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان افسانوں میں "الاؤ" اردو ادب کے شاہکار افسانوں میں سے ایک ہے جس میں دیہی زندگی، اس کا ماحول، اس کے جیتے جاگتے کردار، اس کے معصوم اور غریب کسانوں پر ظلم و ستم کی تصویریں بڑی صاف و شفاف نظر آتی ہیں۔ گاؤں کے کسان جو دن رات خون پسینہ ایک کر کے غلہ پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کی محنت کا صلہ اپنی اور ان کے بچوں کو بھوک اور دکھ درد کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ گاؤں کے لوگوں میں "بھگوا" جو "لالچی" سے بدھی کرنے کے لئے الاؤ روشن کرتا ہے (واضح رہے یہاں پر "لالچی" اور "الاؤ" دونوں ہی علامت کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں) زمیندار کو بیگار نہ دینے اور اس کے ناجائز دباؤ سے بچنے کا عزم ارادہ کرتا ہے۔ لیکن یہ زمانہ ہے دولت والوں کا، جن سے الشور بھی خوش رہتا ہے۔ "الاؤ" کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

(الف) بھیابات ہے کی ہے، ہم لوگوں پر ظلم ہوتا ہے۔ لیے کون چلے سال بھر محنت کرکے بھاتے ہیں اور ہمارے ہی بال بچے بھوکوں مرتے ہیں۔

(ب)... مشکل کیا ہے ؟ آج سے ہم لوگ ٹھان لیں کہ آپس میں مل جل کر رہیں گے۔ زمیندار کو بیگار نہیں دیں گے۔ کوئی ناجائز دباؤ نہیں سہیں گے۔ ....

بیگار ختم، کہتے ہوئے دکھو نے تھوڑا سا کوڑا کرکٹ اٹھا کر الاؤ میں ڈال دیا۔ الاؤ سے پھر ایک بار تھوڑی سی آگ بلند ہوئی اور بجھ گئی۔..؟

(ب)... درست، یہ سب ٹھیک ہے۔ گر یب کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ اسے کرنا ہوگا جو ہوتا۔

(ج)... لیکن سوال یہ تھا کہ گواہ کہاں سے آئے ؟۔ عدالت میں دوسرے لوگ کیسے بھیجے ؟ گر روپیہ ہو تو یہ مشکل نہیں، روپیہ خرچ کرنے والا ہونا چاہئے۔ کام کون سا ہے جو نہیں ہوتا۔ روپیہ ہو تو ایشور بھی خوش رہتا ہے ..... ، زمیندار نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے گاؤں اجڑ جائے لیکن سر اٹھانے والوں کا سر کچلا ضرور جانا چاہئے۔

"چوکیدار" بھی سہیل عظیم آبادی کا لازوال افسانہ ہے۔ جس میں گاؤں کے ایک معصوم اور غریب انسان "رام لال" کی کہانی ہے۔ لیکن یہ رام لال علامت ہے غربت و افلاس کی، معصومیت اور انسانیت کی اور ٹھیک اسی کے برعکس ڈپٹی مجسٹریٹ صاحب ہیں جو سرمایہ دارانہ و زمیندارانہ نظام کے علمبردار ہیں۔

سہیل صاحب نے عام طور پر اپنے افسانوں کا پلاٹ مزدور اور غریب طبقے سے اخذ کیا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ انھوں نے دوسرے طبقوں کو نظر انداز کیا ہے۔ سہیل صاحب نے بہت سارے اہم اور سلگتے ہوئے واقعات اور موضوعات کو فن کی بھٹی میں تپا کر خوبصورت اور معیاری افسانوں کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ان میں صوبہ بہار کی سماجی زندگی کی سچی تصویریں بھی ہیں، ہندوستان کی آزادی کی درد و کرب بھری کہانیاں بھی ہیں ملک کے دو حصوں میں تقسیم ہونے کے بعد کے دکھ بھرے واقعات ہیں اور اس کے بعد ملک گیر سطح پر فرقہ وارانہ فسادات کی چیخ و پکار بھی۔ ان سارے موضوعات اور واقعات پر بڑے پایہ کے افسانے ملتے ہیں، جو دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم سہیل صاحب کے چند شاہکار افسانوں کا نام لے سکتے ہیں جن میں "ایک منفرد زون"، "دل کا بوجھ"، اور "اندھیارے میں ایک کرن" وغیرہ اہم ہیں۔

"طوائف" کے نظر آنے والے حسین چہرے اور ان کے خوشنما پوشاک کے پیچھے کتنی درد و کرب بھری کہانیاں ہوتی ہیں، انھیں سہیل صاحب نے بڑے فنکارانہ ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔

ان میں "ایک سوال"، "وہ گھر پھوٹا"، "سادھو اور بیسوا" جیسے لازوال اور دل کو چھو لینے والے افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں زمانہ اور سماج سے ٹکرائی ہوئی لڑکیوں کی ایسی سسکتی اور کراہتی کہانیاں ہیں کہ ان کے مطالعے کے بعد بے اختیار قاری کی محبت اور ہمدردی ان کے لئے پیدا ہو جاتی ہے۔

سہیل عظیم آبادی پچاس سال کے طویل عرصے تک افسانے لکھتے رہے لیکن ان کا ذہن، ان کا قلم کبھی نہیں تھکا اور اپنے آخری وقتوں میں بھی سہیل صاحب نے "استاد"، "وہ آدمی"، اور "افسانہ نگار" جیسے تازہ دم اور گہری معنویت اور دعوت فکر دینے والے افسانے لکھتے رہے۔ سہیل صاحب نے یقیناً "پریم چند" کی ڈگر پر چل کر اردو افسانہ نگاری میں ان کی ادبی روایات اور ترقی پسند تحریک کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ استحکام بخشا ہے۔ سہیل صاحب کے بیشتر افسانے ایسے ہیں جو شاہکار افسانوں میں شمار کئے جانے کے ساتھ ساتھ افسانوی ادب میں قابل قدر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

محمد سالم
استانہ اختر محلہ مہدولی، دربھنگہ ۲

"بے جڑ کے پودے" — ایک مطالعہ

پریم چند کے بعد اردو افسانہ نگاروں کی جو نسل ابھری اس میں سہیل عظیم آبادی ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ وقار عظیم کہتے ہیں "سہیل کے افسانوں کا سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ان کے موضوع میں سادگی ہے اور طرز میں سکون اور ان سادگی اور سکون نے مل کر سہیل کے افسانوں اور ان کے فن کی تعمیر کی ہے" اس وقت میں اُن کے افسانوں کا کہانے اُن کے مختصر ناول "بے جڑ کے پودے" پر گفتگو کروں گا۔

چونکا دینے والا عنوان ہے جس کو پڑھ کر قاری یہ سوچنے لگتا ہے کہ اس کے حقیقی معنی کیا ہیں؟ —— "بے جڑ کے پودے" کے لغوی معنی ہوئے، وہ نوزائیدہ پیڑ جن کی جڑیں نہ ہوں۔ لیکن اس ناولٹ کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سہیل صاحب کا اشارہ ان یتیم بچوں کی طرف ہے جن کے ماں باپ کا پتہ نہ ہو اور جو دوسروں کے سہارے پروان چڑھتے ہوں۔ ایک جگہ موصوف نے شاید عنوان ہی پر ارنسٹ کے حوالہ سے یوں روشنی ڈالی ہے "اس نے خود کو ایسا پودہ محسوس کیا جو پھیلتا جا رہا تھا مگر جس کی جڑ تھی ہی نہیں ایسی بیل کی طرح جو دوسرے پیڑوں پر پھیل جاتی ہے اور اسکی جڑ کہیں نہیں ہوتی۔"

اس ناولٹ کا پس منظر انگلو انڈین سوسائٹی ہے اس میں ہندوستانی کرسچن کے علاوہ ہندو سماج کا کچھ عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ ناولٹ کا انجام حالات اور مقدر کے المیہ کی نشان دہی کرتا ہے کیونکہ ارنسٹ اور نورا کو آخر میں پتہ چلتا ہے کہ وہ دونوں حقیقی بھائی بہن ہیں۔ اس کے واقعات پر خارجی کشمکش کی بہ نسبت داخلی کشمکش زیادہ حاوی نظر آتی ہے۔ ارنسٹ بہت جذباتی اور حساس واقع ہوا ہے۔ وہ زیادہ تر اندرونی کشمکش سے دوچار رہتا ہے۔ وہ مصیبت اور پریشانی میں چیختا نہیں بلکہ ایک توازن کے ساتھ اس کے جذبات و احساسات جاگتے ہیں جو شعلہ بننے کی بجائے چنگاریوں کی طرح سلگتے ہیں۔ انتہائی غم کی حالت میں آدمی کا سنجیدہ و متوازن رہنا اس کے پختہ کردار کا ثبوت ہے۔ ارنسٹ اس کی مثال ہے اس ناولٹ کے مطالعہ سے مشاہدے کی گہرائی کا علم ہوتا ہے پلاٹ میں تسلسل ہے۔ جو بھی واقعات رونما ہوتے ہیں، وہ بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے مربوط ہو کر آگے بڑھتے ہیں۔

"بے جڑ کے پودے" میں تقریباً تمام کردار واقعات کی مناسبت سے پیش کئے گئے ہیں۔ سہیل صاحب نے ہر کردار کو اس کی ذہنی ساخت کے مطابق تراشا ہے کہ

اُس کی واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ ایسے کردار ہیں جن کو زیادہ ابھرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ مثلاً فریڈی، مریتا اور ڈیوڈ سے پتہ چلتا ہے کہ سہیل صاحب بڑے افراد کو زیادہ اہمیت دینا پسند نہیں کرتے۔

"نئے جڑ کے پودے" میں مرکزی کردار ارنسٹ اور نورا کے ہیں جو ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں دونوں خوبصورت ہیں اور سنِ بلوغت کو پہونچ کر ایک دوسرے سے شادی کر لینے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ لیکن دونوں اناتھ ہیں اور اپنے والدین کے متعلق آخر تک بے خبر رہتے ہیں۔ بچپن ہی سے دونوں مشن کمپاؤنڈ میں رہتے آئے ہیں جو رانچی شہر کے کنارے واقع ہے جہاں بشپ کا حکم چلتا ہے۔ بشپ اپنے ایکشن سے پادری سے زیادہ انگریز افسر دکھائی دیتا ہے۔ اس کا حکم سرکاری افسروں سے زیادہ سخت ہے ارنسٹ اور نورا کی پرورش و پرداخت اور تعلیم دیگر یتیم بچوں کے ساتھ مس گرین کی زیر نگرانی ہوتی ہے۔ مس گرین ایک نیک دل عورت ہے وہ شروع ہی سے مشن ہائی اسکول میں پڑھاتی ہے لیکن چونکہ ذہنی اعتبار سے مذہبی ہے اس لئے دینی خدمت کے پیش نظر وہ اپنی زندگی کو عیسائیت کے فروغ کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اسکول کی ملازمت چھوڑ کر وہ یتیم اور بے سہارا بچوں کی پرورش سنبھال لیتی ہے۔ [illegible] ایسے بچے اس کو ہسپتال سے [illegible] ملتے ہیں [illegible] اس کا بھائی امریکہ سے ہر ماہ پانچ سو روپے بھیجا کرتا ہے اس کے کچھ اور دولت مند لوگ ہیں جو اس کی مالی امداد کرتے ہیں۔ مسٹر سنہا کے [illegible] سے وہ بہت [illegible] ہیں۔ [illegible] انگلینڈ ریٹرنڈ بیرسٹر ہیں۔

پشتہ کے قریب ہی ان کی خوبصورت کوٹھی ہے۔ وہ بھی مس گرین کی مالی امداد کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح مس گرین اناتھ بچوں کے پالنے کا کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہے۔ وہ ہنس ہنس کر لوگوں سے کہا کرتی ہے "میں ماں نہیں ہوں مگر میرے بہت بچے ہیں۔" لیکن تمام بچوں میں وہ ارنسٹ اور نورا کو بہت زیادہ چاہتی ہے۔ مسٹر سنہا ذرا آزاد خیال واقع ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں مسلمان، عیسائی اور آدی باسی نوکر ہیں۔ ان کی آزاد خیالی سے اُن کے تمام ہندو رشتہ دار ناراض رہتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں مسٹر سنہا بے مذہب ہیں۔ اس طرح سہیل صاحب نے ہندو سماج کی تنگ نظری اور مذہبی تعصب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مسٹر سنہا اپنی انگریز بیوی کی موت کے بعد تنہا زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ دوسری شادی نہیں رچاتے۔ وہ ایک خاموش طبع انسان بھی ہیں اور ساتھ ہی نہایت درد مند دل رکھتے ہیں۔ خاص طور پر مس گرین اور عیسائی مشنری سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ ایک بار اُن کے بارے میں وہ ارنسٹ سے اپنا خیال یوں ظاہر کرتے ہیں۔ "یہ کیسے اچھے لوگ ہیں جو اپنی ساری زندگی ایک کام کے لئے وقف کر دیتے ہیں اور اپنے لئے کچھ بھی نہیں کرتے۔"

نورا میٹرک کے بعد ٹریننگ لے کر بچوں کے مشن اسکول میں ٹیچر ہو جاتی ہے۔ ارنسٹ البتہ آئی ایس سی کے بعد ایم۔ اے میں پڑھنا چاہتا ہے تاکہ اس کے [illegible] رہنے کا دیرینہ خواب پورا ہو جائے لیکن [illegible] کے گمان کے مطابق [illegible] کے بجائے وہ اسے آرچ بشپ اس کو چیف منسٹر اسکول میں ہیڈ ماسٹر بنا کر بھیجنا چاہتا ہے۔ یہ مقام رانچی سے چالیس میل دور جنگل میں [illegible] جانے سے انکار کر دیتا

[illegible] گیا ؤنڈ سے اس کے نکل جانے کا حکم صادر کر دیا [illegible] ارنسٹ کو نورا کی محبت بر پورا بھروسہ ہے۔ وہ گفتگو کے دوران مس گرین سے کہتا ہے ___ فریڈی سمجھتا ہے کہ میں دور ہو جاؤں گا تو نورا اس سے بیاہ کر لے گی۔ نول تو نول کا طنزیہ ریمارک اپنا جواب [illegible] فریڈی ایک بد چلن آدمی ہے۔ پادری بن جانے کے بعد بھی وہ دل کا کھوٹا ہے۔ ذلیل کی ساری خصوصیات اس میں موجود ہیں۔ نورا کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن نورا اس سے انتہائی نفرت کرتی ہے۔ فریڈی اوچھے طریقے سے اس کو پریشان کیا کرتا ہے۔ بشپ کے رویہ سے رنجیدہ ہو کر مس گرین ارنسٹ کو مشن کمپاؤنڈ چھوڑ دینے کا مشورہ دیتی ہے۔ ارنسٹ اپنے جگری دوست آرتھر کے گھر جاتا ہے اور پھر صبح کی چائے پی کر وہ اپنے لئے کوئی کام ڈھونڈنے باہر نکل جاتا ہے۔ راہ میں مسٹر سنہا سے ملاقات ہو جاتی ہے، حالات سے باخبر ہو کر وہ ارنسٹ کو اپنے ساتھ کوٹھی میں رکھ لیتے ہیں۔ اس کے لئے ہر طرح کے آرام و آسائش کا انتظام کر دیتے ہیں اور کچھ دنوں بعد ایم۔ اے کی تعلیم [illegible] کو پٹنہ بھیج دیتے ہیں۔ آرتھر بھی ساتھ [illegible] ہے اور ہوسٹل میں دونوں ساتھ رہنے لگتے [illegible] سے بعد ارنسٹ کو نورا کے خط سے [illegible] ہے کہ اس نے اسکول کی نوکری چھوڑ دی ہے [illegible] سنہا نے بیٹی بنا کر اس کو بھی ساتھ رکھ لیا ہے [illegible] ہتے ہیں ___ اور ایسا ہی ہوا کہ مزید تعلیم [illegible] الہ آباد بھیج دی گئی ___ اور پھر حالات [illegible] تے ہیں ___ ایک دن ارنسٹ و مسٹر سنہا [illegible] ہے کہ انہوں نے اپنی ساری جائداد اس کے نام وصیت کر دی ہے۔ ان کی صحت اچھی نہیں رہتی ہے۔ اس لئے کرسمس کی چھٹی میں وہ چلا آئے۔ نورا کو بھی آنے کے لئے لکھا ہے۔ ارنسٹ کو اس خبر سے بے حد خوشی ہوتی ہے کہ مسٹر سنہا نے اُسے اپنا بیٹا اور نورا کو اپنی بیٹی بنا لیا ہے اور شادی کے بعد ساری جائداد کے وہی دونوں مالک ہوں گے۔

کرسمس کی چھٹی میں ارنسٹ اور نورا مسٹر سنہا کے یہاں آ جاتے ہیں۔ رات کے کھانے کی میز پر ارنسٹ، نورا، مس گرین اور مسٹر سنہا جمع ہیں۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلتا ہے۔ ارنسٹ اور نورا کو یقین ہے کہ مسٹر سنہا آج ان دونوں کی شادی کا اعلان کر دیں گے۔ کافی پینے کے بعد سب کے سب کمرے میں آ جاتے ہیں اور ناولٹ کا خاتمہ بالکل ڈرامائی انداز میں یوں ہوتا ہے ___ مسٹر سنہا کہتے ہیں "مس گرین میرے دل پر ایک بوجھ ہے جسے میں آج ہلکا کرنا چاہتا ہوں میں نے ساری زندگی اس بوجھ کو ڈھویا ہے لیکن اب اسے ہٹا دینا ضروری ہے۔ آپ نے دو بار مجھے رائے دی کہ ارنسٹ اور نورا کی شادی ہو، اور میں جانتا ہوں دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن دونوں کی شادی نہیں ہو سکتی ___ آج میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں سچ مچ میرے بچے ہیں۔ ان کی ماں کملا اب مر چکی ہے۔ مجھ میں کبھی پہلے ہمت نہیں ہوئی کہ اس کا اعلان کر دوں۔ حالانکہ آپ جانتی ہیں کہ ان دونوں بچوں کی پرورش کے سلسلے میں دل کھول کر آپ کی مدد کرتا رہا۔ لیکن مجھ میں یہ بات کہہ دینے کی جرأت نہیں ہوتی لیکن اب ضروری ہو گیا ہے کہیں اصلی حقیقت نہ جاننے کی وجہ سے دونوں بیاہ نہ کر لیں۔"

اس ناولٹ کے مطالعہ سے چند نفسیاتی پہلو سامنے آتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی شخص [illegible]

مقالہ

قاسم فریدی
ظہیر منزل
اورنگ آباد

"بے جڑ کے پودے"
ایک تجزیہ

افسانہ زندگی کے کسی ایک واقعے، حادثے، ٹکڑے اور سانحے کو اپنا موضوع بناتا ہے اور اس پر ایک بھرپور نگاہ ڈالتا ہے۔ گویا زندگی کا کوئی بہت مختصر چھوٹا ٹکڑا اپنی پوری تابانی اور تفصیلات کے ساتھ افسانے میں منعکس نظر آتا ہے

ناولٹ زندگی کے ایک چھوٹا زیادہ وسیع حصے کا احاطہ کرتا ہے اور اپنی تفصیلات میں افسانے سے کچھ زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ یعنی ان معنوں میں کہ افسانہ جہاں زندگی کے کسی ایک ٹکڑے، واقعے یا سانحے کو موضوع بنا کر اس کی ساری تفصیلات کو پیش کرتا ہے۔ ناولٹ اس ٹکڑے یا واقعے یا سانحے کے اردگرد جو چنگاریاں اڑتی رہتی ہیں جو جگنو جگمگاتے ہیں، جو پھول اُگتے ہیں، جو ہوا بہتی ہے، جو خوشبو بکھرتی ہے اس کو بھی بیان کرتا ہوا چلتا ہے۔ مثلاً کسی شخص کی موت اگر افسانہ کا موضوع بنے گی تو اس کی موت، وجہ اور موت کے بعد کھوری دوزخ کا سفر اور موت سے متعلق بنیادی تاثر ناولٹ کا موضوع ہوگا۔ اور اس کے ساتھ ہی مرنے والے کے اعزا، واقربا کی کیفیات اور مرنے والے کے بطون کی تفصیلات اور موت و زندگی کے Problems کے بارے میں تفصیلی تاثرات کو بھی پیش کیا جاسکتا ہے

تقریباً ایسی ہی کچھ کیفیات طویل افسانے میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس لئے بعض ناقدوں کے یہاں یہ رویہ بھی پایا جاتا ہے۔ کہ ناولٹ اور طویل مختصر افسانہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یوں تو اردو ادب میں دوسری تمام صنفوں کی طرح ناولٹ کی صنف بھی انگریزی ادب سے مستعار لیا گیا ہے۔ لیکن انگریزی ادب میں ناولٹ کا جو تصور ہے اس کے مقابلے میں اردو ادب میں کوئی بھی ایک ایسا ناولٹ نظر نہیں آتا جو فنی تقاضوں کو پورا کرتا ہو۔

مختصر افسانہ اور ناولٹ کے بعد جب ہم ناول کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ناول کے باب میں پیٹرن کا مسئلہ بھی مفروضات ہوا ہے۔ مطلب یہ کہ مخصوص پیٹرن میں لکھنے کی وجہ سے تمام ناول موضوع اور ساخت کی وجہ سے یکساں نظر آتے ہیں۔ اردو میں ناول کا جو تصور ہے وہ بہت حد تک محدود ہے۔ کسی بھی رومانی یا عشقیہ کہانی کو اردو دنیا میں ناول کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ اس کی کہانی کچھ پھیلی ہوئی ہو اور زندگی کا عکس بھی اپنے اندر رکھتی ہو جبکہ Andre Maurois اپنی کتاب "The Art of Writing" میں لکھتا ہے:

"حقیقی ناول کبھی صرف رومانی نہیں ہوتا۔ اس کے لئے حقائق کا سہارا اور حقیقی سوسائٹی کا منظر ہوگا ہے۔"

ویسے رومانی دنیا سے چل کر ہی ناول کی منزل تک ادب کی دنیا میں مصنفوں نے قدم بڑھایا ہے اس لئے رومانس کو یکسر ناول سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ ویسے ابتدا میں بہت سارے مصنفوں اور مفکروں نے ناول کی بہت ساری غیر واضح تعریفیں پیش کی ہیں۔ "Priestley" کا کہنا ہے کہ ناول بیانیہ نثر ہے جس میں خیالی

میں غور و اقعات سے سروکار ہوتا ہے۔" پروفیسر بیکر اور Anthony Trollope کے نزدیک ناول انسانی زندگی کا ترجمان ہے۔ ہنری جیمس کا خیال ہے کہ "ناول ہی وسیع ترین تعریف میں زندگی کا شخصی اور راست اثر ہے۔" Vergínia Wolfe ناول کے متعلق کہتا ہے کہ "ناول کی دنیا مسلسل تبدیل ہوتی نظر آتی ہے۔ لیکن ایک عنصر تمام ناول میں مستقل طور پر باقی رہا ہے یعنی انسان۔ تمام ناول انسان کے متعلق لکھے گئے ہیں۔ اس لئے وہ ہمارے اندر ایسے ہی احساسات ابھارتے ہیں جیسا کہ انسان حقیقی دنیا میں ابھارتا ہیں۔ ناول فن کی وہ واحد ہیئت ہے جس کی واقفیت ہم کو یقین کرلے پر مجبور کرتی ہے۔"

ان تمام تعریفوں سے ایک بات جو راقم السطور کی سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ ناول زندگی کا عکس ہے جس میں زندگی کے گوناگوں اور بدلتے ہوئے حالات کی تصویر کشی کی جاتی ہے ساتھ ہی زندگی کو وسیع پیمانے پر پیش کیا جاتا ہے۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر اگر سہیل عظیم آبادی کی گراں قدر تصنیف "بے جڑ کے پودے" کا فنی جائزہ لیا جائے۔ تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر نہ تو ناول کی وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اور نہ ہی یہ ناولٹ کے فنی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ البتہ ہم اسے طویل مختصر افسانہ ضرور کہہ سکتے ہیں۔ افسانہ کے فن کو "بے جڑ کے پودے" اپنے اندر ملحوظ رکھتا ہے۔

"بے جڑ کے پودے" سہیل عظیم آبادی کا ایک طویل مختصر افسانہ ہے جس کے اندر Unity of Impression کی کثرت ہے۔ اس کہانی کا عنوان ہی بڑا علامتی ہے۔ کہانی چند افراد کے گرد گردش کرتی ہے اور آغاز، وسط، عروج اور کلائمکس سے گذرتی ہوئی ڈرامائی انداز میں اختتام پذیر ہو جاتی ہے کہانی دیکھ کر قاری کا ذہن اس کہانی کی روح کا طواف کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ اگر سہیل عظیم آبادی وقت سے قبل آرنسٹ اور نورا کے رشتے کا راز مسٹر سنہا کے ذریعہ فاش نہ کرتے تو کتنا بڑا

منکشف ہو جاتا۔ آسمان ٹوٹ پڑتا اور زمین پھٹ پڑتی اور زندگی انسان کی جہنم ہو جاتی۔

"بے جڑ کے پودے" کا پلاٹ عیسائی معاشرہ ہے۔ کہانی کا آغاز آرنسٹ اور نورا کی بھائی بہن کی محبت سے شروع ہوتا ہے یہ دونوں مشن کے یتیم خانہ میں پلتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی اور بھی دوسرے بچے، فریڈی، مرتھا، جوسف اور دوسرے بھی مشن یتیم خانہ میں ہی پرورش پاتے ہیں۔ ان کی نگرانی مس گرین کرتی ہے۔ وہ آرنسٹ اور نورا کو سب سے زیادہ مانتی ہے۔ اس لئے کہ وہ دونوں بڑے ہی نیک اور منکسر المزاج ہیں۔ فریڈی بچپن سے ہی شاطر، عیار، اور لفنگا ہے۔ وقت گزرتا گیا اور یہ بچے بچپن کی دہلیز پار کرکے جوانی کی سرحد میں داخل ہو جاتے ہیں۔ آرنسٹ میٹرک پاس کرکے مشن کی طرف سے بی۔ اے کرنے کے لئے پٹنہ بھیج دیا جاتا ہے۔ نورا مشن کے پرائمری اسکول میں ٹیچر بن جاتی ہے اور فریڈی پادری بن جاتا ہے لیکن پادری بننے کے بعد وہ اور بھی شیطان ہو جاتا ہے۔ نورا کو تنگ کرتا ہے۔ نورا اسے ناپسند کرتی ہے اور جب آرنسٹ بی۔ اے کرکے واپس آجاتا ہے تو فریڈی اس کی شکایت ڈورمیٹری کے سردار بشپ سے کرکے اسے پیٹر گنج جیسے بنجر ریگستان علاقے میں بھیجوانے کی سازش کرتا ہے۔ بشپ آرنسٹ کو پیٹر گنج جانے کا حکم دے دیتا ہے لیکن آرنسٹ وہاں جانے سے انکار کر دیتا ہے کیونکہ اس کے سامنے اس کا روشن مستقبل ہے۔ جسے وہ تاریک بنانا پسند نہیں کرتا۔ نتیجے میں اسے ڈورمیٹری چھوڑنا پڑتا ہے۔ وہ اپنا سامان لیکر اپنے دوست آلفرڈ کے گھر جاتا ہے۔ آلفرڈ کا گھر بہت ہی تنگ و مختصر ہے۔ اس لئے آرنسٹ اس کے یہاں سامان رکھ کر مکان کی تلاش میں نکلتا ہے راستے میں اسے مسٹر سنہا ملتے ہیں۔ وہ بچپن سے ہی ان کو جانتا تھا۔ مسٹر سنہا کی بیوی ایک انگریزی خاتون تھیں وہ کرسمس میں مشن کے بچوں کو اپنے یہاں بلا کر ہر سال تزک واحتشام کے

سالانہ X-Mas کا تہوار منایا کرتی تھی۔ اس کے مرجانے کے بعد بھی اس کی روح کو خوش کرنے کے لئے مسٹر سنہا ہر سال X-Mas کا تہوار منایا کرتے تھے۔ مسٹر سنہا کی بیوی پوجا نام کی ایک لڑکی اپنے ملک سے لائی تھی وہ مشن کے بچوں کی طرح خدمت کیا کرتی ہے۔ مسز سنہا کے دریافت کرنے پر آرلنسٹ انہیں اپنے حالات سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ آرلنسٹ کو اپنے ساتھ رکھ لیتے ہیں۔ چند دنوں بعد فریڈی اسے چرچ سے بھی یہ کہکر نکلوا دیتا ہے کہ آرلنسٹ ایک ہندو کے ساتھ رہ رہا ہے اور اس نے دھرم بدل لیا ہے۔ کچھ دنوں بعد راستے میں چند لوگوں کے ساتھ فریڈی نورا کو چھیڑتا ہے۔ نورا اسے چپت مارتی ہے۔ یہ خبر بشپ کو مل جاتی ہے۔ وہ فریڈی کی غلط حرکتوں سے باخبر ہوکر سزا کے طور پر اسے پیٹر گنج بھیج دیتا ہے اور نورا کو ڈور میٹری سے اسلئے نکال دیتا ہے کہ اس نے ایک پادری کو مارا کیوں؟ مسٹر سنہا نے نورا کو بھی اپنے ساتھ رکھ لیا۔ آرلنسٹ کو ایم۔ اے کرنے کے لئے وہ کلکتہ بھیج دیتے ہیں اور نورا کو آگے پڑھنے کے لئے الہ آباد ۔۔۔ چند دنوں بعد جب اچانک ان کی طبیعت خراب ہوتی ہے تو دونوں کو بلا لیتے ہیں۔ شفایاب ہو جانے کے بعد جب انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ آرلنسٹ اور نورا ایک دوسرے کو بیحد پیار کرتے ہیں تو وہ مسز گریس، آرلنسٹ اور نورا کو ایک کمرے میں لے جاکر اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ آرلنسٹ اور نورا سگے بھائی بہن ہیں اور ان کے اندر پونچکے دونوں اپنے بچے ہیں۔

"بے جڑ کے پودے" سہیل عظیم آبادی کا ایک کامیاب طویل مختصر افسانہ ہے جس میں زندگی کی حقیقتوں کی جلوہ گری بھی ہے اور فنی بلندی بھی ۔۔۔ سہیل صاحب نے اس کہانی میں انگریزی مشن کی تصویر اور اس کے شب و روز کو اتنے اچھوتے اور نرالے انداز میں پیش کیا ہے کہ تاثر کی یکتائی از ابتدا تا انتہا برقرار رہتی ہے۔ یوں تو اس کہانی میں متعدد کردار ہیں۔ مگر آرلنسٹ، نورا، فریڈی، مسٹر سنہا، مسز گریس اور بشپ کے کردار مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ بقیہ جوسف، پولینا، مرتھا اور آرتھر اور دھرمو وغیرہ ضمنی کردار کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہانی کو ارتقاء کی منزل سے روشناس کرانے میں تعاون ضرور دیا ہے لیکن ان کی اپنی کوئی انفرادی حیثیت انفرادی شناخت نہیں۔

"بے جڑ کے پودے" کا سب سے زیادہ اہم روشن اور متحرک کردار آرلنسٹ کا ہے۔ جو اپنے ارادوں اور خواہشوں کا خود مالک ہے۔ آرلنسٹ اپنی دنیا کا خود حکمراں ہے اور اپنی تقدیر کا خدا بھی۔ اس کے اندر جدوجہد کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ عمل کا پجاری ہے۔ کرشچن ضرور ہے لیکن صالح کرشچن ہے۔ فریڈی کی طرح پادری بن کر شیطنت نہیں کرتا اور نہ ہی بشپ کی طرح دوسروں کے بہکاوے میں آکر کسی کو ایذا پہنچاتا ہے۔ اس کے اندر عزم و اعتماد کا ایک سمندر موجزن ہے۔ اسلئے وہ پیٹر گنج نہیں جاتا اور بشپ کے حکم کو ٹھکرا دیتا ہے۔ مسٹر سنہا سے وہ عقیدت رکھتا ہے اور ان کی عظمت کے آگے اپنا سر خم تسلیم کرتا ہے۔ مسز گریس کی وہ اسلئے عزت کرتا ہے کہ اس نے اس کی پرورش اپنی اولاد سے بڑھ کر کی ہے۔ نورا سے وہ بچپن سے محبت کرتا ہے۔ آرلنسٹ کا کردار ہر اعتبار سے اپنے اندر زندگی کی تابانی رکھتا ہے۔ مذہب کے متعلق بھی اس کا نظریہ واضح ہے۔ وہ چرچ و گرجا میں خدا کے ورود کو ضروری نہیں متصور کرتا بلکہ مسٹر سنہا کی طرح اس کا ایمان ہے کہ خدا نیک انسانوں کے دلوں میں موجود ہے۔

نورا کا کردار بھی عزم و حوصلے اور یقین و ہمت کی علامت ہے۔ بظاہر وہ ایک کمزور سی معصوم لڑکی ہے۔ لیکن آرلنسٹ کی محبت نے چونکہ اس کے دل میں عزم و حوصلے کا چراغ روشن کر دیا ہے اس لئے وہ حالات کا مقابلہ دلیری سے کرتی ہے اور فریڈی کی چالاکی و عیاری کا جواب چپت سے دیتی ہے۔ نورا کا کردار کسی مظلوم و مجبور ہندوستانی لڑکی کا کردار نہیں بلکہ انگریزی مشن میں پرورش پانے والی ایک خود دار اور ہمت ور لڑکی کا کردار ہے۔ وہ مسٹر سنہا کے یہاں جانے کے بعد بیٹی کی طرح ان کی خدمت کرتی ہے اور مسز گریس کو اپنی ماں سے زیادہ چاہتی ہے۔

فریڈی کا کردار آرنسٹ و نورا کی محبت کو پختہ و مستحکم کرنے میں [illegible] ہمدرد و معاون ثابت ہوا ہے۔ فریڈی کی [illegible] کی وجہ کر ہی دونوں کے اندر عزم و اعتماد پیدا ہوا ہے۔ فریڈی پادری ہے لیکن اس کا دل پاک ہے۔ وہ مشن کی تمام لڑکیوں کو چھیڑتا ہے اور نورا کو خاص طور سے۔ اس لئے آرنسٹ کا اس کے متعلق اپنے ہمزاد سے یہ کہنا کہ :-

[illegible] پادری ہو کر چرچ میں لوگوں کو بائبل کا سبق پڑھاتا تھا کہ نیک زندگی گذارو لیکن خود بدمعاشی کرتا تھا۔ اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ شاید سارے پادری ایسے ہی ہوتے ہیں۔ سب کے چہرے پر ایک بناوٹی چہرہ لگا ہوتا ہے۔ دوسروں کو نیک بننے کی تعلیم دیتے ہیں اور خود نہیں بنتے ؛

بہت ہی معنی خیز ہے۔ ان جملوں کے اندر جو حقائق کی تلخی ہے ان سے صرف فریڈی ہی مجروح نہیں ہوتا بلکہ دنیا کے تمام مذاہب کے رہنماؤں اور پیشواؤں کے لئے یہ جملے زہر ہلاہل سے کم نہیں ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مذہبی پیشواؤں نے مل کر برائیوں کو معاشرے میں عام کیا ہے اور خود صوفیانہ وضع و قطع اختیار کر کے طاہر و صالح بنتے ہیں۔

مسٹر سنہا کا کردار بھی آرنسٹ و نورا کی طرح روشن و تابناک ہے۔ لیکن اس کے اندر وہ تابناکی نہیں ہے جو آرنسٹ و نورا کے چہرے سے عیاں ہوتی ہے۔ بلکہ سنجیدگی و خاموشی ان کی فطرت کا خاصہ ہے۔ مسٹر سنہا بھی مذہب کے غلط قانونوں اور رسم و رواج سے انحراف کرتے ہیں لیکن ان کے اندر اتنی ہمت نہیں کہ مذہب کے قانون اور رسم و رواج میں ترمیم و تنسیخ کر سکیں بلکہ ان کے متعلق یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ مسٹر سنہا کا کردار نیم دروں نیم بیروں کا آئینہ دار ہے۔ وہ ایک آزاد خیال انسان ہیں۔ بڑے آدمی ہیں۔ دولت کا انبار ہے۔ مشن کے یتیم لڑکوں کی معاونت کرتے ہیں اور ان کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ مس گرین کی روشن ضمیری اور نیک سیرت کو سراہتے ہیں اور آرنسٹ و نورا سے بیحد پیار کرتے ہیں۔ لیکن اپنے پیار کا اظہار کسی صورت میں نہیں ہونے دیتے۔ جب انہیں آرنسٹ اور نورا کی محبت کا علم ہوتا ہے تو وہ سماج کے رسم و رواج کی دیوار کو توڑ کر چھلانگ لگاتے ہیں۔ ان کے اندر غضب کی چستی، ہمت اور دلیری پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ تمام بدنامی، رسوائی، شرم، حیا اور عزت و ناموس کو بالائے طاق رکھ کر اس بات کا اعتراف کر لیتے ہیں کہ آرنسٹ اور نورا سگے بھائی بہن ہیں اور ان کے اور لوسی کے بچے ہیں۔ جب یہ راز کھلتا ہے تو ذہن میں ایٹم بم پھٹتا ہے لیکن جب سکون ہوتا ہے تو دل سہیل عظیم آبادی کو دعا دیئے بغیر نہیں رہتا ہے کہ انہوں نے کہانی کو اس انداز میں موڑ کر اس دنیا کو پاپ کی آماجگاہ بننے سے بچا لیا۔ مسٹر سنہا کا اعتراف قاری کے لئے صد تحسین و آفرین ہے۔ اس اعتراف کے بعد قاری مسٹر سنہا کی عظمت کے آگے اپنا سر خم تسلیم کر لیتا ہے۔

مس گرین کا کردار تیاگ و تپسیا کی علامت ہے۔ وہ اپنے ملک میں پیٹر نام کے ایک لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ اچانک اس کی موت نے مس گرین کو اتنا متاثر کیا کہ اس نے شادی نہیں کی اور کنواری رہ کر ہی انگریزی مشن سے منسلک ہو جاتی ہے اور مشن کے یتیم و لاوارث بچوں کی خدمت کر کے مسرور ہوتی ہے۔ وہ آرنسٹ اور نورا کو سب سے زیادہ پیار کرتی ہے۔ آرنسٹ کے ڈورمیٹری سے نکالے جانے پر حقیقی ماں کی طرح آنسو بھی بہاتی ہے اور جب مسٹر سنہا کے یہاں اسے سہارا ملتا ہے تو مسکرا بھی دیتی ہے۔

بشپ انگریزی مشن کا سردار ہے۔ جو حد درجہ کا بے وقوف اور کمزور عقل کا مالک ہے۔ دوسرے کے بہکانے میں آ کر آرنسٹ کو بستر گول کر جانے کا حکم دیتا ہے۔ جب آرنسٹ نہیں جاتا ہے تو وہ اسے ڈورمیٹری سے نکال دیتا ہے۔ دراصل بشپ لکیر کا فقیر ہے۔ ضدی ہے اور اپنے فیصلے کو تبدیل کرنے کا عادی نہیں۔ وہ قدامت پرست ہے۔ اس کا ذہن تاریک ہے۔ اپنی عقل سے کوئی کام نہیں کرتا بلکہ دوسروں کے اشارے پر ناچتا ہے۔

ان کے علاوہ مس جوآن، سلوتمن پادری، ارتھر جوسف پولینا اور دھرمو وغیرہ تمام کردار بھی "بے جڑکے پودے" کی کہانی کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور آرنسٹ ولوترا کے گرد گھومتے ہیں۔ چکر لگاتے ہیں۔ گردش کرتے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی شکل نہیں۔ اپنی کوئی شناخت نہیں ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کہانی میں ان کی شرکت آرنسٹ ولوترا کی مرہون منت ہے۔

بہرحال ان تمام کرداروں کی "بے جڑکے پودے" میں جو بھی حیثیت و اہمیت رہی ہو لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ ان تمام کرداروں کے اندر زندگی کی حقیقتوں کی جھلک ضرور ملتی ہے۔ کوئی بھی کردار ایسا نہیں جس پر حقیقت کی قلعی نہیں چڑھی ہو۔ دراصل سہیل عظیم آبادی حقیقت پسند ہیں۔ اس لئے اپنی کہانیوں میں حقیقتوں کی شمولیت کو اپنا ایمان متصور کرتے ہیں۔

مکالمہ نگاری کے اعتبار سے بھی "بے جڑکے پودے" کامیاب ہے۔ ہر جگہ چست وچوبند اور جچے تلے مکالمے ذوقِ جمال کی لطیف کرنوں میں ایک ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں کو کرداروں کے ذریعہ سہیل عظیم آبادی نے اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کی فنکارانہ چابکدستی کی شہادت دینی پڑتی ہے اپنے مکالموں کے ذریعہ اس کہانی میں سہیل صاحب نے اگر ایک طرف سماجی و مذہبی نظام پر تیر کی بارش کی ہے تو دوسری طرف نرمی کے ساتھ اس کی ترمیم و تنسیخ کے لئے مشورہ بھی دیا ہے۔

کہانی "بے جڑکے پودے" کا اسلوب بھی صاف ستھرا اور نکھرا ہوا ہے۔ سہیل صاحب نے اپنی کہانیوں میں مشکل اردو لکھنے سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے معنی خیز جملوں کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ سلاست و روانی کا اتنا خیال رکھا ہے کہ ایک جملہ سے دوسرے جملے اور دوسرے سے تیسرے تک یہاں تک کہ آخر جملوں تک نگاہ پھسلتی ہی چلی جاتی ہے۔ دراصل سہیل صاحب کو زبان پر دسترس حاصل ہے اور انہیں اس بات کا خاص خیال ہے کہ ان کی کہانیوں کا موضوع چونکہ متوسط طبقہ ہے اس لئے وہ اپنی کہانیوں میں جو اسلوب اختیار کرتے ہیں وہ اسی متوسط طبقے کی زبان ہے۔

میرے نزدیک سہیل عظیم آبادی کا طویل مختصر افسانہ "بے جڑکے پودے" موضوع کے اعتبار سے انفرادیت کا حامل نہیں بلکہ تکنیکِ فن کے اعتبار سے اور اندازِ بیان کے لحاظ سے ایک کامیاب افسانہ ہے۔ جو فن کی نزاکتوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور زندگی کی حقیقتوں کی نقاب کشائی بھی کرتا ہے۔ سہیل صاحب نے اس کہانی میں زندگی کی حقیقتوں کو پیش کیا ہے اور ان پر اپنے فن کی ایسی قلعی چڑھائی ہے کہ فن و حقیقت کا حسن دوبالا ہو گیا ہے ——— !!

سلطان اختر

رباعیاں

معظمی سہیل عظیم آبادی مرحوم کی یاد میں

صد مخزنِ الفاظ و معانی تھے سہیل
تہذیب و شرافت کی نشانی تھے سہیل
خاموش ہوئی بزمِ فسانہ اختر
اس دور کی اک لمبی کہانی تھے سہیل

تہذیب کے خوش رنگ نوشتہ تھے سہیل
صد زینتِ ایامِ گزشتہ تھے سہیل
ہر سمت ہے اب مدح سرائی ان کی
انسان کے بھیس میں فرشتہ تھے سہیل

بشکریہ آہنگ، گیا

"ساوتری" ــــ سہیل عظیم آبادی

(تجزیاتی مطالعہ)

عمیر قمر

سہیل عظیم آبادی کے آخری افسانوی مجموعہ "چار چہرے" میں شامل کہانی "ساوتری" اردو کی چند اہم کہانیوں میں سے ایک ہے۔ منٹو اور بیدی کی طرح سہیل صاحب بھی ایک ایسے صاحب طرز ادیب تھے جن کے اسلوب نگارش کی نقالی کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں!

سہیل عظیم آبادی کی زبان انتہائی سادہ اور عام فہم ہے جسے واقعی افسانوی زبان کہا جاسکتا ہے۔ اور جو قاری پر بھرپور اثر چھوڑتی ہے۔ ان کے فنکارانہ عظمت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اپنی نگارشات کو مبلغانہ اور مصلحانہ تحریروں سے بچائے رکھا۔

ترقی پسندی کے پلیٹ فارم سے بھی انہوں نے اپنے ہمعصروں کی طرح کبھی نعرہ بازی کو راہ نہ دی۔ اور نہ پروپیگنڈہ زدہ ادب ہی تخلیق کیا!

"ساوتری" ایک طوائف کی کہانی ہے۔ اور یہ انتہائی کمال فن ہے کہ طوائف خانے کے ماحول میں بھی قاری کا ذہن ذرا جنسی تلذذ کا شکار نہیں ہو پاتا۔

راجیش رانچی کا رہنے والا ہے۔ وہ اکثر بزنس کے سلسلے میں کلکتہ آتا جاتا رہتا ہے۔ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ اور بچے بھی ہیں۔ لیکن کلکتہ وہ جب بھی آتا سوناگاچی ضرور جاتا۔ وہاں کے ماحول سے وہ پوری طرح آشنا ہے۔ ایک بار وہ سوناگاچی جاتا ہے اور وہاں ایک کمرے میں اسے انیتا کی جگہ ساوتری ملتی ہے۔

جی ہاں ساوتری ایک طوائف کا نام ہے۔ اور راجیش یہ نام سن کر چونک پڑتا ہے۔ وہ مذاق میں اپنا نام ستیا وان بتا ڈالتا ہے۔ لیکن اس سے گفتگو کرنے پر اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر کی ساوتری واقعی ابھی زندہ ہے۔ وہ ابھی طوائف میں نہیں بدلی۔ اس کی فطری معصومیت کا حسن جسے اس ماحول میں بھی بچائے رکھنے پر قادر ہوتی ہے۔ راجیش کے لئے ایک کشش بن جاتا ہے۔

ساوتری کی گفتگو سے متاثر ہو کر اس کا دل دھڑکن پر غالب آنا چاہتا ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے ــــ

ساوتری کو یہاں نہیں ہونا چاہئے تھا

شروع ہی سے کہانی قاری کو اپنی بھرپور گرفت میں لے لیتی ہے۔

راجیش جب کمرے میں داخل ہوتا ہے تو اسے ساوتری بیٹھنے کے لئے کہتی ہے۔ اور چائے بنانے کی اجازت چاہتی ہے۔ وہ عام [illegible] کی طرح ٹھہرنے کا وقت دریافت کرتی ہے [illegible] ساوتری [illegible] گئی ہے [illegible] [illegible] ہے۔ [illegible] [illegible] چھپائے کی [illegible] ساتھ ہی نہ جانے کتنی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تھا۔

[illegible]

اسے [illegible] میں آکر وہ بھی اپنا بیوپاری پن بھول جاتا ہے۔ گفتگو کے دوران یکایک جب [illegible] پر رکھی ٹائم پیس بارہ بجاتی ہے تو راجیش چونک اٹھتا ہے۔ [illegible] ساوتری کے ہاتھ میں سو کا نوٹ پکڑا کر وہ ہوٹل واپس چلا جاتا ہے، ساوتری سوچنے لگ جاتی ہے کہ عجیب آزاد مرد تھا۔ دوسرے تو یہاں آکر ایک ایک پائی کی قیمت وصول کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ضرور کوئی شریف اور نیک دل آدمی تھا اور ساوتری کے دل میں انتظار کی شمع جگمگانے لگتی ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی پر بے بسی میں تحیر سے پلکیں جھپکانے والی۔ ہر ہر قدم پر دھوکا کھانے والی عورت کے لئے۔ ایسے لوٹ کھسوٹ کے ماحول میں ایک دل انسان کا مل جانا ایک عجیب سی تسکین کا باعث تھا۔ ان دونوں میں انسیت کا پیدا ہو جانا فطری امر ہے دونوں ہی کی روح ابھی گندگیوں سے پوری طرح آلودہ نہ ہوئی تھی

دونوں ہی دلوں میں موجزن محبت، خلوص، ہمدردی اور انسانیت کا فطری جذبہ پوری طرح مسموم نہ ہو پایا ہے۔

لیکن راجیش جب ہوٹل پہنچا تو اسے طرح طرح کے [illegible] [illegible] ساوتری سب سے زیادہ [illegible] [illegible] گفتگو میں چند گزرے ہوئے [illegible] [illegible] [illegible] کا تجزیہ [illegible] غور کرتا [illegible]

[illegible]

دوسری طرف ہوٹل ہی میں [illegible] ایک [illegible] سیٹھ [illegible] ہے۔ اس نے [illegible] [illegible] ہے۔ لیکن وہ راجیش کو نہیں پہچان پائی ہے۔ کیونکہ اسے تو صرف [illegible] سے مطلب ہے۔ اس کے روح کی پالیدگی [illegible] [illegible] ہیں۔ اب وہ صرف جسم کا [illegible] [illegible] [illegible] بھی عورت اور شراب میں گم نظر آتا ہے۔

ظاہرہ لگتا ہے کہ افسانے میں یہ حصہ داخل ہے صرف دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے۔ لیکن فنکار نے راجیش اور ساوتری کے ساتھ ان دو کرداروں کے تضاد کو دکھا کر یہ بتانا چاہا ہے کہ معاشی [illegible] میں کس طرح انسان اپنا وجود گم کر دیتا ہے [illegible] کا مرض لاعلاج بن جاتا ہے۔

راجیش دوسرے دن کاروبار [illegible] شام میں سنیما دیکھنے چلا گیا۔ اس طرح دو [illegible] [illegible] کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ساوتری [illegible] وہ ٹیکسی میں نیچے بیٹھی ہوتی ہے۔ اس کا بھائی چار و راجیش کو بلانے آتا ہے۔ مجبوراً بدنامی کے خوف سے وہ ساوتری کے پاس جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ ٹیکسی کو واپس ہوٹل چلنے کے لئے کہا

ہے۔ اور ساوتری کو ڈانٹنے لگتا ہے کہ اسے یہاں نہیں آنا چاہئے
تھا ساوتری جھجھک ہے کہ اسی لئے تو اوپر کمرے میں نہیں آئی۔ اور
ہے ساوتری اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتی ہے تو وہ اندر
ہے۔ اور اس کا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔
[illegible] کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ راجیش
[illegible]

[illegible] جملے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ راجیش
[illegible] ہو چکا تھا۔ اس کا غصہ، اندیشے، وسوسے
ایک جھکورے میں خس و خاشاک کی
دوسرا مصنف ہوتا تو بیان رنگینی الفاظ سے
[illegible] پیراگراف رقم کر جاتا۔ سہیل صاحب کی سادہ
[illegible] چھوٹے جملے، اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتے
[illegible] کا سمندر ان میں ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ فلسفے
ایک سادہ سے جملے میں سمٹ کر رہ جاتی ہیں۔
[illegible] عظیم آبادی کا اسلوب کبھی کم سے کم الفاظ
[illegible] اثر پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔
[illegible] کہ راجیش اور ساوتری میں گفتگو شروع
[illegible] یہاں دیکھئے کہ مکالمے کیسے جاندار ہیں۔
چھوٹے چھوٹے جملے [illegible] بھرپور کیفیت
لئے ہوئے ہیں۔
[illegible] ساوتری کہتی ہے کہ تم نیک اور بھلے آدمی ہو۔ اور اس
[illegible] تھی کہ شاید نہ آؤ۔
[illegible] مشکل سے بول سکا — "نہ بھی آتا تو تمہارا
[illegible] تھا۔"
ساوتری بولی — "اسے تم نہیں سمجھ سکتے"

اور پھر [illegible] ایک بات کہوں۔ مانو گے۔ میری بات
کا یقین کرو گے۔
[illegible]
میں تم سے کچھ بھی نہیں چاہتی بس جب تک
کلکتہ میں رہو ملتے رہو۔"
[illegible]

ان دو جملوں میں ایک عورت کے بے غرض پیار کی
[illegible] جذباتی گہرائی کس بھرپور طور پر سامنے آئی ہے۔ نگارش میں
ایسی پالیدہ کیفیت کا پیدا ہو جانا آسان نہیں۔ سہیل صاحب
سراپا خلوص و محبت کے پیکر تھے۔ ان کی شخصیت کا عکس فن میں
نمایاں نظر آتا ہے۔

اب راجیش بھی جذباتی نظر آتا ہے۔ ساوتری شراب
کی مانند اس کے ہوش و حواس پر چھائی چلی جاتی ہے۔
یہاں عورت اور مرد کی جذباتی کیفیت کا چند جملوں
میں اظہار ملاحظہ فرمایئے۔ مرد کی محبت میں گھن گرج ہوتی ہے لیکن
باتیں کیسی بے سمجھی بوجھی، بس فضا میں اڑنے کی سی کیفیت بلکہ
عورت کبھی دنیا اور معاشرے سے بے خبر نہیں ہوتی۔ اس کے یہاں
ٹھہراؤ، گمبھیرتا، دھیما پن، گہرائی اور اندر ہی اندر رہی دو
[illegible]

ساوتری مسکرائی اور بولی [illegible]
[illegible] کتنے دن تک باقی رہتی ہے؟"
راجیش بولا — ساری زندگی [illegible]
تم چاہیں گے۔"
ساوتری ہنسنے لگی۔ راجیش گھبرا کر اس کا منہ تکنے لگا۔
— "میں [illegible] بات نہیں کر رہا ہوں۔"
ساوتری گمبھیر ہو گئی اور بولی — "بات ہمیشہ
سمجھ بوجھ کر کی جاتی ہے مگر وقت اسے غلط بنا دیتا ہے۔"

یہاں عورت کی عظمت کے عجیب احساس سے قاری سرشار ہو جاتا ہے۔ ایک ایسی عورت جس کا شعور بالیدہ ہو، جس کی آنکھوں میں محبت چھلک ہو اگر کسی کے جادۂ زیست کے چند گھڑی ہی کے لئے ہمسفر بن جائے تو اس سے بڑی کوئی اور نعمت نہیں۔ اور اب دیکھئے کہ زندگی کا بڑا سے بڑا فلسفہ زندگی کی بڑی سے بڑی سچائی سہیل عظیم آبادی کتنے اچھوتے، کتنے انوکھے اور دل میں اتر جانے والے جملوں میں کیسی سادگی سے بیان کر جاتے ہیں۔ ان کے جملوں میں شعریت نہیں ہوتی لیکن نثر کا ایسا حسن ہے کہ یہ ذہن میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔

"غصہ ہو گئے کیا؟"

"نہیں تمہیں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

ساوتری مسکرائی۔ اس کی پلکیں جلدی جلدی جھپکیں اس نے چائے کی پیالی اٹھا کر راجیش کے ہاتھ میں تھما دی۔

"کوئی کسی کو نہیں سمجھ سکتا۔ چائے پیو ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

راجیش بولا ——— "یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟"

ساوتری سنجیدگی سے بولی ——— "آدمی آدمی کو سمجھ لے تو کوئی پریشانی نہ ہو۔"

اور شاید سادے سے جملے میں شاید دنیا کے سارے مسائل کا حل پوشیدہ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے فنکار نے اپنے دل کا سارا رس ایک جملے میں جذب کر دیا ہو۔

اور پھر ——— راجیش بولا ——— "تم کیا کیا سوچتی ہو تم دوسری لڑکیوں سے ...."

ساوتری بول اٹھی ——— "یہ بھی عجیب بات ہے۔ جب سے دنیا قائم ہے، مرد اور عورت کا ساتھ ہے۔ مگر مرد نے عورت کو سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ عورت کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہی ہے۔ وہ مرد سے الگ نہیں رہ سکتی۔ اور مرد اسے سمجھتا ہی نہیں۔ وہ اس کے جسم کو دیکھتا ہے، مگر دل نہیں دیکھتا۔"

راجیش بول اٹھا ——— "اور عورت؟"

ساوتری بولی ——— "عورت، مرد کے دل کو دیکھتی ہے اور اتنا سمجھتی ہے کہ شاید خود مرد بھی نہیں سمجھتا۔ اسی لیے خود کو اس کے حوالے کر کے سب کچھ کھو بیٹھتی ہے۔"

یہاں عورت اور مرد کے تعلقات کا کیسا گہرا نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی نئے دور کو خبردار کرنے کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ جہاں عورت کو صرف بچے پیدا کرنے کی مشین سمجھنے کا رجحان قوی ہوتا جا رہا ہے۔ اور ازدواجی زندگی بے کیفی کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن کہیں بھی احساس نہیں ہو پاتا کہ یہ باتیں کوری لادی جا رہی ہوں۔ فلسفے اس کے ذہن نشین کرائے جا رہے ہوں، اسے کوئی سبق دیا جا رہا ہو۔ بلکہ سب کچھ کہانی کا ایک جز بن کر سامنے آتا ہے۔ ساری باتیں کہانی کی خمیر میں گندھی نظر آتی ہیں۔

راجیش عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ ساوتری کو یہاں نہیں دیکھنا چاہتا۔ اپنی کم عقل لیکن چاہنے والی بیوی کو چھوڑنا بھی اس کے بس میں نہیں۔ انتہائی جذباتی عالم میں وہ ساوتری کے ہاتھ پر کچھ روپے رکھتے ہوئے اسے کہیں بھی چلے جانے کی تلقین کرتا ہے اور کمرے سے نکل جاتا ہے۔

راکھی پہنچ کر وہ بے چین رہتا ہے۔ پندرہ دن گذر جاتے ہیں۔ ساوتری کا کوئی خط اسے نہیں ملتا ہے۔ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ ساوتری ناراض ہے۔ شاید اب اس سے کبھی ملاقات نہ ہوگی۔

یہاں ایک کردار سامنے آتا ہے۔ مانک لاہری راجیش کا دوست ہے۔ اس کی پتنی دو بچے چھوڑ کر مر گئی تھی۔ تین سال ہو گئے [illegible] ہیں۔ اور بچوں کے خیال سے دوسری شادی [illegible] کر سکا۔

یہ کبھی بھرتی کا کردار نہیں۔ کیونکہ آدمی کے لئے ضروری ہے کہ کوئی اس کا راز داں بھی ہو۔ جس سے باتیں کرکے وہ دل کا بوجھ ہلکا کر سکے۔ راجیش نے چاہا لیکن اس سے ساوتری کے بارے میں کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کے کیریکٹر سے وہ کافی مرعوب تھا۔

مانک لاہری کا کردار ایک آئیڈیل بن کر ضرور سامنے آیا ہے۔ لیکن بُت نہیں! میں اسے سہیل صاحب کی دوسری اور فنکارانہ بصیرت پر محمول کرتا ہوں کہ انھوں نے پریم چند کی طرح بت جیسے کردار نہیں تخلیق کئے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ کیا دوست جیسی شخصیتیں پیدا کرنے کا اہل ہی نہیں! یا پھر یوں کہہ لیجئے کہ آج کا ٹوٹا پھوٹا ادھورا آدمی اپنے آپ میں مکمل ہو ہی نہیں سکتا!!

ایک دن سرِ راہ چارو سے راجیش کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ دیدی بھی آئی ہے ـــــ ساوتری اپنی ایک پرانی سہیلی کے گھر ٹھہری تھی جو بنگالی تھی۔ راجیش کے لئے یہ خبر باعث مسرت تھی اور ساتھ ہی پریشانی کا باعث بھی۔ رانچی جیسے چھوٹے شہر میں جہاں ہر آدمی قریب قریب آشنا تھا ساوتری سے ملنا ایک سخت مسئلہ تھا۔

مانک بنگالی تھا۔ راجیش نے مانک سے ساری باتیں کہہ دیں۔ مانک ہی کے ساتھ وہ ساوتری سے ملنے بھی گیا۔

مانک بھی ساوتری سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ اس نے راجیش سے کہا کہ میں ساوتری سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اسے رضامند کرسکتے ہو۔ لیکن اس سے کہہ دینا کہ اس کی موجودہ زندگی کے بارے میں تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا ہے۔ تاکہ وہ احساس کمتری کا شکار نہ ہو۔ راجیش ساوتری کو بڑی مشکلوں سے رضامند کرپاتا ہے اور دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔

شاید دوسرے درجے کا کوئی فنکار ہوتا تو کہانی یہیں ختم ہو جاتی۔ اور اس طرح یہ صرف ایک اصلاحی کہانی بن پاتی۔ لیکن اس کے بعد کے ایک پیراگراف نے اختتام پر کہانی کو ایک عظیم فن پارہ [illegible] ہے۔ جیسے منٹو کی "بابو گوپی ناتھ" اور "سوگندھی" وغیرہ۔

ساوتری کی زندگی بدل گئی تھی۔ راجیش کبھی کبھی مانک کے گھر چلا جاتا تھا۔ اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ ساوتری کی شادی سے راجیش کو خوشی تو ضرور تھی۔ لیکن ایک کسک باقی [illegible] تھی کہ اب وہ دوسرے کی ہو گئی ہے۔

ایک دن راجیش مانک کو ڈھونڈتا اس کے گھر پہونچا۔ مانک دو دن کے لئے پٹنہ گیا ہوا تھا۔ [illegible] جانے کے دوران ساوتری کہتی [illegible]

[illegible] یش ہنس دیا اور بولا ـــ "برا ماننے کی کیا بات ہے؟"

"تم کو میری بات بری ضرور لگے گی، اور دکھ بھی ہوگا۔"

[illegible] کہو بھی تو"

"تم مجھ سے ملنے مت آیا کرو۔"

راجیش ساوتری کا منہ دیکھنے لگا۔ ساوتری نے اسے دیکھا اور بولی [illegible]

"مت آیا کرو۔ جب تم آتے ہو تو میں پریشان ہو جاتی ہوں۔ تم نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ میں نے بیاہ اس لئے کرلیا کہ ہمیشہ کے لئے تمہاری گھریلو زندگی سے دور ہو جاؤں۔ تمہیں الجھن میں نہ ڈالوں۔ مگر جب تم آتے ہو، تمہیں دیکھ

(بقیہ صفحہ [illegible])

قیصر جمال

بے جڑ کے پودے

ایک فنی جائزہ

اردو ادب میں افسانے کی طرح ہی ناول لکھنے کی تحریک انگریزی ناول پڑھ کر ہوئی۔ لیکن افسانے کے مقابلے میں ناول کے ارتقاء کی رفتار بہت سست رہی۔ جہاں ایک طرف افسانوں نے اپنی کم عمری میں ہی ادبی دنیا میں دھوم مچا دی وہیں اردو ناولوں کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی بلکہ انگریزی ناول نگاروں کی قائم کردہ اس معیار سے میلوں پیچھے رہ گئے۔ جسے ان لوگوں نے ایک صدی ہی میں بام عروج پر پہنچا دیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو میں ناول نگاری کے ارتقاء میں ترقی ہوتی رہی ہے لیکن ابتک نہ تجربے کی رفتار میں سرعت آسکی ہے اور نہ ہی ان کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہوا ہے۔ نہ فکر و فن میں بلندی آئی اور نہ ہی زبان و بیان کی حدیں پھیلی ہیں۔ اور نہ ہی ایسا اسلوب وجود میں آیا ہے جسے ناول نگاری کی روایت میں اضافہ کہا جائے۔ ان ہی سب وجوہات کی بناء پر اردو ادب میں سوائے چند ناولوں کے اکثر و بیشتر کمتر یا دوسرے درجے کے ہیں۔ رسوا کی "امراؤ جان ادا" پریم چند کی "نرملا" عزیز احمد کی "گریز" عصمت کی "ٹیڑھی لکیر" قرۃ العین حیدر کی "آگ کا دریا" بیدی کی "ایک چادر میلی سی" احسن فاروقی کی "شام اودھ" سجاد ظہیر کی "لندن کی ایک رات" شوکت صدیقی کی "خدا کی بستی" انتظار حسین کی "چاند گہن" وغیرہ چند ایسی ناولیں ہیں جنہیں اس درجے اوپر کہا جا سکتی ہے جس میں اردو کے سینکڑوں ناول رکھے ہوئے ہیں۔ اس نامکمل فہرست میں اپنی پسند کے مطابق کچھ اور ناولوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں ناولوں کی اس فہرست میں سہیل عظیم آبادی کے ناول "بے جڑ کے پودے" کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ "بے جڑ کے پودے" اردو ناول نگاری کے ارتقاء میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

پریم چند کی طرح ہی سہیل صاحب نے "بے جڑ کے پودے" کا مواد زندگی سے لیا ہے۔ اس ناول میں سہیل صاحب نے ڈکنس، ٹھکری اور رابلیٹ کی طرح ہی زندگی کے سماجی اور حقیقی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول میں زندگی کے مسئلے اپنے پیچ و خم اور نشیب و فراز کے ساتھ موجود ہیں۔ جنہیں سہیل صاحب نے بڑے خوبصورت انداز میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ عیسائی مشن میں پروان چڑھنے والے ان بے سہارا بچوں کی زندگی کے مسائل کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے۔ جنہیں ہمارا سماج عام حالتوں میں قبول نہیں کرتا ہے۔ "بے جڑ کے پودے" کے ذریعہ انہوں نے سماج کے نظریہ فکر کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں بہت حد تک وہ کامیاب بھی رہے ہیں۔ "بے جڑ کے پودے" کا پلاٹ الجھا ہوا نہیں ہے۔ پلاٹ میں سادگی اور پرکاری ہے۔ ذاتی واقفیت اور فنی چابکدستی کی بدولت پلاٹ میں کہیں بھی ناہمواریت یا بے ڈھنگے پن کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ زندگی سے قربت زیادہ ہونے کی وجہ کر واقعات فطری انداز میں پھیلتے ہیں۔ پریم چند کی طرح ہی سہیل صاحب کے واقعات اور کردار میں گہرا تعلق ہے۔

ناول کے شروعات ہی میں آناً فاناً اتنے کردار آتے ہیں کہ پڑھنے والا ان میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے واقعات بڑھتے ہیں ارنسٹ، نورا، مسٹر سنہا، مس گرین وغیرہ جیسے جاندار کردار سامنے آتے ہیں۔ یہ تمام کے تمام ہمارے آپ کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔ ان لوگوں سے اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ "بے جڑ کے پودے" میں کچھ کرداروں کی شخصیت کا اظہار ان کی حرکات و سکنات سے ہوتا اور کچھ کا سہیل صاحب کی تشریحات سے ہوتا ہے۔ سہیل صاحب کے کرداروں کا ارتقا عام رفتار سے ہوتا ہے۔ ارنسٹ کا کردار اس ناول میں انتہائی متاثر کن ہے۔ وہ ایک بے سہارا لیکن پرعزم جوان کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے اسی طرح مسٹر سنہا کے انسانیت اور خیر کے جذبات اور مس گرین کی ایثار و قربانی ان کے کردار کی عظمت ہے۔ سہیل صاحب نے ان کرداروں کے نفسیاتی پہلو کو بھی اجاگر کیا ہے۔ "بے جڑ کے پودے" کے مکالموں میں ایک کی اپنی خوبصورتی ہے۔ سیدھے سادے جملے جن میں کہیں کہیں ہندی الفاظ کا استعمال نہایت برجستہ ہے۔ سہیل صاحب نے مکالموں سے واقعات کو آگے بڑھانے، اور کرداروں کی سیرت پر روشنی ڈالنے کا بھی کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کرداروں کے منھ سے نکلے ہوئے ہر جملے فطری لگتے ہیں۔ بیانات کے بدلے مکالموں کی کثرت کی وجہ سے ناول کی دلکشی میں اضافہ ہوا ہے۔

"بے جڑ کے پودے" میں سماجی رنگ گہرا ہونے کی وجہ کر زندگی کا خوبصورت اور سادہ خاکہ ملتا ہے۔ ناول میں فضا، حالات اور واقعات عام رفتار سے کروٹیں لیتی ہیں لیکن اختتام پر یہ رفتار ایک چونکا دینے والے جملے پر ختم ہو جاتی ہے اور قاری چونک پڑتا ہے جب اسے پتہ چلتا ہے کہ ارنسٹ اور نورا حقیقی بہن بھائی ہیں۔

سماجی رنگ گہرا ہونے کی وجہ کر "بے جڑ کے پودے" نے زندگی کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کرلیا ہے۔ ناجائز بچوں کی پریشانی، ان کے مسائل و مصائب، فرسودہ رسم و رواج، نفرت و فریب، پرانے خیالات، فرقہ وارانہ ذہنیت، مذہب کی دیوار، بھوک اور شہوت، ایثار و قربانی کا لگن، انسانیت سے محبت وغیرہ ایسے ہی بہت سے موضوعات ناول میں بھرے پڑے ہیں۔ "بے جڑ کے پودے" میں سہیل صاحب نے ان تمام موضوعات کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر انسانیت اور مذہب کے بارے میں ان کا یہ نظریہ کہ — میرے خیال میں اچھا آدمی بننے کے لئے کسی ایک مذہب کا پابند ہونا ضروری نہیں۔ مندر یا چرچ جانا ضروری بھی نہیں بلکہ اچھا آدمی بننا ضروری ہے۔ مذہب کی روح یہ ہے ......! مسٹر سنہا۔

ایک ماہر ناول نگار کی طرح سہیل صاحب نے بھی مکالموں کے ذریعہ اپنے کرداروں کے داخلی کیفیات کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر مس گرین کے یہ جملے — "میں کسی کی ماں نہیں ہوں لیکن میرے بہت سے بچے ہیں" یا مسٹر سنہا کا یہ جملہ "تم نے کبھی خواب دیکھا ہے۔ خواب ختم ہو جاتا ہے اس کی یاد رہ جاتی ہے ہماری تصویریں خوابوں کی ہیں —"

مجموعی طور پر "بے جڑ کے پودے" انسانیت فرض اور محبت کی لاجواب کہانی ہے۔ جسے اردو ناول کے سرمایے میں ایک بیش بہا اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے ☐

خراجِ عقیدت

ناوک حمزہ پوری

پیدائش :- مجیب الرحمٰن سہیل عظیم آبادی گرامی نسب

۱۱	۶	۱۹

وفات :- عمر فانیٔ مجیب الرحمٰن سہیل عظیم آبادی

۷۹	۶	۱۹

قطعۂ تاریخ وفات

ہزار ونہ صد وہفتاد ونہ زعیسوی سن
بہ بست ونہ ز نومبر سہیل صاحب فن

ہزار حیف کہ ویراں نمودہ بزم ادب
بباغ خلد شد آں فخر قوم و فخر وطن [redacted]

ایک مدت تک تجھے روئے گی دنیائے ادب

بجھ گئی اک شمع اُردو قبل از وقت سحر
عرشِ شہرت سے گرا ایک اور تارا ٹوٹ کر

دیکھتے ہی دیکھتے یہ سانحہ کیا ہو گیا
اک مسافر تھک کے دورانِ سفر میں سو گیا

اے سہیلِ نامور تیری اچانک موت سے
ہو گئی محروم اردو حسنِ حرف وصوت سے

اے کہ تیری ذات صد فخر وطن فخر بہار
اے کہ تیرے غم میں دنیائے ادب ہے سوگوار

ہو گئی بزم ادب محروم اک فنکار سے
ہو گئی محروم اردو اک کہانی کار سے

ہیں فسردہ دل صحافی اک صحافی چل بسا
ایک مخلص دوست اک دیرینہ ساتھی چل بسا

عالمِ انسانیت سے اک عظیم انسان اُٹھا
[redacted] وقارِ اہلِ قلم اُٹھا حلیم انسان اُٹھا

حلقۂ احباب میں برپا ہوا شورِ فغاں
چل بسا اے وائے سچا خادمِ اُردو زباں

خوں فشاں ہے غم میں تیرے چشم لیلائے ادب
ایک مدت تک تجھے روئے گی دنیائے ادب

[redacted] لہ صوری

قمر ساجدی بلیاوی

عقیدت کے پھول

(خلد آشیاں جناب "سہیل" عظیم آبادی مرحوم کی خدمت میں)

اے سہیلِ ضو فشاں اے روکشِ مہتاب — آپ تھے چرخِ صحافت کے درخشاں آفتاب
آپ کے بے انتہا اردو پہ احسانات ہیں — زندگی نور سے معمور احساسات ہیں
محسنِ اردو ادب، افسانوی دنیا کے شاہ — آپ کی تخلیق و کاوش زندگی کی شاہراہ
تاابد زندہ رہے گی ہر کمال آپ کی — نازشِ آفاق ہے جادو بیانی آپ کی
معدنِ ذوقِ نظر مائل ترقی کی طرف — مخزنِ حسنِ زباں کامل ترقی کی طرف
تھا عمل تصنیف میں شامل تھی فکرِ ارتقاء — آپ کو ملحوظ تھی ہر لمحہ اردو کی بقا
خالقِ "بے جڑ کے پودے" "چار چہرے" اور "الا... — جذبِ فطری میں نئی تہذیب کی جانب جھکاؤ
آپ کے سیکولر ارادے آپ کا سوشل دماغ — زیست کے تاریک گوشوں میں جلاتے ہیں چراغ
روزنامہ "ساتھی" جس دم آپ نے جاری کیا — اک تاثر قوم کے جذبات پر طاری کیا
آپ تھے "تہذیب" کے ماہانہ پرچے کے مدیر — کھینچ کے سب کو کیا تہذیبِ قومی میں اسیر
ہفت روزہ "حال" کے بھی تھے ایڈیٹر چند روز — ان مشاغل میں رہے مصروف گو مضطر چند روز
مدیرِ "ہند" و "دلی" سے بھی تھے کچھ منسلک — زندگی تھوڑی رہی لیکن زیادہ مہک
ناظمِ اردو اکاڈمی جب رہے تھے چند سال — آپ کو ہر دم رہا بے بس صحافی کا خیال
خدمتِ قوم و ادب شاداب گلشن کی طرح — کارنامے ہیں نمایاں روزِ روشن کی طرح
یہ نہیں کہ آپ کا غم ہے عظیم آباد میں — آپ ہند و پاک کے ہیں ہر دلِ ناشاد میں
وائے قسمت آپ سوئے خلد راہی ہو گئے — آپ کے پسماندگان وقفِ تباہی ہو گئے

خدمتِ اقدس میں لایا ہے قمر یہ چند پھول
تھی عقیدت آپ سے کر لیجئے اس کو قبول

عاشق نواروی

سہیل عظیم آبادی

(۱)

ہر شاعر و ادیب کا پیارا جو تھا سہیل
علم و ادب کا چاند ستارہ جو تھا سہیل
کشتیٔ علم و فن کا سہارا جو تھا سہیل
بزم ادب کا راج دلارا جو تھا سہیل

فطرت کے ہاتھوں جیتے ہی خاموش ہو گیا
صد حیف آج ہم سے وہ روپوش ہو گیا

آئی اجل پیام مسرت لئے ہوئے
دامن میں اپنے دعوت رحمت لئے ہوئے
مقبول بندگی کی بشارت لئے ہوئے
خلد بریں کی شوکت و عظمت لئے ہوئے

روحِ سہیل تن سے نکل کر کھڑی ہوئی
یزداں کے اک اشارے پہ لبیک کہہ اٹھی

آواز قافلے کو دیئے جا رہا تھا جو
اس کا کام تھا دئے جا رہا تھا جو
ہر رنج و غم میں شاد جئے جا رہا تھا جو
پیہم سم حیات پئے جا رہا تھا جو

گھبرا کے اٹھ گیا وہ مسیحا ہجوم سے
روشن چراغ گل ہوا بادِ سموم سے

میخانۂ ادب کا وہ ساقی نہیں رہا
بیمارِ فکر و فن کا وہ شافی نہیں رہا
تہذیب کا مدیر صحافی نہیں رہا
میدانِ کارِ زیست کا غازی نہیں رہا

شمع ادب کو کون جلائے گا دوستو
گیسو ادب کا کون سنوارے گا دوستو

(۲)

آئی خزاں کچھ ایسی کہ افسردہ ہے چمن
کلیوں میں تازگی نہ گلوں میں ہے بانکپن
بے آب و تاب ہو گئی تصویر انجمن
ماتم کدہ ہے حلقۂ اربابِ علم و فن

وحشت ہے چار سمت ادب کے دیار میں
گلشن کو آگ لگ گئی فصلِ بہار میں

قدرت نے اس کو بخشی تھی فطرت بھی کچھ عجیب
ہر شخص یہ سمجھتا تھا ہے ہم سے وہ قریب
شاعر کا بھی فسانہ نگاروں کا بھی حبیب
عاشق کبھی اس سے ملتا تھا اکثر زہے نصیب

گلزارِ علم و فن کا وہ مالی نہیں رہا
بحرِ فسانہ گوئی کا تھا دُرِ بے بہا

دل سے جو کام لیں تو بنے کچھ معاملہ
کچھ غم نہ ہو جو پاؤں میں پڑ جائے آبلہ
راہِ سہیل پر جو چلے سارا قافلہ
طے ہو بس ایک گام میں منزل کا فاصلہ

راہِ ادب میں عزم سے ہمت سے کام لیں
ہیں بندے جو خدا کے عبادت سے کام لیں

ہو کیوں نہ احترام جنابِ سہیل کا
کتنا تھا نیک نام جنابِ سہیل کا
مرغوب تھا کلام جنابِ سہیل کا
مداح خواص و عام جنابِ سہیل کا

تھی زندگی ادب میں جنابِ سہیل سے
اس میں بہار آئی جنابِ سہیل سے

یہ نظم گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ میں یوم سہیل کے موقع پر پڑھی گئی۔

شبیر احمد

پریم چند کی روایت اور سہیل عظیم آبادی

اردو میں کہانی کہنے کا انداز جدید پریم چند سے پہلے کی روایت رکھتا ہے۔ منشی سجاد حسین اور سجاد حیدر یلدرم کی خدمات پر خطِ تنسیخ پھیرنا منصبِ تنقید کے منافی ہے۔ پریم چند صدی کے موقع پر اس طرح کی ان گنت کوششیں سامنے آتی رہی ہیں۔ پریم چند کی افسانوی خدمات کا انکار ایک تاریخی صداقت کی تکذیب ہے۔ لیکن پریم چند کے فکر و فن کا عقیدت مندانہ [illegible] پریم چند کے ساتھ احمقانہ دوستی کا اظہار ہے۔ اردو تنقید اس معاملے میں ایسی روایتی بے راہ روی کا آج بھی شکار ہے۔ تخلیقی جمالیات کے اقدار و اوصاف کی میزان پر پریم چند اردو افسانے اور ناول کی تاریخ میں ایک کامیاب فنکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کو اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار یا ناول نگار قرار دینا انتہا پسندی سے زیادہ حماقت آمیز ہے۔ بڑے فنکار کی ایک پہچان یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے عہد کی حسیت کا علمبردار ہوتا ہے۔ غالب اور اقبال اپنے عہد ہی کے نہیں بلکہ دانشِ حاضر کے بھی رہبر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میر کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ اگلے زمانے کے اس پیمبرِ فن کی خدمت میں غالب بھی سرِ عقیدت خم کر چکے ہیں۔ افسوسناک حد تک افسوس کی بات یہ ہے کہ اردو کی کہانوی صنفیں پریم چند تک معراجِ جمالیات تک نہیں پہونچی تھیں۔ قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین اور شوکت صدیقی زمانی بُعد کی بنا پر میرے درجِ بالا حلقۂ اعتراض سے باہر ہیں۔

پریم چند کے عہد تک تو عصری حسیت اور [illegible]یت و دانش کی رہبری کا یہ فرض شاعری ہی نے انجام [illegible] بالخصوص غزل نے۔ کلیم صاحب سے معذرت کے ساتھ، اردو ادب کے حسنِ بے مثال کو نظر انداز کرنے والی نگاہیں بینائی نہیں تہمتِ بینائی رکھتی ہیں۔ بہرکیف داستانوں سے قطع نظر اردو میں سماجی اور معاشرتی زندگی کی عقبی زمین پر کہانی کہنے کے فن کو عمومی لب و لہجہ اور اسلوب و لباس سب سے پہلے نذیر احمد نے دیا تھا۔ مغربی ناولوں کے زیر اثر نذیر احمد نے کہانی کے فن کو خلوت خانۂ سلاطین و امراء سے نکال کر طبقۂ متوسط کی زندگی سے پہلی بار ہم آہنگ کیا ہے۔ یہاں کی وہ روایت قصہ گوئی ہے جس کا سنگِ بنیاد انہوں نے رکھا تھا۔ اپنے اس بے نظیر جمالیاتی اجتہاد کے باوجود نذیر احمد کو صفِ اول کا ناول نگار تسلیم کرنا تنقیدی اصطلاح میں عصبیت ہے۔ اس لئے کہ

نذیر احمد اپنی عصری زندگی کے ترجمان و عکاس رہے ہیں۔ مستقبل سے ان کی کہانیوں کا اسی حد تک رشتہ ہے جس حد تک ان کا اصلاحی و تعمیری نظریہ غیر کہانوی سطح پر ان کی کہانیوں کے پس پردہ کارفرما ہے۔ عصری حسیت کی رہبری تو خیر دور کی بات ہے۔ نذیر احمد شعوری طور پر اوسط درجے کے فنکار ہیں۔ بڑے فنکار کی ایک شناخت یہ بھی ہوتی ہے کہ فنکار عصری حسیت کو انفرادی آئینے میں اجتماعی زندگی کا عکس بنا دیتا ہے۔ ایک ایسا عکس جو زندگی کی جمالیاتی تنقید سے عبارت اور مستقبل کا اشاریہ ہے۔ پریم چند نے نذیر احمد کی اس روایت کو مزید استحکام و پائیداری اور وزن و وقار کی قدروں سے مزین کیا ہے۔ نذیر احمد کے عہد میں معاشرتی زندگی کی سمت و رفتار غیر متعین، غیر واضح اور بڑی حد تک تعطل و جمود کے زیر اثر تھی۔ لیکن مردہ بہرحال نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ نذیر احمد کے یہاں ناول کے فن میں فنی اور تخلیقی کمزوریاں نظر آتی ہیں۔ اگر نذیر احمد ایک عظیم فنکار ہوتے تو صرف تعطل و جمود کی مصوری و عکاسی نہ کرتے بلکہ اس کو حرکت و عمل کی جرأت و توانائی سے ہمکنار کر دیتے۔ لیکن نذیر احمد نے نگہبانی کے فرائض انجام دیئے۔ ان کی آواز بانگ رحیل نہ بن سکی۔ اسی طرح پریم چند نے بھی اپنے عصری تقاضا ہائے زندگی کی محض عکاسی کی ہے۔ اس کو انقلابی جد و جہد سے آشنا نہ کر سکے۔

نذیر احمد اور پریم چند کی معاشرتی و اجتماعی زندگی میں زمانی بُعد ایک طرف تعطل و جمود اور دوسری طرف حرکت و عمل کی قدروں کی داستان ہے۔ پریم چند کے زمانے میں ان سیاسی، اصلاحی، اور ادبی تحریکات کی تعبیریں روشن ہونے لگی تھیں جن کا خواب نذیر احمد کے عہد میں دیکھا گیا تھا۔ اس لئے پریم چند کے یہاں ناولوں اور افسانوں میں مقابلۃً نذیر احمد سے زیادہ شدتِ حرکت و عمل ملتی ہے۔ پریم چند کا فن بھی ترجمانی و عکاسی کا فن ہے۔ لیکن ان کی آواز بھی بانگ رحیل نہ بن سکی۔ البتہ بانگ درا ضرور بن گئی ہے۔ اقبال اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں فکر و فن کی جس بلندی پر نظر آتے ہیں پریم چند اپنے آخری دور میں بھی اس سے آگے نظر نہیں آتے۔ اسی لئے درج بالا سطور میں عرض کیا گیا کہ پریم چند کے عہد تک عصری حسیت و جمالیات کی علمبرداری و نگہداری شاعری کا ورثہ رہی۔ پریم چند اپنی ادبی زندگی کے آغاز ہی سے دویکانند اور گاندھی جی کے فلسفے کے زیر اثر رہے اور اپنے نظریۂ جمالیات کی تعین و تقدیر کی بجائے مذکورہ مذہبی و سیاسی شخصیتوں کے مقلد و پیرو کار کی حیثیت سے ادب و فن کی راہ پر گامزن رہے۔ کسی سیاسی و مذہبی رہنما سے متاثر ہونا کوئی جرم نہیں۔ لیکن تقلید کسی کی بھی ہو، خواہ وہ شخصیت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، شاید دنیا کا سب سے گھناونا ... ۔ کیونکہ یہ اپنی ذات کی تکذیب و تردید کا دوسرا ... ہے اور یہیں سے انسانی تاریخ میں جرائم کی ابتدا ...تی ہے۔ انفرادیت کی سطح پر کسی بھی نظریہ کی روشنی میں اپنی ذات کا احساس و شعور اور تعمیر و تشکیل کے وجود کا بنیادی تقاضہ ہے جس کا کوئی بھی رشتہ انسان کی تقلیدی نفسیات سے نہیں ہے۔

پریم چند کا المیہ یہ ہے کہ وہ زندگی بھر سیاسی رہنماؤں کے معتقد رہے جو منصبِ حسن کاری کے بالکل منافی ہے۔ لیکن پریم چند کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ انہوں نے افسانوی سطح پر احتجاج کے رجحان کو روایت کا ایک اٹوٹ حصہ بنا دیا ہے۔ نذیر احمد

کے یہاں فرد کا احتجاجی رویہ نظر نہیں آتا بلکہ زندگی اور معاشرے کے غضبناک تاثر کا مغلوبانہ اظہار ہے۔ پریم چند نے اس کی بجائے عصری زندگی کے احتجاجی رویے کو کرداروں کی سیرت کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش سیاسی تحریکات کی رہنمائی میں معمولی سطح پر بغاوت تک پہونچتی ہے لیکن بغاوت کا رجحان عملی سطح پر اپنا اظہار نہیں کرتا۔ احتجاج کے دائرے میں مقید رہ جاتا ہے آخری دور میں وہ گاندھی جی کی طرز فکر کے دائرے سے باہر نکلنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ اور مارکسزم کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ناول میں "گئو دان" اور افسانے میں "کفن" کی مثالیں سامنے ہیں۔ پریم چند کا ترقی پسندانہ شعور بھی اردو میں ترقی پسند تحریک کے تاثر کا پروردہ ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جس عہد میں بھگت سنگھ جیسا نڈر مجاہد آزادی کانگریس کے سامراجی عندیئے سے بیزار ہو کر برصغیر کے معاشی و تہذیبی مسائل کی تعبیر میں مارکسزم میں تلاش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس عہد میں پریم چند گاندھی جی کا راگ چھیڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سبھاش چندر بوس کے ترقی پسندانہ نظریات سے بھی وہ بہت بعد میں متاثر ہوئے۔ پریم چند اور اقبال کا زمانۂ انتقال تقریباً آس پاس ہے۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ اقبال جس عہد میں شعری جمالیات میں ضرب کلیمی کا مزاج عطا کرتا ہے، اسی عہد میں پریم چند اپنی آواز کو بانگ درا کی منزل سے آگے نہ لے جا سکے۔ اور اس کا بنیادی سبب پریم چند کا تقلیدی کا رویہ تھا۔ کہہ سکتے ہیں کہ پریم چند کا تخلیقی ذہن تقلید و پیروی کے دائرۂ محدود میں اسیر رہ گیا ورنہ پریم چند کے یہاں تخلیقی امکانات تو ضرور مضمر تھے۔ "گئو دان" میں ہوری گوبر اور دھنیا کا کردار ایک ہی شخصیت کا بکھرا ہوا ریزہ ہے۔ کہیں سہتے رہنے کا میلان ہے، کہیں احتجاج کا رویہ ہے اور کہیں ہلکی سی باغیانہ روش۔ دراصل یہ تینوں ہی کردار مل کر پریم چند کے تخلیقی ذہن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اگر پریم چند ان تینوں کرداروں کی ہم آہنگی سے کسی ایسے کردار کی تخلیق کر سکتے جو خاموشی، احتجاج اور بغاوت کا ارتقائی سطح پر نمائندہ ہوتا تو بلاشبہ وہ عصری دانش و حسیت کی مصوری و عکاسی کی بجائے اس کی رہبری و رہنمائی کرتے۔ "گئو دان" ایک ایسا آئینہ ہے جس میں آپ بیسویں صدی کے اوائل کے تمام سماجی، معاشرتی زندگی کے نشیب فراز اور پیچ و خم کے نقوش دیکھ سکتے ہیں۔ مگر اس آئینۂ فن میں کہانی کی استقبالی روایت سے ان کا تخلیقی و جمالیاتی رشتہ نہیں۔ ان کی آوازِ احتجاج بھی پابندیٔ آداب کی حامل ہے اسی سبب سے فنی سطح پر بھی پریم چند کو اجتہادی انفرادیت کا ثبوت دینے نہ دیا۔ مگر ہمارے برسوں کے استحصال، بے ایمانی، غلامی اور خود غرضی کی معاشرتی قدروں اور سیاسی مجبوریوں کی سب سے بہتر تصویر کشی پریم چند نے کی ہے۔ یہ خوبیاں بھی اردو ناول اور افسانہ نگاروں میں کتنوں کے یہاں ملتی ہیں۔ اس لئے پریم چند اپنی محدود سطح پر ایک عظیم المرتبہ فنکار ہیں۔ لیکن میں ان کو اپنے سے قبل تک کی ادبی روایتوں کا سب سے سچا اور مخلص امین سمجھتا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ وہ آئندہ نسلوں کی

تخلیقی ذہانت کو گہرے طور پر متاثر کرنے میں کامیاب رہے۔ یہیں سے اردو ناول و افسانہ نگاری کی روایت معتبر و محترم ہوتی ہے۔

پریم چند سے متاثر ہونے والوں میں سہیل عظیم آبادی ایک منفرد فنکار ہیں۔ سہیل صاحب کی تخلیقات فکر و فن کی سطح پر آئندہ نسلوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے سکتی ہیں۔ لیکن یہ فن انہوں نے بہتر طور پر پریم چند سے ہی سیکھا تھا۔

سہیل عظیم آبادی کی سب سے اہم ادبی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے پریم چند کی روایت کو آئندہ کی روایت سے ہم آہنگ کرکے احتجاج کو بغاوت کا روپ دینے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ حالانکہ بغاوت کے رجحان کو پریم چند کے یہاں اور انقلابی میلان کو سہیل عظیم آبادی کے یہاں اجاگر ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اس کو کیا کہئے کہ پریم چند کی کوتاہی فکر و نظر جرأت و جسارت سہیل عظیم آبادی کا سنگِ راہ بن گئی۔ اگر سہیل عظیم آبادی پریم چند کی روایت کو اجتہاد کی راہ پر لے جا کر احتجاج کو انقلابی شعور سے ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو ان کا فنی قد پریم چند سے زیادہ معتبر ہوتا۔ اس لئے کہ سہیل عظیم آبادی کی عصری زندگی کا تقاضا کچھ ایسا ہی تھا مگر سیاسی نظریے کی انفعالیت کا شکار پریم چند ہوتے رہے۔ اسی مجہول نقطۂ نظر نے سہیل عظیم آبادی کے فکر و فن کو بالیدگیٔ شعور کا شائستہ اظہار نہ بننے دیا۔ اس کی ذمہ داری صرف سہیل عظیم آبادی کے سر نہیں بلکہ پریم چند کا احساس کمتری اور ان کی شخصیت کا خود غرضانہ اور مصالحانہ رجحان و میلان اس کے لئے زیادہ ذمہ دار ہے۔ سہیل عظیم آبادی کا قصور بس اتنا ہے کہ انہوں نے پریم چند کو مرشدِ فن بنا لیا اور اس کی سیاسی اور معاشرتی نظریۂ زندگی کو قابلِ قدر سمجھا جس کو پریم چند نے اپنایا تھا۔ غور سے دیکھئے تو کانگریس سے وفاداری دونوں کے یہاں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے اور یہی نظریاتی مجہولیت دونوں کے لئے حجابِ فن بن گئی۔ سہیل عظیم آبادی کی جمالیاتی رہگذر میں اندھیرا تو پریم چند نے بچھایا۔ ان کا قصور تو صرف اتنا ہے کہ وہ انفرادیت کے چراغ کو روشن نہ کر سکے۔ ان تمام باتوں کے باوجود سہیل عظیم آبادی کا احتجاج گویا باغیانہ رویہ بن کر عصری حسیت کو فنی روایت میں سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

"جینے کے لئے" اور "الاؤ" دو ایسی کہانیاں ان کی تخلیقی شخصیت کی رہینِ منت ہیں جو اردو افسانے کو [illegible] بخشتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر، منٹو اور عبداللہ حسین سے قطع نظر سہیل عظیم آبادی کی یہ دونوں کہانیاں آج بھی فطری سطح پر ہندوستانی شعور کے باغیانہ رجحان کے اعتبار سے اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بیدی اور کرشن چندر تمام تر شہرت و عظمت کے باوجود افسانے کی روایت کو یہ استحکام کہاں دے سکے ہیں۔ اس لئے کہ دونوں ہی مذکورہ فنکار ترقی پسند تحریک کے زیر اثر انقلابی شعور و حسیت کی نمائندگی کی بجائے مارکسزم کی تقلیدی پیروی میں رومانی انقلابیت کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ اگر سہیل عظیم آبادی "جینے کے لئے" "الاؤ" روشن کرتے رہتے تو ان کے ایک عظیم افسانہ نگار بننے کے امکانات زیادہ قوی اور منور تھے۔ مگر زندگی کا ایک المیہ تو یہ بھی

ہے کہ نقار خانے میں طوطی کی آواز گم ہوتی رہی ہے ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری سہیل عظیم آبادی پر عاید نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو کم بلکہ کم سے بھی کمتر۔

ضرورت ہے کہ تفصیل تجزیاتی مطالعے کا سہارا لے کر اس حقیقت کی جستجو کر لی جائے کہ وہ شخص جس نے پچھلے "الاؤ" روشن کر کے [illegible] جسارت کی تھی آخر میں بجھے ہوئے "الاؤ" کی راکھ کریدنے میں زندگی بھر کیوں مشغول رہ گیا۔ پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ خاکستر میں چنگاری کی تلاش اپنے عہد میں صرف سہیل عظیم آبادی کا حصہ بنا۔ ان کی یہی انفرادیت ان کا امتیاز ہے جو ان کو اردو کی افسانوی روایت کا ایک ناقابل فراموش حصہ بناتی ہے۔

کل آج اور کل

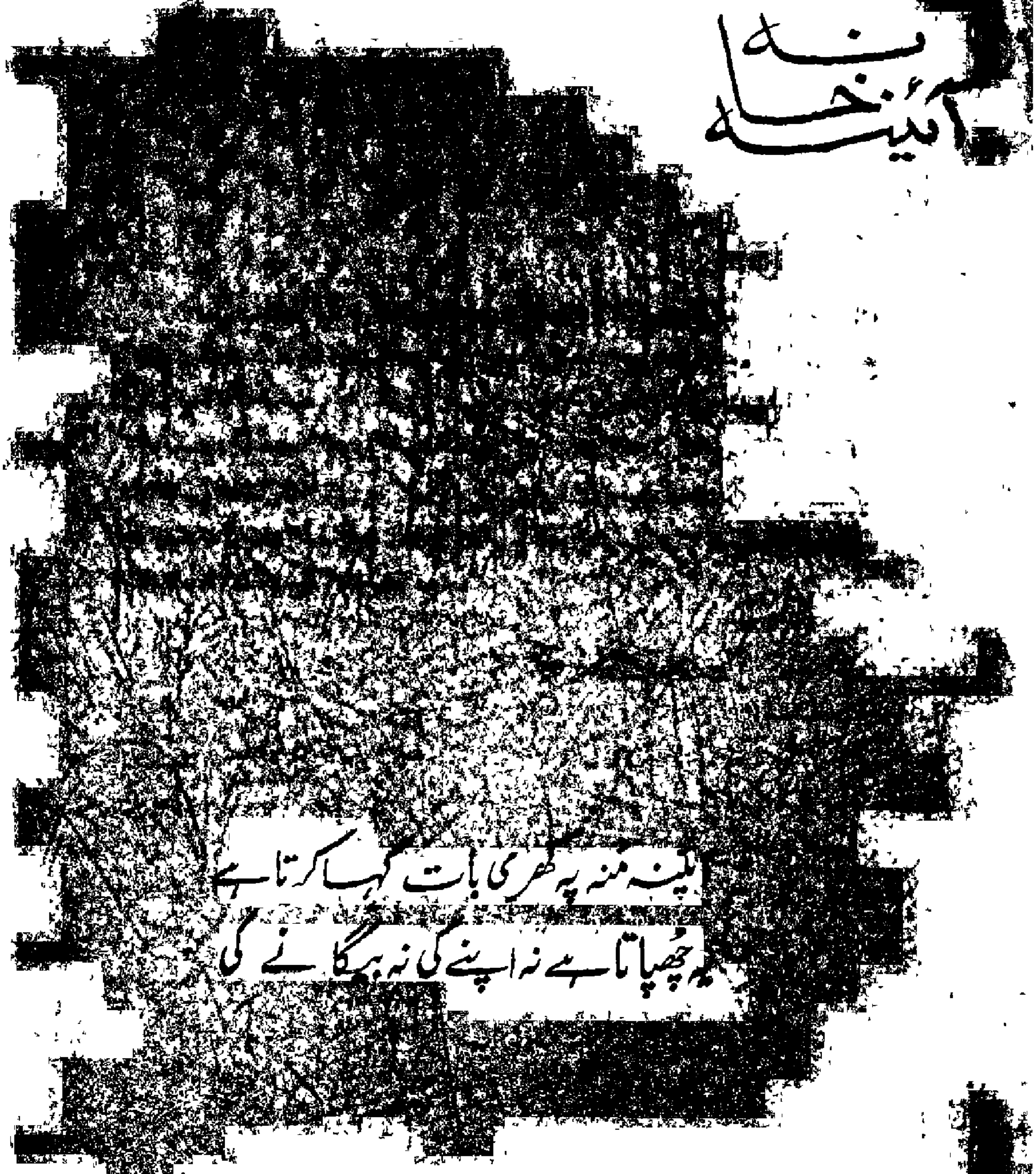
اعجاز علی ارشد

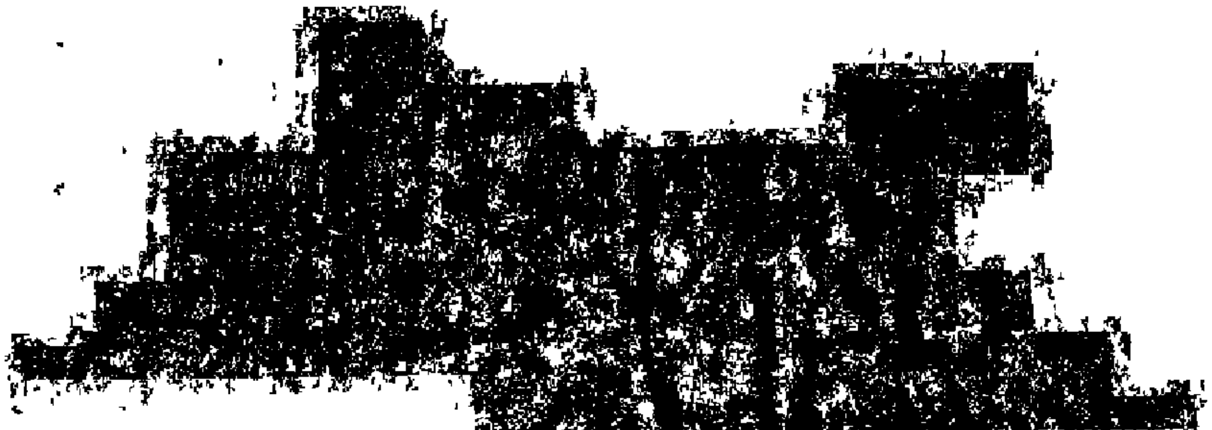
وہ کل جو گذرا ہے اس میں سہیل زندہ تھا
وہ "چار چہرے" کا خالق جو ایک چہرہ تھا
بڑی عظیم وہ قدریں تھیں زندگانی کی
"الاؤ" میں وہ غم زندگی سے جلتا تھا
سبھوں سے ملتا تھا لیکن سبھوں میں یکتا تھا
جنہیں [illegible] لمحہ لمحہ مرتا تھا

یہ حادثہ بھی بہت [illegible] گذرا ہے
دکھے ہیں دل تو بہت اس کی موت سے لیکن
کسی کا دل نہ کبھی جس نے عمر بھر توڑا
کہانی بن گیا جو خود کہانی لکھتا تھا
میں سوچتا ہوں کہ اس کا قصور بھی کیا تھا
وہ کیسے موت کے قاصد کو ٹال سکتا تھا

وہ کل جو آئے گا اس کل میں یاد رکھنا ہے
وہ نرم خوئی وہ انسان دوستی اس کی
روایتیں کہ جنہیں وہ عزیز رکھتا تھا
وہی سلوک جو اس کا سدا وطیرہ تھا

آئینہ خانہ


یہ منہ پہ کھری بات کہا کرتا ہے
یہ چھپاتا ہے نہ اپنے کی نہ بیگانے کی



لوہار لوہے کو گرم کر کے پیٹتا ہے اور چھری کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے لیکن اس میں کاٹ کرنے کی صلاحیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب دھار پر سان چڑھائی جائے ٹھیک یہی حال فن کا ہے۔ صلاحیتیں تو انسان کے اندر موجود ہوتی ہیں۔ اور ذوق اس کو شکل دے دیتا ہے۔ لیکن ریاضت کے بغیر کسی فن میں تیزی اور چمک پیدا نہیں ہوتی۔ جو فنکار ریاضت نہیں کرتا وہ ایسی تلوار بنانے والا لوہار ہے جس میں نہ تو کاٹنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور نہ چمک۔ اور جس طرح ایسی تلوار بے کار ہوتی ہے اسی طرح ایسے فنکاروں کا فن بھی بے سود ہے



شانتی رنجن بھٹاچاریہ، کلکتہ

سہیل عظیم آبادی

اور اردو اکاڈمی

سہیل عظیم آبادی سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی کہہ نہیں سکتا۔ اندازاً ۱۵، ۱۴ سال سے تعلقات رہے ہیں بے شمار بار ہم ملتے رہے ہیں۔ پٹنہ میں، لکھنؤ میں اور کلکتے میں ——— کئی ادبی جلسوں میں، دوستوں کی محفلوں میں، ادبی کانفرنسوں میں، یہاں وہاں، گھنٹوں ساتھ رہے، گھومے پھرے، کھاتے پیتے (پینا کے معنی شراب پینا نہیں، صرف چائے تک ہی یہ پینا محدود رہی ہے) مختلف مسائل پر باتیں ہوتی رہی ہیں۔ اور اس طرح ہم ایک دوسرے سے بہت قریب رہے ہیں۔ ان ۱۵، ۱۶ سالوں میں سہیل بھائی نے مجھے کم از کم دو سو خطوط لکھے ہوں گے چونکہ خط لکھنا ان کی عادت ہی تھی۔ اگر زیادہ دن گذر جاتے تو وہ خیریت معلوم کرنے کے لئے ہی ایک پوسٹ کارڈ لکھ ڈالتے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ان کے خط کا جواب دینے سے پہلے تک ان کے دو تین مزید خط آ گئے ——— اور خطوط کا بر وقت جواب دینا تو ان ہی کا حصہ رہا ہے ——— خیر۔ لیکن کسی کے خطوط کو حفاظت سے رکھنا میری عادت نہیں رہی ہے لہٰذا میں نے کسی کے خطوط جمع نہیں رکھا ——— لیکن صرف چند سال پہلے مجھے ایک ایسی ضرورت پیش آئی تھی اور تب سے میں چند اہم لوگوں کے خطوط جمع رکھنے لگا۔ لیکن افسوس کہ سہیل بھائی کا شمار میں نے ان اہم لوگوں میں سے نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ سہیل بھائی کو میں اپنے بالکل قریب پاتا رہا ہوں۔ اور فطری طور پر اپنوں کی اہمیت کم ہی ہوتی ہے۔ اس لئے "اپنا ہی ہے" سمجھ کر عزت نہیں کی گئی اور ان کے خطوط کو میں نے جمع نہیں رکھا۔

لیکن آج سہیل بھائی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد بعض ساتھیوں نے جو خطوط لکھے ان میں سہیل بھائی کے خطوط کی طرف بھی اشارہ کیا اور کہا کہ میرے یہاں ان کے بہت سے خطوط ہوں گے لہٰذا میں ان کے خطوط کو شائع کر دوں یا ان خطوط پر مضامین وغیرہ لکھوں۔ اب آنکھ کھلی ـ لیکن دیر ہو چکی تھی، دیر بہت دیر ـــ پھر بھی یہ خوشی کی بات ہے کہ گھر کی مکمل تلاشی لینے کے بعد سہیل بھائی کے ۲۲ خطوط ہاتھ آئے، جو نہ معلوم کیوں کر میرے یہاں محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان خطوط میں بہت سی باتیں ہیں ذاتی باتیں، ادبی باتیں، زبان و ادب کے مسائل، سماجی مسائل سیاسی مسائل۔ سب کچھ ـــ

یہ سب ہی جانتے ہیں کہ سہیل عظیم آبادی بہار اردو اکاڈمی کے سکریٹری بھی رہے ہیں اور دیگر ریاستوں میں اردو اکاڈمیوں کے قیام سے بھی وہ دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ وہی ان کے خطوط (مکمل طور پر یا کچھ حصے) پیش کرتا ہوں جس سے بہار اردو اکاڈمی اور دیگر اردو اکاڈمیوں کے سلسلے میں ان کے خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان خطوط میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اختلاف رائے ممکن ہے لیکن یہاں تو صرف ان کی رائے کو پیش کرنا ہی مقصد ہے، ان کی رائے پر بحث کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (مختلف خطوط کے صرف وہی حصے دیئے گئے ہیں جہاں اردو اکاڈمی کا کوئی ذکر کوئی بات ہے۔)

پٹنہ ۔۔۔۔۔ (۱) ۔۔۔۔۔

26-7-74 برادرم سلام و محبت

کل رات واپس آیا تو آپ کا خط ملا۔ شکریہ۔ مرکزی کانگریس کی طرح بہار کانگریس نے بھی اردو کمیٹی بنائی ہے۔ کل ایک سمینار تھا: "اردو زبان اور اس کے مسائل"۔ کل دن کو بجے دن سے دس بجے رات تک اس میں مصروف رہا۔ مضامین تو چند ہی پڑھے گئے لیکن بحثیں خوب کھل کر ہوئیں اور بہت سی باتیں سامنے آئیں۔ خیر یہ سلسلہ تو چلتا ہی رہیگا۔

اردو اکاڈمی کے بارے میں آپ کی خبر درست ہے کہ چیف منسٹر نے اس کی نئی تشکیل کر دی ہے اور مجھے سکریٹری مقرر کر دیا ہے۔ لیکن کاغذات ابھی تک لا ڈیپارٹمنٹ میں ہیں۔ نئی تشکیل میں کچھ دستوری نکتے ابھر آئے ہیں۔ خیر وہ جلدی ہی سدھر جائیں گے اور امید کہ اس مہینے میں چارج لے لوں گا۔ پھر جو بھی ممکن ہوگا کروں گا۔ اس وقت آپ سارے احباب کی مدد کی ضرورت ہوگی۔ بہت سی باتیں میرے دماغ میں ہیں اور ان کو تنہا بروئے کار نہیں لایا جاسکتا۔ خیر دیکھئے کیا ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسری بات۔ دہلی میں کوشش کی تھی کہ مرکزی کانگریس ہر ریاست کی کانگریس کو جہاں اردو بولنے والے کافی تعداد میں ہوں، "اردو کمیٹی" قائم کرنے کی ہدایت کرے۔ بنگال میں تو کافی تعداد میں ہیں اور بھی کہ بنگال اردو اکاڈمی قائم کرے۔ وہاں کی اکاڈمی کے دو مقاصد ہوں — (۱) اردو طلبا کو ابتدائی تعلیم کی آسانیاں فراہم کرنا۔ دوسرے بنگالی زبان کے اعلیٰ ادب کا اردو میں ترجمہ اور اردو کے اعلیٰ ادب کا بنگلہ میں ترجمہ۔ اگر یہ کام ہو جائے تو بہت بڑا کام ہو۔ بنگال کے پاس آپ جیسا آدمی موجود ہے جو دونوں زبانوں کو جانتا ہے کیا یہ ممکن ہے ؟ اگر ممکن نظر آئے تو میں دہلی سے کوشش کروں اور منسٹر ہاؤس پر زور ڈلواؤں۔ اس کا ایک بڑا سیاسی فائدہ بھی ہوگا۔ اردو حلقہ کانگریس سے قریب ہو جائے گا۔ یہ کانگریس بھی ہو اس لئے ذہن میں یہ بات ضرور آئی ہے۔ میں بنگال کے حالات سے واقف نہیں لیکن اس کا یقین ہے کہ بنگال میں ایسے کانگریسی احباب ضرور ہوں گے جن کی زبان اردو ہے اور ان میں کچھ لوگ با اثر بھی ضرور ہوں گے۔ انھیں ٹٹولیے اور کہیے کہ وہ کوشش کریں۔

اور حالات اچھے ہیں۔ خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

خیر اندیش ۔۔۔۔ سہیل عظیم آبادی

۔۔۔۔۔ (۲) ۔۔۔۔۔

پٹنہ

23-8-74 (خط کا صرف وہ حصہ جس میں اکاڈمی کا ذکر ہے)

"بنگال میں مستقل طور پر یہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ تھوڑی سی محنت کے لئے تو بڑا کام کر سکتے ہیں۔ وہاں بھی اردو اکاڈمی قائم کرایئے اور خود اس کے سکریٹری بن جایئے۔ اس کام کے لئے آپ کو وہاں کے سیاسی لوگوں سے مدد لینی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ سنجیدگی سے کوشش کی جائے تو کامیابی یقینی ہے۔ کلکتہ ہی میں اردو کی ترقی کا پہلا ادارہ قائم ہوا تھا۔ اردو ادب کے سلسلے میں بہت سا کام کیا جا سکتا ہے۔ اب بھی وہاں بہت سی چیزیں مل سکتی ہیں۔ ایک بڑا کام یہ ہو سکتا ہے کہ بنگالی زبان کا اعلیٰ ادب اردو میں اور اردو کا اعلیٰ ادب بنگالی زبان میں منتقل کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر سدھارتھ شنکر رائے سے باتیں کی جائیں اور یہ یقین دلایا جائے کہ اردو اکاڈمی غیر بنگالی مسلمانوں سے رابطہ کا ذریعہ بن سکتی ہے تو وہ اسے منظور کر لیں گے۔ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ بہت سے سیاسی کارکن آپ کا ساتھ دیں گے۔ کچھ کیجئے۔"

۔۔۔۔۔ (۳) ۔۔۔۔۔

پٹنہ

برادرم سلام و محبت

کل مجھے بہار اردو اکاڈمی کے سکریٹری کے تقرر کا خط مل گیا۔ آج دس بجے دفتر پہنچ جاؤں گا۔ سابق سکریٹری ڈاکٹر صدر الدین سے تھوڑی دیر میں فون پر بات کروں گا۔ وہ کس وقت چارج دیتے ہیں۔ بڑا لمبا ڈرامہ رہا۔ کل ڈراپ سین ہو گیا۔ اب آپ لوگوں کے تعاون کی ضرورت ہے۔ اکاڈمی سے کچھ ایسا کام کر جاؤں کہ لوگ یاد

وادکری اور رہنمائی حاصل ہو۔

بنگال میں اردو اکاڈمی قائم کرانے کی کوشش کیجئے۔ یہ موقع ہے۔ پھر شاید موقع باقی نہ رہے۔

.... خدا کرے آپ مع الخیر ہوں

خیر اندیش

سہیل عظیم آبادی

——(۴)——

پٹنہ ملا

13-9-74 (خط کا کچھ حصہ)

• پرسوں میں آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں۔ بہار اردو اکاڈمی کے سکریٹری کا عہدہ میں نے سنبھال لیا۔ صدرالدین صاحب کا پتہ نہیں۔ انھوں نے وہ وہ تماشے کئے کہ مت پوچھئے خیر یہ ختم تمام ہوا۔ اب یہ ذمہ داری میرے سر پر ہے۔ اگر کچھ اچھا کام نہیں کرسکا تو بڑی رسوائی ہوگی۔ مجھے قدم قدم پر دوستوں کی مدد کی ضرورت ہوگی اور دوستوں کو تیار رہنا چاہئے۔ ابھی تک سارے حالات کو نہیں جان سکا ہوں۔ پرانی کارروائیوں کو پڑھ رہا ہوں۔ مگر ساری چیزیں گڈ مڈ ہیں۔ بہر حال اب کام کرنا ہے۔ بنگال میں اکاڈمی کے قیام کی کوشش ضرور کیجئے۔ موقع نکال کر میں کلکتہ پہنچوں گا۔ احمد سعید ملیح آبادی کو بھی خط لکھوں گا قدرتی طور پر ان کی دلچسپی اڈیٹرز کانفرنس سے ہے۔ پھر بھی انہیں کرنا ہوگا۔ میں دل سے اثر ڈالنے کی کوشش کروں گا۔

——(۵)——

پٹنہ ملا

7-10-74 (خط کا ایک حصہ)

یہ خط ایک خاص ضرورت سے لکھ رہا ہوں۔ اکاڈمی کے پروگرام میں ایک سہ ماہی رسالے کی اشاعت بھی ہے۔ میرے چارج لینے سے پہلے ہی رسالے کا نام تجویز ہوچکا تھا "زبان و ادب" جو اکاڈمی کے رسالے کا مناسب نام یقینی نہیں ہے۔ لیکن اب تو اسی نام سے رسالہ جاری کرنا ہے۔ طے پایا ہے کہ پہلا شمارہ جنوری ۷۵ء میں شائع کر دیا جائے اور میں نے اس کی ذمہ داری لی ہے۔ اس لئے آپ سے بطور خاص کہنا ہے کہ ایک مضمون جلد سے جلد عنایت فرمائیے .... اکاڈمی نے ہر مضمون کے لئے مناسب معاوضہ دینے کا فیصلہ کیا ہے اور یہ ضروری بھی تھا۔ آخر اکاڈمی معاوضہ نہ دے تو بیچارے ہر وقت آخری سانس لینے والے رسالے کہاں سے دیں گے۔ آپ کا مضمون ۲۰ اکتوبر تک مجھے مل جانا چاہئے۔ رجسٹرڈ پوسٹ سے، اور اکاڈمی کے پتے پر۔ اور حالات اچھے ہیں۔ مضمون کا شدت کے ساتھ انتظار رہے گا۔"

(خط کا کچھ حصہ)

• میرے جیسے روگ نے میرے لئے الجھنیں ہی الجھنیں چھوڑی ہیں۔ ایک ایک کو سلجھا رہا ہوں۔ جب سے سکریٹری مقرر ہوا ہوں، اشاعتی کمیٹی کی کوئی میٹنگ نہیں ہوئی ہے۔ اب شکایت کیا کروں لیکن واقعہ یہ ہے کہ صدرالدین صاحب نے سارے کام عجیب انداز میں کرنا شروع کیا اور سب کو الجھا کر رکھا۔ میں اس معاملے کو جلد سے جلد ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں نے سعید ملیح آبادی کو لکھا ہے کہ وہ اکاڈمی کے قیام کی تحریک کریں۔ انھوں نے ایک اداریہ اپنے اخبار میں لکھا تھا اور مجھے بھیج دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد مجھے کوئی اطلاع نہیں۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اس تحریک سے قریب رہئے۔ اور مجھے بھی اطلاع دیتے رہئے۔ میں اپنے اثرات کو کام میں لاؤں اور غلط لوگوں سے اسے محفوظ رکھنے کی کوشش کروں۔ میری دلی خواہش یہ ہے کہ آپ اکاڈمی کے سکریٹری بنائے جائیں۔ اگر اکاڈمی بن جائے اور پروفیسر مقبول احمد صاحب بھی ذمہ دار عہدہ دار کی حیثیت سے اس سے منسلک ہوں، امیر رضا کاظمی صاحب ہوں۔ ورنہ برادرم کلکتہ کا اثر اب

پر وہ نہیں جو پہلے تھا۔ کچھ عجیب ماحول ہے۔ جب میں کلکتہ میں تھا تو ماحول ہی کچھ اور تھا۔ لیکن آپ کوشش کیجئے۔

...... میرا خیال ہے کہ اس لئے بھی کوشش کی جانی چاہئے کہ سدھارتھ شنکر رائے کے بعد پھر یہ کام نہیں ہوگا۔ ایک ایسا انسان اتفاق سے آگیا ہے جو یہ کام کرسکتا ہے ...... میں سخت الجھن میں ہوں۔ تین مہینے ہوگئے۔ اب تک میرے اتر پردیش کا معاملہ طے نہیں پایا اور ضرورت ہے کہ میں جا نہیں چھوڑتی ...... آپ کا مضمون "ہماری زبان" میں پڑھا تھا اور بہت پسند آیا تھا۔ آپ لکھتے ہی کام کی باتیں ہیں۔ آپ کے مضامین میں شوق سے پڑھتا ہوں۔ بنگال کے لوک گیت کو ضرور پڑھوں گا ...... آٹھ بج چکے ہیں اور میں دفتر میں بیٹھا آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں ـــــ

ـــــ (۷) ـــــ

پٹنہ ملا

25-2-75 (خط کا کچھ حصہ)

... سو دیر کے لئے میں نے ایک مختصر مضمون لکھا ہے لیکن آپ کی کتاب کے حوالے سے میں نے شروع ہی میں اس کا اعتراف بھی کر لیا ہے ......" افق نو" کے بدلے بہار اردو اکاڈمی کا رسالہ "اردوستان" ہوگا۔ یہی نام ملا۔ اب مارچ میں شائع ہو جائے گا۔ کتابت مکمل ہے ... اور حالات اچھے ہیں۔

ام ـــــ"

ـــــ (۸) ـــــ

پٹنہ ملا

۸ر اپریل ۱۹۷۵ء برادرم۔ محبت

ادھر آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنگال میں اردو اکاڈمی کے قیام کی امید فضول ہے۔ وہاں کے لوگوں کو کوئی دلچسپی نہیں اپنی جگہ سے کوئی ہلنے کو تیار نہیں اور جب تک سیاسی سطح پر کوشش نہیں ہوگی، وہاں اکاڈمی کے قیام کی امید فضول ہے۔ سرکار کو انتظامی معاملات اور وزراء کو اپنی پارٹی کی طاقت بڑھانے سے

فرصت نہیں۔ کوئی تہذیبی کام ان کے دماغ میں کم ہی آتا ہے۔ میں بنگال میں اردو اکاڈمی کے قیام کا خواہشمند اس لئے ہوں کہ بنگالی ادب کا قیمتی سرمایہ اردو میں منتقل ہوسکے۔ بنگال میں اردو کا ادب ہے ضرور لیکن اس سے زیادہ اہم اور قیمتی بنگالی ادب کا سرمایہ ہے جو اردو میں منتقل ہو جائے تو اردو کی دولت میں اضافہ ہو۔ خاص کر ڈی۔ ایل۔ رائے، بنکم چٹرجی، ٹیگور اور سرت چندر چٹرجی کی تخلیقات۔ مجھے سرت بابو کے ناولوں سے عشق ہے میں بڑی ایمانداری کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ اپنے عہد کے وہ دنیا کے سب سے بڑے ناول لکھنے والے تھے۔ اور بیسویں صدی کی سب سے بڑی ادبی بے ایمانی یہ ہے کہ انھیں نوبل پرائز نہیں ملا۔ بڑے بڑے نام، جن کو نوبل پرائز ناول نویس کی حیثیت سے ملا، سرت بابو کے سامنے طفل مکتب ہیں۔ اور اب تو خیر ادب کا نوبل پرائز سیاسی انعام بن کر رہ گیا ہے۔ کمیونزم کی مخالفت کرو، اور انعام حاصل کرو۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ سرت بابو کے سارے ناول ہندوستان کی ہر زبان میں ترجمہ ہو جائیں لیکن کون کرے گا؟ ...... آپ علی گڑھ گئے۔ پہلے لکھتے تو سینیشن پر مل لیتا کچھ باتیں کرتا۔ بنگال میں اکاڈمی کے قیام کے سلسلے میں آپ ہی کو کچھ کرنا ہوگا۔ تیار رہئے۔ امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔ سلام

مخلص:- سہیل عظیم آبادی

ـــــ (۹) ـــــ

بہار اردو اکاڈمی پٹنہ ملا

۲۲ر مئی ۱۹۷۵ء برادرم

"اردوستان" کا پہلا شمارہ آپ کو بھیجا جاچکا ہے مل گیا ہوگا۔ آپ کا مضمون مجھے پسند آیا تھا۔ اب رسالے کا نام بدلنا ہوگا۔ درخواست دے دی گئی ہے ...... آپ کی تحریریں میری نظر سے گذر رہی ہیں۔ آپ قابل قدر کام کر رہے ہیں ...... آپ بہت کام کر رہے ہیں۔ واقعی میں دل سے آپ کے کاموں کو

خدا کا حصہ۔ میں کچھ بھی نہیں کہہ رہا ہوں۔ بس دعا کر رہا ہوں۔ خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

مخلص

سہیل عظیم آبادی

—— (۱۰) ——

[illegible] (خط کا کچھ حصہ)

"بنگال میں اردو اکاڈمی قائم ہوگی۔ مجھے اس میں شک ہی نظر آتا [illegible] منشی پریم چند نے مرنے سے کچھ دن پہلے ایک مضمون لکھا تھا۔ مہاجنی تہذیب [illegible] انہوں نے اس مضمون میں —— Commercial impact سماج پر اثر کی تصویر کھینچی تھی۔ وہ آج سامنے ہے۔ جب تک روپے کی امید نہ ہو۔ کوئی آدمی کسی کام کے لئے قدم نہیں بڑھاتا۔ کلکتے کا یہی حال مجھے نظر [illegible]۔ اگر کچھ ہوگیا تو معجزہ ہوگا۔"

[illegible] اردو اکاڈمی پٹنہ —— (۱۱) ——

۱۴ دسمبر ۷۸ء (خط کا کچھ حصہ)

اس خبر سے بے حد خوشی ہوئی کہ اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے موقع پر [illegible] سدھارتھ شنکر رائے نے اردو اکاڈمی کے قیام کا اعلان کر دیا [illegible] دیکھنا یہ ہے کہ تشکیل کب اور کیسی ہوتی ہے۔ میری دلی تمنا ہے [illegible] آپ سکریٹری ہوں۔ اس لئے نہیں کہ آپ مجھے عزیز ہیں۔ اس لئے بھی نہیں کہ آپ بنگالی ہیں۔ اگرچہ یہ بات بڑی اہم ہے اور اس پر زور دینا [illegible] ہے۔ بلکہ اس لئے کہ جہاں تک مجھے علم ہے آپ سے زیادہ خاموشی اور سنجیدہ کام اردو کا کوئی دوسرا نہیں کر رہا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ آپ ہندوستان سے عام طور پر اور بنگال کے خاص طور پر سارے اردو کے کام کرنے والوں سے آپ واقف ہیں۔ میں نے حیات انشر الفاری کو خط لکھا ہے کہ وہ [illegible] رائے کو اپنی طرف سے مشورہ دیں، ورنہ اگر خدا نخواستہ کوئی غلط آدمی آگیا تو سارا مقصد فوت ہو جائے گا۔

اکادمی کے مقاصد اور قواعد و ضوابط کیا ہوں گے اسے میں نہیں جانتا لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ مقاصد میں ایک بات یہ بھی ہو —— بنگالی زبان کے اعلیٰ ادب کا اردو اور اردو زبان کے اعلیٰ ادب کا بنگالی میں ترجمہ [illegible] دونوں زبانوں کو فائدہ ہوگا۔ اردو سے غالب، اقبال، سرسید شبلی اور دوسرے بڑوں کے کارنامے سے بنگالی زبان آشنا ہوگی۔ اور بنگالی زبان سے ٹیگور، نذر الاسلام، بنکم چٹرجی اور سرت چٹرجی کے علاوہ بہت سے ادیبوں اور شاعروں کو اردو دنیا جان سکے گی۔ بنگال میں اردو کا قدیم سرمایہ ہے اس کی اشاعت ہو سکے گی۔

اگر خدا نخواستہ اکاڈمی غلط ہاتھوں میں پڑ گئی تو سارا کیا دھرا برباد ہو جائے گا۔ بڑی مشکل سے اردو والوں کو ایک موقع ملا ہے .. بہار کی اکاڈمی میں دو تین غلط آدمی آگئے ہیں تو معاملات کو الجھاتے رہتے ہیں۔ اور میرے لئے درد سر ہیں۔ اس بات کی پوری کوشش کیجئے کہ اس قسم کے لوگ نہیں آنے پائیں۔"

—— (۱۲) ——

[illegible] نور منزل، سبزی باغ۔ پٹنہ ۴

۴ مارچ ۷۸ء [illegible]

[illegible] عزیزی —— بنگال اردو اکاڈمی کے سلسلے میں اعلان تو کب کا ہو چکا۔ اب اس سلسلے میں کیا ہو رہا ہے۔ میں نے بعض دوستوں کو بھی لکھا ہے۔ احمد سعید ملیح آبادی اور سالک وغیرہ کو۔ اکاڈمی کا سکریٹری تمہیں بننا چاہئے۔ تم اپنے طور پر کوشش کرو۔ اگر خدا نخواستہ کوئی سیاسی آدمی یا کوئی جز وقتی یعنی [illegible] سکریٹری بنا تو اکاڈمی غارت ہو جائے گی۔ بہار کا تجربہ تلخ ہے۔ بچہ یہ کہ اکاڈمی میں عملہ کافی ہو۔ کم آدمیوں کے ساتھ کام کرو گے تو پریشان ہو جاؤ گے یہی میرے ساتھ ہوا . . . میں نے تم کو سرت بابو پر ایک مفصل مضمون لکھنے کو خط لکھوایا تھا۔ مضمون اب تک نہیں ملا۔ میں اسے آہنگ [illegible] میں شائع کرنا چاہتا ہوں۔ اس سال اُن کا صد سالہ یوم پیدائش منایا جا رہا ہے۔ ایک چھوٹا سا مضمون میں لکھوں گا۔"

خیر اندیش [illegible]

سہیل عظیم آبادی

—— (۱۳) ——

[illegible] پٹنہ ۶

۹ مارچ ۷۸ء

برادرم

محبت اور محبت ..... ۴ یا ۵ مارچ کو اسی مضمون کا خط تمہیں

لکھ چکا ہوں جو مل چکا ہوگا لکھا تھا کہ کوشش کرو کہ بنگال اردو اکاڈمی کا سکریٹری تم کو بنایا جائے۔ اس سے پہلے سالک لکھنوی اور احمد سعید ملیح آبادی کو لکھ چکا تھا کہ کوشش کریں کہ تم کو سکریٹری بنایا جائے .....

میری یہ خواہش محض مروت یا شفقت کی وجہ سے نہیں بلکہ ایمانداری سے سمجھتا ہوں کہ تم سے بہتر کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے۔ کلکتے کے اردو حلقے کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں رکھتا ہے اور کلکتہ ہی کیا ہر جگہ کا یہی حال ہے۔ میں کسی ایسے آدمی کو اردو اکاڈمی کے لئے مفید نہیں سمجھتا جس کی دوسری دلچسپی بھی ہوں۔ خاص کر سیاسی یا تجارتی مقاصد میں یہ ضرور رکھنا — بنگالی کے اعلا ادب کا اردو میں ترجمہ اور اشاعت، اور اردو کے اعلا ادب کا بنگالی میں ترجمہ — ادیبوں کو ایوارڈ۔ غریب ادیبوں کو امداد کتابوں کی اشاعت کے لئے امداد۔ لائبریریوں کی امداد۔ اردو کی اچھی کتابوں پر انعام۔ اچھے ترجموں پر انعام — بہار کی اکاڈمی میں سرکاری افسروں کی بھرمار ہے۔ ایسا نہ کرنا۔ یہاں تو گورنر صدر، وزیر تعلیم نائب صدر اول، نائب وزیر نائب صدر دوم، ایجوکیشن کمشنر، فائنس کمشنر اور ڈائرکٹر ایجوکیشن یہ بہت زیادہ ہے ..... لیکن اسے سرکاری ادارہ نہ بننے دو، بہار اشرف کی طرح۔ بلکہ بہار کی طرح خود مختار ادارہ بناؤ۔ یو پی اکاڈمی کا بھی دستور العمل منگالو۔ وہاں تماشہ یہ ہے کہ مجلس عام کی صدر بیگم حبیب اللہ ہیں اور مجلس عاملہ کی صدر پنڈت آنند نرائن ملا ہیں۔ یہ بھی نہ ہونے دینا۔ مجلس عام کم سے کم ۴۵ چالیس ممبروں کی ہو اور مجلس عاملہ پندرہ کی اور مجلس عام اور مجلس عاملہ کی رکنیت کے لئے کوئی خاص شرط نہ ہو، جیسے بہار اردو اکاڈمی میں ہے مثلاً یہ ہر ہر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر بحیثیت عہدہ ممبر ہوں گے۔ ہرگز نہ لانا، ورنہ بے حد غلط لوگوں سے ملاقات ہوا کرے گی۔ رکنیت کی شرط صرف اردو کی علمی، ادبی خدمات ہوں اور کچھ نہیں ..... یہ طے ہے کہ میں آئندہ Term میں (سکریٹری بہار اکاڈمی) نہیں رہوں گا۔ میں تو اب بھی سکریٹری بننا نہیں چاہ رہا تھا۔ زبردستی بنا دیا گیا اور بحالی کے بعد صحت کی بنا پر استعفا دینا چاہ رہا تھا تو چیف منسٹر نے خود سے ایک اسسٹنٹ سکریٹری کا Sanction

بگاڑ دیا ...... تمہارا طالب

سہیل عظیم آبادی

(۱۴)

پٹنہ

۱۴ مارچ ۱۹۷۲ء (خط کا ایک حصہ)

اگر تم اپنے اصولوں میں ایک بات رکھوا لو کہ اکادمی کا کوئی ممبر انعام یا امداد کا مستحق نہیں ہوگا۔ صرف وہ کام کرے گا اور اس کے لئے رقم لے سکے گا جو مجلس عاملہ اس سے کرنے کے لئے کہے۔ تو بہت اچھا ہے۔ ورنہ سارے لوگ تم کو نوچ کر کھا جائیں گے اور ایسی بے شرمی کا مظاہرہ کریں گے کہ تم کو شرم آئے گی۔ کمزوری کے باوجود کل مجھے اچھی خاصی لڑائی کرنی پڑی۔ دو تین ممبر تلے ہوئے تھے۔ میرے منہ سے ایک بہودہ جملہ نکل رہا تھا۔ بھیک کیوں نہیں مانگنے جا کر — اگر گورنر صدارت نہ کر رہے ہوتے تو میں یہ جملہ ضرور کہہ دیتا۔

(۱۵)

پٹنہ

[illegible] مارچ [illegible] برادرم محبت

کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوں۔ بے ساختہ تم یاد آگئے۔ جی چاہ گیا تم سے باتیں کروں۔ سردست صرف دو گھنٹے دفتر میں رہتا ہوں۔ اور واپس آکر کھانا کھانے کے بعد سو رہتا ہوں۔ کل آندھرا پردیش اردو اکاڈمی کے سکریٹری شری بھارت چند کھنہ کا کئی صفحات کا خط آیا ہے۔ ان سے میری ملاقات اس وقت کی ہے جب ہم دونوں جوان تھے۔ بھارت چند کھنہ حیدرآباد میں تعلق دار یعنی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے بعد میں I.A.S بھی ہوگئے۔ میں ان سے 1943 میں حیدرآباد میں ملا تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق بیماری سے صحت یاب ہونے کے بعد تبدیلِ آب و ہوا کے لئے وہاں گئے تھے اور مجھے وہاں طلب فرمایا تھا۔ ان دنوں میرے ایک عزیز وہاں معتمد سکریٹری تھے اور میں وہاں ایک ماہ رہ گیا تھا۔ وہ اس زمانے میں رسالوں میں لکھا کرتے تھے۔

آندھرا پردیش اکاڈمی کو اس سال حکومت نے ساڑھے آٹھ لاکھ

[illegible] ۔ بہار کو حکومت کم سے کم تین لاکھ ضرور دے گی۔ جہاں اتنظر کو ایک لاکھ ملتے تھے آندھرا پردیش کو ڈیڑھ لاکھ اب دیکھنا یہ ہے کہ بنگال کو کتنی رقم ملتی ہے۔ (۔۔۔) ۔ اور [illegible] کا کیا حال ہے۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ ایک ماہ کے بعد مرحلہ بازی شروع ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ بنگال اکادمی کے لائف ممبر بھی ہوں گے۔ ان میں ل۔ احمد صاحب اور جمیل مظہری تھا۔ کو ضرور آنا چاہئے ۔۔۔ اور یاں لکھنؤ سے واپسی پر تمہیں پٹنہ آنا ہے۔ یہاں کی بنگال اسوسی ایشن کو تم سے ملنے کی بڑی تمنا ہے۔ لکھنؤ جانے سے پہلے مجھے لکھ دینا کہ کس دن واپس آؤ گے تاکہ بنگالی اسوسی ایشن والے تمہیں بلالیں۔

خیر اندیش

سہیل عظیم آبادی

—— (۱۶) ——

بہار اردو اکاڈمی پٹنہ

۳ جون ۸۰ء (خط کا ایک حصہ)

۔۔۔ آج کل ہر روز میرے خلاف کسی نہ کسی اخبار میں کسی نہ کسی بہانے سے ضرور کچھ چھپتا ہے۔ لیکن اب اتنا عادی ہو چکا ہوں کہ کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لطف لیتا ہوں۔ بقول غالب ؎ گالیاں کھا کے بھی بے مزا نہ ہوا۔ ۔۔۔ میں ۷۵ سال کا ہو گیا۔ جوانی گاندھی جی کے اثر سے سوکھی ندی کی طرح گزر گئی۔ گالیاں سننے کا کوئی کام نہیں کیا۔ اب۔ یہ بھی سہی۔ محروم تو نہیں رہا۔ اس نعمت سے [illegible]

—— (۱۷) ——

پٹنہ

۱۳ مئی ۸۰ء (خط کا کچھ حصہ)

۔۔۔ اللہ پاک کا کرم ہے۔ طبیعت اچھی ہے البتہ زکام کا اثر کچھ باقی ہے اور کوئی خاص بات نہیں ۔۔۔ میری باتیں صباح الدین عمر سے ہوئی تھیں۔ انھوں نے اب یہ جلسہ جولائی میں جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ انشاء اللہ ضرور جاؤں گا۔ ویسے تم سے کہہ رہا ہوں۔

[illegible] سکریٹری اتر پردیش اردو اکاڈمی۔

میری طبیعت میں اتنا چڑچڑا پن پیدا ہوتی جا رہی ہے اور اس بڑی شدت کے ساتھ سوچ رہا ہوں کہ استعفا دیکر اکادمی سے الگ ہو جاؤں جیسا کہ بعد سے چڑچڑاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ کام کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن اب باتیں برداشت نہیں ہوتیں اور سازشوں کے علاوہ کام کم ہوتا ہے ۔۔۔

—— (۱۸) ——

بہار اردو اکاڈمی۔ پٹنہ ۴

[illegible] جولائی ۸۰ء (خط کا کچھ حصہ)

۔۔۔ تمہارے یہاں اکاڈمی کس منزل میں ہے ۔۔۔؟ مجھے تو ایسے تجربے ہو رہے ہیں کہ مت پوچھو۔ اب تو ایک لمحہ بھی رہنے کو جی نہیں چاہتا بلکہ ایک میٹنگ میں میں نے کہہ بھی دیا تھا کہ میں استعفا دینا چاہتا ہوں لیکن سارے لوگوں نے مخالفت کر دی۔ لیکن میں ایمانداری کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ اب زیادہ دنوں تک تعلقات باقی نہیں رکھ سکوں گا۔ جس کو کوئی فائدہ پہنچ گیا وہ ۔۔۔ تعریف کرے گا اور جس کو فائدہ نہیں پہنچا تو پھر ہر طرح گالیاں دے گا۔ یعنی دونوں حالتوں میں چین نہیں۔ میں تو اسی نتیجے پر پہنچتا جا رہا ہوں کہ اردو سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ ہر ایک کو اپنی ذات سے ہے۔ مجھے اپنے اوپر بھی شک ہوتا ہے۔ شاید اردو سے اس لئے دلچسپی ہے کہ اسی کی وجہ سے مجھے تھوڑی بہت شہرت ملی۔ اسی کی وجہ سے عزت ملی۔ [illegible] (اور اخبار نویس کہلایا) پیسے کمائے اور اب بھی کما رہا ہوں۔ اب تو مجھے مایوسی ہوتی جا رہی ہے۔ اگر تم کو کسی دن خبر ملے کہ میں نے استعفا دے دیا ہے تو تعجب نہ کرنا۔ حالانکہ اب بھی چاہتا ہوں کہ اکادمی کو ایک شکل دے دوں۔ ابھی ایک تہائی شکل دے سکا ہوں۔ لیکن جو حالات ہیں وہ بے حد مایوس کن ہیں اور زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا بھی کچھ ایسا ہی حال ہوگا۔ بہتوں کو تو یہ غم کھائے جا رہا ہوگا کہ یہ کم بخت بنگال اردو اکادمی کا سکریٹری کیسے اور کیوں بن گیا

(حاشیہ صفحہ پر)

ہے تو اس کے نقاصیں کی مادری زبان اردو ہے۔ خواہ اسے ایک خط لکھنا نہ آتا ہو۔ کیوں ہے نا عجیب بات ؟ اور سوچئے الزامات — میرا خیال ہے کہ اردو کو خود اردو بولنے والے مار ڈالیں گے —

——— (۱۹) ———

پٹنہ ۴

۳۰ر اگست ۷۶ء (خط کا کچھ حصہ)

• بہار اردو اکادمی کا آئین اتنا برا بنا ہے کہ اس کے سدھار کی کوئی امید نہیں۔ یہ مدت ختم ہوا دریں بھاگوں۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ زبان ممبروں کا ذہن روپے گننے تک محدود ہے اور اس سے مجھے شرم آتی ہے . . . کل اتر پردیش اردو اکادمی سے خط آیا ہے۔ وہ جلسہ • اکتوبر میں کر رہے ہیں۔ تمہیں بھی دعوت نامہ ضرور جائے گا۔ ایک مہینے کے اندر بنگال اکادمی کا اعلان ہو جائے تو اچھا ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ نے بھی اردو اکادمی کے قیام کا اعلان کر دیا ہے اور راجستھان کے وزیر اعلیٰ نے بھی اور کرناٹک کا اعلان پہلے ہی ہو چکا ہے یعنی اب۔ اتر پردیش، بہار، مہاراشٹر، آندھرا پردیش، کرناٹک، بنگال، مدھیہ پردیش اور راجستھان — اور دیکھا دیکھی شاید گجرات اور پنجاب بھی بن جائے۔ کشمیر میں کلچرل اکادمی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کام کیا ہوتا ہے۔ ریاستی حکومتوں نے اکادمیاں قائم کر کے اردو والوں کو امتحان میں ڈال دیا ہے۔ معاف کرنا۔ زیادہ لوگوں کا ذہن کھاؤ کماؤ سے آگے نہیں بڑھتا — میری دلی خواہش ہے کہ جمیل مظہری صاحب کو بنگال اکادمی کا نائب صدر بنایا جائے۔ ان کی ساری زندگی کلکتہ میں گذری ہے اور کلکتہ کی اردو فضا پر ان کا گہرا اثر ہے بلکہ بہت زیادہ لوگ متاثر ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ کچھ لوگ ان کے خلاف بھی ہیں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے صدر تو سونیتی بابو ہیں — اس وقت کلکتے میں جمیل صاحب کے علم کا کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے جو اکادمی کی رہنمائی کر سکے۔ ل۔ احمد صاحب بہت ضعیف ہو چکے ہیں اور کلکتہ کے ادبی ماحول پر ان کا اتنا اثر نہیں پڑا جتنا جمیل صاحب کا بہرحال میں مشورہ دے سکتا ہوں اختیار تو ہے نہیں — حد مگر ہے تم اچھے ہو —

خیر اندیش

سہیل عظیم آبادی

——— (۲۰) ———

پٹنہ

۲ر ستمبر ۷۶ء (خط کا ایک حصہ)

• یہ اطلاع تو ملی تھی کہ آپ لوگوں نے آئین مرتب کر کے حکومت کے حوالے کر دیا ہے۔ اب وہ اس پر غور کرے گی۔ یہ کام ہو جائے تو بنگال کے اندر جو اردو کا بہت سا سرمایہ چھپا ہوا ہے وہ نکل آئے۔ اردو زبان و ادب کی ترقی میں کلکتہ، مرشد آباد، ڈھاکہ اور مٹیا برج کا نام بھلایا نہیں جا سکتا۔ فورٹ ولیم کالج میں اردو نثر کو ترقی دینے کے سلسلے میں جو کام ہوا، اگرچہ اس کا مقصد سیاسی تھا لیکن اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کیسی مصیبت ہے کہ فورٹ ولیم کالج پر کوئی ایسی کتاب نہیں، جس کو پڑھنے کے بعد کوئی جان سکے کہ کیا کیا کام وہاں انجام پایا ہے۔

——— (۲۱) ———

نور منزل۔ پٹنہ ۶

۱۳ر فروری ۷۷ء (خط کا کچھ حصہ)

• بنگال اردو اکادمی کا کیا ہوا۔ اب تک سرکاری طور پر کوئی

(حاشیہ صفحہ ۲) ۲ ان دنوں مغربی بنگال اردو اکادمی قائم نہیں ہوئی تھی۔ صرف حکومت نے ایک تیاری کمیٹی بنائی تھی جس کا میں ممبر سکریٹری تھا اور طے تھا چونکہ ممبر سکریٹری بعد میں سکریٹری ہوتے ہیں اس لئے سہیل صاحب نے اپنے طور پر فیصلہ کر دیا تھا کہ میں ہی سکریٹری ہو گیا ہوں یا ہو جاؤں گا۔ لیکن موجودہ حکومت مغربی بنگال نے ایسا نہیں کیا ہے۔

۱ سونیتی کمار چٹرجی مرحوم مغربی بنگال اردو اکادمی کے تیاری کمیٹی کے چیئرمین تھے۔

اعلان ہو چکا ہے۔ " ہماری زبان" میں ایک خبر شائع ہوئی تھی کہ فلیق انجم (ڈی) اعلیٰ سکتال سے ملے تھے اور انھوں نے بتایا تھا کہ اکادمی کو چھ لاکھ روپے ملے ہیں۔ لیکن اب تک اکادمی کی تشکیل نہیں ہوئی۔ تجربوں نے یہ بتایا ہے کہ ... اردو زبان یا اس کے ادب کی ترقی سے واقعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بس ہنگامہ کرنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ ہنگامہ بھی بے مقصد۔ میں تو بہت مایوس ہو گیا ہوں۔ جب حالات اتنے خراب ہیں تو بھی ہنگامہ کرنے سے باز نہیں آتے۔ اگر موقع ہو تو لکھو کیا ہو رہا ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ استعفیٰ منظور نہیں ہوتا ہے۔ ایک غلطی ہو گئی۔ دوبارہ نہیں۔ یہ مدت ختم ہو تو ادھر میں الگ ہو جاؤں۔ کچھ لکھوں پڑھوں تو۔"

—— (۲۲) ——

پٹنہ ۶

۲۸ جولائی ۱۹۸۲ء (خط کا کچھ حصہ)

"میرا استعفیٰ تو منظور نہیں ہوا لیکن ۱۰ ستمبر کو تین سال کی مدت پوری ہو جاتی ہے۔ مجھ سے کہا گیا کہ استعفیٰ واپس لے لوں۔ مگر اب سکریٹری رہنا نہیں چاہتا۔ تین سال سکریٹری رہنے کا اثر میرے ذہن پر بہت برا ہوا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ شرم معلوم ہوتی ہے۔ اور حالات اچھے ہیں۔ پلان بنا رہا ہوں کہ ۱۰ ستمبر کے بعد کیا کروں گا۔ جب ادب کا رسیا بیٹھنے کا عادی نہیں رہا ہوں۔ خدا کرے تم اچھے ہو۔"

—— (۲۳) ——

نور منزل، سلطان گنج پٹنہ ۶

۲۵ اگست ۱۹۸۲ء (خط کا کچھ حصہ)

"اور کیا حالات ہیں۔ میں انشاء اللہ آئندہ مہینے ۱۰ ستمبر کو اکادمی کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔ میرے استعفیٰ کو مئی میں ہی دے دیا تھا لیکن منظور نہیں ہوا۔ مگر ۱۰ ستمبر کو تین سال کی میعاد پوری ہو جاتی ہے۔ کلکتہ پہنچوں گا۔"

(۲۴) رانچی

۱۵ فروری ۱۹۸۳ء (خط کا کچھ حصہ)

"کل بازار گیا تھا تو "اردو بلٹز" کا تازہ شمارہ خرید لایا۔ بنگال اردو اکادمی کے سلسلے میں لمبا چوڑا مضمون تھا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ خدا کرے اکادمی جلد سے جلد کام کرنے لگے۔ لیکن اب تو اس نام سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ تین برسوں کے تجربے اتنے برے ہیں کہ مت پوچھو۔ خدا کرے بنگال اردو اکادمی میں کام کرنے والوں کو وہ دن دیکھنا نہ پڑے۔ ایسے لوگ اکٹھا ہو جاتے ہیں جو کام نہیں کرنے دیتے اور ہر موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے اللہ بچائے۔ تم کو شاید لکھ چکا ہوں۔ ۳ مئی کو میں نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ وہ تو منظور نہیں ہوا لیکن ۱۰ ستمبر کو میرا Term ختم ہو گیا اور میں الگ ہو گیا ...... بنگال اردو اکادمی کی تشکیل ہو گئی۔ اب کون کون لوگ آئے۔ ۔"

—— (۲۵) ——

نور منزل - پٹنہ

۱۶ اپریل ۱۹۸۳ء (خط کا کچھ حصہ)

"بنگال اردو اکادمی کا سکریٹری تم کو ہونا چاہئے۔ تم سے زیادہ کون اہل ہے۔ اور اس کے لئے کوشش کرنا بری بات نہیں۔ اس لئے بھی کہ تم سے زیادہ کوئی بہتر آدمی نظر نہیں آتا۔ میں تمہاری کام والے کے ساتھ نہیں ہوں کہ کوشش نہ کرو۔ اگر کوئی سیاسی آدمی آ گیا تو پھر اکیڈمی اکھاڑا بن جائے گی۔ میری بات مان لو اور کوشش ضرور کرو۔ اپنے لئے نہیں اکادمی کی بہتری کے لئے۔"

۲۱ مئی ۱۹۸۳ء (خط کا کچھ حصہ)

"بنگال میں اردو اکادمی اب تک نہیں بنی اس کا افسوس ہے۔ اسے بننا چاہئے ۔۔۔ اور حالات اچھے ہیں۔ خدا کرے تم اچھے ہو۔"

—— (۲۷) ——

نور منزل پٹنہ ۶

۳۰ مئی ۱۹۸۳ء (خط کا کچھ حصہ)

"بنگال اردو اکادمی کا کیا ہوا۔ جیسے بھی ہو اس کا سکریٹری

تمہیں بننا ہے۔ تم سے زیادہ مستحق کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے۔ کوشش کرو۔ میں اس کا قائل نہیں کہ تم کوشش نہ کرو۔ کوئی غلط آدمی آجائے گا تو مقصد ہی فوت ہو جائے گا ــــ"

——— (۲۸) ———

نور منزل۔ پٹنہ ۶

۱۱ جون ۵۹ء (خط کا کچھ حصہ)

• بنگال اردو اکادمی کا کیا ہوا۔ کلکتہ کے حالات اخبارات سے اچھے نظر نہیں آتے۔ ایسی حالت میں اکاڈمی کا کیا ہوگا۔ میں نے ابراہیم ہوشؔ اور سالکؔ کو لکھا تھا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ عجیب حال ہے مجھے تو کبھی کبھی بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ اقبال اور ٹیگور کا کلام بنگالی اور اردو میں ترجمہ ہو اور بڑے لکھنے والوں کا بھی۔ یہ بڑا کام ہے۔ تیسرے درجے کی کتابیں چھاپنے سے بہتر [illegible] جانتا ہوں کہ لوگ اپنی اپنی کتابیں چھاپنا چاہیں گے اور مخالفت کریں گے لیکن یہ کام ہونا ہی چاہئے ــــ"

——— (۲۹) ———

نور منزل۔ پٹنہ ۶

۳۰ جون ۵۹ء (خط کا کچھ حصہ)

• یہ جان کر دکھ ہوا کہ بنگال اردو اکادمی کا معاملہ پڑا ہوا ہے تو اب تک قائم ہو جانا چاہئے تھا۔ شاید کسی نے پھر دلچسپی کا [illegible] اور لوگوں سے مل کر یاد دلائی ہی نہیں۔ ورنہ یہ کام اب تک ضرور ہو جاتا۔ بھئی تم تو بہت کام کرتے ہو۔ تم پر رشک آتا ہے۔ مجھ سے تو اب کوئی کام جیسے ہوتا ہی نہیں۔ سوچتا رہتا ہوں۔ تین دن سے ایک مضمون لکھنے کی تیاری کر رہا ہوں۔ اب تک تو کچھ نہیں لکھ سکا۔ بہار اردو اکادمی سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ بس جلسوں میں شرکت کی دعوت آجاتی ہے اور میں چلا جاتا ہوں۔ میری رائے ہے کہ بنگال کی اکادمی کے سلسلے میں کوشش کرو۔ اگر قائم ہو جائے تو بہت سے کام ہو سکتے ہیں۔ سالکؔ اس کام میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں ــــ"

——— (۳۰) ———

نور منزل۔ پٹنہ ۶

۸ راگست ۵۹ء (خط کا کچھ حصہ)

• کلکتہ تو بالکل بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اب تو کلکتہ کے لوگ خطوں کے جواب بھی نہیں دیتے۔ ایسا لگتا ہے کہ اب وہاں کے لوگوں کو روپے کمانے کے علاوہ کسی چیز سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کس کس کا نام لوں۔ لوگوں کو خطوط لکھے کسی نے جواب نہیں دیا ..... بنگال اردو اکادمی کا کیا ہوا۔؟ کیا ساری باتیں فائل ہی میں ہیں۔؟ یا امید ہے۔ بس سرکار کو بھی تو دو دن ہو گئے۔ میں تو مایوس ہوتا جا رہا ہوں ــــ"

——— (۳۱) ———

نور منزل۔ پٹنہ ۶

۱۸ ستمبر ۵۹ء (خط کا کچھ حصہ)

• زبان و ادب والا مضمون پسند آیا تھا۔ میں لکھ چکا ہوں۔ اردو والوں کا حال ناگفتہ بہ ہے۔ بہار کی اکاڈمی نے ایک [illegible] بلایا تھا۔ احمد سعید ملیح آبادی اور علقمہ شبلی آنے والے تھے لیکن نہیں آئے۔ شاید تقریب ملتوی کر دی گئی جس میں وہ لوگ آنے والے [illegible]

نور منزل۔ پٹنہ ۶

۲۸ ستمبر ۵۹ء (خط کا کچھ حصہ)

[illegible] اردو اکادمی کا کیا ہوا۔ شاید اب تک کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ سننے میں آیا تھا کہ احمد سعید ملیح آبادی اور شبلی اکیڈمی کی طرف سے یہاں آنے والے تھے۔ پھر پروگرام ملتوی ہو گیا۔ شاید بہار اردو اکادمی نے ساری اکیڈمیوں کو دعوت دی تھی۔ جنوری میں کٹک جانے کا ارادہ ہے۔ ان شاء اللہ یکم یا ۲ جنوری کو کلکتہ پہنچوں گا۔ لیکن کلکتہ میں ٹھہروں گا۔ کٹک سے واپسی پر اور دو دن وہاں ٹھہروں گا ــــ"

ظہیر غنی امروہوی

سہیل عظیم آبادی کے چند خطوط

بلاشبہ سہیل عظیم آبادی، نصف صدی تک اردو زبان و ادب اور بالخصوص اردو افسانے کی خدمت کرتے رہے ان کی ادبی حیثیت مسلم ہے اور ان کے ادبی خلوص اور دیانت داری کو ہر ادیب، شاعر اور نقاد تو جانتا ہی ہے اور وہ ادارے بھی، جن سے وہ وابستہ رہے بالخصوص انجمن ترقی اردو (ہند)، بہار اردو اکادمی، اور پٹنہ ریڈیو اسٹیشن کی وہ خاص طور پر۔ لیکن فعال خدمت انجام دیتے رہے۔ اردو افسانے اور اردو زبان سے مرحوم سہیل عظیم آبادی والہانہ انس و شفقت تو رکھتے ہی تھے لیکن وہ اردو کے نو آموز و نو مولود اور نو وارد ادبا و شعرا سے بھی بے پناہ محبت و شفقت روا رکھتے تھے۔ ان کو بھی جان سے زیادہ چاہتے تھے اور انہیں سرگرم عمل رکھنے کے لئے تحریک بھی بخشتے تھے اپنے خلوص اور خطوط کے ذریعہ۔ وہ اردو کے کھرے اور سچے بہی خواہ تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اردو زبان اور ادب کی ترویج و اشاعت نیز ترقی و بقا کے لئے جد و جہد کرتے ہوئے گزاری۔ انھوں نے اردو کی شمع کو نہ صرف بہار و بنگال میں روشن رکھا بلکہ ایسے غیر اردو داں اور غیر مسلم علاقوں کے افراد میں اس زبان سے عملی طور پر محبت دلائی کہ ان کی بدولت بستر کے آدی باسی اردو کے پرستار ہے۔ عیسائی اردو سیکھنے کی جانب مائل ہوئے ان کا یہ کارنامہ اردو زبان کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے، وہ اردو، اردو کا متوار نہیں بولتے تھے وہ اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں تھے وہ اردو کو "حق" ہی بھی نہیں سمجھتے تھے بلکہ عملی طور پر اردو کے لئے صرف کام کرتے تھے شہر شہر، قریہ قریہ خود جاکر اردو کی ترویج و اشاعت نہایت لگن اور خلوص سے انجام دیتے تھے!

سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری کی عمر چالیس پچاس برس سے بھی زیادہ عرصے پر محیط ہے، انھوں نے پریم چند کی روایات کو آگے بڑھایا اور صحت مند ادب تخلیق کیا۔ یوں تو ان کے متعدد افسانوی مجموعے اور کتابیں ہیں جو انھیں زندہ جاوید رکھیں گی لیکن ان کا ایک اچھوتے موضوع پر ناول "بے جڑ کے پودے" اردو ناول نگاری کے باب میں ایک اہم اضافہ کہلائے جانے کا مستحق ہے یہ نہیں جانتا اردو ناقدین نے سہیل عظیم آبادی کے فن اور شخصیت اور ادبی کارناموں اور افسانہ نگاری نیز ان کی فنی نگارشات اور خدمات کو اپنی تحریروں میں کوئی درجہ دیا ہے یا نہیں ــــ؟ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اب جبکہ وہ ہمارے درمیان نہیں رہے ان کا اردو جاننے والے قدر کریں اور ان کی فنی نگارشات، ادبی خدمات، شخصیت اور اردو زبان کے لئے ان کی انتھک جد و جہد کا خلوص دل سے اعتراف کیا جائے اور ان گوشوں کو کھنگالا جائے جو عام اردو جاننے والے یا نو آموز افسانہ نگاروں کی نگاہوں سے اوجھل رہے ہیں۔ ان پر تحقیقی کام کا سنجیدگی سے آغاز کیا جانا چاہئے اور ان کے فن اور شخصیت پر محققانہ روشنی

ڈالی جانی چاہیے تاکہ اس ضمن میں جو افراد بھی آگے بڑھیں ان کو ان کے فن اور شخصیت پر اس طرح کرنے میں آسانیاں فراہم ہوں اور وہ ایک فقید المثال، عظیم المرتبت ادیب اور اردو زبان کے سچے فدائی کی بے لوث خدمات، حیات اور ادبی کارناموں کو یکجا کرکے ان کو وہ مرتبہ دلا سکیں، جس کے وہ مستحق تھے اور جو ان کو زندگی میں ملنا چاہیے تھا کیونکہ یہی ان کا اور ہم سبھی کا بیش قیمت سرمایہ ہے جس کی حفاظت کرنا ہر اردو داں کا فرض ہونا چاہیے ــــ!

سہیل عظیم آبادی سے میرا تعلق سترہ، اٹھارہ برس پرانا تھا مجھے یاد نہیں کہ میں نے ان کو پہلا خط کب اور کیوں اور کیسے، کن حالات میں لکھا تھا، لیکن اس سارے عرصے میں، میں نے انھیں جب جب خط لکھا انھوں نے نہ صرف جواب دیا بلکہ میری حوصلہ افزائی اور رہنمائی بھی موصوف دمعنو فرماتے رہے، وہ شفقت و خلوص کا بحر بیکراں تھے۔ ان کے خطوط ان کے خلوص کا سرچشمہ ہیں!

ان کے تیس (۳۰) خطوط میرے پاس ان کی ادبی امانت ہیں جن کو میں اس یقین کے ساتھ پیش کر رہا ہوں تاکہ ان کے ذہن، مزاج، فطرت اور فن کو سمجھنے میں عام اردو داں کو آسانی ہو، اور ان کی فکر، سچائی، فنی بصیرت و آگہی، نظر و شعور کو ایک عام قاری بھی سمجھ سکے، بلاشبہ اردو زبان و ادب ایک عظیم القدر ادیب ایک بلند مرتبت انسان سے محروم ہوگیا، خود میں بھی ایک شفیق و خلیق بزرگ کے خلوص اور یگانگت و قربت سے ہی محروم نہیں ہوا ہوں بلکہ اردو زبان و ادب اور بالخصوص اردو افسانے کے ایک گرانقدر اور نایاب ورثے سے محروم ہوگیا ہوں

(پہلا خط)

"راوی" افسانوی ادب کا واحد اردو ماہنامہ

پٹنہ ۴۔ ٹیلی فون دفتر ۳۰۲۵

۲۴ دسمبر ۱۹۶۲ء رہائش ۳۰۹۹/۵۸۵۷

برادرم!

آپ کا افسانہ پڑھا۔ راوی کے ایڈیٹر انیس جاجنری میرے بھانجے ہیں اور لطیف جاوید میرا بڑا لڑکا ہے اور یہ دونوں سارے افسانے اور مضامین اشاعت سے پہلے مجھے دکھا لیتے ہیں، پڑھنے کے بعد اپنی رائے دے دیتا ہوں۔ آپ کا افسانہ پڑھنے کے بعد مجھے خیال ہوا کہ خود ہی آپ کو خط لکھوں اور اس لئے کہ آپ میں اچھا افسانہ نگار کی صلاحیت نظر آتی ہے اور آپ ذرا توجہ دیں تو اچھے افسانے لکھ سکتے ہیں اور میری دعا بھی یہی ہے۔ راوی کا بنیادی مقصد بھی نئے افسانہ نگاروں کو آگے بڑھنے میں مدد دینا ہے اور اسی لئے یہ خط خود لکھ رہا ہوں۔ سب سے پہلے افسانے کا عنوان "بدلہ" غور طلب ہے اس پر نظر پڑتے ہی افسانے کا انجام ذہن پر چھا جاتا ہے اور یہ اچھی بات نہیں اس لئے کہ تجسس مٹ جاتا ہے اور افسانے کی دلچسپی مٹ جاتی ہے۔

افسانے میں جو واقعات آتے ہیں اب وہ عام ہیں۔ اس قسم کا کوئی واقعہ اس زمانے میں "عیاشی" کہی جا سکتی تھی جب کوئی عجیب بات سمجھی جاتی تھی اب تو کوئی خاص بات نہیں ہے، معمولی ہے۔ افسانہ بے حد جذباتی انداز میں لکھا گیا ہے اور کہیں کہیں لکھنے کا بیان ردعمل تقریر کے انداز میں سامنے آتا ہے آپ نے کہیں تقریر تو نہیں لکھی ہے لیکن گوپال کو بار بار اپنے گاؤں کی شرمیلی لڑکیاں یاد آتی رہی ہیں، اس سے تقریر کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے افسانہ نگار کا کام اپنے قلم سے کچھ کہنا نہیں ہے بلکہ واقعات کو اس طرح ترتیب دینا کہ ردعمل اپنی خواہش کے مطابق ہو، ظاہر ہے افسانہ نگار کہنا تو چاہتا ہے لیکن اثرات پیدا کرکے۔

آپ نے اشوک ہوٹل، جن پتھ، جیم خانہ کلب وغیرہ کے نام دئے ہیں ایسے افسانوں میں اصلی نام دینا مناسب نہیں اس پر اعتراض ہو سکتا ہے اور افسانہ نگار کو کسی بھی اختلاف مول لینا نہیں ہے۔

افسانہ جذبات کی رو میں اور جلد بازی میں لکھا گیا ہے اور کہیں بھی ٹھہراؤ نہیں ملتا، بلکہ بہاؤ ہی بہاؤ ہے اور اس سے افسانے کا اثر کم ہو گیا ہے۔ مرد تی نے آخر میں گوپال سے گھر خبر بھجوائی ہے کہ وہ رات کو دیر سے آئے گا یقین ہے کہ پھر اس کا کوئی پروگرام ہے کسی دوسری لڑکی کے ساتھ! کیوں نہیں دتی کو کسی دوسرے شخص کے ساتھ کسی پروگرام میں شریک دکھایا جائے آج کے "مہذب" لوگوں کی زندگی بڑی حد تک یہی ہے۔

بیان کو خواہ مخواہ تشبیہوں، استعاروں اور رنگین طرز نگارش سے بوجھل نہ بنائیے، الفاظ کی زیادتی بھی، فسانے کی جان نکال دیتی ہے۔ پڑھنے والا لفظوں کی بھول بھلیوں میں پھنس کر رہ جاتا ہے اس سے بچئے!

عنوان، مہذب لوگ۔ ایک شام۔ دو ڈ۔ یا اور کچھ۔ میرا خیال ہے کہ افسانے پر نظر ثانی کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ مشورے مخلصانہ ہیں لیکن آپ کو پسند نہ آئے تو اسے رد کر دیں آپ کہیں تو میں خود کہیں کہیں قلم لگا دوں یا پھر افسانہ آپ کو بھیجوا دوں آپ خود نظر ثانی کر لیں۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں ——— والسلام ——— خیر اندیش

سہیل عظیم آبادی

داستان پبلشرز پٹنہ ۴

(نوٹ) مذکورہ افسانہ "عیاشی" کے عنوان سے "راوی" کے لئے بھیجا تھا لیکن "راوی" میں "روشن راتیں، تاریک لمحے" کے نام سے مارچ اپریل ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا تھا، ازاں بعد ماہنامہ "شبستان" (لاہور) میں "زلف زلف اندھیرا" کے عنوان سے پہلے نمبر پر شائع ہو کر بے حد مقبول ہوا۔ پاک و ہند کے کئی معیاری جرائد میں متعدد بار مختلف عنوانات سے چھپا اور منتخب بھی کیا گیا۔ (ظ۔ک۔ا)

دوسرا خط ——— (پوسٹ کارڈ پر)

RAVI MONTHLY URDU MAGAZINE

DEVOTED TO FICTION

REF——— PATNA-4 (INDIA)

PHONE 3025

Date, 2-4-1963

برادرم ——— دعائیں!

آپ کا خط مورخہ ۲۶ جنوری مل گیا، شکریہ، میں نے آپ کو خط بے حد خلوص کے ساتھ لکھا ہے اور آپ کو قطعی کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے، میری تمنا تو صرف یہ ہے کہ ہمارے نوجوان

آگے بڑھیں، اور یہ کہنا شاید غلط نہیں ہوگا کہ تیس سال کی ادبی زندگی سے میں نے ضرور کچھ سیکھا ہے اپنے جذبات تو بہرحال ہر لکھنے والے کے ہوتے ہی ہیں۔ لیکن ان کو خوبصورتی کے ساتھ بھی سمویا جا رہا ہے اور اس میں زیادہ حسن پیدا کیا جا سکتا ہے اور اگر حسن پیدا کیا جا سکتا ہو تو پھر پیدا کرنا چاہیئے آرٹ کا مفہوم تخلیق حسن ہی تو ہے بلکہ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

حقیقت بیانی بری بات نہیں، لیکن آپ خاص ناموں کو استعمال نہیں کر سکتے، واقعات چاہے کچھ ہوں، میں دلی میں پانچ سال تو مستقل طور پر رہا ہوں اور وہاں بیس سال سے آنا جانا ہے بہت کچھ دیکھا ہے اور اچھی طرح واقف ہوں، لیکن قانوناً کسی ہوٹل اور کسی ریستوران کے نام سے آپ کسی واقعہ کو منسوب نہیں کر سکتے۔ تاوقتیکہ وہ واقعہ پولس میں نہ آ چکا ہو اور بہت مشہور نہ ہو چکا ہو، ممکن ہے کہ ہوٹل یا ریستوران کا مالک برا مانے اور قانونی چارہ جوئی ہی کر بیٹھے پھر یہ کہ اس سے کوئی خاص فائدہ بھی نہیں ہوتا۔

مجھے بیحد خوشی ہوگی اگر آپ بہتر سے بہتر اور بڑی بے باکی کے ساتھ لکھیں، عریانی اور پردہ داری کا میں خود بھی بہت زیادہ قائل نہیں ہوں لیکن حسن تو ضرور پیدا ہو آپ میرے خط کا کوئی غلط اثر نہ لیں، میرے لئے اس سے زیادہ رنج کی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی، بھلا آپ کو یہ لگا افسانہ تو اپنے مشورے کے ساتھ بھیج دوں گا اور شائع ہونے سے پہلے آپ ضرور مطمئن ہو جا

خدا کرے آپ اچھے ہوں، زیادہ محبت

——— "س" سٹ

(نوٹ) آج سہیل صاحب مرحوم کے اس خط کو نقل کرتے ہوئے خیال ہوا کہ انہوں نے اس خط پر اپنے نام کا مخفف حرف "س" کیوں لکھا تھا نہ جانے میرے خط کا یہ ردعمل تھا۔ یا ایک

کے چھپے ہوئے خط پر ان کا اپنی تحریر کا سبب رہا ہوگا کیونکہ وہ اس کے ایڈیٹر نہیں تھے شاید اصولی طور پر انھوں نے اپنے دستخط نہ کرتے ہوئے صرف "س" لکھا ہو۔ اس طرح ان کی اصول پرستی کا پتہ چلتا ہے اگرچہ بھانجے اور بیٹے "راوی" کے مدیر تھے تاہم انھوں نے ان کے مدیرانہ حقوق اور مرتبہ کو اول، اہم اور ناگزیر سمجھا اس کا احساس اب ہوتا ہے ——— (فاک - ۱ ۲۸ دسمبر ۱۹۶۹ء)

تیسرا خط ——— (نافہ)

SUHAIL AZIMABADI (ذاتی لیٹر پیڈ پر)

PATNA 6

5.3.63 برادرم محبت!

آپ کا افسانہ میں نے دیکھ لیا ہے اور لطیف میاں کے حوالہ کر دیا ہے، اگلے شمارے میں وہ شائع کریں گے۔

ممکن ہے کہ آپ کو مجھ سے کچھ اختلاف ہو لیکن آپ نے اجازت دی تھی اس لئے میں نے کہیں کہیں قلم لگا دیا ہے اور اب عنوان ہو گیا ہے "روشن راتیں، تاریک سائے" آپ کو جو کچھ لکھ سکا ہوں وہ یہ کہ آپ بہت جذباتی آدمی ہیں جذبات کو بیدار ہونے ہی چاہئیں لیکن لکھنے والوں کو جذبات پر قدرت ہونی چاہئے اگر خود ابل پڑے تو پھر فن کا حسن ضائع ہو جاتا ہے خود کرداروں کو بولنے دیجئے اس طرح لکھئے کہ ایک ایک لفظ بول پڑے دوسرے لفظوں میں یہ کہ ایسی تصویر بنائیے کہ خود بول پڑے مصور کچھ نہ کہے۔ آپ اپنی تصویر بھیج دیں۔

کبھی کیا امروہہ میں رسالوں کا کوئی ایجنٹ نہیں ہے باتیں کیجئے اس سے، اگر پڑھنے والوں کا حلقہ ہی نہیں بڑھا تو پھر ہم آپ کس کے لئے لکھیں گے۔ ایک زمانہ تھا کہ امروہہ میں کافی تعداد میں اچھے کاتب ہوا کرتے تھے خدا جانے اب کیا حال ہے کیا اب بھی ہیں اور کیا کوئی پٹنہ آنے پر آمادہ ہو سکتا ہے ——— یہاں کام زیادہ اور کاتب بہت کم ہیں۔ بڑی دقت ہے اور رسالہ دیر سے شائع ہوتا ہے اگر ممکن ہو تو کسی اچھے کاتب کو آمادہ کیجئے، کچھ اور لکھئے ——— خدا کرے آپ مع الخیر ہوں ——— والسلام

خیر اندیش

سہیل عظیم آبادی (دستخط)

چوتھا خط ——— (سادہ ان لینڈ لیٹر)

نور منزل سلطان گنج۔ پٹنہ ۶

۲ راپریل ۱۹۶۳ء، برادرم کیفی صاحب محبت!

آپ کا خط مل گیا تھا لیکن مصروفیتوں کی وجہ سے جواب نہ دے سکا تھا میرے بھتیجے کی شادی تھی اور اس کے بعد بیمار رہا، اب بھی بالکل اچھا نہیں ہوں، زکام رہتا ہے کم بخت اچھا ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔

سب سے زیادہ پریشانی کاتب کی ہے لیکن میرے پاس اتنا کام نہیں ہے کہ خاص طور پر بلاؤں، ایک رسالہ ہے اور اگر کوئی اچھا کاتب آنے پر رضامند ہو تو میں پورا رسالہ لکھنے کو دے سکتا ہوں اس کے ساتھ اور کام دلانے کی بھی کوشش کروں گا۔ پٹنہ میں کتابت کا کام ہے متعدد پریس ہیں اور اچھے کاتب تو بہت ہی کم ہیں ایسی حالت میں کیا کہوں؟ آپ کی کہانی اس ماہ میں شائع ہو گئی ہے دوسری کہانی ابھی دیکھی نہیں ہے ایک دو ماہ بعد شائع ہوگی تو بھی مطمئن رہیں میری دلی تمنا یہ ہے کہ نوجوان ابھریں اور بڑھیں ہم لوگوں کو تو جو کچھ بھی کرنا تھا کر چکے، اب آپ لوگ میدان میں آئیں اور کام کریں۔

امروہہ میں کیا کوئی ایجنٹ نہیں ہے اس سے باتیں کیجئے اور رسالہ منگانے پر آمادہ کیجئے اشاعت بڑھانے میں میری مدد کیجئے اگر یہ رسالہ کامیاب ہو گیا تو یقین ہے کہ نئے لوگوں کو آگے بڑھانے میں کوئی بڑا کام کرے۔ اس وقت ہمارے ملک میں کوئی ایسا رسالہ نہیں رہا ہے جو رسالے ہیں وہ خالصتاً تجارتی اصول پر چل رہے ہیں۔

آپ "راوی" کو اپنا رسالہ سمجھ کر اس کے لئے جو کچھ بھی کر سکتے ہیں ضرور کیجئے میرے لکھنے کا انتظار نہ کیجئے جو کچھ بھی آپ رسالے کے حق میں مفید سمجھیں کرتے جائیں۔ میرے کہنے کا انتظار نہ کریں۔

[illegible] کر دیجئے گا کر لیجئے امروہہ میں بھی، اور اگر مراد آباد جانا ہو تو وہاں بھی۔

خدا کرے آپ اچھے ہوں۔ والسلام

خیر طلب ــــ سہیل عظیم آبادی (دستخط)

(نوٹ) ــ مجھے یاد نہیں کہ میں نے دوسرا افسانہ کون سا بھیجا تھا اور وہ "راوی" میں چھپا تھا یا نہیں، کسی صاحب کی نظر سے گذرا ہو تو مطلع فرما کر متشکر کیجئے گا۔ (ظ۔ک۔ا)

پانچواں خط ــــــ (راوی کے پرنٹیڈ لیٹر پیڈ پر)

RAVI MONTHLY URDU MAGAZINE

DEVOTED TO FICTION, PATNA-4 (INDIA)

REF ___ PHONE 3025

Date - 13-4-63

برادرم ــ سلام و دعا،

رسالہ مل گیا ہوگا۔ آپ کی کہانی شائع ہو گئی ہے معلوم نہیں ترمیم آپ نے پسند کی یا نہیں۔ مخلصانہ مشورہ ہے کہ توازن کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ توازن میں بڑا حسن ہے ایک قصہ سنئے انیشد کی کہانی ہے۔ کہتے ہیں ــ کہ ایک دن گدھے نے گھوڑے کو دیکھا تو اسے اپنے بوجھ پر شرم آئی تو اس نے دعا کی کہ خدا اس کے جسم کے ہر حصے کو گھوڑے سے بڑا بنا دے، چاروں پاؤں بھی، گردن بھی اور پیٹھ بھی تو اس کی شکل کچھ ایسی ہو گئی کہ وہ اونٹ بن گیا اب سوچئے اونٹ اور گھوڑے کا کیا مقابلہ ہے، پریم چند کا یہی کمال ہے ان کا قلم کبھی حد سے تجاوز نہیں کرتا وہ دوسروں کی کڑوی بات کہنے کے بدلے خود ہی زہر پیتے ہیں اور یہی ان کی عظمت ہے انتہا پسندی سے ہنگامہ کھڑا ہو سکتا ہے لیکن حسن پیدا نہیں ہو سکتا اور آرٹ حسن کی تخلیق کا نام ہے ــ!

کاتب کے بارے میں پھر لکھوں گا سر دست یہی کہوں گا کہ اشاعت بڑھانے کی کوشش کیجئے پڑھنے والے نہ ہوں تو پھر لکھنے اور رسالہ شائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ــــ خدا کرے آپ اچھے ہوں ــ والسلام ــ خیر اندیش ــ سہیل عظیم آبادی (دستخط)

چھٹا خط ــ (راوی کے نام سے انگریزی میں چھپا ہوا لیٹر پیڈ)

RAVI MONTHLY URDU MAGAZINE

DEVOTED TO FICTION PATNA-4 (INDIA)

Dated 24-4-1963

برادرم!

رسالہ آپ کو مل چکا ہوگا، ادھر آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ کاتب کے مسئلے پر توجہ دیجئے، سخت پریشانی ہے اگر کوئی کاتب آ جائے، اچھا ضرور ہو تو ایک تو یہ رسالہ دے دوں گا دوسرے [illegible] بھی بہت سا کام ملتا رہے گا۔ اگر محنتی آدمی ہو تو دو ڈھائی سو روپے ماہوار کمانا مشکل کام نہیں ہے لیکن کتابت کا نمونہ پہلے بھجوائیے اور یہ بھی دریافت کر لیجئے کہ اسی سائز کے صفحات کی کتابت کی اجرت وہ کیا لیں گے خواہ شمارہ مقرر کر لیں یا ٹھیکہ پر۔ اگر دو کاتب آ جائیں تو بھی کام نکل سکتا ہے پٹنہ میں چھ لیتھو پریس ہیں۔ تین روزانہ، دو ہفتہ وار، اور چار ماہوار رسالے ہیں اور کاتب خاص کر اچھے کاتب بہت کم ہیں آپ بس خود اس سلسلے میں جلدی کریں، میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔

آپ کا افسانہ تو شائع ہو گیا۔ اس کے بعد آپ نے کوئی خط نہیں [illegible]

[illegible] جواب کا انتظار رہے گا ــــ والسلام ــ خیر طلب ــــ سہیل عظیم آبادی (دستخط)

ساتواں خط ــــ (ڈاک خانے کا پوسٹ کارڈ)

ڈاک خانے کی مہر کی تاریخ 27-8-63

برادرم!

میں ادھر برابر باہر رہا۔ چند دنوں پہلے آیا ہوں، [illegible] سے کام سنبھلتا ہی نہیں، سخت پریشان ہوں، پرچے ہر ماہ کے چھپے، لیکن دفتر کا انتظام بالکل ٹھپ ہے اس کی وجہ سے نقصان جاری ہے کچھ اور سامان کروں گا کوئی سمجھدار آدمی رکھوں گا لیکن اب اسے ختم نہ ہونے دوں گا، میرا لڑکا لطیف بی۔اے فائنل میں ہے اور انگریزی میں آنرز کر رہا ہے اور

تیاری کر رہا ہے۔ اور اگر ادل آئے تو پھر کسی طرح یہ سب چلا جائے اس لئے اس کے پاس وقت نہیں۔ بھانجا انیس اپنی ماں کی علالت کی وجہ سے پریشان رہا۔ بہرحال مشکلات حل ہوں گی۔ اور حالات بہتر ہیں۔ آپ کا افسانہ پڑھ نہیں سکا۔ اب پڑھوں گا اور دیکھوں گا۔

خدا کرے آپ بخیر ہوں — والسلام

خیر اندیش —

سہیل عظیم آبادی (دستخط)

(نوٹ:) مجھے یاد نہیں ۶۵-۱۹۶۷ء میں، میں نے سہیل صاحب کو کوئی خط لکھا یا نہیں ۱۹۶۴ء میں میری شادی ہوئی اور ۱۹۶۵ء میں ہند و پاک جنگ، نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا حالات تھے کہ میرے پاس مرحوم کا کوئی خط نہیں آیا اگر میں خط لکھتا تو حسب روایت اور خلوص وہ جواب ضرور دیتے، جیسا کہ ان کا مزاج تھا۔ ہاں یاد آیا ۱۹۶۵ء میں جمعہ کی نماز پڑھنے کے دوران مجھ پر دل کا دورہ پڑا تھا اور میں اس سانحہ سے اس قدر خوفزدہ رہا ہوں کہ تادم تحریر اسی کی گرفت میں جی رہا ہوں — (ظ۔ک۔ا)

آٹھواں خط — (پوسٹ آفس کا ان لینڈ لفافہ)

ڈاکخانے کی مہر کی تاریخ [illegible]

برادرم کیفی !

آپ کا کارڈ ملا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہوگا۔ مبارک باد قبول کیجیے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں کسی دوسرے شخص سے پیش لفظ لکھانے کو غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ افسانے پڑھنے والوں سے خود اپنی قیمت وصول کر لیتے ہیں اور وہی ان کی اصل قیمت بھی ہے۔ لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں پیش لفظ کے طور پر کچھ لکھوں تو میں حاضر ہوں۔ میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں کہ ہمارے نوجوان آگے بڑھیں، آفتاب ماہتاب بن کر چمکیں، مجھے سب سے زیادہ خوشی تو اسی وقت ہوتی ہے جب کسی نوجوان کا افسانہ پڑھنے کے بعد رشک کا جذبہ پیدا ہو۔ حسد کسی حال میں بھی نہیں۔ میری تو ہمیشہ یہ تمنا رہی ہے کہ میرے بعد کا ہر آنے والا مجھے راستے میں چھوڑ کر آگے بڑھ جائے۔ افسانوی ادب تو اسی حال میں ترقی کر سکتا ہے۔ ہم اور آپ سے زیادہ اہم فن ہے جس کی ہم دونوں خدمت کرنا چاہتے ہیں۔

آپ اگر چاہتے ہیں کہ پیش لفظ میں لکھوں تو مسودہ بھیج دیں — ! والسلام

خیر اندیش:—

سہیل عظیم آبادی (دستخط)

(نوٹ:) میں نے اپنا ایک افسانوی مجموعہ "رنگ کھرا غم" ترتیب دیا تھا جو تادم تحریر اشاعت پذیر نہیں ہو سکا۔ میں بلاشبہ سہیل صاحب کے سامنے طفل مکتب تھا اور ہوں۔ لیکن ان کا خلوص اور حوصلہ افزائی ملاحظہ فرمائیے کہ مجھے کس قدر برابری کا درجہ دیتے تھے اور محبت و عظمت سے نوازتے تھے۔

(ظ۔ک۔ا)

نواں خط — (لفافہ)

عطا منزل، سلطان گنج۔ پٹنہ ۶

[illegible] ۱۹۶۶ء

برادرم [illegible] سلام و تہنیت

آپ کے افسانے مل گئے۔ شام کو دفتر سے آیا تو رجسٹرڈ پیکٹ ملا۔ خوشی ہوئی۔ میں بڑی خوشی سے سب کو پڑھوں گا۔ اور لکھوں گا میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کوئی بات نہیں کہ آپ لوگ آگے بڑھیں اور اس فن کو ترقی دیں۔ جس کے لئے میں نے بھی کچھ کرنے کی کوشش کی ہے اگرچہ جو کچھ بھی کر سکا ہوں وہ کچھ قابل قدر نہیں لیکن اس میں میرے جذبے کی کمی نہیں۔

دسمبر میں اگر مسودہ بھیج سکا تو آخری تاریخوں تک بھیج

[illegible] دفتر کی مصروفیات، شاید آپ کو معلوم ہو، میں آل انڈیا ریڈیو میں اردو پروگرام کا پروڈیوسر ہوں اس کے علاوہ ایک کام آ گیا ہے اور مجھے ۵ دسمبر تک اسے ختم کر کے روانہ کر دینا ہے۔ یہ کام کچھ محنت طلب ہے کہ کم سے کم ہزار صفحات پڑھنا ہے۔ اب آپ میری مصروفیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں سات آٹھ تک لکھنا شروع کر دوں گا اور جیسے ہی ختم ہو جائے گا روانہ کر دوں گا۔ مطمئن رہیں آپ جانتے ہیں میں وعدہ نویس نہیں ہوں۔

میں ایک ماہ سے "صبا" کے افسانہ نمبر کے لئے ایک افسانہ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن اب تک مکمل نہیں کر سکا ہوں میرا حال کچھ ایسا ہی ہے شاید آپ نے میرا مضمون "کہانیوں کی کہانی" پڑھا ہو گا اپنا کچھ یہی ہے، ان لوگوں پر رشک آتا ہے جو ایک نشست میں افسانہ ختم کر لیتے ہیں۔

خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

واپسی کے لئے ٹکٹ بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی۔

خیر اندیش:- سہیل عظیم آبادی (دستخط)

دسواں خط

منزل مسلمان گنج - پٹنہ ۶ — برادرم — سلام و دعا

خط ملا، حالات معلوم ہوئے، ایک کام ختم کر کے اس کا پارسل آج ہی روانہ کیا ہے۔ اس طرح کچھ فرصت نصیب ہوئی ہے دو دن میں فرصت ہو جائے گی۔ دو دن کا ایک کام اور ہے۔

آپ میرے ان سوالوں کا جواب لکھ کر بھیج دیں

(۱) افسانہ نگاری کب سے شروع کی؟

(۲) عمر

(۳) اب تک کتنے افسانے لکھے ہیں ـــ؟

(۴) اپنے افسانوں میں آپ کیا خاص بات پیدا کرنا چاہتے ہیں؟

(۵) افسانہ نگاری کی تحریک کس طرح پیدا ہوئی ـــ؟

میرے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہوئے تھے تیسرا پریس میں تھا کہ ۱۹۴۷ء میں دلی میں انقلاب آیا اور وہ مجموعہ شائع نہ ہو سکا میرے پاس کوئی کاپی نہیں۔ ان شاء اللہ اسی مہینے میں آپ کا کام ختم کر دوں گا۔

اور حالات اچھے ہیں ـــــــ والسلام

خیر اندیش

سہیل عظیم آبادی (دستخط)

گیارہواں خط

[illegible] دسمبر ۱۹۶۰ء

آپ کا خط مل گیا۔ خوشی ہوئی اب میں جلد ہی آپ کا کام ختم کر دوں گا جنوری کے دوسرے ہفتے تک۔ اب تک میں نے آپ کا ایک ہی افسانہ پڑھا ہے۔ بے حد مصروف آدمی ہوں اور سب سے بڑا روگ اپنی بیماری یعنی پڑھنا، رات کو دیر تک جاگ جاتا ہوں صبح کو دیر سے اٹھتا ہوں اور نہا دھو کر دفتر جانے کی تیاری شروع کر دیتا ہوں۔ دس سے ساڑھے پانچ تک دفتر میں سر مارنا پڑتا ہے۔ آپ جانتے ہیں ریڈیو کا کام کس طرح ہوتا ہے اگر کوئی پروگرام ۹ بجے جانا ہے تو اسے ۹ ہی بجے جانا ہی چاہیئے ایک سکنڈ بھی دیر نہیں ہونی چاہیئے۔ ساڑھے پانچ بجے دفتر سے چھٹی ہوتی ہے لیکن چھ ساڑھے چھ سے پہلے دفتر چھوڑنا ممکن نہیں ہوتا، پھر ملنا ملانا یا کوئی گھریلو کام، الجھنیں ہی الجھنیں رہتی ہیں۔

مگر اب یہ کام جلد ہی ہو جائے گا یہ باتیں میں نے دراصل اپنے لئے دریافت کی تھیں تاکہ اس کے پس منظر میں آپ کے افسانوں کا مطالعہ کروں۔ لیکن آپ نے جو کچھ معلومات بھیجی ہیں ان سے کوئی زیادہ مدد نہیں ملے گی پھر بھی سمجھنے کی کوشش کروں گا آپ کو افسانہ نگاری کا شوق ہے اور یقیناً میں آپ سے عمر میں زیادہ ہوں اور پہلے سے لکھ رہا ہوں اگرچہ زیادہ تجربے کا دعوے دار نہیں، پھر بھی میرے اپنے تجربے میں ہر نوجوان

افسانہ نگار مجھے حد پیارا ہے اور جانتا ہوں کہ وہ آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے آپ کو اپنے تجربوں کی روشنی میں کچھ باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ اگر ممکن ہو تو ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔

(۱) صرف لکھنے کے لئے ہرگز نہ لکھیں بلکہ جب کوئی بات آپ کو مجبور کرے تو لکھیں۔

(۲) ان چیزوں کے بارے میں ہرگز نہ لکھیں جسے آپ نہ جانتے ہوں، جو اپنے مشاہدے اور تجربے ہوں ان کو افسانوں کی بنیاد رکھیں اور انھیں سے کہانی کا تانا درست کریں۔

(۳) زبان جس قدر سیدھی سادی ہوگی افسانوں میں اتنا ہی زیادہ ہو گا، مرصع تحریر شاعری کا لطف تو دے سکتی ہے لیکن کہانی کو قتل کر دیتی ہے

(۴) اس لئے آپ ہرگز نہ لکھیں کہ آپ کی چیزیں چھپیں، لوگ پڑھیں اور نام ہو، بلکہ اس لئے لکھیں کہ آپ اپنی تحریر سے لوگوں کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں۔

(۵) اس کی پرواہ نہ کریں کہ آپ کو عام مقبولیت حاصل ہو چند اچھے آدمی اگر پڑھ کر متاثر ہوں اور تعریف کریں تو اس کی قیمت زیادہ ہے

(۶) کبھی دور از قیاس تشبیہ و استعارے سے کام نہ لیں اور نہ خواہ مخواہ تحریر کو الجھائیں۔

(۷) بڑے افسانہ نگاروں کی تحریروں کا مطالعہ کرتے رہیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ اس نے کس طرح اپنے افسانوں کو پُر اثر بنایا ہے اور کیا خوبی پیدا کی ہے۔

(۸) جس چیز سے آپ خود مطمئن نہ ہوں اسے ہرگز شائع نہ کرائیں بلکہ ضائع کر دیں۔

(۹) نیا نیا شوق بھڑکا ہوا ہوتا ہے اور نمائش کی خواہش ہوتی ہے اس خواہش کو پوری طاقت سے دبایئے اور خود فن پر عبور حاصل کرنے کی کوشش کیجئے، دنیا کا کوئی فن ریاضت کے بغیر حاصل نہیں ہو گا مثال کے طور پر ایک مصور جب تصویریں بنانا شروع کرتا ہے تو پہلے صرف لکیریں کھینچتا ہے پھر شکل بناتا ہے پھر رنگ بھرتا ہے برسوں سال مشق کرتا ہے تو مصوری شروع کرتا ہے۔ گانے والا برسوں سال ریاضت کرتا اور آواز پر قابو حاصل کرتا ہے۔ پھر محفل میں گاتا ہے عام طور پر ہمارے نئے لکھنے والوں میں یہ جذبہ شدید ہوتا ہے کہ جلد ہی مشہور ہو جائیں یہ جذبہ بڑا گمراہ کن ہوتا ہے کہ فن پر قدرت حاصل نہیں کرنے دیتا اور وہ تھوڑی دور چل کر تھک جاتے اور پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ کیا آپ کسی نومشق مصور کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھنا پسند کریں گے یا کسی نومشق گانے والے کا گانا سننا پسند کریں گے۔ ایک ہی جواب ہو گا — نہیں — یہی قانون لکھنے والوں پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

اگر افسانہ نگاری کا شوق ہے تو خوب پڑھئے، دوسروں کو پڑھئے اس کے حسن و قبح پر غور کیجئے، خود لکھئے اور سختی کے ساتھ اس کا جائزہ لیجئے اگر آپ مطمئن ہوں تو بھیجئے ورنہ ہرگز نہ بھیجئے ایسا اصول بنا لیجئے۔

آپ شاید یقین نہ کریں لیکن یہ واقعہ ہے کہ میں دس دس صفحے لکھنے کے بعد ضائع کر دیتا ہوں۔ اور جب تک مطمئن نہیں ہو جاتا ہرگز اشاعت کے لئے نہیں بھیجتا، یوں بھی ہر وقت آدمی لکھنے کے موڈ میں نہیں ہوتا، دو ماہ سے ایک کہانی لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جس طرح میں لکھنا چاہتا ہوں، ویسی نہیں بن رہی ہے فن پر قدرت حاصل کرنا — مشر کے لفظوں میں زہریلے سانپ سے کھیلنا ہے بڑی ہوشیاری کی ضرورت ہے۔" مجھے یقین ہے کہ اگر آپ میری باتوں پر غور کریں گے اور عمل کرنے کی کوشش کریں گے تو ہرگز مایوس نہ ہوں گے آپ کا ہر افسانہ پہلے سے بہتر ہو گا۔

اور حالات اچھے ہیں خدا کرے آپ اچھے ہوں — والسلام

خیر اندیش

سہیل عظیم آبادی (دستخط)

(نوٹ) افسانہ نگاری کے ضمن میں، میں نے کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی، نہ ہی استادی شاگردی اختیار کی۔ البتہ اچھی تحریروں اور سہیل عظیم آبادی جیسے مخلص فن کاروں کے مشوروں کی روشنی میں میں نے اردو افسانہ نگاری کا سفر جاری رکھا ہے۔ یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں کسی بھی ایک ادیب کا مقلد بننا نہیں چاہتا ہوں، کیونکہ میں تخلیق میں یقین رکھتا ہوں تقلید کبھی میرا مزاج نہیں رہا ہے ——— (ظ۔ک۔ا)

بارہواں خط (ان لینڈ لیٹر)

۱۲ فروری ۶۲ء

برادرم کیفی سلام و محبت

زندہ ہوں آپ کے دو خط آئے لیکن جواب نہ لکھ سکا۔ بات یہ ہے کہ ادھر ذہنی طور پر بے حد پریشان رہا ایک مستقل الجھن تو یہ ہے کہ دفتر میں کوئی دوسرا اردو جاننے والا نہیں ہے اس لیے سارا کام خود ہی کرنا پڑتا ہے کوئی دوسرا مددگار نہیں، اور ادھر پٹنہ ریڈیو سے اردو پروگرام میں بہت خاصہ اضافہ ہو گیا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ پریشانی یہ ہے کہ پچھلے سال بچوں کے لئے ایک پریس قائم کر دیا تھا لیکن وہ اسے چلا نہ سکے اب جو دیکھتا ہوں تو عقل گم ہے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ ایک سال میں کتنا نقصان ہوا ——— انجام یہ کہ دفتر سے سیدھا پریس جاتا ہوں اور ان کے کاغذات دیکھتا ہوں یعنی تین چار مہینے جھک مارنا ہوگا تو حالات سدھر سکیں گے سر دست تو نقصان ہی نقصان ہے اور کم و بیش پچیس ہزار کی رقم پھنسی ہوئی ہے۔ اس سے بھی زیادہ بیہودگی انتخابات کی ہے۔ اب ۱۵ فروری کو یہ ہنگامہ ختم ہو جائے گا تو سکون ہوگا۔ پھر میں آپ کو ہر طرح سے دیباچہ اور آپ کے تراشے بھیج دوں گا، مطمئن رہیں۔ میں شرمندہ ہوں کافی دیر ہو چکی ہے۔

اور حالات اچھے ہیں خدا کرے آپ اچھے ہوں ——— والسلام

خیر اندیش :- ——— سہیل عظیم آبادی (دستخط)

تیرہواں خط (ان لینڈ لیٹر)

۱۳ اپریل ۶۴ء سلطان منزل، سلطان گنج پٹنہ

برادرم کیفی !

میں بڑا مجرم ثابت ہوا اب تک نہ لکھ سکا اور آپ کے بعض خطوط کا جواب تک نہ دے سکا لیکن کیا بتاؤں کس الجھن میں گرفتار رہا ملازمت، گھریلو الجھنیں ——— اب ذرا سکون ہوا ہے اسی مہینے میں لکھ کر بھیج دوں گا۔

خدا کرے آپ بخیر ہوں ——— والسلام

خیر اندیش :-

سہیل عظیم آبادی (دستخط)

چودہواں خط (ان لینڈ لیٹر)

[illegible] ۶۶ء

برادرم سلام و دعا [illegible]

آج رات رانچی سے واپس آیا تو آپ کا خط ملا۔ بھائی میں بے حد مصروف آدمی ہوں اتنا کہ آپ اندازہ نہیں کر سکتے، کاش! آپ میری زندگی سے واقف ہوتے، اس پر بدنصیبی یہ کہ لگ بھگ ایک سال سے اپنی الجھنوں میں گھرا ہوا ہوں سارا دن دفتر میں ختم ہو جاتا ہے دیر کر کے گھر آتا ہوں ادھر دو سال سے ایک لفظ نہیں لکھ سکا، در اصل آپ کے صرف دو افسانے پڑھ سکا تھا۔ تیسرا پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ حالانکہ افسانے میرے بیگ میں رہتے تھے پڑھے بغیر لکھنا نہ آپ کے ساتھ انصاف ہے اور نہ اپنے ساتھ۔ آپ کا خط کچھ ایسا تھا کہ واقعی پڑھ کر رنج پہنچا جیسے مجھ پر بھروسہ نہیں رہا ہو، ایسی صورت میں خاموشی کے ساتھ مسودہ واپس کر دینے کے سوا کیا چارہ تھا؟ مسودہ امانت کی صورت میں میرے پاس محفوظ تھا۔

اِدھر بہار سخت حالات سے گزر رہا ہے قحط کا دیو منہ

کھولے بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اور اس سے جنگ جاری ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے کتنے آدمی موت کا شکار ہوں گے۔ خود میرا حال یہ ہے کہ ہر سال سینکڑوں من غلہ ہوتا ہے، پچھلے سال ایک دانہ بھی میرے کھیتوں میں پیدا نہیں ہوا۔

میری سب سے بڑی خوشی نوجوانوں کو آگے بڑھتے دیکھنا ہے اور اس کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہوں کہ جو کچھ ہو سکے کروں۔ اس لئے آپ کے مجموعے پر پیش لفظ لکھنے کے لئے احتراز کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ لیکن حالات کا شکار رہا اور شاید دو مہینے اور ایسا ہی حال رہے گا۔ سوچ رہا ہوں کہ ایک ڈیڑھ ماہ کی فرصت لے لوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک دفتر میں دوسرا کوئی ایسا اردو جاننے والا نہیں — ریڈیو افسروں میں جس کے حوالے پروگرام کیا جا سکے اس لئے رخصت نہیں لے سکتا۔ آپ کو شاید معلوم ہے کہ میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہوں، علی عباس حسینی صاحب اور اعجاز حسین صاحب بیمار ہیں اور ان کو دیکھنے کے لئے جانا چاہتا ہوں لیکن یہی مشکل درپیش ہے ایک صاحب تبدیل ہو کر آ رہے ہیں تو فرصت مل سکے گی۔

کوثر صاحب بے حد وضع دار اور شریف طبیعت بزرگ ہیں۔ اور بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔

مجھے آپ کے افسانوں پر کچھ لکھنے سے احتراز نہیں البتہ کم سے کم دو ماہ انتظار کرنا ہوگا، ذہن الجھا ہوا ہے نہ آپ کے ساتھ انصاف ہوگا اور نہ اپنے ساتھ۔

امروہہ جانے کا وعدہ کرنا میرے لئے بڑا مشکل ہے۔ یوں سیر کرنے کا شوق بہت زیادہ ہے۔ جب تک آزادی رہی ملک کا کونا کونا چھان مارا۔ لیکن اب تو پابہ گل ہوں۔ کام کرتے جائیے — اور ٹولی بازی سے الگ رہئے۔ یہ بری چیز ہے اور اچھے ادیب کو بڑھنے نہیں دیتی۔

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔ — والسلام

خیر اندیش — سہیل عظیم آبادی (دستخط)

(نوٹ ۱) افسانہ نگار وکیم کوثر چاندپوری، جو محب احقر کی دعوت پر "انجمن بستانِ ادب امروہہ" کی ایک شب افسانہ میں دہلی سے تشریف لائے تھے۔

(نوٹ ۲) ادبی جلسے، نشستیں منعقد کرانا اس کندۂ ناتراش کا سب سے بڑا شوق تھا جو، اب احباب کی سرد مہری اور عدم تعاون کی بدولت نابید ہو چکا ہے۔

حضرت سہیل عظیم آبادی سے صرف چونکہ میری مراسلت ہی تھی بالمشافہہ ملاقات کا میں خواہش مند تھا اور وہ بھی اس لئے میں نے ان کے اعزاز میں "ایک شب افسانہ" کا انعقاد امروہہ میں کرانا چاہا تھا۔ ظ۔ک۔

پندرہواں خط — ان لینڈ لیٹر

نور منزل سلطان گنج۔ پٹنہ

برادرم کیفی — سلام و محبت — عید مبارک!

کل دفتر سے واپسی پر آپ کا عید کارڈ ملا، شکریہ، بے حد خوشی ہوئی۔

میں کسی کو نہیں بھولتا آپ کو بھی نہیں بھولا۔ البتہ مصروفیت بہت زیادہ رہی اور پٹنہ سے باہر بھی رہا۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ بمبئی میں ہیں اور کسی اخبار میں کام کر رہے ہیں آپ نے تفصیل نہیں لکھی، دلی تمنا ہے کہ خدا آپ کو کامیاب بنائے۔ صحافت اور وہ بھی اردو صحافت میں کوئی جان نہیں۔ بمبئی بہت بڑی جگہ ہے۔ جد و جہد کیجئے، اور کوئی بزنس شروع کر دیجئے خدا برکت دے گا۔ سوال سرمائے کا ہے لیکن جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔ کلکتہ میں اور بمبئی میں جو آج بڑے لوگ ہیں ان کے آباء و اجداد بڑی بدحالی میں آئے تھے لیکن محنت نے انھیں پھل دیا۔

خدا کرے آپ اچھے ہوں — والسلام

خیر اندیش — سہیل عظیم آبادی (دستخط)

(نوٹ ۸) ستمبر ۱۹۴۸ء میں میں اپنا آبائی پیشہ تجارت ترک کر کے بمبئی چلا گیا تھا وجہ میری افسانہ نگاری اور زندگی کا اصلی مشاہدہ اور تجربہ ہوا کرتا تھا۔ بمبئی میں ست نمار طریقے سے کرو ڑپتی دو افراد کی طرح والکیشور روڈ پرساگر محل۔ میں اپنے بہنوئی مسٹر علی محمد کے ساتھ رہتا تھا جو ٹاٹا کمپنی کے ڈائرکٹر مسٹر اے ڈی نورو جی کے پرسنل سکریٹری تھے لیکن میں بمبئی میں ادھر سے ادھر بھٹکتا رہا۔ اور اردو اخبارات کے علاوہ ہندی سماچار پتروں میں کام کرتا رہا اسی طرح مختلف اداروں میں خود کو بیچ کر ایک دن خود کو فلم انڈسٹری میں لے گیا جہاں میں نے متعدد فلموں کے مکالمے بغیر کسی اجرت اور نام کے لکھے اسی لیے ناکام اور ناشاد رہا۔ (ظ۔ک۔ا)

(سولہواں خط) (ان لینڈ لیٹر)

۴ر جنوری ۱۹۶۹ء

برادرم کیفی

آپ کا خط ملا۔ اور منتر کا وہ شمارہ بھی، جس میں آپ کی کہانی "جادو ٹونا" شائع ہوئی ہے۔ کہانی میں نے پڑھ لی ہے یہ کہانی آپ کی پچھلی کہانی کے مقابلے میں بہت زیادہ کامیاب ہے زندگی سے بہت نزدیک۔ بڑے شہروں میں ایسے بے شمار واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور روٹی حاصل کرنے یا دولت کمانے کے چکر میں انسان اتنا مصروف رہتا ہے کہ اسے خبر بھی نہیں ہوتی کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔!

یہ بھی واقعہ ہے کہ مرد، بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے مزدوری کرتا رہتا ہے اور گھر پر بے کار بیٹھی ہوئی عورت اپنے جذبات کی تسکین کی دوسری راہیں نکال لیتی ہے یہی حال زہرہ اور خورشید کا بھی تھا۔

کہانی سیدھی سادی ہے، دراصل ان عوامل اور محرکات کے تجزیے کی ضرورت ہے جو مردوں اور عورتوں کو اس جگہ سے ہٹا کر کہیں اور پہنچا دیتے ہیں۔ زہرہ کا ذکر آپ نے اس طرح کیا ہے کہ یہ بات آخر میں الجھ کر رہ گئی ہے وہ بھی سلیمہ داشتہ تھی یا بیاہتا۔ ایسا لگتا ہے کہ جلدی جلدی آپ نے کہانی ختم کر دی، اگر ذرا اور رحم کر لکھتے تو زیادہ خوبصورت ہو جاتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب بُری ہے آپ لکھتے رہئے ایک دن میں کوئی کمال کو نہیں پہنچتا۔ کمال ریاضت کا پھل ہے لیکن بس تھوڑی سی بات۔ بُرے لکھنے والوں کے افسانے بھی پڑھئے، بڑے کا مطلب صرف اردو کے لکھنے والے نہیں ہیں بلکہ ہر زبان کے خاص کر فرانسیسی، روسی اور دوسری غیر ملکی زبانوں کے

میری کوئی کتاب میرے پاس نہیں ہے — کیا کہوں —!

[...]الات اچھے ہیں

والسلام

خیر اندیش

سہیل عظیم آبادی (دستخط)

(نوٹ ۹) ہمارے بیشتر اردو ناقدین تنقید لکھتے وقت غیر ملکی زبانوں کی اصطلاحوں میں بات کرنا پسند کرتے ہیں، اردو کی کتابیں خریدنے کی بجائے انگریزی کی کتابیں مستعار لینے میں فخر محسوس کرتے ہیں ان کے نزدیک اردو میں ٹیکنیکل خامیاں ہیں' وہ اس کی لغات میں جدید تنقیدی اصطلاحیں موجود نہیں ہیں اسی لئے

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

کے مصداق میں اپنے محدود علم کی بدولت غیر ملکی زبانوں اور ادب کے مطالعے سے مستفیض نہیں ہو سکا یہ میری کوتاہی بھی ہے اور میری تخلیقی صلاحیتوں کو نکھارنے کا بڑا ذریعہ بھی ہے، پھر بھی میرا اشارہ خدانخواستہ حضرت سہیل عظیم آبادی کی جانب ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ (ظ۔ک۔ا)

(سترہواں خط) — (لفافہ)

SUHAIL AZIMABADI [...]ATNA-6

۱۸ر دسمبر ۱۹۶۹ء

برادرم کیفی

سلام و محبت

آپ کا عید کارڈ ملا۔ بے حد شکریہ!

آپ دہلی چلے آئے اچھا کیا۔ بمبئی کوئی اچھی جگہ نہیں ہے کہ سب

[illegible] پہلے، کسب معاش ضروری ہے اچھی شراب کے لئے اچھی بوتل بھی ضروری ہے روح کو باقی رکھنے کے لئے جسم کی حفاظت ضروری ہے اس لئے اس کی طرف سے غفلت کبھی نہ کیجئے، بمبئی تاجروں اور منافع خوروں کا شہر ہے جہاں آرٹ بھی تجارت ہے جہاں سارے تعلقات، خلوص اور محبت کی بنیاد ذاتی اور مشترکہ مفاد پر ہوتی ہے جو آج جان نثار ہے کل وہی دشمن جان بن جاتا ہے یا کم از کم پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے۔

آن جہانی پنڈت نہرو نے کہا تھا۔ "دلی بے رونا شہر ہے" بڑا ہی جاہ اور با معنی جملہ ہے کوئی آپ کی پرواہ کرنے والا نہیں ہر آدمی دوسرے کو کچل کر خود آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بہر حال آپ اپنا کام کئے جائیے ہر روز ایک قدم آگے بڑھاتے جائیے دنیا آپ کی ہو گی یہی قانون ہے بیٹھنے والے پیچھے چھوٹ جاتے ہیں اور چلنے والے آگے نکل جاتے ہیں آپ بھی چلتے جائیے ہمت نہ ہاریئے اپنی راہ آپ بنائیے شیر شاہ سوری کی زندگی سے ہر نوجوان کو سبق لینا چاہئے!

میں بحمد اللہ اب اچھا ہوں پچھلے دنوں بہت بیمار ہو گیا تھا کبھی کبھی اپنی خیریت لکھا کیجئے۔ والسلام

خیر اندیش

سہیل عظیم آبادی (دستخط)

(نوٹ ۱) دلی میں سترہ مہینوں تک ایک جوتے بیچنے والے کے یہاں میں اپنی عقل بیچتا رہا۔ لیکن پھر بھی اپنا رب نہیں بن سکا۔
(ظ۔ ک [illegible])

(اٹھارواں[18] خط) — ولیٹر ہیڈ لفافہ

HAAL -- POLITICAL AND CULTURAL

[illegible] URDU WEEKLY PATNA-6

[illegible] SUHAIL AZIMABADI

22-1-71

برادرم کیفی   سلام و دعا

تمہارا بھیجا ہوا عید کارڈ ملا تھا جواب بھی نہ لکھ سکا تھا بے حد معروف تھا جون میں آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت سے ریٹائر ہو گیا۔ ۱۵ راگست سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا ہے لیکن کچھ عجیب حال رہا، کاتبوں کی کمی سے بے حد پریشان رہا۔ پٹنہ سے بہت سے اردو اخبارات شائع ہوتے ہیں اور کاتبوں کی کمی ہے اس لئے سارے اخبار والے پریشان ہیں میں بھی پریشان رہتا ہوں۔ ایک زمانہ میں امروہہ کاتبوں کا مرکز تھا معلوم نہیں اب کیا حال ہے وہاں بہت اچھے اچھے کاتب تھے اور دلی میں تو پچاس فیصد سے زیادہ امروہہ کے کاتب تھے۔

مجھے فوری طور پر دو کاتبوں کی ضرورت ہے وہ تنخواہ پر کام کریں یا ٹھیکے پر۔ تمہیں اخبار الگ سے بھجوا رہا ہوں جیسی کتابت میں چاہتا ہوں اس کے نمونے کے لئے "حال" کا تراشہ بھیج رہا ہوں اگر امروہہ میں کاتب مل جائیں تو انہیں بھیجنے کا سامان کرو، یا ان سے دریافت کرو کیا تنخواہ لیں گے یا صفحے کے حساب سے کیا اجرت لیں گے۔ پریس سے ان کو دوسرے کام دلاتا رہوں گا۔ اور یقین ہے کہ وہ خوش ہوں گے۔

اگر امروہہ سے کاتب پٹنہ آنے کے خواہش مند ہوں تو ان سے دریافت کرو اور ان کی کتابت کے نمونے بھیجو۔

خدا کرے کہ تم شاد و عزیز ہو — والسلام

خیر اندیش

سہیل عظیم آبادی (دستخط)

(انیسواں[19] خط — (ان لینڈ لیٹر) (ذاتی)

بہار اردو اکادمی۔ پٹنہ ۴

۱۲ر اکتوبر ۱۹۷۶ء

برادرم کیفی   سلام و دعا،

خط ملا۔ پڑھ کر دکھ ہوا۔ اللہ پاک آپ کی مدد فرمائے (آمین)

گزشتہ جنوری میں مجھے ہلکا سا دل کا دورہ پڑا۔ اور [illegible] اسپتال بھار ا۔ اب اچھا ہوں لیکن سخت پرہیز اور احتیاط کا سلسلہ جاری ہے۔ ستمبر ۶۷ء میں بہار اردو اکادمی کا سکریٹری مقرر ہوا۔ یہ مدت تین سال ہے۔ ستمبر ۷۸ء [illegible] ئی اس کے بعد ارادہ نہیں کہ رہوں۔

[illegible] افسانہ مل گیا ابھی پڑھ نہیں سکا ہوں بعد میں اطلاع [illegible]

والسلام

خیر اندیش

سہیل عظیم آبادی (دستخط)

نوٹ (۱):- ۱۹ جنوری ۶۷ء کو میرا شیر خوار بیٹا تسنیم کیفی سترہ مہینے تک دنیا وی جہنم بھگت کر انتقال کر گیا۔ اس کی ام الصبیان کی بیماری اور میری مستقل بیکاری نے مجھے "گنہگار رجینا" کی تخلیق کرائی، جو بہار اردو اکادمی کے مجلہ "زبان و ادب" کے نومبر ۷۶ء کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی لیکن مجھے وہ شمارہ ہنوز نہیں مل سکا۔ علاوہ ازیں پونے چھ سال کی یہ طویل مدت حضرت سہیل عظیم آبادی کے خلوص اور شفقت کو ماند نہیں کر سکی تھی اور یہ سارا عرصہ میں نے بیماری اور بیکاری کے جنگل میں گذارتے ہوئے نصف درجن ننھے فرشتوں کا پیٹ پالا ہے لیکن بہ حیثیت ایک ادیب کے نہیں بلکہ ٹیوشنز کے طور پر، ان ناگفتہ بہ حالات میں بھی میرا تخلیقی عمل سود و زیاں سے بے نیاز رہ کر جاری رہا ہے اور آج بھی محرومیوں کے باوصف جاری و ساری ہے۔ (ظ۔ک۔ا)

بیسواں خط (۲۰) بہار اردو اکادمی پٹنہ کے لیٹر پیڈ پر

بہار اردو اکادمی ۔ پٹنہ (ذاتی)

बिहार उर्दू अकादमी पटना

BIHAR URDU ACKADMY PATNA

PHONE- [illegible]

۶ دسمبر ۱۹۷۶ء

[illegible] سلام و محبت!

خط ملا اور محترمی شہباز صاحب کی نظم بھی ملی۔ شکریہ!

آج ہی بقرعید کے بعد دفتر کھلا ہے سب کچھ الٹا سیدھا پڑا ہے اب متفرق کمیٹیوں کی میٹنگ شروع ہوگی۔

بہار اردو اکادمی بھی ملک کی دوسری اکادمیوں کی طرح صرف اپنے صوبے کے مصنفوں کی کتابوں کی اشاعت میں امداد دیتی ہے البتہ انعامی مقابلے میں سارے ملک کے مصنف شریک ہوسکتے ہیں، جب ان کی کتاب شائع ہو جائے اور وہ [illegible] پسند فرمائیں تو انعام کے لئے کتاب کی آٹھ جلدیں بھیج سکتے ہیں۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ [illegible] والسلام

خیر اندیش

سہیل عظیم آبادی (دستخط)

(نوٹ [illegible] شہباز صدیقی طنز و ظرافت کے شاعر ہیں، نصف صدی تک علم و ادب اور اردو زبان کی خاموش خدمت کرنے کے باوجود ان کا دیوان شائع نہیں ہوسکا ہے چونکہ موصوف نابینا ہیں اس لئے میں نے چاہا تھا کہ کسی طور ان کا دیوان شائع ہوسکے تاکہ فن کا یہ نادر و نایاب خزینہ شائع ہو کر یونیورسٹی درجات اور نصابات میں جگہ پاسکے اور اعزاز و انعام سے نوازا جائے اور ایک علمی اور ادبی شخصیت کی اس کی زندگی میں امداد و اعانت کے ساتھ ساتھ اس کی پذیرائی ممکن ہوسکے۔ شہباز صدیقی صاحب کا تبحر علمی بے پایاں ہے اور میں ان کا ہم وطن، ہم عصر، اور ہم ذات بھی ہوں یعنی ظہیر صدیقی بھی ہوں۔ [illegible] ظ۔ک۔ا)

اکیسواں خط (۲۱) (ان لینڈ لیٹر)

[illegible] برادر کیفی [illegible]

[illegible] حالات معلوم ہوئے [illegible]

میں صباح الدین عمر صاحب کو خط ضرور لکھ دوں گا۔ لیکن ان کے حالات کیا ہیں یہ میں نہیں جانتا۔ میرا طریق کار یہ ہے کہ سب کمیٹیوں میں کچھ بھی نہیں بولتا نہ کسی کی حمایت کرتا ہوں اور نہ مخالفت۔ کمیٹی کے ممبروں کو بالکل آزادی ہوتی ہے، البتہ وہ قانون کے دائرے سے باہر ہونے لگتے ہیں تو ٹوک دیتا ہوں۔ پھر سب کمیٹیوں کی سفارشیں مجلس عاملہ میں آتی ہیں اور میرا طریقہ وہی رہتا ہے اور جو بات جس طرح منظور ہوتی ہے اسی پر عمل کرتا ہوں۔ پھر کسی ممبر کی مداخلت قبول نہیں کرتا اور مجھے معلوم نہیں کہ صباح الدین صاحب کا طریق کار کیا ہے۔ ویسے ان سے میرے تعلقات بہت اچھے ہیں۔

اکادمیوں کی ایک کانفرنس ۶ اور ۷ نومبر کو لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ میں نے شرکت کی تھی اب کسی کانفرنس کی اطلاع نہیں البتہ اکادمیوں کی ایک مشاورتی کمیٹی بنی ہے اس کا جلسہ ہوگا تو ضرور جاؤں گا۔ بشرطیکہ سردی بہت زیادہ نہیں بڑھی، اب بوڑھا ہو رہا ہوں، اللہ کا احسان ہے ۷۵ سال کی عمر میں ۸ گھنٹے کام کر لیتا ہوں لیکن بیماری کے بعد سے احتیاط تو برتنا ضروری ہے سردی کے موسم میں ہر جگہ جانا ممکن نہیں، دوسرے غذا میں سخت پرہیز ہے ابالی سبزی وغیرہ کھاتا ہوں، جہاں جاؤں وہاں کے لوگوں کو تکلیف پہنچاؤں، اس کے علاوہ اب شب افسانہ اور مشاعرے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔ آپ لوگ آرگنائز کریں اور فرصت ... میں آج ہی صباح الدین عمر صاحب کو خط لکھ رہا [illegible]

[illegible] ... ہوں۔

... کہانی "زبان دراز" میں کام کرنے والے ... نسیم ہیں۔ سب نے پڑھی ہے میں نے نہیں پڑھی، کہہ رہے تھے کہ بہت جذباتی ہے۔ میں نے شریک کرنے کو کہہ دیا ہے [illegible] خدا کرے آپ مع متعلقین بخیر ہوں [illegible]

خیر اندیش:

سہیل عظیم آبادی (دستخط)

(نوٹ ۱۳) میں نے اپنا ایک افسانوی مجموعہ "اگنی ہوئی روشنی" اترپردیش اردو اکادمی کو بھیجا تھا جو چھ مہینے بعد بغیر کسی اعتراض و عذر کے مجھے واپس بھیج دیا گیا۔ میں نے مسترد کئے جانے پر استفسار اور اعتراض چاہا تو کوئی معقول عذر سکریٹری سے لیکر صدر صاحب تک نے مرحمت نہیں فرمایا اسی لئے میں نے سہیل صاحب سے اعانت کی درخواست کی تھی۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اکادمی کے ارباب حل و عقد نے معاندانہ اور مطلق العنانہ رویہ میرے تئیں اختیار کیا تھا۔

(نوٹ ۱۴) کہانی "گنہگار رجنیا" جس کی تخلیق اگر میں نہ کرتا تو اس طفل شیرخوار کی جان کنی اور سسکتے ہوئے مرنے کے لمحات کو خدائے نامہربان کی قہرسامانی کو نہ بھول پاتا۔

[illegible]

بائیسواں خط (ان لینڈ لیٹر)

SUHAIL AZIMABADI

MANZIL SULTAN GANJ

(Bihar)

۱۵ ستمبر ۱۹۷۹ء

عید مبارک

برادرم کیفی

سلام و محبت!

تمہارا عید کارڈ ملا۔ اسی سے خیریت بھی معلوم ہوئی شکریہ!

ادھر بہت لکھا لکھار رہا۔ میں نے ۲۷ مئی کو ہی اکادمی کی سکریٹری کے عہدے سے استعفا دے دیا تھا وہ منظور نہیں ہوا لیکن ۸ ستمبر کو تین سال کی مدت پوری ہو گئی، میں نے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ کوئی دوسرا سکریٹری مقرر کیا جائے۔ اب تک کوئی نہیں آیا ہے۔ کوئی آ ہی جائے گا۔ مجھ سے بار بار کہا گیا کہ استعفا

واقف ہوئے ہوں۔ لیکن تین سال میں ایسے بُرے تجربے ہوئے ہیں کہ شعلے

میں ہوں اور امید گل کی آرزو غالب کے دن

دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا۔

پھر ان تجربوں کو دہرانا نہیں چاہتا تھا اب نجات مل جائے تو اپنا کام شروع کردوں میرا پروگرام مختصر سا ہے۔ ہر سال دو کتابیں شائع کرنے اور فروخت کرنے کا، ایک ادارے کے قیام کا، یہ ادارہ رجسٹرڈ ہوگا اور خاص خاص احباب پر مشتمل ہوگا۔ ایسے لوگوں پر جن کو مجھ پر کامل اعتماد ہو، اس کے سارے ارکان، جن میں حیاتی ارکان ہوں گے اور سو روپے فیس ہوگی ادارے سے جتنی کتابیں شائع ہوں گی وہ ارکان کو رعایتی قیمت پر دی جائے گی۔ ایک ادارہ، دار المصنفین قسم کا، جن لوگوں کی کتابیں شائع ہوں گی ان کو رائلٹی دی جائے گی اور ایمانداری کے ساتھ انشاء اللہ جلدی کام شروع کردوں گا۔

خدا کرے تم مع الخیر ہو۔ والسلام

خیر اندیش

سہیل عظیم آبادی (دستخط)

(نوٹ ۱۵) یقیناً سہیل صاحب بہار اردو اکادمی کے کارکنان سے مطمئن اور خوش نہیں تھے غالب کا شعر اور اس کا تیکھا اظہار، بیزاری اور جھنجلاہٹ صاف ظاہر کرتی ہے کہ وہ بے حد ملول خاطر تھے کاش! اصل حقائق کو سہیل صاحب جرأت اور بے باکی سے لکھتے تاکہ ان عوامل اور عواقب اور اراکین اکادمی کے ہلاولیوں کا عام اردو داں کو پتہ چل سکتا۔ (ظ۔ ک)

تیئسواں خط ۲۳ (ان لینڈ لیٹر)

نور منزل، سلطان گنج۔ پٹنہ ۶

۹ر اپریل ۱۹۷۸ء

برادرم کیفی!

آپ کو یہ اطلاع تو مل ہی چکی ہوگی کہ میں نے مئی ۷۷ء میں بہار اردو اکادمی کی سکریٹری شپ سے استعفا دے دیا تھا، استعفا تو خیر منظور نہیں ہوا لیکن ایک فائدہ یہ ہوا کہ مدت ختم ہونے کے بعد مجھے آزادی مل گئی اب میں گھر پر ہوں اور پڑھتا لکھتا رہتا ہوں پڑھتا زیادہ اور لکھتا کم ہوں۔

اکادمی سے سبک دوشی حاصل کرنے کے بعد ایک سخت مسئلہ سامنے آیا وہ یہ کہ خود کو مشغول کس طرح رکھوں، بہت سے خیالات سامنے آئے ایک بات ذہن میں یہ بھی آئی کہ اپنا پرانا رسالہ "تہذیب" پھر جاری کروں لیکن سہ ماہی کی شکل میں، لیکن اندازہ ہوا کہ کام بہت سا سر پر آئے گا کتابت، طباعت کا، پھر بھیجنا بھیجانا، اب پہلی انرجی باقی نہیں ـــ اسی درمیان ایک نئی بات پیدا ہو گئی۔ بہار کے شہر گیا سے ایک ماہانہ رسالہ "سہیل" ۱۹۳۹ء سے جاری ہے۔ اس رسالے کی ابتدا بڑی شاندار تھی پھر رفتہ رفتہ حالات خراب ہوتے گئے بس کسی طرح جاری رہا اس کے مالک اور ایڈیٹر ادریس صاحب ہیں اب ان کے لڑکوں نے بڑی محنت سے رسالے کو سدھارنا شروع کیا ہے یہ دونوں لڑکے یونیورسٹی کے طالب علم اور خوش ذوق ہیں، ادریس صاحب بھی آئے تھے باتیں ہوئیں اور طے پایا کہ میں اسے اپنی نگرانی میں لے لوں اور میں نے وعدہ کر لیا ہے۔ آئندہ اگست سے رسالہ میری نگرانی میں شائع ہوگا ۴۸ صفحات پر۔ کچھ دنوں تک تو مجھے کچھ محنت کرنی پڑے گی پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اب آپ سے کہنا ہے کہ اپنی ایک کہانی بھیجیں[۱۶] اور جلد تاکہ پہلے ہی شمارے میں شریک ہو سکے، اس کے علاوہ آپ کے دوستوں میں جو اچھے لکھنے والے ہوں ان کی چیزیں بھجوا دیجئے لیکن اچھی چیزیں ہوں، جدیدیت زدگی کا شکار نہ ہوں۔ میں ادب میں تجربوں کا مخالف نہیں لیکن سمجھ میں آنے والی باتیں ہوں جو سمجھ میں نہ آئے وہ ادب نہیں کچھ اور ہو تو ہو۔ اور حالات اچھے ہیں اللہ پاک کا کرم ہے اچھا ہوں۔ امید ہے کہ آپ مع متعلقین بخیر ہوں گے۔

والسلام

خیر اندیش ـــ سہیل عظیم آبادی (دستخط)

(نوٹ ۱۶) سہیل ۱۹۴۸ء کے کسی شمارہ میں میری کہانی "گھروالی" شائع ہوئی تھی جس نے ادبی حلقوں میں کافی تہلکہ مچایا، اپنی ادبی حیثیت کے بنانے میں سہیل صاحب کے مشفقانہ اور محبتانہ خلوص کو فراموش نہیں کرسکتا۔ فروری ۱۹۴۸ء سے فروری ۱۹۵۸ء تک دلی میں خود کو بیچتا رہا ہوں اپنی تخلیقات اور تحریریات کو دوسروں کے ناموں اور ہاتھوں میں اونے پونے داموں پر فروخت کرتا رہا ہوں، کیوں کہ دلی میں رسائل کے مدیران خود تو نوٹ سے سو بنانے میں لگے ہوتے ہیں لیکن ادیبوں کو سو کے نوٹ دینے میں بھی آنا کانی کو جائز سمجھتے ہیں اور بیشتر تو سالم ہی ادیب کو نگل لینے اور کچل دینے کے درپے ہیں۔ کیونکہ ادیبوں کے اندر بھی نہ احتجاج ہے نہ امتیاز ہے، اپنے حقوق کی پامالی کو اپنا مقدر سمجھنے والے "اِنَّ اللّٰہَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَاءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ" کی جیتی جاگتی لیکن زندہ درگور لاشیں ہیں۔ (ظ۔ک)

چوبیسواں خط[۲۴] —— (ان لینڈ لیٹر)

پٹنہ ۶
۳ مئی ۱۹۷۸ء

برادرم کیفی سلام و محبت!

خط ملا اور کہانی بھی ملی، ابھی پڑھی نہیں ہے، بے حد مصروف ہوں، ۱۴ مئی کی شب کو یہاں سے روانہ ہوں گا اور دوسرے دن یعنی ۱۵ کو ۹ بجے دلی پہنچوں گا۔ ساڑھے دس بجے انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہے اس میں شرکت کرنی ہے پھر دوسرے دن شام کے وقت جلسہ ہے لیکن جلسوں کے بعد بھی دو تین دن دلی میں رہوں گا میرا قیام راؤزالونیو میں ہی خواجہ بدیع الزماں کے یہاں رہے گا میرے ایک عزیز ہیں اور محکمہ تعلیم میں افسر ہیں، ان کے کوارٹر کا نمبر 187 ہے لیکن اس سے بھی آسان یہ ہے کہ انجمن ترقی اردو کی عمارت میں مل لیجئے میں خود آپ سے ملنے پہنچتا لیکن نہیں پہنچ سکوں گا۔

۱۹۳۵ء سے دلی جاتا ہوں اور چار سال تو مستقلاً رہا ہوں، لیکن یہ کہاں ہے یہ نہیں جانتا، موقع نکال کر ضرور ملنے کی کوشش کروں گا۔ کہانی ایک دو دن میں دیکھ لوں گا پھر لکھوں گا، اور حالات اچھے ہیں، خدا کرے آپ اچھے ہوں

والسلام
خیراندیش —— سہیل عظیم آبادی (دستخط)

(نوٹ ۱۷) پورے سولہ برس[۱۷] بعد پہلی بار میری ملاقات حضرت سہیل عظیم آبادی سے "انجمن ترقی اردو" اردو گھر نئی دلی کی عمارت کے احاطہ میں ہوئی میرے ساتھ میرے کرم فرما عزیز احمد گل بھی تھے۔ شام کا وقت تھا انجمن کا اجلاس جاری تھا۔ میں نے سہیل صاحب کے قریب پہنچ کر کہا۔ میرا نام ظہیر کیفی ہے، یہ سنتے ہی مجھ سے بغل گیر ہو گئے اور اجلاس چھوڑ کر میرے ہمراہ چلے آئے اردو کی سربرآوردہ شخصیتیں متحیر ہو کر مجھے دیکھنے لگیں، لیکن سہیل صاحب مجھ سے محو گفتگو تھے، پھر انہوں نے ایک کمرے میں گرما گرم چائے کا آرڈر دے کر سنگی بنچ پر بٹھاتے ہوئے میرے حالات دریافت کئے۔ اور خود ایک پتھر پر بیٹھ کر چائے پی اور نہایت شفقت و محبت سے ایک ایک بات دریافت کرتے رہے، یہی میری اُن سے پہلی اور آخری ملاقات تھی، دوسری ملاقات کا ان کا وعدہ تھا لیکن افسوس —— وہ جب دلی آئے تو میں آؤٹ آف اسٹیشن تھا، جب واپس آیا تو پتہ چلا وہ الہ آباد میں انتقال فرما چکے۔ یہ سانحہ میں بھلا نہیں پا رہا ہوں۔

پچیسواں خط[۲۵] —— (پوسٹ کارڈ)

۸ دسمبر ۱۹۷۸ء

برادرم محبت!

خط ملا۔ سارا ستمبر کا مہینہ [illegible] ہوم میں گذر

آپریشن لینا پڑا۔ اب اچھا ہوں، ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ میں پٹنہ میں ہوں اور سہیل گیٹ سے شائع ہوتا ہے گیا ہم ہاسپیل دور ہے۔ میں پھر ان کو [illegible] ہوں ۳ دسمبر کو دہلی میں رہوں گا ایک میٹنگ میں شرکت [illegible] میٹنگ ۳ بجے شام کو چیمسفورڈ کلب میں ہوگی۔ اگر آپ مل سکیں تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ ۳۱ دسمبر کو پٹنہ واپس ہو جاؤں گا۔

اور حالات اچھے ہیں میرا قیام ۸۲۲۵ پنڈارا روڈ میں [illegible] صاحب کے ساتھ رہے گا پروگرام ہے کہ یہاں سے ۲۸ دسمبر کو روانہ ہو کر ۲۹ دسمبر کو دہلی پہنچ جاؤں۔ ضرور ملئے

خدا کرے تم اچھے ہو ——— خیر اندیش

سہیل عظیم آبادی (دستخط)

(نوٹ ۱۸) افسوس کہ میں پھر سہیل صاحب سے نہ مل سکا کیونکہ بے حد پیچیدہ زندگی بسر کرتا رہا ہوں۔ شمع اور بیسویں صدی اور انجمن ترقی اردو کی ملازمتیں بھی میری بھرپور کفالت نہ کر سکیں کیونکہ اردو کے ان نام نہاد اداروں میں کسی ایک ادیب کی گنجائش نہیں ہے البتہ ایک گدھے کی ضرورت ہمہ اوقات رہتی ہے۔

چھبیسواں خط[26] (ان لینڈ لیٹر)

SUHAIL AZIMABADI
NOOR MANZIL
SULTANGANJ
PATNA-6
(BIHAR)

۲۶ فروری ۱۹۷۹ء

برادرم محبت!

خط ملا، حالات معلوم ہوئے۔ دکھ پہنچا۔ لیکن جب تک ملک میں سرمایہ دارانہ نظام باقی ہے ایسے سیکڑوں دھچکے برداشت کرنے ہوں گے [illegible] تمہارے ساتھ ہوتا تو رو لیتا لیکن سب

ساتھ ہے۔ رونے سے زیادہ حالات کے خلاف لڑنے کی ضرورت ہے[19]۔ دلیپ میں برادرم خلیق انجم کو بھی لکھ رہا ہوں اور امید ہے کہ وہ میرے خط کا اثر لیں گے۔

میں دہلی جانا چاہتا تھا لیکن جب دہلی جاؤ تو پانچ سو تو خرچ ہو ہی جاتے ہیں اور اب میری آمدنی کی راہیں محدود ہیں، محدود بچے کام کر رہے ہیں، آنکھ میں موتیا بند آ گیا تھا ۱۳ فروری کو آپریشن ہوا، ۲۱ فروری کو نرسنگ ہوم سے گھر آ گیا آپریشن کامیاب رہا، ۴ مارچ کو عینک کے لئے نظر کی جانچ ہوگی اس کے بعد ہی باہر نکل سکوں گا یا زیادہ لکھ سکوں گا۔ مئی میں ان شاء اللہ ضرور دہلی پہنچوں گا اپریل میں کلکتہ اور کٹک جانے کا ارادہ ہے۔

خلیق انجم کو میں تمہارے بارے میں لکھ چکا ہوں اور لکھ رہا ہوں۔ لیکن انجمن کی حالت بھی اچھی نہیں ہے، خلیق سارے [illegible] جات کیسے پورے کرتے ہیں تعجب کی بات ہے بہرحال میں [illegible] ہوں کہ وہ جو کچھ بھی کر سکتے ہوں ضرور کریں۔

میں ان دنوں بہت کم پڑھتا یا لکھتا ہوں اور چند [illegible] اور کبھی یہی حالت رہے گی۔

اور خدا کا فضل ہے اچھا ہوں۔ خدا کرے تم بخیر ہو ———

[illegible]

خیر اندیش ——— سہیل عظیم آبادی (دستخط)

(نوٹ ۱۹) شمع کو تیاگ کر بیسویں صدی اور دہلی اور انجمن سے آ ملی تھی لیکن یہاں بھی استحصال کی وہی صورت رہی۔ اصولوں کی بات وہی جرم رہی ٹھہرا۔ ادیب کیوں ہوں۔ چھپتا کیوں ہوں چنانچہ اپنے روحانی ذوق کو پامال ہوتے دیکھ کر یہاں سے بھی نکل کھڑا ہوا۔ اس لئے کہ یہ چند سکّے میرے ذہن و ضمیر کو خرید نہیں سکتے تھے۔ میں نے لاکھوں کمائے اور لٹا دئے تجارت جیسی خوشحالی کو لات مار کر ادب کے میدان میں آیا تھا اور ہر سانس کی قیمت چکائی تھی محض اپنے فن اور ذہن کو باقی رکھنے کے لئے خوشی لی

...وقت کو تولا بھی دی تھی۔ نکبت اور افلاس اور بڑھاپے کو
قبل از وقت گلے لگایا اور اپنے موٹی بچوں کو غیر محفوظ زندگی دے کر بھی
پچھتایا ہوں نہ پچھتایا ہوں ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں اور مانتا ہوں
کہ میں نہ جانتا کہ تم بلند ہوں نہ پیر، لیکن ہوں کہ میرے اندر کمزوریاں نہیں
ہیں لیکن یہ تو تا در مطلق اور جانتی۔ ماج کی بخشی ہوئی ہیں ۔۔۔ (ظ۔ک۔۱)

(نوٹ ۳) انجمن ترقی اردو، میں دس روپے پیسہ
پر وہ سارے سنجیدہ اور پیٹ بھگ میں پڑے ہوئے کام تمام ار
جو مستقل اور معقول تنخواہ لینے والے افراد سال بھر تک بھی انجام
دے سکے تھے باوجود اس کے کہ ہزاروں روپے انجمن سے ہر ماہ کما تے
رہتے ہیں وہ سیاہ و سفید کے مالک ہیں جنکو نہ دفتری اوقات و
امور کی تکمیل سے دلچسپی ہے نہ کسی اردو داں سے ہمدردی اور نہ لاکھوں
روپیوں کی کتابوں کو گودام کے گرد و غبار اور پانی میں گلنے کا قلق ہے
کیوں کہ وہ اپنے عہدوں کی بدولت معقول ذرائع آمدنی رکھتے ہیں
گو ہال متل نے بالکل صحیح مانگ انجمن ترقی اردو کے ارباب حل و عقد
سے کی ہے کہ وہ چار منزلہ بلڈنگ کی آمدنی کا حساب دیں اور اس
پر کافی سنسنی ادبی حلقوں میں پھیل گئی، جواب الجواب مضامین کا سلسلہ
اخبارات و رسائل میں چل نکلا ہے۔ لیکن نتیجہ ڈھاک کے تین پات ہی رہے
گا۔ کیونکہ بابائے اردو کی قربانیوں اور ورثہ کے مالک اور صلبی اولاد
غالب یہی افراد ہیں جو ادب اور انجمن کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں۔
(ظ۔ک۔۱۰)

ستائیسواں خط ۔۔۔۔۔ (ان لینڈ لفافہ)

SUHAIL AZIMABADI
NOOR MANZIL (اسٹامپ مہر)
SULTAN GANJ
PATNA-800006 BIHAR

۹ مارچ ۱۹۷۹ء برادرم کیفی محبت! ادھر میں نے بہت دنوں سے ملا صاحب کو خط نہیں لکھا ہے۔

میں نے تمہارے بارے میں برادرم خلیق انجم کو خط لکھ دیا تھا
آج ان کا خط آیا ہے۔ وہ بھی تمہارے کام سے مطمئن ہیں۔ انھوں نے
ہر ممکن مدد کا وعدہ کیا ہے۔

میری آنکھ اب تک ٹھیک نہیں ہوئی ہے لکھنے پڑھنے کا کام کم
ہی کرتا ہوں۔ اس لئے زیادہ کچھ نہیں لکھوں گا۔ تم خلوص اور ایمانداری
سے اپنا کام کرتے جاؤ۔ اپریل یا مئی میں تو میں دہلی پہنچوں گا ہی۔
انشاء اللہ۔

خدا کرے تم اچھے ہو ۔۔۔۔۔ والسلام
مخلص ۔۔۔۔۔ سہیل عظیم آبادی (دستخط)

اٹھائیسواں خط ۔۔۔۔۔ (ان لینڈ لفافہ)

SUHAIL AZIMABADI
NOOR MANZIL (اسٹامپ مہر)
SULTAN GANJ
PATNA-800006 (Bihar)

۲۸ مارچ ۱۹۷۹ء برادرم، محبت!

خط مورخہ ۲۲ مارچ کل شام کو ملا۔ اردو اکادمی کے پرانے
چپراسی میرے نام کے خط پہنچا دیتے ہیں ویسے خود اکادمی کے دفتر نہیں
جاتا۔ کوئی اختلاف نہیں، لیکن دوسرے آنکھ کے آپریشن کے بعد
دھوپ اور گرمی سے بچنا ضروری ہے۔ پڑھنا لکھنا بھی کم ہی ہوتا ہے
ویسے آپریشن کامیاب رہا۔ ۴ اپریل کو عینک کے لئے نمبر مل جائے
گا۔ ابھی تو ایک آنکھ سے کام لیتا ہوں۔

میں تمہارے بارے میں خلیق انجم کو لکھا تھا۔ انہوں نے بھی تمہاری
تعریف کی تھی اور ہر ممکن مدد کا وعدہ کیا ہے۔ ابھی شاید تم کسی دوسرے
آدمی کے فرصت پر جانے کی وجہ سے اس جگہ کام کر رہے ہو۔ خلیق نے لکھا
تھا کہ شاید وہ صاحب واپس نہیں آئیں گے۔ تو تمہیں مستقل جگہ مل جائے
گی۔ انشاء اللہ۔

ان کے گھر کا پتہ نہیں معلوم، دریافت کرکے لکھو اب تو امید ہے کہ جلد کسی جلسے میں شرکت کے لئے دہلی جانا ہوگا۔ ملاقات ہوگی۔ [illegible] لوگوں سے بھی تمہارے بارے میں باتیں کروں گا۔

یہ اچھا ہی ہوا کہ تم نے در بھنگا جاتے ہوئے مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی، میں ایک تقریب میں باہر چلا گیا تھا۔ دو دن بعد لوٹا [illegible] لاہور سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا اور تیسرا ۱۹۴۲ء میں حیدرآباد سے، تیسرا مجموعہ "سوغات" ساقی بکڈپو دہلی سے شائع ہونے والا تھا ۱۹۴۷ء میں، مگر وہاں آگ اور خون کے کھیل میں سب ختم ہو گیا۔ بہت سے افسانوں کی نقل بھی میرے پاس نہیں۔ ویسے بھی بہت احتیاط نہیں برتتا ۱۹۶۳ء میں "بے جڑ کے پودے" اور ۱۹۶۷ء میں "چار چہرے" شائع ہوا دونوں انجمن کی تجارتی الماریوں میں ہیں ایک مجموعہ ممکن ہے اس سال آجائے انشاء اللہ خوبی کی بات یہ ہے کہ میرے پاس میری کوئی کتاب نہیں، تم ہندی والے چھاپنا چاہتے ہو لیکن میرے پاس [illegible] کہ ہندی میں لکھواؤں۔

انشاء اللہ جلد ہی ملاقات ہوگی۔

میں اردو اکادمی کے دفتر میں نہیں جاتا، سکریٹری کو خط لکھو وہ بھجوا دیں گے۔

انجمن کی مجلس عاملہ میں پانچ جگہیں خالی ہوئی ہیں، انتخاب ہونے والا ہے میں امیدوار کھڑا کرنے والا ہوں، دیکھو کیا ہوتا ہے ویسے امید ہے کہ ایک دو آدمی میرے آ ہی جائیں گے۔ بھائی جلیق کو اور حبیب احمد خاں کو لکھا ہے کہ انجمن کے ممبروں کی فہرست اور ان کے پتے بھیج دیں تم کو بھی لکھتا ہوں وہ سب سائیکلو اسٹائل میں بھجوا دو [illegible] سب کو خطوط لکھنے ہیں

[illegible] حالات اچھے ہیں، خدا کرے اچھے ہو　　　　والسلام

غیر اندیش
سہیل عظیم آبادی (دستخط)

[illegible] مہر کی شکل میں ہے

تمہارا پتہ صاف نہیں

فلمی ستارے اردو میگزین اور ترکمان گیٹ کے درمیان کیا لفافہ جانا لکھو۔ ویسے امید ہے کہ خط مل ہی جائے گا۔

(نوٹ (۲) مارچ ۱۹۷۴ء کے وسط میں دربھنگا اردو کانفرنس میں امیر یا سر لے گیا تھا، پٹنہ میں چند گھنٹے رات میں اپنے عزیزوں کے ساتھ رکا تھا سوچا تھا سہیل صاحب سے بھی ملوں گا لیکن شاید یہ بھول گیا تھا کہ میں ایک ادیب نہیں۔ دس روپے پر بکا ہوا ایک آدمی ہوں۔ یہی وجوہ ہیں کہ کانفرنس کے کسی اجلاس یا مشاعرے میں بھی بہ حیثیت ادیب کے شرکت نہیں کر سکا تھا سخت ترین سردی میں کالج گراؤنڈ میں انجمن ترقی اردو کے بک اسٹال پر سیلزمین بنا [illegible] لات میں جو کیا اس کی کتابیں اور جلسوں کے ارباب حل و عقد [illegible]

(نقش [illegible] آل خطاب [illegible] ان لیڈ لعاد)

۲۶ اپریل ۱۹۶۹ء

[illegible] برادرم کیفی

خط ملا اور کہانی بھی [illegible] کر افسوس ہوا کہ اب آپ انجمن میں نہیں ہیں، میں سمجھ رہا تھا کہ آپ کی جگہ مستقل ہو گئی ہوگی۔ ادھر برادرم جلیق انجم کا خط آیا تو انہوں نے بھی کچھ نہیں لکھا۔ ادھر بہت پریشان تو رہا، بہار کے شہر جمشید پور میں فرقہ وارانہ فساد ہو گیا لگ بھگ پانچ سو ہندو مسلمان مرے۔ ہندوستان کی قسمت پر رونا آتا ہے۔ کیا یہاں کے بسنے والے وحشیوں کی زندگی گزاریں گے۔ کبھی مہذب انسان نہ بنا چاہیں گے یا نہیں [illegible] فساد دیکھے تھے ذاتی طور پر بھی صدمے کا سبب ہے، اردو کے مشہور افسانہ نگار زکی انور اس فساد میں شہید کر دئے گئے ہیں وہ مجھے چھوٹے بھائی کی طرح عزیز تھے۔ میرے ساتھ چھ سال رہے تھے بے حد مخلص، ایماندار، سنجیدہ [illegible]

اور شریف انسان تھے۔ دل اور دماغ پر عجیب کیفیت طاری ہے خدا مرحوم کو اپنے دامن رحمت میں جگہ دے۔

آپ نے "زبان وادب" کے لئے میرے پاس کہانی بے کار بھیجی، میں نے اردو اکادمی کی سکریٹری شپ سے استعفا دیدیا تھا اردو اکادمی نہیں جاتا ہوں اس لئے "زبان وادب" کے لئے آپ کی کہانی نہیں دے سکوں گا۔ اگر کہئے تو "سہیل" کو بھیج دوں۔ یا پھر آپ کو واپس کردوں، دوسری کہانیوں کے بارے میں بھی آپ سید محمد زبان وادب کے ایڈیٹر کو لکھئے۔ زیادہ مناسب ہے میرے لئے مناسب نہیں۔

امید ہے کہ مئی کی کسی تاریخ کو انجمن کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہوگا اور میں دہلی پہنچوں گا۔ ان شاء اللہ ملاقات ہوگی۔

حالات بہتر ہیں خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

والسلام۔

خیر اندیش سہیل عظیم آبادی (دستخط)

(نوٹ ۲۲) زکی انور کی موت پر ماہنامہ "شمع ستارے" کے ایڈیٹر انیس دہلوی کو اس حقیقت نے متوجہ کیا کہ ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا جائے چنانچہ مہرولی دہلی میں اس جلسہ کا انعقاد کیا گیا۔ گنتی کے ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی، دو ایک مضمون پڑھے، قابل الذکر برگزیدہ شخصیت حضرت کوثر چاند پوری کی تھی جنھوں نے زبانی تعزیت پیش کی۔ باقی افراد نے سیاسی سطح پر معاصلہ خشمناک کا مظاہرہ اپنے طریقوں سے کیا۔ میں نے ایک مضمون زکی انور کی موت پر لکھا تھا جو جہات دہلی میں بہت تاخیر سے چھپا۔ لیکن آج تک اس کی کوئی کاپی مجھے حاصل نہیں ہوسکی۔ کاش میں اس مضمون کو پندار یا سہیل وغیرہم میں برائے اشاعت بھیج سکتا۔ مجموعی طور پر اردو کے ادیبوں نے منظم طور پر کوئی احتجاج زکی انور کی دردناک موت پر نہیں کیا اور نہ ہی ان رسائل وجرائد کے مدیران نے دلچسپی لی۔ جنھوں نے زکی انور کی تخلیقات کے ذریعے اردو کے نام پر کاریں اور کوٹھیاں بنا لی ہیں، منجملہ اردو ادارے اور ان کے ٹھیکیدار و مالکان، سنبالک اور کتا دھرتا ایماندار ہرگز نہیں ہیں یہ "اردو، اردو، اردو خطرہ خطرہ" کا ڈھول شب و روز پیٹ کر صرف اپنا الو سیدھا کرتے ہیں جبکہ بلّے اور نزن یا اتہ تک کے گوشے گوشے میں اردو داں موجود ہیں جو ہر سال کروڑوں روپیوں کی کتابیں بھاری قیمتوں کے علاوہ کئی کئی گنا زیادہ رقم خرچ کر کے حاصل کرتے ہیں اور تب بھی اردو ادارے والے یہی شور مچاتے ہیں نہ اردو رسالے اور کتابیں خریدنے والے ناپید ہو چکے ہیں (ظ کتال)

آخری تیسواں ۳۰ خط — (ان لینڈ لیٹر)

مئی ۱۹۶۹ء

برادرم محبت!

خط ملا۔ حالات معلوم ہونے سے رنج ہوا۔ زکی بہت پیارے چھوٹے بھائی کی طرح عزیز تھے ان کے بڑے بھائی ابو یوسف مرحوم میرے دوستوں میں تھے ان کی موت کے بعد زکی کا کوئی بڑا بھائی نہ رہا۔ اور میرا کوئی چھوٹا بھائی نہیں تھا۔ پانچ سال میرے ساتھ رہے پھر الگ ہوئے تو بھی برائے نام، جو رشتہ قائم ہو گیا تھا وہ روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ ان کی حیثیت گھر کے ایک فرد کی تھی۔

اللہ کا کرم ہے بچے محفوظ ہیں۔ بڑی لڑکی اسی کالج میں لکچرر ہے جہاں وہ لکچرر تھے۔ ذرا ڈاکٹر اجازت دے تو جمشید پور جاؤں، ابھی تو بہت گرمی پڑ رہی ہے اور ڈاکٹر اجازت نہیں دیتا۔ تمہاری کہانی اکادمی کو بھجوا دونگا میں نہیں جاتا۔ بات یہ ہے کہ جہاں میں سب کچھ تھا وہاں کچھ نہیں بن کر جانا مجھے پسند نہیں، میری طبیعت ایسی ہی واقع ہوئی ہے۔

اور حالات اچھے ہیں خدا کرے تم مع متعلقین بخیریت ہو۔ شاید مئی کے آخر میں انجمن کا جلسہ ہو اور میں دہلی آؤں تو تمہیں اطلاع دے دوں گا۔

والسلام — خیر طلب — سہیل عظیم آبادی (دستخط)

(نوٹ ۲۳) افسوس کہ سہیل صاحب سے میری دوسری ملاقات نہ ہو سکی وہ دہلی تشریف لائے تھے، پھر علی گڑھ تشریف لے گئے تھے اور پھر الہ آباد غالباً "سہیل کے پریم چند نمبر" کے سلسلے میں گئے تھے اور وہیں، اردو افسانہ کا یہ روشن چراغ ۱۹ نومبر کو گل ہو گیا، لیکن ان کے خلوص و محبت کی روشنی نہ صرف اردو داں طبقہ کو حقوق کی حصولی کیلئے راہ دکھاتی رہیگی بلکہ اردو داں افسانے کی بقا اور آبرو کو بھی

دارالمصنفین
اعظم گڑھ

برادرم ۔ السلام علیکم

آپ کا خط ملا ۔ یاد آوری

سہیل عظیم آبادی کی اچانک وفات سے انتہائی دکھ ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اپنا قریبی عزیز ہم سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا ۔ چنڈی گڑھ ... ساتھ رہا تھا ۔ پھر واپسی میں دلی تک ہم لوگ ریل گاڑی میں ساتھ رہے ۔ وہ برابر نظروں میں گھوم رہے ہیں انکی شرافت اخلاق کا بڑا قائل رہا ۔ کسی جھگڑے میں نہیں پڑتے ۔ متنازعہ باتوں سے پرہیز کرتے الجھی ہوئی باتوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے ۔ ان کی بہت سی باتیں یاد آتی ہیں ۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ تعزیت میں ان کے یہاں کس کو خط لکھوں کسی کا نام معلوم نہیں اُن کے لڑکوں اور بھائیوں میں سے کسی سے ملاقات ہوں تو میرے غمناک جذبات ان لوگوں تک پہونچا دیں ۔

آپ کی کتاب تشکیلِ جدید پر جلد ریویو ہو جائے گا ۔ خدا کرے آپ طرح مع الخیر ہوں والسلام

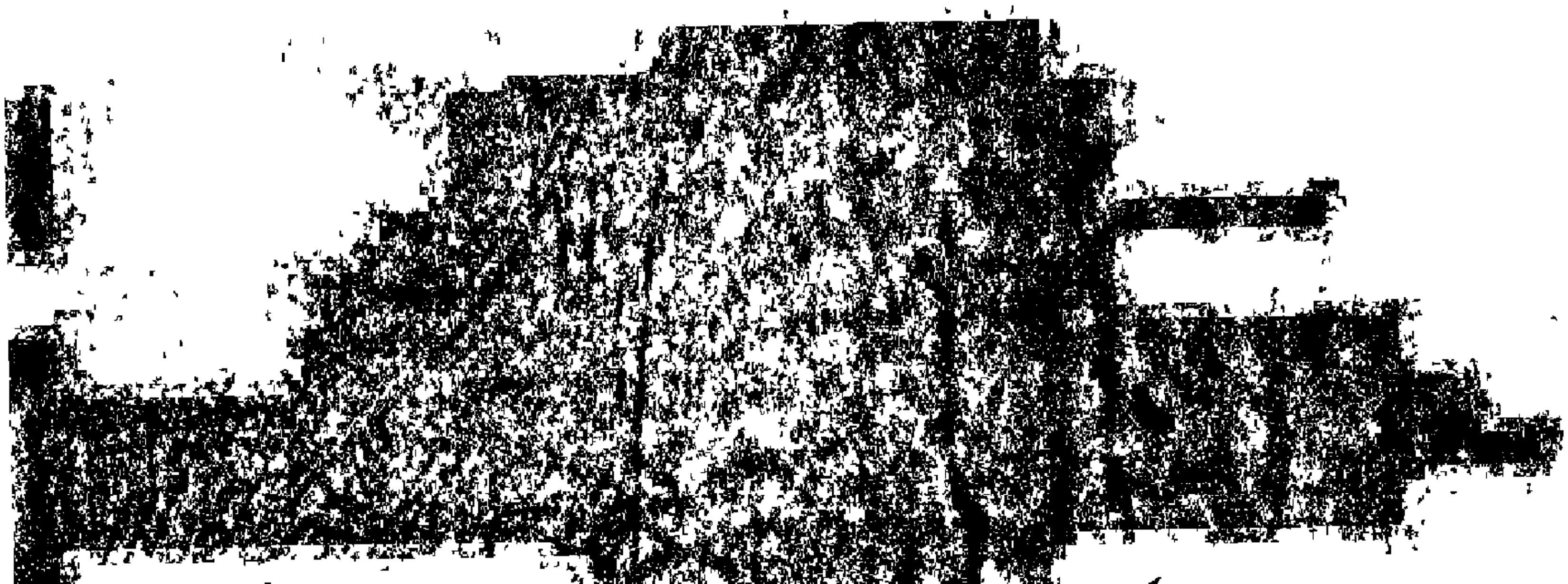
سید صباح الدین عبدالرحمٰن
مدیر معارف

بخدمت جناب پرویز
عالم گنج پٹنہ

نامے جو مرے نام آئے

اُردو کے تمام نامور ادیبوں سے سہیل عظیم آبادی کے ذاتی تعلقات تھے۔ اُن کے نام سینکڑوں ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے خطوط کا ایک انبار ہے، جو اگر شائع کر دیئے جائیں تو گذشتہ پچاس سال کی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں پر خاص روشنی ڈالیں گے لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں ـــــ سرِ دست منشی دیا نرائن نگم اور مولوی عبدالحق کے چند خطوط شائع کئے جا رہے ہیں۔

(مرتب)



افسانوں کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ اپنا ماحول ہوتا ہے اور اس کے کرداروں کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔ یہ کردار سربلند اور توانا بھی ہوتے ہیں۔ اور حقیر اور کمزور بھی ـــــ ان کرداروں میں اتنی ہی رنگا رنگی ہوتی ہے جتنی انسانی کرداروں میں۔ کامیاب افسانہ نگار وہی ہے جو ان سارے کرداروں کی نبض پر انگلی رکھ سکے۔ جو ان کے قلب کی حرکت اور خون کی رفتار کو سمجھ سکے۔ اگر کوئی افسانہ نگار اسے نہیں سمجھتا اور کرداروں کی طاقت سے زیادہ بوجھ اُن پر ڈال دیتا ہے تو وہ اپنے کرداروں کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔ ایسے افسانہ نگار کوئی ایسا کردار پیدا ہی نہیں کر سکتے جس کی عمر طویل ہو اور ایسے کرداروں کی تخلیق کا کوئی حاصل نہیں جو پیدا ہوتے ہی مر جائیں۔ جن افسانوں میں کردار زندہ اور صحت مند نہیں ہوتے انہیں کرداروں کا قبرستان کہنا زیادہ درست ہے۔

"سہیل عظیم آبادی"

منشی دیا نرائن نگم

ایڈیٹر "زمانہ" کانپور کے خطوط ۔ سہیل عظیم آبادی کے نام

(1)

۴ مارچ ۳۹ء

دی زمانہ پریس کانپور۔ E/155, 39

کرمی، تسلیم

کارڈ گرامی مورخہ ۹ رجنوری صادر ہوکر باعث شکریہ ہوا تھا۔ ادھر عرصہ تک کسلمند رہا۔ اس وجہ سے جواب نہ دے سکا۔ امید کہ معاف فرمائیں گے۔

رسالہ زمانہ ہندوستانی کے بدلے میں برابر ارسال خدمت ہورہا ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ دسمبر کا پرچہ ڈاکخانہ کی نذر ہوگیا۔ بہرحال مکرر بھجوا رہا ہوں۔

ہندوستانی پر ریویو کر کے کاتب کے حوالے کردیا گیا ہے۔ عنقریب ہی درج رسالہ ہوگا۔ اطمینان فرمائیے۔

آپ کا اشتہار بھی زمانہ کے زیر ترتیب پرچہ میں شائع کر دیا جائے گا۔ مگر کسی قدر اختصار کے ساتھ۔ کیونکہ اشتہار کی کاپی تقریباً مکمل ہوچکی ہے۔

جس مضمون کا آپ نے وعدہ کیا ہے اگر وہ مکمل ہوگیا ہو تو بھیج دیں۔ کانپور کے فسادات کا حال تو آپ نے پڑھا ہی ہوگا۔ ابھی فضا بالکل صاف نہیں ہے۔ مگر امن ہوگیا ہے۔ دیکھیں ہم لوگوں کو پرامن زندگی بسر کرنے کا کب سلیقہ آتا ہے۔

یہاں بفضلہ خیریت ہے۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیریت ہوگا۔

نیازمند۔ دیا نرائن نگم

کانپور

۲۴ مارچ ۱۹۳۹ء

میرے محب و مکرم تسلیم

آپ کا نوازش نامہ معہ کہانی ملا۔ ننھے میاں کو لطیف میاں کہوں گا اور اُن کی درازیٔ عمر و بلندیٔ اقبال کے لئے دعا کروں گا۔

حق پرست صاحب (......) آپ کے خط کا جواب بھیجا ہے جو ملفوف ہے۔ پچھلے دنوں ان پر بھی ایک سانحہ عظیم گذرا ہے۔ ایک روز کے لئے کانپور بھی آئے تھے۔ خوب لطفِ صحبت رہا اور ہم دونوں نے رنج و غم میں ایک دوسرے سے شرکت کی۔ قصہ سرسری دیکھ چکا ہوں۔ اپنے طرز پر اچھا ہے۔ آپ نفسیاتی قصے لکھتے ہیں۔ لیکن میرے خیال سے روزمرہ کے معمولی معمولی واقعات کیوں نہ ...... لکھئے جن سے آئے دن انسان دوچار ہوتے رہتا ہے اور جن کا زندگی پر بہت دیرپا اور مستقل اثر رہتا ہے۔

امید کہ آپ اور ننھے میاں اور ان کی مادر مہر سب اچھی طرح ہوں گے۔

آپ کا

دیا نرائن نگم

مسوری ۹ر جولائی ۱۹۳۹ء (۳)

میرے محب و مکرم سہیل صاحب تسلیم عرض۔

آپ کے خطوط ۹ر و ۱۱ر جون کے وقت پر مل گئے تھے۔ افسانہ بھی ملا۔ میں اس اثنا میں ایک لڑکی کی علالت سے جو میرے ساتھ یہاں آئی تھی، بہت متردد رہا۔ اس لئے آپ کے نوازش ناموں کا جواب بھی نہ لکھ سکا۔ خواستگار معافی ہوں۔ ہندوستانی کا اس اثنا میں کوئی پرچہ میری نظر سے نہیں گذرا۔ ممکن ہے کانپور میں آیا ہو — رانچی نہ آسکنے کا مجھے بھی بے حد افسوس ہے۔ خیر یار زندہ صحبت باقی۔ شاید کبھی آئندہ موقع ملے۔ ہندوستانی سے آپ کی علاحدگی مجھے اس لئے شاق ہوئی کہ آپ نے اسے ایک مخصوص لائن پر چلانے کی کوشش کی تھی۔ اردو میں یوں تو آئے دن رسالے نکلتے رہتے ہیں۔ لیکن بہت ہی کم پرچے ایسے ہیں جن کے ایڈیٹر کسی خاص مقصد کو سامنے رکھ کر کام کرتے ہیں۔ خیر ابھی آپ کے سامنے بہت سے مواقع آئیں گے۔ میری بڑی خواہش ہے کہ آپ کے لئے ہندوستانی اکیڈمی میں گنجائش نکل سکے۔ لیکن ابھی تو اکیڈمی کی قلب ماہیت ہو رہی ہے دیکھئے آئندہ چل کر یہ کیا روپ اختیار کرتی ہے اس وقت البتہ کچھ کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ آج کل میں اس کے کمیٹی کا رکن بھی نہیں ہوں۔

کاش زمانہ آپ کو جذب کر سکتا یا آپ کے حالات آپ کو اس کے لئے فنا ہونے کی اجازت دیتے۔ لیکن آپ اپنی جگہ پر خوب کام کر رہے ہیں اور زمانہ کا بھی یہی مطلب ہے کہ ملک کی ادبی خدمت زیادہ عام اور حب وطن کے جذبات مدنظر رکھ کر کی جائیں۔ کام و ہی ہے خواہ صورتیں مختلف ہوں۔ اس لئے ہم لوگ اگر یکجا ایک جگہ ساتھ بیٹھ کر کام نہیں کر سکتے تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں ہے

زمانہ کے لئے ادیب کی آرزو کے سلسلہ میں جو مضمون آپ لکھنا چاہتے تھے اس کو مکمل کر لیں تو جلد مرحمت فرمائیں۔ قاضی نذر الاسلام کی نظم کے ترجمے کا بھی انتظار رہے گا۔

آپ کی کہانی کا شکریہ۔ میں نے اسے حتی الوسع غور سے پڑھا ہے۔ لیکن معاف کیجئے گا مجھے اس کا وہ حصہ جس پر آپ نے خصوصیت سے زور دیا ہے پسند نہیں۔ اس لئے نہیں کہ اس میں ...... کے خلاف کوئی بات ہے بلکہ اس لئے کہ یہ EPISODE بالکل خلاف قیاس اور اس لئے قابل رد ہے۔ آپ نے خواہ مخواہ کو بھوک اور جنسی احساسات میں تصادم کرایا ہے۔ آپ کا نظریہ شاید صحیح ہو لیکن آپ نے جس طرح اس کو اس قصے میں پیش کیا ہے وہ خلاف واقعہ ہے۔ شروع میں آپ نے قصہ خوب اٹھایا ہے۔ لیکن آخر میں اس کی اگلی شان باقی نہ رہی۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو میری اس نکتہ چینی سے غلط فہمی نہ ہوگی۔ آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کا مداح اور قدر دان ہوں۔ اس وقت محض دوستانہ حیثیت سے بے تکلفانہ اظہار رائے کیا گیا۔ ورنہ یہ افسانہ بیسوں دوسرے قصوں سے دلچسپ ہے۔ میں اسے واپس نہیں بھیج رہا ہوں۔ اگر آپ پسند کریں تو اس میں زمانہ کے لئے کچھ ترمیم و تنسیخ کر دیں ورنہ جیسی رائے ہو مطلع فرمائیں۔ مسودہ میرے پاس با احتیاط محفوظ ہے۔

کل پرسوں کانپور واپس جانے کا ارادہ ہے۔ شاید راستے میں دو ایک روز ہردوار ٹھہروں۔

اس لئے ۱۴/ ۱۵/ جولائی تک کانپور پہونچوں گا۔ جواب
کانپور عنایت فرمائیں۔
امید کہ مزاج مبارک بخیریت ہوگا۔

آپ کا
دیا نرائن نگم

---

(۴)

کانپور
۴ر جنوری ۱۹۴۰ء

میرے مکرم تسلیم عرض۔

آپ کا محبت نامہ ملا۔ مجھے لکھنؤ ریڈیو کے لئے
ایک مضمون لکھنا تھا۔ اس میں مصروف رہا۔ اس لئے
پہلے نہیں لکھ سکا۔

انجمن ترقی اردو اور ساہتیہ سمیلن کے متعلق آپ
کی رائے صحیح ہے۔ آپ نے وہ لطیفہ سنا ہوگا جس میں
ایک گورو مہاراج کے دو چیلوں نے گورو جی کی ٹانگیں
آپس میں تقسیم کرلیں۔ اور جب ایک چیلے نے غلطی
سے دوسرا پاؤں دابنا شروع کیا تو فوجداری ہوگئی
اور دونوں چیلوں نے گورو جی کے دونوں پاؤں
توڑ کر رکھ دیئے۔ یہی حال آج کل ہماری ادبی
سوسائٹیوں کا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مضمون
لکھو۔ لیکن کیا لوگ صاف گوئی پسند کریں گے۔
آپ نے سنا کہ انجمن اردو کی دہلی میں جو کانفرنس ہوئی
اس میں بھی مذہب کا رنگ غالب رہا۔

آپ جو مضمون لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں شوق سے
لکھئے۔ مجھے اس کے چھاپنے میں عذر نہ ہوگا۔ ایک
اور لمبا چوڑا مضمون کئی ماہ سے میرے پاس لاہور
کے ڈاکٹر موہن سنگھ صاحب کا رکھا ہوا ہے۔
لیکن اسے بھی ایک اسی خوف سے نہیں چھاپا کہ اکثر
احباب کو ناپسند ہوگا۔ لیکن اب میں ... کر چکا ہوں۔

حق پرست صاحب کا خط آیا تھا۔ بھیج رہا ہوں
آج کل وہ بڑی تردد میں پھنس گئے ہیں۔ بیوی نرسنگ
ہوم میں بیمار پڑی ہیں۔ لیکن آج کے خط سے معلوم ہوا
کہ کچھ افاقہ ہے۔ اور شاید سخت ترین منزل گذر چکی
ہے۔ لیکن ابھی صحت میں دیر ہے۔ خدا کرے انہیں
جلد ہی اس فکر سے اطمینان نصیب ہو۔

موصوف نے اس خط میں اپنا پتہ لکھ دیا ہے۔
بعض مصلحتوں سے ان کو مضامین میں نام کے اخفا کی
ضرورت ہے مگر میں نے انہیں اطمینان دلا دیا ہے کہ
آپ کو بلا تکلف ہمراز بنا سکتے ہیں۔ کیونکہ آپ جیسے
مخلص محب سے کسی کو نقصان نہیں پہونچ سکتا ہے۔

ننھے میاں کو دعائے درازیٔ عمر۔ خدا کرے
نیا سال آپ کو بیگم سہیل کو اور لطیف میاں کو مبارک ہو۔
جوبلی نمبر تلاش کر کے بھیج دوں گا۔

آپ کا
دیا نرائن نگم

---

(۵)

کانپور
۲ر اپریل ۱۹۴۰ء

مائی ڈیر سہیل صاحب!

... کے تینوں عنایت نامے یکے بعد دیگرے
... شرمندہ ہوں کہ آپ کو اتنے دنوں تک
انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔ ۱۴ر اپریل (ممکن ہے
تاریخ لکھنے میں سہو ہوا ہو۔ ادارہ) چنانچہ وہاں سے
تین دن مدہوش صاحب کے بعد فتح پور سیکری
اور وہاں سے متھرا اور بندرا بن گیا جہاں تین چار
دن لگ گئے۔ بندرا بن میں بڑا لطف آیا۔ کرشن
لیلا کی جگہ ہے۔ ہولی کا زمانہ تھا۔ اچھا لطف آیا۔
وہاں سے کانپور آیا تو دو ہی تین دن بعد یہاں

یار لوگوں میں پھر جھگڑا ہو گیا۔ ایک فریق کہتا تھا کہ مسجد کے سامنے ہولی نہیں جلائی جا سکتی۔ دوسرا فریق مصر تھا کہ ہولی جلے گی تو اسی جگہ۔ اس پر تکرار اور اس کے بعد فساد ہو گیا۔ بہادروں نے دس آدمی تو جان ہی سے مار ڈالے اور تقریباً تیس چالیس آدمی زخمی کر دیئے یہ بیچارے موقع واردات پر نہیں مارے گئے بلکہ انکا دستا صلوں کی نذر ہو گئے۔ بھلا بتائیں تو ہی جس ملک میں بے گناہ راہگیروں پر اس طرح حملے ہوں وہاں سوراج میں بھی کتنی کسر ہے۔

آپ کانگریس، مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد کی شکایت کرتے ہیں اور شاید یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ بلند بانگ ریزولیشن پاس کر کے یا عدم اشتراک عمل وغیرہ کی دھمکی دے کر ملک آزادی کامل حاصل کر سکتا ہے۔ حالانکہ ہماری نجات بہت مشکل ہے۔ گونا گوں پیچیدگیوں نے ہمارے مسئلے کو اور بھی ناقابل حل بنا رکھا ہے۔ انتخاب جداگانہ کا طریقہ اب رنگ لایا ہے اور جناح صاحب ملک کا بٹوارہ کرانے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ ایسی صورت میں یاد الٰہی کیجئے یا چرخہ کاتئے۔ انگریز سے مصالحت کے بغیر کام نہ چلے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس وقت دیر تک ملک میں کوئی منظم ستیہ گرہ جاری نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے گرم دل والے احباب کتنا ہی زبانی شور و غل کیوں نہ مچائیں مگر اس وقت ملک کسی اہم تحریک کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ملک میں کافی بیداری پیدا نہیں ہوئی یا کچھ لوگ ہر قسم کی قربانیوں کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مگر منظم طاقت سے برسرپیکار ہو کر فتح اور غلبہ حاصل کرنا کارے دارد۔ محض ہمت و بہادری سے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی ہے راجپوتوں سے زیادہ کون بہادر تھا۔ مگر باہمی نفاق نے ان کی طاقت اور بہادری دونوں کو بے اثر بنا دیا۔ بہرحال دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

آپ کا
[illegible]

کانپور
۱۰ مئی سنہ ۱۹۴۰ء

میرے مکرم، تسلیم عرض

آپ کا ایک خط دہلی سے اور دوسرا پٹنہ سے آیا میں یکم مئی کو پٹنہ گیا تھا۔ سنہا صاحب کے اصرار سے تین دن مسلسل قیام رہا۔ لیکن یقین مانئے آپ کے بغیر لطف نہیں آیا۔ میں نے اطلاعی کارڈ بھجوا دیا تھا لیکن آپ دہلی میں بہت دن رہے اور پٹنہ دیر میں پہونچے۔ غالباً فساد کی خبریں نہ ملتیں تو ابھی چند دن اور وہیں قیام رہتا۔

مجھے دلی افسوس ہے کہ اس دفعہ تھوڑی دیر کا بھی موقع نہ ملا۔ مجھے لکھنؤ جانا پڑا اور واپسی پر جو امید تھی وہ پوری نہ ہو سکی۔ اب دیکھئے کب تک موقع ملتا ہے میں اگست میں پھر پٹنہ آؤں گا۔ فی الحال اگلے ہفتہ راجپور (دہرہ دون) جانے کا ارادہ ہے۔ وہاں سے جولائی میں واپسی کا ارادہ ہے۔ آپ نے فسادات کا جو بھیانک حال لکھا ہے اسے پڑھ کر بڑی کڑھن ہوئی پٹنہ میں میرے سامنے بھی لوگوں کو تردد ہو رہا تھا لیکن سمجھدار لیڈران سرگرم کوشش تھے کہ جس طرح سے ہو سکے تشدد کا بازار گرم نہ ہو۔ کانپور میں بھی

ہائک فساد ہو گیا۔ مصیبت یہ ہے کہ ابھی تک لوگوں میں رواداری کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی۔ اگر پاکستان ڈ... ہوتا ہے تو اپنا پاکستان سے کیوں کہتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پولیٹیکل اختلافات تشدد سے کیسے طے ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر یہ خلاف عقل اسکیم چلائی گئی ...ب کو کچھ عرصے کے لئے ...... کی بدترین صورت کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ بہار میں راجندر بابو موجود ہیں اس لئے اس وقت صورت حال اطمینان بخش ہے ...رے صوبوں کا کیا حشر ہوگا۔ ڈھاکہ اور ...اد کی خبروں نے عجیب ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ خدا خیر کرے۔ آپ کے اہل و عیال کی خیریت ... رہتے ہر وقت دست بدعا ہوں ... کرم مفصل حالات سے مطلع فرمائیں تاکہ رنج کر دو ...

...آپ کا مضمون ملا۔ پہلا مضمون (موسیقی) زمانہ مئی میں درج ہو رہا ہے۔ یہ مضمون زمانہ جون میں درج ہوگا۔ سلسلہ خوب ہے۔ لیکن اگر آپ نظر ثانی کرتے، ذرا مختصر اور Terse کر دیتے تو بہت خوب ہوتا۔ ایسے مضامین میں میری رائے میں واقعات کا بیان کرنا ہی کافی ہونا چاہیئے۔ زیادہ Comment کی ضرورت نہیں۔ آپ نے جگہ جگہ پر رائے زنی کی ہے جس سے مضمون کی اہمیت میں فرق آ گیا ہے میں نے خفیف سا رد و بدل کر دیا ہے۔ اُمید کہ آپ ناپسند نہ کریں گے۔

...... کے متعلق چند سطروں کا نوٹ لکھ دیجئے گا۔ درج زمانہ کر دوں۔ زمانہ کے متعلق سر تیج بہادر نے خاص کوشش کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ دیکھئے کوئی نتیجہ بھی نکلتا ہے یا نہیں اصل مشکل یہ ہے کہ اس کے لئے پیچھے پڑنے کی ضرورت ہے۔

ویا زاتی تحکم

منٹو ایک عظیم فنکار تھا۔ اس کی عظمت یہ نہیں کہ اس نے بہت سے افسانے لکھے۔ اس کی عظمت یہ بھی نہیں کہ وہ ایک پبلشر کے گھر بیٹھ کر ہر روز ایک افسانہ لکھ کر اس سے شراب کے لئے روپے وصول کر لیا کرتا تھا اس کی عظمت یہ بھی نہیں کہ جب اس کا جی چاہتا تھا وہ قلم اٹھا کر افسانہ لکھنا شروع کر دیتا تھا اور ختم کر کے اٹھتا تھا۔ منٹو کی عظمت اس کی بیباکی اور صاف گوئی میں مضمر ہے اس کو جو چیز جیسی نظر آتی تھی ویسا ہی بنا کر اسے پیش کرتا تھا اور اس کی کبھی پروا نہیں کرتا تھا کہ کوئی اسے کیا کہے گا۔ اس نے دوسروں کے کہنے کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ وہ سماج کی گندگیوں کو کرید کرید کر نکالتا تھا اور ایک جگہ پر اس طرح اکٹھا کر کے رکھ دیتا تھا کہ دیکھنے والوں کو گھن آنے لگتی تھی۔ جن باتوں کو لکھتے وقت بڑے بڑے فنکاروں کے قلم میں لغزش پیدا ہو جاتی تھی منٹو کا قلم اسے بڑی آسانی اور بے تکلفی کے ساتھ لکھ جاتا تھا۔ منافقت سے اسے نفرت تھی۔ اور اس کے فن کا مقصد تھا سماج کے چہرے سے منافقت کی نقاب ہٹا دینا اور اس مقصد میں منٹو اپنے سارے ہمعصر افسانہ نگاروں سے کامیاب تھا

"سہیل عظیم آبادی"

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے خطوط — سہیل عظیم آبادی کے نام

(۱)

۱۔ دریا گنج۔ دہلی
۲۰ر فروری ۱۹۴۱ء

مکرمی تسلیم

آپ کا خط پہنچا۔ میں آج لائل پور اور لاہور کے سفر سے واپس آیا ہوں۔ مجھے اس سے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ چھوٹا ناگ پور میں کام کرنے کے لئے بے تاب ہیں۔ اس سے بڑھ کر میرے لئے کوئی خوشخبری نہیں ہوسکتی۔ مجھے کامل یقین ہے کہ آپ کو ضرور کام یابی ملے گی۔ اس میں ... آپ کے خط کا منتظر رہوں گا۔

(۲)

۱۔ دریا گنج۔ دہلی
۴ر مارچ ۱۹۴۱ء

مکرمی سہیل صاحب سلمہ

آپ کے دونوں خط پہونچ گئے۔ میں لائل پور اور لاہور سے آکر رام پور چلا گیا تھا۔ وہاں نواب صاحب : رام پور نے ایک اکیڈمی کا افتتاح کیا تھا۔

آپ کا خیال بہت اچھا ہے۔ ہماری زبان اور ... فنڈ کا کام بھی ساتھ ساتھ ہوتا رہے تو مناسب ہے۔ ہماری زبان کے پرچے بھیجے جاتے ہیں۔ ... فنڈ کے لئے ایک اپیل بھی چھپوا رہا ہوں۔ اس کی کاپیاں انیس الحق[1] فخرالدین صاحب کو بھیجوں گا۔ اُن سے آپ کو بھی مل جائیں گی۔

مجھے اس کا افسوس ہوا کہ تمنائی[2] بیمار ہو کر گھر چلے گئے ہیں۔ چند روز ہوئے اُن کا خط آیا تھا۔ میں نے جواب لکھ بھیجا تھا۔ انہوں نے بھی خطبہ طلب کیا تھا۔ لیکن میں نے یہاں آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کا حجم کم ہے اور آپ نے جو اپنی کتابوں کی ضخامت رکھی ہے اُس کے لئے کافی نہیں۔ اس لئے نہ بھیج سکا۔

میں آپ کے دوسرے خط کا انتظار کروں گا جس میں وہاں کے حالات کی تفصیل ہوگی۔

سہیل صاحب اگر آپ نے یہ کام کر لیا تو سمجھئے کہ بڑا کام کیا۔ کرنے کے اصل کام یہی ہیں۔

عبدالحق

۱؎ مولوی انیس الحق فخرالدین سابق ڈپٹی کلکٹر۔ بہار میں عمارت فنڈ جمع کرنے کا کام ان کے سپرد کیا گیا تھا۔
۲؎ زبیر احمد تمنائی۔ نیا منشار کتاب گھر۔ اور سلسلہ اردو لائبریری کے بانی۔

(۳)

سری نگر، کشمیر
۱۴/ جولائی ۱۹۴۱ء

مکرم کرم فرما۔ تسلیم

آپ کا خط مورخہ ۱۰/ جولائی پہونچا۔ جسے پڑھ کر جو مسرت ہوئی وہ بیان نہیں کر سکتا۔ مسٹر عمانوئل پٹو کا کام فی الحقیقت بڑی کامیابی ہے۔ اُن سے آپ کے کام کو بہت فروغ ہوگا۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ انہیں کے محلے میں ایک ہال کرایہ پر لے کر مدرسہ قائم کر لیا۔ آپ نے ان کے معاوضہ کے متعلق لکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سرِ دست ان کو ماہوار رقم کچھ اور زیادہ دی جائے۔ نہیں لکھا کہ اس وقت کیا دی جاتی ہے۔ ان کے بارے میں جو آپ کی تجویز ہے وہ ضرور لکھ بھیجئے۔ بلاشبہ ان کو مالی امداد جہاں تک ممکن ہو ضرور دینی چاہئے۔

اس سے بے حد مسرت ہوئی کہ آپ کے شبینہ مدرسے مقبولیت حاصل کر رہے ہیں اور تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ آپ نے تعلیم کے لئے اوقات کی جو تقسیم کی ہے۔ وہ بہت مناسب ہے۔

میں تفضل کریم صاحب کو کل ہی خط لکھ بھیجوں گا۔

جولائی کے حسابات دفتر پر بھیجئے۔ یہ ہمیشہ دفتر پر آنے چاہئیں۔ وہاں سے میرے سامنے پیش ہو جائیں گے۔

عملی سبق ضرور دینے چاہئیں۔ اصل کام اردو پڑھانے میں طریقۂ تعلیم ہی ہے۔ اردو کو جو مشکل کہا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ طریقۂ تعلیم نہایت ہی غلط ہے۔ اگر صحیح طریقے پر تعلیم دی جائے تو طالب العلم بہت جلد ہی اردو پڑھنا لکھنا سیکھ سکتے ہیں۔

کتابوں کے متعلق میں نے بھی دفتر کو تاکید کر دی ہے۔ مسز عمانوئل پٹو سے ارادوں اور منڈا گینوں پر ضرور مضمون لکھوایئے۔ اور جلد۔ میں انہیں اس کا معاوضہ دوں گا۔

مجھے پرنسپل صاحب عثمانیہ ٹریننگ کالج (حیدرآباد دکن) نے لکھا ہے کہ آپ رانچی میں ٹریننگ اسکول کا بار کیوں اٹھاتے ہیں۔ چند مدرس یہاں بھیج دیجئے۔ ہم انہیں اردو پڑھانے کی پوری تعلیم اس سے انجمن ترقی بار سے بچ جائے گی۔ مہربانی فرما کر لکھئے اس میں آپ کی کیا رائے ہے۔

آپ Hunger کا ترجمہ شروع کر دیجئے۔ بہت اچھی کتاب ہے۔

ہماری زبان میں ابتک آپ کے مرکز کے متعلق کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ آپ مہربانی کر کے اس وقت تک جو کام ہوا ہے اس کی کیفیت لکھ بھیجئے۔ میں اپنی تمہید کے ساتھ اسے شائع کر دوں گا۔

خیر طلب
عبدالحق

(۴)

حبشی گوڑہ، حیدرآباد دکن
۲۲/ اگست ۱۹۴۱ء

مشفقی

آپ کے خط پڑھ کر مجھے جس قدر مسرت ہوتی ہے۔ کسی تحریر سے نہیں ہوتی۔ میں آپ کے ہر خط کا جواب دیتا ہوں۔ شاید پہونچنے میں دیر ہوتی ہو۔ آپ کا یہ خط مورخہ ۱۰/ اگست بہت مفصل ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹا ناگپور میں ہمارے کام کے بڑھنے اور سرسبز ہونے کی بڑی توقع ہے۔ مجھے ہرگز یہ

یہ امید نہ تھی۔ یہ آپ کی مخلصانہ کوشش اور ایثار کا پھل ہے۔ حالات بہت ہمت افزا ہیں۔

برسات کے بعد ضرور اپنا جھونپڑا بنا لیجئے۔ اس کے لئے اگر ضرورت ہوا تو انجمن سے تو نہیں مگر اپنی ذات سے آپ کو مدد دینے کے لئے تیار ہوں۔

آپ "یوم مخالفت ہندوستانی" کا ضرور جواب لکھئے اور اس کی ایک نقل انجمن کو بھیج دیجئے تاکہ ہماری زبان میں شائع کر دیا جائے۔ آپ اپنے بیان کو ضرور پریس میں بھیجئے۔ آج کل پروپیگنڈہ کا زمانہ ہے۔ اس سے چارہ نہیں۔ ہمارے کام میں بڑا نقص یہ ہے کہ اس کا باقاعدہ پروپیگنڈہ نہیں ہوتا۔

آپ نے اردو رسم خط کو عدالت میں رائج کرنے کے متعلق جو تجویز کی ہے۔ نہایت مناسب اور ضروری ہے اپیل لکھ کر اور دستخط کرا کے حکومت کے سامنے پیش کیجئے۔ آپ کے مرکز کا بڑا کارنامہ ہوگا۔ ابھی سے شروع کر دیجئے۔ اگر حبیب الرحمٰن صاحب مصارف نہ دیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ میں اس کے سب مصارف آپ کو دوں گا۔ ان امور میں کبھی پس و پیش نہ کرنا چاہئے۔

دس آدمیوں کے دستے تیار کرنے اور گاؤں میں بھیج کر بالغوں کو تعلیم دینے کی ہمت اچھی ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ نے لکھا ہے چھوٹی سی اردو لائبریری ضرور قائم کر دی جائے۔ ورنہ ان کا لکھنا پڑھنا سب بیکار جائے گا۔ اس پر جو مصارف ہوں گے اس کا تخمینہ تیار کر لیجئے۔

کمیٹی کی تجویز کو فوراً قبول کر لیجئے۔ ہمیں تو ہر طرح اردو پھیلانی ہے خواہ کسی طریقے سے ہو۔ آپ ان کو بلا تامل جواب لکھ بھیجئے۔ خرچ کی کمی ہو تو وہ دیکھ لی جائے گی۔

آپ کو اب معلوم ہوا کہ مخلص کام کرنے والے نہیں ملتے۔ میں تو سالہا سال سے یہی رونا رو رہا ہوں جس نوجوان نے آپ کو خط لکھا ہے۔ کہ وہ آپ کے ساتھ کام کرنے کو تیار ہے اُسے فوراً بلا لیجئے۔ گذر کے موافق تنخواہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ نوجوان آگے چل کر آپ کا بہت اچھا اور کارآمد رفیق ثابت ہوگا۔

شاہ مصطفےٰ صاحب بہت مخلص اور پرجوش آدمی ہیں۔ میں انہیں ضرور لکھوں گا۔ اور آپ کے کام کی طرف متوجہ کروں گا۔

عہ۲۵ سالانہ تو بہت کم ہے۔ حبیب الرحمٰن صاحب سے تو بہت زیادہ کی توقع تھی پچیس ماہانہ دیتے تو خیر ایک بات بھی تھی۔ موقع دیکھ کر اُن سے کہیں، ممکن ہے دے نکلیں۔

میں اکتوبر میں رانچی آنے کی کوشش کروں گا۔ فی الحال یہاں پھنسا ہوا ہوں۔ یہاں ایک جماعت محض بغض و حسد کی وجہ سے انجمن کی مخالف ہو گئی ہے۔ اب ایک کمیٹی انجمن کی تحقیقات کیلئے مقرر کی گئی ہے۔ جس کے ممبر زیادہ تر مخالف جماعت کے ہیں۔ میں مقابلے کے لئے ہر طرح تیار ہوں جو ہو سو ہو۔ ان کا اصل منشا یہ ہے کہ نظام گورنمنٹ جو امداد دیتی ہے وہ بند کر دی جائے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اس خیال سے میں بہت پریشان اور افسردہ رہتا ہوں۔ اور مقدور بھر تگ و دو کر رہا ہوں۔

پرنسپل صاحب ٹریننگ کالج سے ابھی کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ دو چار روز میں مل کر اطلاع دوں گا۔

آپ کی سواری کا معاملہ قابل غور ہے بلکتا شہر تک محدود ہے اور لاری دیہات میں ہر جگہ

جاتی ہیں وہاں لوگ کوئی نہ کوئی سواری کام میں لاتے ہیں۔ میں ایک
بار راکچی پہونچ جاؤں تو سب مسئلے بیٹھ کر طے کر لیں گے۔

تمنائی کی حالت کا حال سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔
آپ خط لکھئے تو میری طرف سے ضرور پوچھ لیجئے گا۔ میں انھیں
بہت پسند کرتا ہوں۔ مخلص آدمی ہیں اور کام کرنے والے۔

آپ خط شہر ہی کے پتے سے بھیجا کیجئے۔

خیر طلب

عبدالحق

حیدرآباد دکن

[illegible] ستمبر سنہ ۴۸ء

مشفقی و مکرمی، [illegible]

آپ کے دونوں خطوط پہونچ گئے۔ یہ خوب ہوا کہ آپ
خان بہادر عبدالصمد خاں صاحب سے مل لئے۔ ان کے وسیلے
سے آپکے کام میں بڑی مدد ملے گی۔ جیسے پال سنگھ اور دوسرے
آدمی ہاسی لیڈروں سے ضرور میل جول بڑھائیے۔ وہاں عیسائی
[illegible] بھی کسی کام آئیں گے۔

اردو کی اپیل بہت ضروری ہے۔ آپ کی تجویز خان
بہادر حبیب الرحمٰن صاحب کو پیش پیش رکھنے کی قابل داد
ہے۔ ان لوگوں سے اسی طرح کام لینا چاہئے۔

سمارٹ صاحب کا خط میرے نام آیا تھا۔ آج میں نے جواب
لکھ بھیجا ہے۔ اور ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے۔ اور
[illegible]سلت کی ایک کاپی بھی بھیج دی ہے۔

کل خان بہادر حبیب الرحمٰن صاحب، خان بہادر عبدالحمید صاحب
اور شاہ مصطفیٰ صاحب کو خط لکھ بھیجوں گا۔ آپ کے شاگرد خوب
ترقی کر رہے ہیں۔ آپ نے املائی جو نمونے بھیجے ہیں انھیں دیکھ
کر بہت خوشی ہوئی۔ میں کسی ایسے شخص کو تلاش کر رہا ہوں
جو راکچی جا کر پڑھانے کا طریقہ سکھا دے۔

[illegible] صاحب کے انتقال کی خبر سن کر بہت افسوس
ہوا۔ وہ ہمارا کام کر رہے تھے اور ان کے ذریعہ سے میں ایک
[illegible] تذکرے کی نقل کروا رہا تھا جسے وہ مرتب کرنا چاہتے
تھے۔ افسوس جوان مر گئے۔

آپ سواری کے لئے ضرور سکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل
خرید لیجئے۔ آپ معاملہ طے کر کے اطلاع دیجئے۔ رقم کہیں نہ کہیں
سے دلا دی جائے گی۔

تمنائی کو آپ بلا لیجئے۔ مگر ان کا قیام عارضی ہوگا۔ انھیں
میں نے اپنے لئے رکھا ہے۔ آپ کے کام سے فارغ ہونے
کے بعد میں انھیں دہلی بلا لوں گا۔

عیسائیوں میں خوب اردو پھیلائیے۔ یہ بہت بڑا
کام ہے بلکہ بڑے ثواب کا کام ہے۔

[illegible]
لوگ آپ کو خواہ مخواہ بوڑھا آدمی سمجھتے ہیں۔ مجھے لوگ
جوان سمجھتے تھے۔ ملاقات کے وقت یہ کہنے لگے کہ
تحریریں پڑھ کر ہم آپ کو جوان خیال کرتے تھے مگر آپ تو
بوڑھے نکلے۔

مخالفت ہندوستانی کے متعلق انگریزی کا بیان [illegible]
بہت معقول ہے۔

عبدالحق

حیدرآباد دکن (۶)

[illegible] ستمبر سنہ ۴۸ء

مشفقی و مکرمی، تسلیم

آپ کا خط پہونچا۔ خوشی کی بات ہے کہ آپ کا کام
ترقی پر ہے۔ مجھے اس سے حقیقی مسرت ہوئی کہ آپ نے اصل
مقصد کی خاطر ظاہری رسوم اور پابندیوں کو ترک کر دیا۔
یہ بھی ایک قسم کا ایثار ہے۔ آپ ضرور ان کے رسوم تقریبوں
میں شریک ہوجیے۔ اس سے یگانگت اور یکجہتی بڑھے گی۔

ریورنڈ سمارٹ بہت خوب آدمی ہیں، اور مجھے

یقین ہے کہ ان کے تعاون سے آپ کی اسکیم عیسائیوں میں اردو پھیلانے کی ضرور کامیاب ہوگی۔

آپ انجمن سے کسی قسم کا کوئی الاؤنس لینا نہیں چاہتے یہ بہت بڑا ایثار ہے۔ ترجمہ وغیرہ کا کام دینے کے لئے میں بخوشی تیار ہوں۔ آپ نے تنخواہ لے کر خلوص سے کام نہ کرنے کی جو مثالیں دی ہیں وہ آپ پر صادق نہیں آتیں۔ دنیا میں ہر قسم کے لوگ ہیں، خود غرض بھی اور بے نفس بھی۔ آپ نے جس سچے جذبے اور شوق سے کام شروع کیا ہے۔ اسے تنخواہ یا الاؤنس سے زوال نہیں آسکتا۔ اچھا اگر آپ انجمن سے کچھ نہیں لینا چاہتے تو مجھ سے لینے میں آپ کو عذر نہیں ہونا چاہئے۔ میں کوئی امیر آدمی نہیں ہوں۔ اور پنشن لینے کے بعد میری آمدنی بہت کم رہ گئی ہے۔ لیکن تھوڑی بہت آپ کی مدد بغیر کسی تکلیف کے کرسکتا ہوں۔ جب ضرورت ہو آپ بلا تکلف مجھ سے منگا سکتے ہیں۔ اس کا علم میرے اور آپ کے سوا کسی تیسرے شخص کو نہ ہوگا۔ یا آپ مقرر کردیں کہ ہر مہینے اتنا بھیج دیا کروں میں پابندی کے ساتھ بھیجتا رہوں گا۔

ترجمے کے حساب میں آپ کو ہر مہینے کتنی بھیجی جائے، اس کا تعین کر دیجئے تو میں ماہ اکتوبر سے اس کی ابتدا کر دوں گا۔

آپ کی موٹر سائیکل کے لئے۔ میں اس ہفتہ ایک چیک بھیج دوں گا، اطمینان رکھئے۔

جس دن آپ نے مشن سکولوں میں اردو داخل کر دی سمجھ لیجیے کہ آپ نے چھوٹا ناگپور فتح کر لیا خدا کرے ایسا ہی ہو۔

سلطانیہ قاضی بی۔ اے، قاضی بشیرالدین وکیل میرٹھ کی صاحبزادی ہیں، کٹر کانگریسی اور گاندھی جی کی چیلی ہے۔ ان کا خط میرے نام وصول ہوا ہے جس میں وہ لکھتی ہیں کہ "میں ہندی اردو کے متعلق مہاتما جی سے سوالات کئے اور انھوں نے میرے شکوک رفع کر دئے۔ اب میں آپ سے مل کر اس الجھی ہوئی بحث کو سلجھانے کی کوشش کروں گی۔ مہاتما جی کا بھی یہ خیال ہے کہ زبانی ہی اردو ہندی کے جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے۔ اور یہ خط میں آپ کو ان کے ہی مشورے سے لکھ رہی ہوں۔"

میں نے لکھا ہے کہ دہلی آکر ملیں۔

ضروری انجمن ترقی اردو ہزاری باغ سے ایک خط آیا ہے۔ وہ سالانہ جلسہ کرنا چاہتے ہیں اور مجھے صدارت کے لئے لکھا ہے۔ وہ خط ملفوف ہے۔ براہ کرم اپنی رائے سے اطلاع دیجئے کہ میں اسے قبول کروں یا نہ کروں ایک دو بار میں نے بغیر تحقیق صدارت قبول کرلی تو بہت مایوسی اور افسوس ہوا اور معلوم ہوا کہ جلسہ محض ایک نمائشی چیز تھی۔ اور کوئی طبقہ دلچسپی یا ہمدردی رکھنے والا نہ تھا مہربانی کرکے اس کا جواب جلد لکھئے تاکہ میں صدر انجمن کو جواب لکھ سکوں۔

[illegible] مسٹر بلرام آپ کے اچھے مشنری ہو سکتے ہیں۔ اچھا کیا آپ نے ایک اور آدمی بلا لیا۔ اب عتیق آزاد ہو گئے۔ صلاح الدین صاحب کو میں نے چند روز کے لئے یہاں بلا لیا ہے کل یہاں پہونچ جائیں گے۔

[illegible]

حیدرآباد دکن
[illegible] اکتوبر [illegible]

[illegible] تسلیم

خط پہونچا، اگر ریورنڈ سمارٹ پچاس روپے پر رضامند ہو جائیں، تو آپ کی بڑی جیت ہے۔ اس سے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ عیسائی برادری میں مقبول ہوتے جاتے ہیں۔ اگر اب آپ کو سہیل مسیح کہوں تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

جلسہ اگر وسط نومبر میں قرار پایا ہے تو مجھے کچھ عذر نہیں۔

تو اس صورت میں یہ ہوگا کہ ہندوستانی کمیٹی کے اجلاس سے فارغ ہو کر (جو ۱۵ اکتوبر سے شروع ہوں گے اور غالباً ۲۰ اکتوبر تک رہیں گے) میں کلکتہ چلا جاؤں فضلی صاحب کی فلم کمپنی سے کے ملنے کے لئے۔ آپ بھی وہاں آجائیں۔ کلکتہ سے پلٹ کر آپ کے پاس رانچی جاؤں اور پھر رانچی سے ہزاری باغ، مگر اس میں بہت وقت ضائع ہوگا۔ اور اگر کلکتہ سے واپس دلی جاتا ہوں اور پھر ہزاری باغ جاؤں تو اس میں بہت ایٹر پڑتی ہے۔ اور خرچ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لئے میں نے جنوری کا مہینہ تجویز کیا تھا۔ دوسری تدبیر یہ ہے کہ جلسہ نومبر کے آخر میں کیا جائے۔ میں کلکتہ سے دلی واپس چلا جاؤں وہاں بیس پچیس روز رہ کر ہزاری باغ جاؤں اور وہاں سے رانچی، یہ تجویز زیادہ مناسب ہے آپ قادر بخش خاں کو لکھئے کہ آخر نومبر میں یا شروع دسمبر میں کوئی تاریخ مقرر کر دیں تو مناسب ہوگا۔ آپ میری طرف سے بھی لکھ سکتے ہیں۔ یعنی یہ کہ آپ یہ بات میرے مشورے سے لکھ رہے ہیں۔

وقف نامے کے متعلق آپ نے اب جو کچھ لکھا، اس سے اطمینان ہوا۔ یہ ہو جائے تو ہماری بڑی کامیابی ہے۔ تمنا تی آجائیں تو مجھے ضرور اطلاع کیجئے گا۔

اب دلی پہونچ کر سلطانہ فاطمہ کو بلاؤں گا۔ میں زبان کے معاملے میں ہر ایک سے گفتگو کرنے کو تیار رہوں گا۔ گاندھی جی سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنی بات پر قائم نہیں رہتے۔ میں نے بھارت ساہتیہ پریشد کے جلسے میں ہر چند کوشش کی کہ وہ ہندوستانی کو مان لیں، مگر وہ نہ مانے اور صاف کہہ دیا کہ میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا۔

مخیر طلب
عبدالحق

اورنگ آباد دکن
(۸)
۱۹ اکتوبر ۴۲ء

مکرمی و مشفقی، تسلیم

عید اور دسہرے کی تعطیلات میں اورنگ آباد چلا آیا۔ چار پانچ روز کے بعد حیدر آباد واپس چلا جاؤں گا۔ انجمن کی کارروائی ابھی جاری ہے۔ آپ کا خط اور آپ کے طالب العلموں کے رسالے کا غذات مجھے نہیں وصول ہوئے۔ محمد سلیمان صاحب کا خط میں نے پڑھا۔ ان کے خیال سے مجھے اتفاق ہے۔ اور اسی پر میرا عمل ہے۔ میں مخالفتوں کا کبھی خیال نہیں کرتا۔ اپنا کام کئے جاتا ہوں۔ بعض اوقات یہ مخالفتیں مفید بھی ہوتی ہیں۔ اور ہمیں ان سے اپنے کام میں اصلاح کا موقع ملتا ہے۔ اگر ہماری نیت میں خلوص اور کام میں استقلال اور صداقت ہے تو ضرور کامیابی ہوگی۔ اور دوسرے بھی اس سے متاثر ہوں گے۔ مجھ پر خود وہ وقت گذر چکا ہے جس کا ذکر سلیمان صاحب نے اپنے خط میں کیا ہے۔ میں نے ناگپور کے جلسے میں پورا زور لگایا کہ ہندوستانی کو ہندوستان کی عام زبان بنایا جائے۔ گاندھی جی رضامند نہ ہوئے اور یہی اصرار کرتے رہے کہ ہندی ہو۔ اب وہ ہندوستانی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بعد از وقت ہے۔ بقول پنڈت سندر لال کے گاندھی جی ہر چیز کو ہندو مذہب کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ لشب سے آپ کی گفتگو کا نتیجہ بہت اچھا نکلے گا۔ میری بڑی آرزو ہے کہ رانچی پہنچ کر تمام حالات اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ لیکن جب تک انجمن کی امداد کا معاملہ طے نہیں ہوتا ہے میرا یہاں سے جانا خلاف مصلحت ہوگا۔ نومبر میں صوبہ سرحد جانے کا ارادہ ہے۔ اگر حیدر آباد سے جلد فرصت ہو گئی تو ایک چکر آپ کے ہاں کا بھی کر دوں گا۔

قادر ڈی مولڈر کی ہمدردی اور اعانت کا جس قدر شکریہ کیا جائے کم ہے۔ میرا خط انھیں پہنچ گیا ہوگا۔

عبدالغفور شہباز کی نظموں کا مجموعہ پہنچا
آپ نے اس بجٹ سے جو کتابیں خریدی ہیں وہ حیدرآباد
بھیج دیں، اگر ان میں کوئی کتاب قابل ترجمہ ہوئی تو ترجمہ کرا لوں گا
یہاں بغیر معاوضہ کے ترجمہ ہو جائے گا۔

اگر ۱۹۴۳ء میں ہماری ریڈر یں بہار میں منظور
ہو گئیں تو بڑی کامیابی ہوگی۔

[illegible] کاغذ اور پنسل یا [illegible] آپ کو بہت [illegible]
ہوں گی۔ اگر آپ کہیں تو بچوں کے لکھنے کے لئے [illegible]
سے بھیج دوں۔

آپ کا دوسرا خط بھی ملا۔ کرسیانگ میں مشنریوں کا بڑا
مرکز ہے۔ چند سال ہوئے میں وہاں گیا تھا اس بارے میں فضلی
احمد کریم فضلی صاحب آئی سی ایس سے بھی مدد مل سکتی ہے۔
وہ کئی سال تک وہاں متعین تھے۔ آج کل وہ کلکتہ میں ہیں۔ یہ فضلی
[illegible] والے فضلی [illegible] بھی نکل چکے ہیں۔
ان سے لکھ کر مشورہ کیجئے۔
[illegible] ترجمہ پہنچا۔ ترجمہ خاصا ہے لیکن زبان کی بہت [illegible]

سلیمان صاحب کا پمفلٹ اور مضمون بھی مجھے پڑھنے
کے لیے بھیج دیجیے۔ امید کہ آپ خیر و عافیت سے ہوں گے۔

[illegible]

(۹۱)

دریا گنج دہلی

۱۸ جنوری ۱۹۴۳ء

[illegible] کرمی۔ تسلیم

آپ کا خط [illegible] الا [illegible] کا ایک نسخہ بھی موصول
[illegible] شکریہ [illegible]

(۹۰) [illegible]

دریا گنج - دہلی

۳ ر جنوری ۱۹۴۳ء

[illegible] مکرمی و عزیزی تسلیم!

خط پہنچا۔ میرا خط اب پہنچ گیا ہوگا۔ آپ نے اپنے اس
خط میں کئی خوشخبریاں سنائی ہیں۔ ایک تو سکریٹری آبادی باسی
مہاسبھا کا جنگول سنٹر اور مڈل اسکول کا قائم کرنا اور اس میں اردو
کا پڑھانا اور وہ بھی لازمی طور پر۔ اس میں آپ میری رائے کیا
دریافت کرتے ہیں۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ یہ تو خدا کی
رحمت ہے کہ آدی باسی اردو پڑھیں آپ فوراً شکریہ کا نفل
پڑھئے۔

وہ خدا کا بہت ہی نیک بندہ ہے جس نے ہمارے مرکز
کے لئے زمین دی ہے۔ اسے مغفرت کی خوشخبری پہنچا دیجیے۔ یہ
خیال آپ کا ٹھیک نہیں کہ ایسی زمینوں کی ملکیت میرے
نام ہو۔ میں کون !! آپ کی طرح انجمن کا خادم۔ میرے نام
یہ ملک کیوں رہے۔ یہ انجمن کے نام ہونی چاہیے یعنی کہ بڑی
انجمن ترقی اردو کے نام خواہ وہ کوئی ہو۔

عیسائی بچوں کو اردو کے انعام دینے کے لئے بیس
روپے کی منظوری دی جاتی ہے۔ میں نے پچھلے خط میں پوچھا تھا
کہ اب تک چھوٹا ناگ پور میں کتنے اشخاص اردو پڑھ چکے ہیں اور
کتنے پڑھ رہے ہیں۔ اور کتنے مدرسوں میں اردو پڑھائی
جاتی ہے۔ اس معلومات کی شدید ضرورت ہے کیونکہ جو رپورٹ
میں ناگ پور کی اردو کانفرنس میں پیش کرنے والا ہوں اس
میں اس کا اندراج ضروری ہے۔

آپ کا ایک خط ابھی موصول ہوا۔ آپ اپنے حالات
اور فرصت کو دیکھ کر دہلی آئیے۔ یہ ضرور نہیں کہ آپ
فروری میں آئیں۔ ہندوستانی کمیٹی کا اجلاس پٹنہ میں
۵ فروری کو ہوگا۔ میں وہاں جاؤں گا۔ کرسیانگ پہنچ کر
[illegible] کرسیانگ کے پتہ سے بھیج

رہا ہوں۔ میں ۵ جنوری کو ناگ پور اردو کانفرنس کی خاطر چلا جاؤں گا۔ اس کے اجلاس ۱۹/۲۰/۲۱ کو ہوں گے۔ ۲۴ تک واپس آجاؤں گا۔ [illegible] کی سمتر کا کارڈ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی

عبدالحق

[illegible] جنوری [illegible]

مشفق و کرمی۔ تسلیم

آپ کا خط پہنچا۔ آخر آپ کو [illegible] پہنچ گئے۔ یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ فضل کریم صاحب نے ساڑھے تین ایکڑ کی زمین کی قیمت ادا کر دی۔ غریب مسلمان نے جو زمین دی ہے وہ بہت زیادہ قابل شکر ہے۔ کسی شخص کے نام سے زمین کی رجسٹری نہیں ہونی چاہئے۔ خواہ میں ہوں یا آپ۔ اس کی رجسٹری سوائے سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند کسی دوسرے نام سے نہیں ہو سکتی۔ میرے والد کا نام علی حسن تھا۔

[illegible] پرگنہ کی خبر لیجئے اور دیکھئے کہ وہاں کیا نوعیت ہے۔ آپ نے میزان الرحمن صاحب کو بہت اچھی رائے دی۔ اگر یہ ہو جائے تو کام کی صورت نکل آتی ہے۔ آپ میزان الرحمن صاحب سے کہئے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ اپنی انجمن کا الحاق صدر انجمن سے [illegible]

میں ناگپور کانفرنس کی وجہ سے بہت مصروف ہوں اس لئے زیادہ کچھ نہیں لکھ سکتا۔ آپ کی صحت و عافیت اور کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔

پرسوں ناگپور روانہ ہو جاؤں گا۔

خیر طلب
عبدالحق

(۱۳)

دریا گنج - دہلی
۱۳ مارچ [illegible]

مشفق و عزیزی سلمہٗ

خط پہنچا۔ کیفیت معلوم ہوئی۔ میزان الرحمن خبطی آدمی ہیں۔ یہ سب کام وہ ایک خاص مقصد سے کر رہے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ طبیعت بے حد بے چین اور برق وش پائی ہے۔ جو خیال آتا ہے جھٹ پٹ بے سوچے سمجھے کر ڈالتے ہیں۔ مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے۔ آپ کا پمفلٹ میرے پاس پہنچ گیا ہے۔ یہ سخت غلطی ہے کہ وہ انجمن میں کسی غیر مسلم کو نہیں لینا چاہتے۔ کیا پاکستان میں کوئی غیر مسلم اردو نہ پڑھ سکے گا۔ یہ پاکستان نہیں ناپاکستان ہوگا۔

آپ کی تجویز بہت اچھی ہے۔ عبدالرحمن صدیقی کو لکھوں گا۔ مکان کا معاملہ آج کل بہت بڑھا ہے۔ آپ ہرگز نہ چھوڑئیے۔ جب تک اس سے بہتر اور کسی کرایہ پر نہ ملے۔ پادریوں میں یہ کیفیت [illegible] کی پیکاری اور سرزوری نہیں پیدا ہوئی۔

سٹروں کے لئے سے کی حد تک آپ کتابوں کی فہرست بنا کر بھیج دیجئے۔ دیدی جائیں گی۔ جب آپ بھائی سٹروں کی سفارش کریں تو وہ کیوں منظور نہ ہوگی۔

آپ نے شاید ناگپور کانفرنس کی قرار دادیں نہیں پڑھیں ہم خود اپنے امتحانات جاری کرنے والے ہیں۔ کسی دوسرے الحاق کی ضرورت نہیں۔

تمنائی کو پھر ہڑک اٹھی ہے۔ ریڈیو میں کئی خدمتیں خالی ہیں وہ سفارش کے زور سے کوئی ایک خدمت چاہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اور میری سفارش رام کا بان ہے۔ جو کبھی خطا ہی نہیں کرتا۔

خیر طلب
عبدالحق

(۱۳)

پٹنہ

۱۹ اپریل ۱۹۴۸ء

شفیق و عزیزی سلمہ

[illegible] سے فارغ ہو کر کل شام پٹنہ پہنچا۔ تو آپ کا خط ملا۔ اسی کے ساتھ میزان الرحمٰن صاحب کا بھی خط ملا۔ خط میں اردو ڈپلوما کی اسکیم اور نصاب انگریزی میں چھپا ہوا رکھا تھا۔ یہ خط انھوں نے دلی سے لکھا تھا۔ اور انجمن کے مکان میں مقیم تھے چند روز۔ وہ کرشملہ چلے گئے۔ وہاں سے ۱۰ اپریل کو واپس آ گئے [illegible] اپنی ترقی کی فکر میں ہیں۔ اور اسی لئے اردو کا پروپگنڈا شائع کیا ہے۔ خیر وہ اپنی خاطر اس کام کو کریں لیکن تراشہ دیکھا۔ اس کے لکھنے والے کی نیت مشتبہ ہے۔ صدیقی صاحب سے اس بارے میں کئی بار گفتگو ہوئی۔ وزیر تعلیم ظہیر الدین صاحب کے متعلق ان کا خیال ہے کہ اردو کے معاملے میں مخلص ہیں۔ فی الحقیقت انھیں اردو سے ہمدردی ہے۔ دلوں کا حال خدا [illegible] لیکن بظاہر انھوں نے ہر موقع پر اردو کی بڑی حمایت کی ہے۔

[illegible] جا کر اور وہاں کے حالات معلوم کر کے سخت صدمہ ہوا۔ سوائے کراچی کے باقی تمام سندھ میں اردو کا کہیں نام نہیں۔ اردو وہاں کی تعلیم میں مطلق داخل نہیں۔ سندھ [illegible] سلمان، حکومت میں سربرآوردہ مسلمان، وزیر تعلیم مسلمان، ڈائرکٹر تعلیمات اور افسران تعلیم مسلمان۔ لیکن سب غافل اور نکمے۔ وہاں رہ کر ان کے ساتھ بہت سر مغزی کی اور سمجھایا۔ اب آمادہ ہوئے ہیں کہ نصاب تعلیم میں اردو داخل کی جائے۔ لیکن ان وعدوں کا کیا اعتبار۔ اسی لئے میں نے چھوٹا ناگپور کی طرح کراچی میں سندھ اردو مرکز قائم کر دیا ہے۔ اور اس کے خرچ کے لئے رقم بھی وہیں سے حاصل کرنے کی تجویز ہے۔ یہ مرکز ان [illegible] کے سرپرستی [illegible] کئے ہیں انھیں پورے کرائے گا۔ نیز کراچی سے باہر مختلف مقامات میں جا کر اردو کی ترویج و اشاعت کی کوشش کرے گا۔ وغیرہ وغیرہ — یہ لمبی داستان ہے کبھی ملاقات ہوئی تو بیان کروں گا۔

آپ نے اپنے خط میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ سچے کام کرنے والے نہیں ملتے۔ یہ بڑی کمی ہے۔ سندھ اردو مرکز کے لئے میں فی الحال حکیم اسرار احمد صاحب کو چھوڑ آیا ہوں۔ وہ بڑے مخلص ہیں اور [illegible] کام کرنے والے ہیں۔ سندھ اردو کانفرنس کے سلسلے میں انھیں بہت پہلے بھیج چکا تھا۔ وہاں کے حالات سے خوب واقف ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اپنا ایک [illegible] نکالا ہے۔ جسے وہ کراچی بلالیں گے۔

امیر رضا صاحب کا خط پڑھا۔ ان کا ترجمہ بہت قابل [illegible] ہے۔ اصل کتاب اسی لئے طلب کی گئی تھی کہ ان کے معاوضہ کا فیصلہ کر کے رقم ادا کر دی جائے۔ لیکن انھوں نے نہیں بھیجی، وہ کہیں سے بھی لے کر چند روز کے لئے بھیج سکتے تھے۔ وہ الٹا ہمیں الزام دیتے ہیں۔

آپ جو سو اسو روپیہ ہندوستان کے [illegible] پر صرف کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کہاں سے آئیں گے۔ انجمن یہ رقم کسی حال میں نہیں دے سکتی۔ جنگ نے کام خراب کر رکھا ہے۔ اس کی وجہ سے اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں۔ اس سال کا بجٹ بنایا تو معلوم ہوا۔ اخراجات آمدنی سے بڑھے ہوئے ہیں [illegible] روپیہ آپ کو چھوٹا ناگپور مرکز کی رقم سے دینا پڑے گا۔ کچھ دنوں تو وہاں کسی آدمی کا رہنا ضروری ہے [illegible] آپ آدمی [illegible] کر نکال لیجئے۔ بمتنائی کے بھائی کو کچھ دن رکھ کر دیکھ لیجئے۔ جب میں سندھ جا رہا تھا تو بمتنائی دلی آئے تھے۔ اور میرے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ریڈیو کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ خدا کرے کوئی جگہ مل جائے۔

[illegible] یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ کرسچین [illegible] والوں نے اردو کو اپنے نصاب میں داخل کر لیا ہے۔ پھر وہی آدمی

کا معاملہ۔

آپ کے دوست فادردن اکسم کا خط دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ ایسی صاف اور اچھی اردو لکھی ہے کہ یقین نہیں آتا کہ انھوں نے لکھی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں وہ دہلی آئے یا نہیں۔ وہاں سے ان کے آنے کی کوئی اطلاع وصول نہیں ہوئی ہے۔

[illegible]

[illegible] شاہ۔ چلتی ریل میں سے
۲۸ فروری [illegible]

مشفق [illegible]

آپ کا خط مجھے واردھا میں ملا۔ جہاں مہاتما گاندھی کی [illegible] سباہ بلائی گئی ہے اور مجھے اس کانفرنس (ہندوستانی پرچار سبھا کانفرنس) میں شریک کرنے کے لیے کیا کیا جتن کئے ہیں۔ اب میں حیدرآباد جا رہا ہوں۔ وہاں یوم حالی ہے ۳ مارچ کو، اور انجمن کی گشتی کتب خانہ کا سالانہ جلسہ ۹ مارچ کو۔ ۹ کو احمد نگر روانہ ہو جاؤں گا۔ جہاں ۱۰، ۱۱، ۱۲ کو اردو کانفرنس ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے آپ نے دو نئے اسکول بورڈ سے لے لئے ہیں۔ اور مڈل اسکول اچھی طرح چل رہا ہے۔ اس سے بھی زیادہ خوشی اس سے ہوئی کہ سنتال پرگنہ کا اسکول ترقی کر رہا ہے۔

[illegible] مرکز کی رپورٹ بابت سال ۱۹۴۹ء لکھ کر جلد بھیج دیجئے۔ ہماری سالانہ رپورٹ تیار ہو گئی ہے۔ میں ۱۵ مارچ کو پہنچ کر طبع کے لئے دے دوں گا

عبدالحق

دریا گنج۔ دہلی
۳۰ اپریل ۱۹۵۰ء

مشفق و مکرمی۔ تسلیم

آپ کا خط پٹنہ کا لکھا ہوا آج پہنچا۔ امید ہے آپ رانچی واپس آگئے ہوں گے۔ افسوس کہ ابھی تک آپ کے والد صاحب کی علالت چلی جا رہی ہے۔ [illegible] علاج سے توقع ہے کہ شفا حاصل ہو جائے۔

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ حبیب الرحمن صاحب بڑی سرگرمی سے انجمن کی شاخیں قائم کر رہے ہیں۔ حق یہ ہے کمیونسٹ خوب کام کرنا جانتے ہیں۔ لیکن انھیں یہ سب کچھ [illegible] محی الدین صاحب کے مشورے سے کرنا چاہیے۔ مسٹر جعفر امام اور بدر الدین احمد صاحب ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ ان کے [illegible] خیال حال رہی تو ہماری کامیابی یقینی ہے۔ قاضی [illegible] صاحب کے حال پر افسوس ہوتا ہے ان کی زندگی بے ثمر رہی۔ ان کو کبھی سچا اطمینان اور مسرت حاصل نہ ہوگی۔ کیونکہ ان میں خلوص نہیں۔

سید محی الدین صاحب کا کچھ دنوں سے کوئی خط نہیں آیا۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں بیمار نہ ہو گئے ہوں۔ اب لکھ کر دریافت کروں گا۔

میں اچھا ہوں اور حسب معمول اپنے کام میں مصروف ہوں۔ صلاح الدین بیمار ہیں اور رخصت لے رکھی ہے۔

خیر طلب

[illegible]

دریا گنج۔ دہلی
۱۵ مئی ۱۹۵۰ء

مشفق و مکرمی، تسلیم

خط پہنچا۔ افسوس کہ اب تک والد صاحب کی طبیعت رو بہ صحت نہ ہوئی۔ خدائے تعالیٰ جلد شفا عطا فرمائے۔

محی الدین صاحب کا خط [illegible] سے آیا تھا۔ انھیں بخار آ گیا تھا اب اچھے ہیں۔ یہاں آنے والے ہیں اور یہاں سے حیدرآباد جائیں گے۔ گرمیاں وہیں بسر کریں گے۔

آپ قاضی صاحب سے اور کیا توقع کر سکتے تھے۔ انشاء اللہ وہ ہر جگہ منہ کی کھائیں گے۔

بدرالدین صاحب (پٹنہ) آئے تھے۔ مجھ سے [illegible] فرماتے تھے کہ انتخاب مسلم لیگ کے بعد وہ اور دو کا کام زور شور سے کریں گے۔ خدا کرے ایسا ہو اور ہمارے چہرے سے کلنک کا ٹیکہ مٹ جائے۔ صلاح الدین صاحب نے انجمن سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ مجبور ہیں [illegible]

(۱۷ [illegible]

دریا گنج۔ د[illegible]
۸ جولائی [illegible]

[illegible] تسلیم

آپ کا خط پہنچا اس کے بعد چائے کا پارسل بھی وصول ہو گیا۔ شکریہ۔

میزان الرحمٰن کی اس حرکت پر بہت افسوس ہوا۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اگر میزان الرحمٰن یا ان کی مجلس رقم نہ دی تو میں اپنے پاس سے ادا کر دوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔

انجمن سے دو سو روپیہ بطور مبادلہ آپ کو بھیجے گئے تھے۔ وہ براہ کرم بھجوا دیجئے۔

شملہ کا کھیل ختم ہو گیا۔ مجھے بہت معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا کہ گاندھی اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ پانچوں مسلمان مسلم لیگ انتخاب کرے۔ لیکن مولانا آزاد نے سخت مخالفت کی اور جواہر لال، مدنی، آصف علی، بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ کیا افسوس ہے۔

آپ رانچی سے خوشگوار موسم کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ ہم یہاں سخت گرمی میں۔ پڑے گھل رہے ہیں۔

چائے جو اس وقت آگئی ہم اگست میں استعمال کریں گے۔ کرسیاں لکھ دیجئے کہ اب [illegible]

دو پونڈ ستمبر میں بھیجیں

خیر طلب
عبدالحق

دریا گنج۔ دہلی
۱۵ اکتوبر ۱۹۴۵ء

[illegible] مکرمی و عزیزی سلمہ

خط پہنچا۔ سید محمود صاحب کی گفتگو کا حال معلوم ہوا۔ وہ بے چارہ معذور ہے اور قابل معافی۔ میں ان کی کانگریس حکومت سے امداد لینا۔ خودداری اور شرافت کے خلاف سمجھتا ہوں۔ یہ وہی کانگریس تو ہے۔ جس نے اردو کی تخریب میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اردو مسلم نزاع زبان کے مسئلے سے شروع ہوئی۔ سیاست کا جھگڑا تو بعد کا ہے۔ اور گاندھی جی نے اس تنازع کو اور سخت اور بگاڑ دیا۔ اور ملک کو ایسا شدید نقصان پہنچایا جس کی تلافی ناممکن ہے۔ میں اگر زبان کے معاملے میں گاندھی کا ساتھ ہو جاتا تو ہماری انجمن کبھی کی دفن ہو گئی ہوتی۔ ان لوگوں کا منشا یہ ہے کہ کسی طرح انجمن میں تفرقہ ڈال کر اس کا خاتمہ کر دیں۔ ان صاحبوں کی ہمدردی جھوٹی اور بناوٹی ہے۔ میں یہ سب تماشے اپنے آنکھوں دیکھ چکا ہوں۔ مسلم لیگ کی غیر معمولی کامیابی سے مرعوب ہو کر یہ اس قسم کی باتیں بنا رہے ہیں۔ آدمی ایک بار، دو بار بیوقوف بن سکتا ہے ہر بار بے وقوف نہیں بن سکتا۔

میں نے دفتر کو ہدایت کر دی ہے کہ جن نمونوں کے بھیجنے کے لئے آپ نے لکھا ہے۔ وہ ان کو دے [illegible] سے بھیج دیے جائیں۔ کیونکہ بغیر اس کے ان حضرات سے قیمت وصول ہونے کی کوئی توقع نہیں [illegible]

خیر طلب
عبدالحق

[illegible] دکن

۲ جولائی ۴۷

شفقی و مکرمی تسلیم

آپ کا خط دہلی سے ہوتا ہوا یہاں پہنچا۔ میں ۲۳ جون کو یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس سے بہت اطمینان ہوا کہ آپ واپس آگئے۔ اور اب بچے اچھے ہیں۔ اگر مومن گرانٹ سے کچھ رقم مل جائے تو یہ بڑی امداد ہوگی مجھے اس میں شبہ ہے کہ سیدمحمود کو محکمہ تعلیم پھر ملے۔ بدری [illegible] اس پر کبھی رضامند نہ ہوگا۔

آپ کے مشورے کے مطابق راغب احسن صاحب کو لکھتا ہوں دیکھیے وہ کیا کہتے ہیں۔

یہاں انجمن کی عمارت کی امداد کی خاطر آیا ہوں۔ مسٹر [illegible] وعدہ کیا ہے کہ وہ اعلیٰ حضرت [illegible] اس بات کے لئے زور سفارش کریں گے۔ وہ آج کل آجائیں گے۔ اور غالباً ایک ہفتے کے بعد یہاں آئیں۔

اور سب طرح خیریت ہے۔

خیر طلب
عبدالحق

دریا گنج - دہلی

۲۹ نومبر ۴۶ء

مکرمی و عزیزی سلمہٗ

جب میں حیدرآباد سے واپس آیا۔ تو آپ کا خط ملا۔ اس سے پہلے لکھ چکا ہوں کہ سر مرزا انتقام برتتے ہوتے ہیں۔ اور انجمن کو نقصان پہنچا کر رہیں گے۔ اب حیدرآباد کی امداد سے مایوسی ہے آپ یہاں آتے آپ کے مرکز کے متعلق آپ سے گفتگو کرتا۔ ان حالات میں اب چھوٹا ناگ پور مرکز کا قائم رکھنا ممکن نہیں انجمن کی حالت نازک ہے۔ اب آپ کہیے کہ کیا کیا جائے۔ انجمن میں اتنی سکت نہیں کہ وہ اس کا بار اٹھاسکے آئندہ انجمن کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اس کے متعلق بھی آپ سے مشورہ کرنا چاہتا تھا آپ مجبور رہے سفر کی مجبوری باقی نہ رہی ہو تو چند روز کے لئے ضرور آجائیے۔

خیر طلب

دریا گنج دہلی

۱۳ فروری ۱۹۴۷ء

مشفق و عزیزی سلمہٗ

خط پہنچا۔ اگر مومن گرانٹ مل جائے تو بہت اچھا ہو۔ کچھ تو کام چل نکلے گا۔ ابھی آپ اور انتظار کیجئے۔ جب لکھوں تو اس وقت مکان، فرنیچر وغیرہ کا انتظام کیجئے گا۔

حیدرآباد کے معاملے نے عجیب الجھن میں ڈال دیا ہے۔ روز ایک مراسلہ نازل ہوجاتا ہے۔ پرانے گڑے مردے اکھاڑے جارہے ہیں۔ پرانے کاغذات اور مسلیں تلاش کرکر کے جواب لکھنے پڑتے ہیں۔ تحقیقاتی کمیٹی مقرر ہوگئی ہے اور اس نے اپنا کام بھی شروع کردیا ہے۔ ایک گزیٹیڈ آفیسر یہاں آکر حسابات و کتب خانہ وغیرہ کی تحقیق کریں گے۔ ہم بڑی مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ نہ آئندہ کا کوئی ٹھیک ٹھیک پروگرام بنا سکتے ہیں۔ نہ حال کی اصلاح کرسکتے ہیں۔

کلکتہ آئندہ اردو کا مرکز ہونے والا ہے۔ اور اب بھی وہاں اردو کتاب خانہ کی گنجائش ہے۔ گلاب سنگھ کا معاملہ آپ ہی کو نہیں مجھے بھی ناگوار ہے۔ لیکن یہ معاملہ بہ حالت مجبوری کیا گیا تھا۔ اور اب جو حیدرآباد کی امداد رک گئی ہے تو وہی کام آیا۔ ہماری کتابیں وہ اپنے خرچ سے چھاپے گا۔ اور ہمیں رائلٹی دے گا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ہمارا یہ کام اسی سال بیٹھ جاتا۔ آپ ذرا صبر کیجیے۔ حیدرآباد کا معاملہ دو بہ راہ ہوجائے۔ ادھر یا ادھر، تو اس وقت دوسرے

امور پر غور کرنے کا موقع ملے گا۔ اس وقت میں بے حد مصروف بھی ہوں اور پریشان بھی۔

عبدالحق

(۲۲۲)

جون ۴۷ء

مشفقی و مکرمی

میں کل بنگلور سے واپس آیا۔ تو آپ کے اکٹھے تین خط ملے آپ کی پریشانیوں سے مجھے بہت افسوس اور رنج ہوا۔ پے درپے آپ کو ایسی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ جو بہت صبر آزما اور دل شکن ہیں۔ آپ کی ہمت پر آفریں ہے کہ ان سب کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

ہندی اردو کے معاملے میں سی پی وغیرہ کے مسلمان بھی یہی شکایت کر رہے ہیں فی الحال حالات کا انتظار کرنا چاہیے ... دیکھنا چاہیے کہ ہندوستان اور پاکستان میں اقلیتوں کے متعلق باہمی کیا معاہدہ ہوتا ہے۔ اگر چھوٹا ناگپور بہار سے الگ نہ ہوا تو بہار کی طرح وہاں بھی ہندی مدارس اور دفاتر میں لازمی ہو جائے گی۔ اردو کے لئے مسلمانوں کو اپنے طور پر انتظام کرنا ہوگا۔ ابھی کچھ دن اور انتظار کیجیے۔ جب تقسیم کی کوئی صورت قائم ہو جائے تو اس وقت اس مسئلہ پر حالات کی رو سے غور کرنا پڑیگا

خیر طلب
عبدالحق

(۲۲۳)

دریا گنج۔ دہلی
۴ر جولائی ۴۷ء

مشفق و مکرمی

آپ کا خط پہنچا۔ پڑھ کر سوا افسوس کے اور کیا

کر سکتا تھا۔ آپ کے حالات بھی عجیب ہیں۔ کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ ادھر انجمن کی مالی حالت بھی سقیم ہے۔ اس مہینے تنخواہوں کی تقسیم کے لئے روپیہ نہ تھا۔ میری پنشن آگئی تھی۔ کچھ کچھ روپیہ کر کے تقسیم کر دیا۔ باقی کے لئے فکر میں ہوں۔ جن پر ہمارا لقایا ہے وہ دیتے نہیں ورنہ کام چل جاتا۔

ہندوستان کی تقسیم سے انجمن کی حیثیت بھی مشکل میں پڑگئی ہے۔ یہاں رہے یا وہاں رہے میں بعض ہمدردان انجمن سے گفتگو ہوئی۔ ان صاحبوں کی رائے ہے کہ دونوں جگہ کام کی ضرورت ہے یا انجمن کے مرکز دونوں مملکتوں میں رہنے چاہئیں۔

بہت دن ہوئے آپ نے ایک باب کا ترجمہ بھیجا تھا۔ اس کے بعد آپ نے خبر نہ لی۔ اب اسے تلاش کروں گا۔ آپ اصل انگریزی کتاب مجھے بھیج دیجیے۔ میں اسے دیکھ لوں۔ اس کے بعد اپنی رائے سے مطلع کر دوں گا۔

باقی سب خیریت ہے۔ دلی میں عجیب طوفان رہا ہے۔ تقسیم کے معاملے میں بڑی بڑی چالاکیاں اور گھتیاں کی جارہی ہیں۔ ادھر ریاستوں کے معاملے نے بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے۔

خیر طلب
عبدالحق

تعزیتی خطوط



خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زبانِ گورِ غریباں کا

مظفرپور

۳۰ر نومبر ۱۹۷۹ء

عزیزم لطیف [illegible]

ریڈیو اور اخبارات میں اپنے پیارے بھیا کی موت کی خبر میرے کانوں میں پگھلا سیسہ ڈال گئی۔ یہ یکایک کیسے ہوگیا ؟

[illegible] سائنس ترقی کے دور میں کافی آگے بڑھ گیا اور بہت سی قابلِ ستائش منزلیں طے کیں لیکن موت کے سامنے اس کو گھٹنا ٹیکنا پڑ گیا۔ اس معاملہ میں ہم بہت مجبور ہیں۔ ٹھیک ہی کہا گیا ہے کہ ہم صرف کٹھ پتلی ہیں جس کی ڈور دوسرے کے ہاتھ میں ہے۔

بھیا نے مجھے جو پیار دیا میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ مظفرپور میں جو کانفرنس منعقد ہونے والی تھی، اس میں شامل ہونے کے لئے وہ یہاں آنے والے تھے اور میرے ہی غریب خانہ پر قیام کرنے والے تھے لیکن خدا نے مجھ سے ان کا چند گھڑی کا ساتھ بھی چھین لیا۔

خداوند تعالیٰ سے دعاگو ہوں کہ تم لوگوں کو اور خاص کر بھابی جان کو صبر عطا فرمائے اور بھیا کی روح کو تسکین دے۔

ہریش جیسوال

---

(۲)

ماہنامہ پیامِ تعلیم، نئی دہلی۔

۳۰ر نومبر ۱۹۷۹ء

عزیزم سلمۂ دعائیں۔

کل رات ریڈیو پر سہیل صاحب کے انتقال کی خبر سن کر بالکل وہی کیفیت ہوئی جو ۱۲ر فروری ۱۹۷۸ء کو محمود احمد ہنر کی خبر سنکر ہوئی تھی۔ کس قدر افسوس ہوا اس خبر کو سنکر، یہ الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا

تمام بہی خواہ اور احباب ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جاتے ہیں۔ اب تو رونے کے لئے آنکھوں میں آنسو بھی نہیں رہ گئے۔ میں بھی کسی وقت جانے کو تیار بیٹھا ہوں کب چلا جاؤں گا کچھ خبر نہیں۔

اس خبر کا کہ مرحوم گھر پہونچنے سے پہلے ہی دوسری دنیا کو سدھار گئے، تم لوگوں پر کیا اثر ہوا ہوگا اس کے تصور ہی سے کانپ اٹھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور تم لوگوں کو اس بار کو اٹھانے کی طاقت عطا فرمائے۔

مجھے اپنے غم میں برابر کا شریک سمجھو۔ مکتبہ کے منیجر شاہد علی خاں صاحب کو بھی اس خبر سے سخت صدمہ ہوا۔ اُن کے مرحوم سے بڑے پرانے تعلقات تھے۔ ان کی طرف سے بھی تعزیت قبول کرو۔ اللہ تم سب پر اپنا فضل فرمائے۔

ولی شاہجہانپوری

---

(۳)

لکھنؤ

۳۰ر نومبر ۱۹۷۹ء

عزیزی میاں لطیف صاحب! السلام علیکم

آج صبح میرے پڑوسی میاں اقبال نے یہ المناک خبر سنائی کہ رات ریڈیو اور ٹی وی نے محترم سہیل عظیم آبادی صاحب کے انتقال کی خبر سنائی ہے۔ "بیشک ہم سب اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف واپس ہوں گے۔" اس کا یقین ہوتے ہوئے بھی ایسی المناک خبروں سے دل کو چوٹ لگتی ہے، صدمہ پہونچتا ہے۔

بس کل ہی کی تو بات ہے منشی پریم چند کے سلسلے میں ہم دونوں کی خط و کتابت ہوئی تھی۔ آخری خط میں انہوں نے دورہ چنڈی گڑھ، دہلی اور الہ آباد کی خبر دی تھی

لکھنؤ آنے کی خواہش کا اظہار بھی تھا لیکن ارادہ میں پختگی نہ تھی۔

ہاں ایک بات اور [illegible] کے والد کی حیثیت گھر میں کچھ بھی رہی ہو مگر سارے ہندوستان میں ان کی عظمت محتاج تعارف نہیں۔ ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ وہ جس سے بھی ملتے تھے ٹوٹ کر ملتے تھے۔ ان کے ذہن میں صرف دوستی تھی۔ ان کے دل میں دشمنی کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ نہ جانے کتنی عظیم شخصیتیں اُن سے ملتی تھیں، ان سے خط و کتابت کرتی تھیں۔ ان میں بہت [illegible] ان سے پہلے سفر آخرت پر روانہ ہو چکے ہوں گے [illegible] کے خطوط ہوں گے، مضامین ہوں گے۔ ہر خط اور ہر پرچہ ان کی عظمت اور بڑائی کی نشاندہی کرنے والا ہوگا۔ اس کی آپ صرف حفاظت کیجئے گا بلکہ ان کی نشر و اشاعت کا بھی انتظام کیجئے گا۔ آپ لوگ ان کی جائیداد کے وارث ہیں اور ہم سب ان کی عظمت اور بڑائی کے وارث ہیں۔ وہ خطوط آپ رکھیں یا کسی لائبریری کو دے دیں مگر اس کو شائع کر کے ہم سب کو اس کا حصہ ضرور دیدیں۔ اصلی وارث ہونے کی بنا پر یہ ذمہ داری بھی آپ ہی پر عائد ہوتی ہے اللہ آپ کو ان سب ذمہ داریوں کو نبھانے کی توفیق دے۔ کاش اس وقت ہم آپ کے ساتھ پٹنہ میں ہوتے اور ان اجتماعی دعاؤں، محفل ایصال ثواب میں شریک [illegible]

—— ابو محمد شبلی

---

(۴)

[illegible] گیا

[illegible] نومبر [illegible]

برادر عزیز شان الرحمٰن

[illegible] میں نہیں آتا کہ تمہیں کیا لکھوں، کس انداز سے [illegible] یقین ہو تو لگتا ہے یہ غم جتنا تمہارے لئے ہے اس سے زیادہ بڑا میں خود اپنے لئے محسوس کر رہا ہوں۔ اور ایسے میں لگتا ہے کہ لوگ خود مجھے تشفی و تسلی دیں، تعزیت پیش کریں۔ بلاشبہہ ماں باپ بہت بڑی دولت ہیں۔ ان کا سایہ جب تک سر پر [illegible] اطمینان رہتا ہے، ایک تقویت ملتی رہتی ہے۔ تم سے یہ تقویت چھن گئی۔ مگر تمہیں خود اس بات کا احساس ہوگا کہ سہیل عظیم آبادی کی شخصیت رشتہ داروں تک محدود نہیں تھی۔ مجھ جیسے بہت سے لوگ ہیں جن کا اُن سے کوئی براہ راست رشتہ نہ تھا لیکن اس کے باوجود ہم سبھوں نے ان کو بے حد قریب سمجھا۔ تمہارے ابا سے شعوری اور لاشعوری طور پر میں نے (اور میری طرح بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی) جو کچھ سیکھا ہے اس کی تفصیل کہاں تک بیان کروں۔ بے زبان، انکسار، خود اعتمادی، دوسروں کے مسائل سے گہری دلچسپی، وسعتِ ذہن و نظر، اختلاف نظریات میں تحمل اور برداشت، اردو کے لئے خود کو قربان کرنے کا عزم۔ یہ اور بہت سی خوبیاں تمہارے ابا نے ہم لوگوں کو دینا چاہا۔ افسوس ہے اُن سے جتنا مجھے سیکھنا چاہئے تھا نہیں سیکھ سکا۔ اس ناگہانی حادثہ کی وجہ سے سخت دل برداشتہ ہوں۔ اب ایسا لگتا ہے واقعی اردو زبان مرجائے گی، اردو ادب بے جان ہو جائے گا۔ اس وقت ذہنی طور پر بے حد منتشر ہوں۔ صحیح ڈھنگ سے تم لوگوں تک اپنے غم کا اظہار بھی نہیں کرسکتا۔ تم معاف کرنا۔ باور کرو اس حادثہ کا شدید اثر ہے۔ اپنے غم میں مجھے شریک سمجھو۔ کیا اردو ادب کو اب سہیل عظیم آبادی

جیسی شخصیت مل سکے گی؟ مجھے یقین نہیں آتا اور یہ سوچ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ خدا تم لوگوں کو صبر دے اور ہزاروں ہزار ایسے والوں اور سہیل عظیم آبادی کے شیدائیوں کو صبر [illegible]

[illegible] نسیم الدین [illegible]

(۵)

[illegible] سرینگر
یکم دسمبر ۱۹۷۹ء

بھابھی جان!

[illegible] الفاظ تعزیت کروں اور کس دل سے کہوں کہ صبر کیجئے۔ زندگی بھر کا ساتھ چھوٹ گیا ہو تو کسی کے تسلی و تشفی کے الفاظ کیا معنی رکھیں گے؟

سہیل بھائی ہمارے درمیان نہیں رہے یقین ہی نہیں آتا۔ انہوں نے نہ جانے کتنوں کو زندہ رہنے کا حوصلہ بخشا۔ ہر ایک کے دکھ درد میں کام آنے والے دوسروں کو فائدہ پہونچانے، ان کی زندگی سنوارنے کے لئے ہر لمحہ مضطرب اور بے چین۔ اب ایسے لوگ کہاں ہیں؟

سہیل بھائی کو مرحوم کس منہ سے کہوں؟ وہ تو اب بھی ہمارے ادب میں، ہماری محفلوں میں، ہمارے قلب میں اسی طرح زندہ ہیں جیسے کل تھے۔

سہیل بھائی سے میری خط و کتابت ۱۹۴۶ء سے تھی۔ جب میں دربھنگا میں طالب علم تھا اور سہیل بھائی رانچی میں تھے۔ جب میں ۱۹۶۷ء میں پٹنہ آیا تو یوں کہنا چاہئے کہ کئی سال تک دن رات کا ساتھ رہا۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھا۔ میری بیٹی کو بالکل اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے تھے۔ اور جب بھی میرے گھر [illegible] اور اگر روزانہ نہیں تو ہر دوسرے تیسرے [illegible] روز ضرور آتے تھے) اس کے لئے چاکلیٹ ضرور لاتے۔ میری بیوی کے ساتھ بالکل بہو جیسا برتاؤ کرتے اور جس وقت جیسی چائے پینے کی خواہش ہوتی ان ہی سے کہتے۔ ان کی کن کن باتوں کو اس وقت یاد کروں۔ ہر دل میں ان کا گھر تھا۔ ایسی مقبول اور محبوب شخصیتیں اتفاق سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔

میں نے کبھی ایک شعر کہا تھا۔ ایسا لگتا ہے سہیل بھائی اپنے بارے میں یہی کہہ رہے ہوں۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ان کی یاد کو بھی تازہ رکھیں [illegible]

عصرِ نو مجھ کو نگاہوں میں چھپا کر رکھ لے
ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا سرمایہ ہوں

عزیزی لطیف اور شان پر جو بیتی ہوگی، میں اس کا تصور ہی کر سکتا ہوں۔ آپ اب ان کی ماں بھی ہیں اور باپ بھی۔ میں آپ سب لوگوں کے لئے دعا گو ہوں اور آپ سب کے غم میں برابر کا شریک۔

مظہر امام

---

(۶)

مظفرپور
یکم دسمبر ۱۹۷۹ء

انیس الرحمٰن صاحب!

ریڈیو اور اخبارات سے اس حادثے کی اطلاع ملی۔ خداوند مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر و ضبط کی توفیق۔

میں اب تک علیل ہوں۔ ایسا کہ شاید ابھی ایک ہفتہ سفر سے قاصر رہوں۔ جسم میں کچھ صلاحیت ہو تو حاضر ہوں گا۔

اختر قادری

مئو ناتھ بھنجن ،
منی عزیز، چندی گڑھ
یکم دسمبر ۱۹۷۹ء

مکرمی سلام مسنون

۲۹ نومبر کی رات کو آل انڈیا ریڈیو سے جناب سہیل عظیم آبادی کے انتقال پر ملال کی خبر کے نشر ہوتے ہی سکتہ سا طاری ہو گیا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ سہیل صاحب اتنی جلد ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔ ابھی ماہ اکتوبر کو وہ ہمارے ساتھ رہے۔ بڑے خوش و خرم اور بظاہر صحت مند معلوم ہوتے تھے کسے خبر تھی کہ مرحوم سے یہ آخری ملاقات ہو گی۔ اردو ادب کو اس سانحۂ عظیم سے جو شدید نقصان پہونچا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ہم سب آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

حکیم شکور احمد ایوبی
ایڈیٹر "آبگینہ"

---

(۸)

محترمہ!

ابھی ابھی اخبار سے دردناک حادثے کی اطلاع ملی کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔ موت اور موت بھی مسافرت کی، سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں۔ اپنے گذشتہ خط میں سہیل بھائی نے جنوری میں یہاں آنے کو لکھا تھا مگر اس سے پہلے ہی آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔ اب اس وقت ان کی ایک ایک بات یاد آ رہی ہے۔ اردو زبان و ادب کا جو نقصان عظیم ہوا وہ تو ایک ناقابل تردید حقیقت ہے مگر میرے لئے تو یہ ایک ذاتی حادثہ ہے۔

میں کیسے لکھوں کہ صبر سے کام لیجئے مگر اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔ خدا ہی آپ لوگوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے اور مرحوم پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔

علقمہ شبلی

---

(۹)

۳ دسمبر ۱۹۷۹ء

بھابھی جان!

سہیل بھائی کے یوں اچانک اٹھ جانے کا ہم سب کو بڑا دکھ ہے۔ وہ میرے غریب خانہ پر سات روز رہے اور اس قلیل سے عرصہ میں انہوں نے میرے گھر کے ہر فرد کا دل جیت لیا۔ ہم سب آپ کے دکھ میں شریک ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مرحوم کی آتما کو شانتی دے اور آپ سب کو بھی ان کی جدائی برداشت کرنے کی شکتی دے۔

بیٹے سے کہہ کر مجھے جلد ہی تفصیلات سے آگاہ فرمائیں۔ ہم لوگ بے حد پریشان ہیں۔

[illegible]

---

(۱۰)

دہلی

عزیزم!

سمجھ میں نہیں آتا کہ سہیل بھائی کی وفات پر تعزیت کس طرح کروں۔ آپ کے تو وہ والد تھے۔ لیکن میرے وہ سگے بھائی سے بھی زیادہ تھے۔ میرے ان کے تعلقات تقریباً ۲۰ سال کے تھے۔ مرحوم

صف اول کے افسانہ نگار ہی نہیں، ایک اعلیٰ درجہ کے انسان بھی تھے۔ بہت کم لوگ ہیں جو اپنے چھوٹوں سے اتنے خلوص محبت اور شفقت سے ملتے ہوں۔ سہیل بھائی کی وفات سے میں ایک مشفق اور ہمدرد بھائی سے محروم ہوگیا ہوں۔ خدا آپ سب کو صبر جمیل عطا کرے۔

خلیق انجم

۴ر دسمبر ۹۰ء

برادرم شان میاں!

[illegible] سہیل بھائی کی المناک رحلت کی [illegible]۔ دم بخود رہ گیا۔ وہ اپنی بے پایاں محبت کے سمندر میں غرق ہو گئے۔ مدت سے وہ امرت رائے سے ملنے کے لئے بے چین تھے۔ اور وہیں کے ہو رہے۔ میں انہیں [illegible] ہی نہیں، اپنا بھائی، دوست، استاد [illegible] سمجھتا تھا۔ اب ساری دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس سے اتنے رشتے ہوں اور جو مجھے اتنا عزیز رہا ہو۔ اس سے میں اندازہ کرسکتا ہوں کہ اس اچانک سانحہ کا اور اپنی سب سے عزیز، سب سے شفیق ہستی سے محرومی کا تم پر کیا اثر ہوگا۔ لیکن صبر کے سوا تمہارے لئے کوئی چارہ نہیں ہے۔

نہیں جانتا کہ چندی گڑھ میں ان کے ساتھ آخری سفر اور آخری صحبتیں ہوں گی۔ جس دن دہلی سے گئے مجھے فون کیا۔ میں نہیں تھا۔ میری بیوی سے دیر تک باتیں کرتے رہے اور کہا کہ افسوس ہے کہ اب تم سے ملاقات نہیں ہوسکے گی۔ اور ان کا یہ کہنا کیسا پیغمبرانہ تھا۔

تم خوش نصیب ہو کہ اپنے اس غم میں تنہا نہیں [illegible] کے سینکڑوں دوست اور ہزاروں قدردان اس غم میں تمہارے شریک ہیں۔ ایسے لوگ کبھی نہیں مرتے۔ انہوں نے ساری زندگی اردو زبان و ادب کی خدمت کی ہے۔ ان کی تخلیقات ہمارے ادب کا سدا بہار سرمایہ ہیں۔ جب تک اردو زبان زندہ ہے وہ زندہ رہیں گے۔

اور کیا لکھوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ خدا تم کو اور دوسرے تمام افراد کو صبر عطا کرے۔ بھائی سہیل کے نہ رہنے سے تم مجھے اور عزیز ہو گئے ہو۔ جب کبھی کسی کام میں میری ضرورت ہو، بے تکلف سے لکھنا۔

[illegible] سہیل بھائی نے مجھے لکھا اور چنڈی گڑھ میں بتایا کہ انہوں نے عصر آگہی کے لئے ایک کہانی لکھ لی ہے۔ براہ کرم اس کا مسودہ بھیج دیجئے۔ میں خاص اہتمام سے شائع کروں گا۔

قمر رئیس

---

(۱۲)

کلکتہ

۵ر دسمبر ۹۰ء

بچوں!

کیا لکھوں۔ میں خود پچھلے پندرہ بیس دنوں سے بیمار ہوں اور گھر پر پڑا ہوا ہوں۔ اچانک کل اخبار میں دیکھا کہ سہیل بھائی ہم تمام کو چھوڑ کر چل دیئے ہیں۔ دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ یہ سچ ہے کہ وہ پچھلے تین چار سال سے بیمار تھے۔ اکثر خطوط میں وہ بیماری کے سلسلے میں لکھتے رہے ہیں لیکن ایسی امید نہیں تھی کہ وہ ہم سے ہٹ کر ابھی سے اپنی راہ الگ کرلیں گے اور ہمیشہ کے لئے چل دیں گے۔

والد کی موت سے بچوں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ مگر ایک فنکار کی موت سے پورے سماج کا نقصان [illegible] علم و دانش کا نقصان ہے۔ سہیل بھائی

ایک ایسے حقیقت پسند قلمکار رہے ہیں۔ [illegible] میری ان کی ملاقات تھی اور ہر ماہ وہ مجھے دو تین خط ضرور لکھا کرتے تھے۔ ہاں! ان کو یاد ہم جیسے لوگ نہیں بھلا سکیں گے۔

کیا لکھوں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ صرف اتنا ہی لکھ سکتا ہوں کہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں انجام دینے کو تیار ہوں۔ دعا گو ہوں کہ بھگوان [illegible] تمام دیں [illegible] تم تمام کو صحت مند رکھے۔

[illegible] رنجن بھٹاچاریہ

(٣)

رام اینا، مرزا پور، یو۔ پی

[illegible] ! سلام مسنون۔

قیاست جدید (کانپور) میں ایک ایسی خبر دیکھنے کو [illegible] پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ سہیل بھائی کے متحرک، فعال اور سرگرم پیکر پر موت نے اتنی آسانی سے غلبہ پالیا، یہ کیسے مان لوں۔ جہاں تک مجھے خیال آتا ہے نومبر کے تیسرے ہفتہ میں موصوف مرحوم نے دہلی اور وہاں سے الہ آباد جانے کا ذکر کیا تھا۔ میں نے اس موقعہ کو [illegible] تا اور لکھا تھا کہ الہ آباد سے مرزا پور چلے آیئے اور موت نے راستہ نہ کاٹا ہوتا تو وہ ضرور آتے۔

وضعداری، خلوص، شرافت اور بے غرضی کے ایسے نمونے پہلے بھی کم ہی ملتے تھے اور یہ دور تو ان تمام [illegible] صاف کا دشمن ہے۔ مجھے خط لکھنے میں عموماً دیر ہو جاتی تھی لیکن سہیل صاحب فوراً جواب لکھتے تھے۔ میں نے "کلکتہ ایک رباب" کا دوسرا ایڈیشن (جو زیر طباعت ہے) انہیں کے نام سے معنون کیا ہے۔ اس کا ذکر تو خط میں کر دیا تھا لیکن حد درجہ افسوس ہے کہ [illegible] مرحوم کتاب نہ دیکھ سکے۔ سہیل بھائی ایک عظیم افسانہ نگار ہی نہیں، ایک عظیم انسان بھی تھے۔ ایسے باپ سے محرومی کا آپ لوگوں کو جس قدر بھی غم ہو کم ہے۔ صبر کی تلقین کس طرح کروں۔ مگر صبر کے سوا چارہ کار بھی کیا ہے۔ جو آیا ہے اُسے جانا ہے اور کب جانا ہے، یہ کسی کو خبر نہیں ہے۔ میری تعزیت اپنی والدہ محترمہ کو بھی پہونچا دیجئے۔ دعا ہے کہ آسمان مرحوم محترم کی لحد پر شبنم افشانی کرے۔

مجھے اپنے غم میں رسما نہیں واقعتاً برابر کا شریک غم سمجھئے۔ یہ دنیائے ادب ہی کا حادثہ نہیں بلکہ میرا اپنا غم بھی ہے جس کی شدت کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔ مجھے آپ لوگوں میں سے کسی کا نام معلوم نہیں۔ لہذا پتہ میں سہیل بھائی ہی کا نام لکھ رہا [illegible]

حرمت الاکرام

(٤)

١٧٨ اے معظم پورہ
حیدر آباد۔ اے پی
١٠ دسمبر [illegible]

بھابی جان، آداب عرض

ابھی میں نے اخبار میں ایک ایسی دلخراش خبر پڑھی ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس خبر پر کیسے یقین کروں کہ سہیل بھائی نہیں رہے۔

آپ کے لئے اور لطیف وشان کے لئے یہ صدمہ کتنا گہرا ہوگا، یہ سوچ کر ہی دہشت ہوتی ہے۔ لیکن میرے لئے بھی یہ بہت بڑا دکھ ہے۔ کیونکہ سہیل بھائی نے [illegible] زبان سے مجھے بہن نہیں کہا تھا بلکہ انہوں نے ہمیشہ اپنی شفقت، محبت اور بزرگی کا برتاؤ کیا [illegible]

آج سے نہیں بلکہ اس وقت سے جب میں نے لکھنا سیکھا تھا سہیل بھائی نے ہمیشہ دل کھول کر میری حوصلہ افزائی کی [illegible] میں صرف ایک بار سہیل بھائی سے ملی اور ان کی سیمائی رہی مگر یہ دوری کا فاصلہ مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا اور میں ہمیشہ اپنے بڑے بھائی کی طرح اپنے سر پر ان کی مہربانی اور پرخلوص شخصیت کا سایہ محسوس کرتی تھی۔ بلکہ ہمیشہ میری توجہ کا مرکز رہا وہاں سہیل بھائی جیسی شخصیت رہتی تھی۔

سہیل بھائی صرف میرے لئے نہیں بلکہ ادیبوں کی ایک نئی نسل اور اپنے ہم عصروں کے لئے نور کا منارہ تھے۔ جو [illegible] لکھنے والوں کو راہ دکھایا [illegible]

مجھے اس وقت بہت کچھ لکھنا تھا مگر قلم ساتھ نہیں [illegible]

آپ لوگوں کو کیا کہہ کر تسلی دوں سارے الفاظ [illegible] کاش میں خود وہاں آکر آپ کو، لطیف و شان کو تسلی دے سکتی۔ سہیل بھائی جیسے شفیق شوہر کی جدائی آپ کے لئے سب سے بڑا دکھ ہے۔ مگر آپ اپنے آپ کو سنبھالئے۔ لطیف و شان سے بھی کہئے کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ خدا کرے کہ آپ کی صحت اچھی ہو۔ مجھے آپ تینوں کی بڑی فکر ہے۔ اپنی خیریت کی خبر آج ہی لکھوائیے اور اس حادثے کی تفصیل بھی۔ مجھے اس بات کا بڑا دکھ ہے کہ مجھے پٹنہ سے [illegible] فوری اس کی اطلاع نہیں دی اور آج بارہ دن کے بعد مجھے ایک اخبار سے یہ اطلاع ملی۔

میں آپ کے خط کا انتظار کروں گی۔ لطیف و شان کو دعائیں۔ اس وقت مجھے آپ کے پاس ہونا چاہئے تھا آپ کو تسلی دیتے اور میں اتنی دور اکیلی بیٹھی ہوں۔ بھابی آپ اپنے آپ کو سنبھالئے۔ [illegible]

بچے آپ کو سلام کہہ رہے ہیں اور آپ کی خیریت کے طالب ہیں۔

آپ کی بانو (جیلانی بانو)

(۱۵)

دہلی، ۸ر دسمبر ۱۹۷۹ء

[illegible] کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کا ماتم کروں۔ آپ کے عزیز شوہر کا، اپنے چھوٹے بھائی سہیل کا [illegible] میں چالیس روز اپنے وطن سے دور رہ کر جب پٹنہ لوٹا تو سہیل نے جس طرح محبت و خلوص [illegible] مجھے خوش آمدید کہا اور شہاب کہہ کر پکارا [illegible] اس پرخلوص ہستی کا ہمیشہ کے لئے گرویدہ بنا دیا۔ اور میں واقعی اسے اپنا بھائی سمجھنے لگا۔ اور اب سنتا ہوں کہ وہ ہم سب کو چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ہم چنڈی گڑھ میں ساتھ رہے۔ وہاں [illegible] کا سفر ایک ہی گاڑی سے کیا۔ کیا خبر تھی کہ یہاں سے وہ کہیں اور کے سفر کی تیاری کر رہا تھا۔

اس کی ایک ایک بات یاد آ رہی ہے اور دل بے قابو ہوتا جا رہا ہے کہ یہ سب اب ماضی اور خواب کی باتیں ہو کر رہ جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے جوار رحمت میں جگہ [illegible] آپ کو اور لڑکوں کو اس غم کو برداشت کرنے کی قوت عطا فرمائے [illegible]

[illegible] شہاب الدین

(۱۶)

جامعہ نگر نئی دہلی۔ ۲۵

عابدہ والا [illegible]

۸ر دسمبر ۱۹۷۹ء [illegible] عزیزہ بہن سلام مسنون

محترمی سہیل صاحب کی اچانک اور بے وقت وفات کا اس قدر صدمہ ہوا کہ میں الفاظ کے باوجود اس سے

آپ کو خط نہ لکھ سکی۔ میرے اور ڈاکٹر صاحب سے ان کے بہت پرانے اور خلوص کے تعلقات تھے۔ اور اس سال تو دو دن چنڈی گڑھ میں ہر وقت کا ساتھ رہا ... سے کہا بہت میں جامعہ آؤں گا۔ میں نے کہا کہ ضرور ... آپ وعدہ کرتے ہیں مگر آتے نہیں۔ چنڈی گڑھ ... ول کے مریض اور پرہیز پر رکھ میں بھی دل کی مریض ہوں) ہنس ہنس کر باتیں ہوا کرتیں۔ ہائے افسوس کہ وہ گھر پہنچنے بھی نہ پائے اور اتنی جلدی داغ مفارقت دے گئے۔ ایک صبح اخبار میں یہ خبر پڑھی تو دل و دماغ بے کار ہو گیا۔ وہ تو خوش نصیب تھے کہ زیادہ دکھ اٹھائے بغیر اپنے خالق سے جا ملے۔ مگر اردو ادب کتنا بدنصیب ہے۔ اس کا ایک سے بڑھ کر ایک عاشق اور خادم سدھار ... اور وہ بے سہارا ہوتی جا رہی ہے۔

میں کیا لکھوں۔ میں ذاتی طور پر آپ کو نہیں جانتی سہیل صاحب کے بچوں سے بھی واقف نہیں۔ لیکن یہ جانتی ہوں کہ عورت کے لئے اس سے بڑا صدمہ دنیا میں کوئی نہیں۔ میں خود سال بھر سے مر مر کے جی رہی ہوں اور جی جی کر مر رہی ہوں۔ مگر عابد صاحب کی جدائی لوسہہ نہیں پا رہی۔ آپ کی حالت کا مجھے پورا احساس ... اندازہ ہے۔ اور آپ کے اور ان کے بچوں کے ... ہے کا بھی۔ لیکن انسان بالکل مجبور ہے کہ سوا صبر ... اور کچھ نہیں کر سکتا۔ حالانکہ صبر صرف ظاہری ہوتا ہے۔ دل کی دنیا جب اجڑتی ہے تو بس نہیں سکتی پھر۔ میری طرف سے دلی تعزیت قبول کیجیے۔ سہیل صاحب میرے بھائی کی طرح تھے۔ مجھ پر بہت شفقت کیا کرتے تھے۔ ان کی جدائی خود میرے لئے بہت تکلیف دہ ہے تو آپ کے، ان کے بچوں اور سارے خاندان کے لئے کیا قیامت کا وقت ہے اسی کو سوچ کر دل

کانپتا ہے بس خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ آپ کو اور ... کو صبر و برداشت کی قوت اور ان کو اپنے جوار رحمت میں ... [illegible]

[illegible]

سفیہ گرجویٹ کالج، بھوپال۔

۹ر دسمبر ۷۹ء

عزیزم شان سلمہ، السلام علیکم

... ڈاکٹر عابد حسین صاحب سہیل بھائی ... میں ایسی بری خبر سنا گئے کہ دل دھک سے رہ گیا اور دعا کرتا ہوں کہ کسی طرح یہ خبر غلط ہو۔ اس لئے کہ ۲۴ر نومبر کا خط مجھے کلکتہ سے واپسی پر دلی سے چلا ہوا ملا تھا جس نے ایک خوشی کی لہر میرے اور میرے گھر والوں اور بعض شاگردوں کے دل میں پیدا کر دی تھی۔ اس خط کے ذریعہ انہوں نے مجھے اطلاع دی تھی کہ وہ جلد ہی بھوپال آ رہے ہیں۔ اب بھلا بتایئے کہ وہ موقع جب آیا کہ ہم سب لوگوں چھوٹے بڑے ان کے چاہنے والے بھوپال میں ان کی آمد کا انتظار کریں، شب و روز کا شمار کریں۔ ہفتے دن میں تبدیل ہوں، دن گھنٹوں میں اور پھر ہم سب ان سے بغلگیر ہوں۔ گھنٹوں باتیں کریں، ادب کی باتیں، سیاست کی باتیں، بھوپال کی باتیں، پٹنہ کی باتیں، دوستوں کی باتیں، غیروں کی باتیں اور ان کے سالہا سال کے تجربے سے اپنے دلوں میں یقین کے چراغ روشن کریں۔ خلوص و محبت کی شراب سے سرشار ہوں کہ اچانک وہ ہمارے درمیان نہ رہے۔

اس خبر نے ذہن و دماغ کو بہت رنجیدہ کیا۔ سناٹے کی کیفیت پیدا کر دی۔ بے دلی اور مایوسی ...

مبتلا کیا۔ کہیں، کسی سے کہیں۔ کیونکہ کہیں کہ ہم سب اداس ہیں۔ ہم سب پر دو غم ہے۔ اپنے محترم بھائی سے بچھڑنے کا غم۔ آپ سبھوں پر جو غم کا پہاڑ ٹوٹا ہے اس کا غم۔ ہماری آنکھیں سہیل بھائی کی یاد میں اکثر پُر نم رہتی ہیں۔ اس احساس [illegible] غمناک اور بڑھ جاتی ہے کہ ہم سے محبت کرنے والا ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گیا۔ ہائے ہائے۔

[illegible] عبدالقوی دسنوی

[illegible] (۱۸)

عزیزہ بیگم سہیل، آداب

میں گذشتہ تین ہفتے سے یہ چند سطریں لکھنے کا [illegible] ہوں اور ہمت نہیں پڑتی کہ انہیں قلمبند [illegible]

سہیل مرحوم دلی سے اپنی روانگی سے ایک دن پہلے تک میرے ساتھ رہے۔ حسب معمول ہر طرح کی گفتگو رہی۔ آئندہ کے منصوبے تیار ہوتے گذشتہ کاموں پر نظر ثانی ڈالی گئی۔ کیا معلوم تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے اور وہ اتنی جلدی ہم سب سے [illegible] ہونے والے ہیں۔ باور کیجئے کہ جب ریڈیو پر ان کی موت کی خبر سنی تو گویا بجلی سی گر گئی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

وہ وہاں گئے جہاں ہم سب کو بالآخر ایک دن جانا ہے۔ دعا ہے کہ خدائے برتر و عظیم اُن سے عفو و کرم کا سلوک کریں۔ آمین

آپ کا جو نقصان ہوا ہے اور جو صدمہ آپ کو پہنچا ہے اس کی تلافی تو ممکن نہیں لیکن ہمدردوں میں اس خاکسار کو بھی شمار کیجئے۔ خدا آپ کو صبر جمیل [illegible]

۱۱ر دسمبر [illegible]

عزیزم [illegible] عظیم آبادی

حضرت سہیل عظیم آبادی کی ناگہانی موت کی خبر سن کر دل ڈوب گیا۔ اس خیال سے یہ صدمہ اور بھی شدید ہو جاتا ہے کہ [illegible] چند روز پہلے وہ چنڈی گڑھ میں انجمن ترقی اردو کے سالانہ اجلاس کی مجلس استقبالیہ کے مہمان تھے اور چہکتے ہنستے مسکراتے یہاں سے رخصت ہوئے تھے۔

۲۳ر نومبر کو انہوں نے مجھے دلی سے بہت ہی پیار بھرا خط تحریر کیا۔ وہ اردو کے کاز کے لئے چلتے پھرتے گھر اور عزیزوں سے دور راہیِ ملک عدم ہوئے۔ [illegible] بجا طور پر انہیں شہید اردو کہا جا سکتا ہے۔

ان کے نام نامی سے ایک طویل عرصہ سے میں آشنا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی تحریریں پڑھ پڑھ کر میں نے لکھنا سیکھا۔ ذاتی تعلقات اُن سے گذشتہ برس پٹنہ اردو کانفرنس کے دوران استوار ہوئے اور خط و کتابت کے ذریعہ ذہنی طور پر ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ آپ کا اور لطیف صاحب کا ذکر وہ اکثر اپنے خط میں کیا کرتے تھے۔ امید ہے آپ ان روابط کو برقرار رکھیں گے جو آپ کے والد محترم نے مجھ سے استوار کئے تھے۔ ایک عزیز کے طور پر آپ جب بھی چاہیں مجھے کسی خدمت کے لئے یاد کر سکتے ہیں۔ خدا آپ کو اور لطیف صاحب کو یہ عظیم صدمہ برداشت کرنے کی توفیق دے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

وشوا ناتھ طاؤس

(۲۰) ۱۵،۲۰،۳

پیارے بیٹو!

پٹنہ ویکلی میں بھائی جان کے انتقال پر ملال کی خبر دیکھ کر کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو۔ بڑی خوبیوں کے انسان تھے اور ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کے صرف پیکر اور علمبردار تھے۔ ان کی ہمدردیاں بڑی وسیع تھیں۔ وہ مجھ پر بہت مہربان تھے اور ہر ہفتہ خطوط سے نوازتے تھے۔

آپ سب کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔

تارا چند رستوگی

میں نے یہ کہاں سوچا تھا کہ تمہیں محبت اور خلوص کے خط لکھ رہا تھا تو کبھی یہ ماتم گسار خط بھی لکھنا پڑے گا۔ یہ میری بدنصیبی ہے کہ وہ سہیل جو چند ماہ گزر جانے سے پہلے مجھے پٹنہ سے ذرا دیر خط لکھتا تھا کہ دہلی آکر تم سے ملوں گا۔ ماضی کے حسین لمحات میں ہم دونوں کھو جائیں گے۔ ڈیئر سہیل پٹنہ اور دہلی کے درمیان کہیں ہم سے الگ ہو گیا۔

مگر سہیل بھائی کے نصیب کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان کی زندگی کے آخری لمحات اس زبان کی خدمت کے نذر ہوتے جس کے لئے وہ عمر بھر جنگ جو رہے۔ ایسی ہوتی ہیں وہ لاثانی اور عظیم شخصیتیں جو اپنا جسم اور ذہن دم آخر تک مقدس کاز کے لئے وقف کر دیتی ہیں۔

ہم سب کو مرحوم پر فخر کرنا چاہئے اور مجھے

تو بالخصوص کہ اس نے میری سب سے پہلی تصنیف "پھٹا عدیا" کا پیش لفظ لکھ دیا تھا جس میں اپنی روح کو پوری شدت سے سمو دیا تھا۔ کچھ یوں کہ ناچیز کے خیال اور جذبے میں جان پڑ گئی تھی۔

یہ رسمی فقرہ ہو گا کہ میں تم سب کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ غم کوئی رسم نہیں ہوتا بلکہ دل میں اتر جاتا ہے اور وہاں اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک عظمتوں کی یاد ...

حیدرآباد

محترمہ بھابی صاحبہ! سلام مسنون

... حضرت سہیل عظیم آبادی کے انتقال کی خبر پا کر بڑا صدمہ ہوا۔ مرحوم سے میرے کوئی پچیس برس کے تعلقات خوردی و بزرگی تھے۔ ... آپ کو اور بچوں کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔

میں باہر تھا اس لئے دیر سے یہ رسم دنیاوی ادا کر رہا ہوں۔

(۲۲)

۱۹ جنوری

عزیزان محترم لطیف الرحمٰن اور شان الرحمٰن

اپنے عزیز اور مخلص دوست سہیل عظیم آبادی کے انتقال کی اطلاع ... جو دکھ ہوا ہے لفظوں میں نہیں آ سکتا۔ ہائے کیسا محبوب دوست آناً فاناً نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے

آپ حضرات کو برداشت کرنے کی طاقت عطا ہو۔

میں اتنی مدت آپ کو خط نہ لکھ سکا۔ بیوی کینسر کے مرض میں مبتلا ہے۔ انہیں بمبئی لے گیا تھا ان کے علاج کے لئے۔ ابھی ایک ماہ قیام کرکے واپس آیا ہوں۔

میرے پاس سہیل بھائی کے بے شمار خطوط محفوظ ہیں۔ یہ خطوط ماہنامہ "ادبیات" میں شریک اشاعت ہوں گے۔

جگن ناتھ آزاد

[illegible]

بھائی جان کی وفات کی اطلاع مجھے ویلور میں ملی تھی۔ میرے بڑے بھائی صاحب کو دل کا عارضہ ہے میں انہیں کے علاج کے سلسلے میں ویلور گیا تھا واپسی پر میں بیمار پڑ گیا۔ دمہ کا مریض ہوں سردیوں میں [illegible] پریشان رہتا ہوں۔ [illegible] چند الفاظ بھی نہ لکھ سکا۔

مگر سچی بات تو یہ ہے کہ بھائی جان کی [illegible] لئے مجھے آج بھی الفاظ نہیں مل رہے ہیں جن سے میرے جذبات کا اظہار ہو سکے۔ میرے نزدیک سہیل بھائی ایک مہربان بھائی، دوست اور بے حد پیار کرنے والی ہستی تھے۔ ان کی دوسری خوبیاں ان کے آگے [illegible] ہیچ ہیں۔

بہرحال دیر سے سہی مگر مجھے کہنے دو کہ بھائی جان کی وفات سے اتنا ہی صدمہ پہونچا جتنا آپ دونوں بھائیوں کو پہونچا ہوگا۔ میں خداوند قدوس کی خدمت میں دعا گو ہوں کہ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ ملے اور ہم ان کے صدمے کو برابر یاد رکھ سکیں۔ اس کی اہلیت عطا

فرمائیے ——

غیاث احمد گدی

24-P, Gandhi Nagar
Jammu. Tawi

(۲۵)

عزیز شان!

میرا گھر ماتم کدہ بن گیا ہے۔ ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ نہیں رہے یہ بات زبان پر لا نہیں سکتا پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہے ہیں — ۲۰ نومبر ۷۹ء کا لکھا ان کا ایک خط میرے سامنے ہے [illegible] خط مجھے سہیل صاحب نے دلی سے لکھا تھا۔ ان کی محبت اور شفقت نے مجھے ایک نئی زندگی عطا کی تھی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ وہ اپریل میں جموں آئیں گے۔ سردیوں میں جموں آنا فضول ہے۔ کیونکہ جموں آکر وادیٔ گل پوش کشمیر نہ گئے تو کچھ بھی نہیں [illegible] یہ سب کیوں ہوا۔ ایسا نہیں ہونا تھا! تیرے تھا آپ تو ان کی اولاد ہیں لیکن دیکھو ہمیں بھی وہ آنسو دے گئے ہیں۔ ایک گھاؤ دے گئے ہیں جو ہمیشہ رستا رہے گا۔ تمہاری چچی بھی غمزدہ ہیں۔ 6-12-79 کو ان کا بڑا بھائی گورداسپور میں فوت ہو گیا تھا۔ پہلے ہی رو رہی تھیں اس پر ایک اور چوٹ ایک اور گھاؤ۔ سہیل بھائی ہمیشہ یاد آتے رہیں گے۔ ان کی محبت اور ان کے خطوط اب میری پونجی ہیں۔ انہوں نے [illegible] کہ وہ ایک ناولٹ لکھ رہے ہیں۔ آپ کے دکھ میں برابر کا شریک ہوں اور اپنی تقدیر کا ماتم کر رہا ہوں۔ مجھے لکھنا کیا تھا۔ ان کے آخری لمحات میں کیا ہوا ہوگا۔ دل سے ہی الہ آباد آئے ہوں گے۔ بچپن میں باپ مر گیا تھا تو رو دیا تھا اور آج پھر رو رہا ہوں ——

یش شرما

D-235/...

حکومت بہار
محکمہ سینچائی و بجلی

سینچائی کے سلسلے میں بہار کے وسائل جنتا سرکار کے دور اقتدار میں اہم ترقیات کی طرف پیش رفت

۱۔ ۱۹۷۹-۸۰ کے سالانہ منصوبہ میں مختلف سینچائی پروجیکٹوں کے لئے ۱۱ کروڑ روپے کا منصوبہ اور محاسبہ منظور کیا گیا اور ابتک لگ بھگ ۵۰ کروڑ روپے کا خرچ مختلف منصوبوں پر کیا جا چکا ہے۔

۲۔ پانچویں منصوبہ کے اختتام تک محکمہ سینچائی کی پروجیکٹوں سے ۲۲ لاکھ ۲۰ ہزار ہیکٹر زمین میں سینچائی کی صلاحیت کا انتظام کیا گیا اور ۱۵ لاکھ ۵۵ ہزار ہیکٹر میں اس کا استعمال کیا گیا۔

۳۔ شمالی بہار کو سیلاب سے بچانے کے لئے ۱۱ جدید پیدا ہوئی پروجیکٹ ۱۱ کروڑ روپے کی لاگت کی ایک ۲۳ میل لمبی ایمبینکمنٹ کی تعمیر کا کام جاری ہے جس کے لئے حال ہی میں ٹینڈر فائنل کیا گیا۔ اس ایمبینکمنٹ کی تعمیر سے اس علاقے میں پڑنے والے سیلاب سے متاثرہ افراد کو فائدہ اٹھائیں گے۔

۴۔ بہار راجیہ نرمان نگم، محکمہ سینچائی کے ماتحت حکومت بہار کا ایک ادارہ ہے۔ ریاست کے بہت سینچائی منصوبوں کے کاموں کی تکمیل کے لئے اس کارپوریشن کا قیام ۱۹۷۸ء میں عمل میں آیا اور تب سے لگاتار تعمیر کے کام کا انتظام ہوتا آرہا ہے۔

۵۔ فروری ۱۹۷۹ء میں ۳ لاکھ ۲۶ ہزار ہیکٹر زمین میں سینچائی کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا جس کے برخلاف بارش اور سینچائی کے وسائل میں پانی کی کمی ہونے کے باوجود محکمہ کی باصلاحیت کارکردگی اور مناسب انتظام کے نتیجے میں ۱۱ لاکھ ۴۱ ہزار ہیکٹر زمین میں سینچائی کی سہولت فراہم کرنے میں کامیاب ہوئے کہ خریف فصل کو برباد ہونے سے بچا لیا گیا۔ جاڑو ربیع موسم میں ۱۵ لاکھ ہیکٹر زمین میں سینچائی کی سہولت فراہم کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

۶۔ سوکھا زدہ علاقہ کے (پلاموں، نوادہ، روہتاس اور مونگیر) پروجیکٹوں پر رواں مالی سال ۱۹۷۹-۸۰ میں لگ بھگ ۲۵ کروڑ روپے اور آئندہ سال ۱۹۸۰-۸۱ میں لگ بھگ ۳۰ کروڑ روپے خرچ کرنے کا نشانہ ہے جس سے حاصل ۵ ہزار ہیکٹر زمین میں سینچائی صلاحیت کا نشانہ ۱۹۸۰-۸۱ میں ہوگا۔

۷۔ سینچائی کے علاقے میں بجلی کی پیداوار کے دو علاقائی فرق کو ممکن حد تک دور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ فیصلہ بنایا گیا ہے کہ جو بھی نئے پروجیکٹ اب لئے جائیں گے وہ ریاست کے سوکھا سے متاثرہ علاقوں میں پڑے یا آدیباسی علاقہ میں۔

۸۔ ۱۹۷۹-۸۰ کے سالانہ منصوبہ میں سون نہر پر نالہ کا نچی نہر اور کرم ناسا نہر کو جدید کرنے کے لئے ۷۰ لاکھ روپے کی منظوری دی گئی ہے۔

۹۔ رواں مالی سال ۱۹۷۹-۸۰ میں منظور شدہ ۲۶ کروڑ روپے کا سالانہ منصوبہ میں سے گنڈک پروجیکٹ کیلئے ۲۰ لاکھ روپے کا انتظام کیا گیا ہے۔

۱۰۔ ۱۹۷۹-۸۰ میں کوسی بیراج اور مشرقی نہر، مغربی نہر اور راجپور نہر کے لئے بالترتیب ۵ کروڑ، ۱۵ کروڑ اور ڈیڑھ کروڑ روپے کی منظوری دی گئی ہے۔

۱۱۔ سیلاب پر کنٹرول کرنے کے کام کے انویسٹیگیشن، ... اور مونیٹرنگ کام کیلئے ۱۹۷۹-۸۰ سالانہ منصوبہ میں ۵۰ لاکھ روپے کی منظوری کی تجویز در پیش ہے۔

۱۲۔ ۱۹۷۹-۸۰ کے سالانہ منصوبہ میں کوسی اور گنڈک کمانڈ علاقہ کے علاوہ دوسرے علاقوں میں پانی کی نکاسی کے کام کے لئے ایک کروڑ ۴۲ لاکھ روپے کی منظوری کی تجویز در پیش ہے۔

۱۳۔ مالی سال ۱۹۷۹-۸۰ میں سینچائی ٹیکس وصولی کا نشانہ ۸ کروڑ روپے کا رکھا گیا ہے۔

۱۴۔ سرکار نے فیصلہ کیا ہے کہ سینچائی ٹیکس کے مقرر کرنے اور اس کی وصولی دونوں کے لئے ایک ایجنسی ہو اور پوری ریاست میں علاقائی نہر پرنالی لاگو کی جائے۔

۱۵۔ گنڈک اور کوسی کے علاوہ دیگر چالو بڑے پروجیکٹوں کا پروگرام مرتب کیا گیا ہے کہ ان بڑے پروجیکٹوں کو جہاں تک ممکن ہو سکے یکساں کیا جائے جس میں کہ ان سے سینچائی کا فائدہ کسانوں کو جلد سے جلد حاصل ہو سکے۔

۱۶۔ بھیتھی بلان سے مشرقی ایمبینکمنٹ کی تعمیر کی منظوری سرکار نے دے دی ہے اور اس سے ہزار ۱۵۰ افراد جو گھر سے بے گھر ہو جاتے تھے ان کو فائدہ پہونچے گا۔

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ بہار کے ذریعہ جاری کردہ۔

سہیل عظیم آبادی کی تخلیقات



لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

غزلیں

(۱)

چشم گریاں سے ٹپک جاتی ہے حالت میری
آبرو ڈوب گئی ضبطِ محبت میری
زندگی عرصہ میں گرفتارِ فراق
موت یعنی وہ گھٹا دیتے ہیں ایت میری
مجمع عام ہے ہنگامۂ محشر کیا ہے
تیری وحدت میں قیامت ہوئی کثرت میری
خاک اچھا لو جو فلک پر تو زمیں پر گر جائے
اب کھلا یہ کہ بہت پست ہے ہمت میری
تیری بے پردگی ہی حسن کا پردہ نکلی
کام کچھ کر گئی ہر حال میں غفلت میری
دیکھیے دیکھیے بے پردہ ہے دامِ سہیل
نگہِ نرگسِ مخمور ہے قیمت میری

تمناؤں کی دنیا ملتے ہی آباد کرتے ہیں
غضب ہے اپنے ہاتھوں زندگی برباد کرتے ہیں
عجب پر کیف تھیں ظالم تری پہلی ملاقاتیں
مزے لے لے کر ان کو آج تک ہم یاد کرتے ہیں
وہ راتیں کیف میں ڈوبی وہ تری پیار کی باتیں
نکل پڑتے ہیں آنسو جب کبھی ہم یاد کرتے ہیں

---

(۳)

ہے یہ مطلب گردشِ ایام کا
پھر وہ رکھ لے کوشش ناکام کا
وہ خرابہ میں کہ کعبہ میں ملے
آدمی جویا ہے بس آرام کا
کچھ نہ تھا سب کچھ ہوا پھر کچھ نہیں
رنگ تھا آغاز میں انجام کا
جس کی ہمت شاخِ گل سے بھی بلند
حوصلہ اس طائرِ ناکام کا
عشق نے مجھ کو بنا
آدمی تھا میں مگر تھا نام کا
دیکھیے کوئی کی آنکھوں سے سہیل
جلوۂ تاریک حسنِ شام کا

(۴)

اے حسرتِ دل گو وصل ہوا پر شوق ہمارا کم نہ ہوا
جس سے کہ خلش کچھ اور بڑھے وہ زخم ہمارا ہم نہ ہوا

تھا ہم نفسوں میں ایک نفس جو ہو گیا رخصت ہجر کی شب
غیروں کی شکایت کیا کیجے جب خود میرا دم ہمدم نہ ہوا

کیا غم ہے جو ہم گمنام رہے تم تو [illegible] بدنام ہوئے
اچھا ہے کہ میرے مرنے پر دنیا [illegible] ماتم نہ ہوا

غم میں بھی خوشی کا رنگ رہا فریاد میں بھی آہنگ [illegible]
مجلس میں رباب و چنگ رہا اک کھیل ہوا ماتم نہ ہوا

ہر وقت کی آہ و [illegible] دم بھر کو [illegible]
رونا ہی مقدر تھا میرا تو کس لئے میں شبنم نہ ہوا

کیا لطف ہے ایسے جینے کا جس کی نہ کسی کو پروا ہو
[illegible] کام کا مرنا وہ مرنا جس کا کسی کو غم نہ ہوا

جنگل میں گئے گلشن میں گئے بستی میں گئے صحرا میں گئے
ہر طرح سے بہلایا دل کو پر دل کا دھڑکنا کم نہ ہوا

آرام سے نفرت ہو جاتی آرام کی صورت ہو جاتی
غم ہے تو سہیل اس کا غم ہے کیوں دل کو کسی کا غم نہ ہوا

نظمیں

سہیل عظیم آبادی

واہمہ

یہ واہمہ تھا محض، کل تمہاری باہوں میں
گھنیری زلفوں کے سائے میں سو رہا تھا میں
دل و دماغ پہ چھائی تھی ایک تبسم زدہ سا [illegible]
تمہاری سانس کی خوشبو، تمہارے جسم کا لمس
میرے خیال میں جنت کا اک نظارہ تھا
حنائی انگلیاں میرے سر کے بالوں سے
الجھ رہی تھیں
مگر یہ واہمہ تھا۔

پیاسی روح

تپتے جلتے صحرا میں ایک پیاسی [illegible]
افتاں خیزاں اور بھٹکتی
سرگرداں ہے
صحرا سارا جل رہا ہے
سورج شعلے اگل رہا ہے
اور اک پیاسی روح
افتاں خیزاں
ڈھونڈ رہی ہے پانی ایک قطرہ
اپنی پیاس بجھانے کو
لیکن پانی کا اک قطرہ
تپتے جلتے صحرا میں، نظر نہیں آتا

[illegible] صحرا سارا جل رہا ہے
سورج شعلے اگل رہا ہے
اور اک پیاسی روح
ڈھونڈ رہی ہے پانی کا اک قطرہ
[illegible] افتاں خیزاں
[illegible] شاید روح یہ میری ہے۔

لوگ کہتے پھرتے ہیں
[illegible] بڑا شرابی ہوں
[illegible] "بھاری آوارہ"
رات دن خرابات میں
میں پڑا رہتا ہوں
جیسے میرا گھر ہے وہ
میں بڑا شرابی ہوں
میں ہوں "بھاری آوارہ"
درست یہ شکایت ہے
سچ! مگر یہ پوچھو تو
آج تک کسی کا بھی میں نے دل دکھایا ہے
آج تک کسی کو بھی میں نے کب ستایا ہے
اپنی جیب بھرنے کو
میں نے کس کا دھن لوٹا
میں نے دوستوں سے کب کیا منافقت کی ہے

[illegible]نے کے پردے میں دشمنی کیسی ہے؟

پھر بھی میں آوارہ
لوگ کہتے پھرتے ہیں
میں ہوں تمہاری آوارہ

آنکھ مچولی

آؤ آنکھ مچولی کھیلیں
میں بوڑھا ہوں، تم بوڑھی ہو
پھر بھی ہم تم دل رکھتے ہیں
پچھلی باتیں یاد آتی ہیں
ایسا دل جو راکھ ہے لیکن
چنگاری اس میں باقی ہے
چنگاری جو اب بھی چپ ہے
بھڑکے تو شعلہ بن جائے
دنیا بھر کو آج جلا دے
آؤ آنکھ مچولی کھیلیں
آؤ، ہم تم!

سہیل عظیم آبادی

متفرق اشعار

چراغِ اُمید بجھ چکا ہے عجیب عالم ہے زندگی کا
جب اپنی قسمت نے ساتھ چھوڑا تو پھر بھروسہ ہے کیا کسی کا

دماغ کو کر رہا ہوں روشن میں داغ دل کے جلا رہا ہوں
اب اپنی تاریک زندگی کا نیا سراپا بنا رہا ہوں

وہ لمحہ زیست کا لعنت ہے آدمی کے لئے
جھکے جو سر کسی انسان کی بندگی کے لئے

ہزار بار یہ دیکھا گیا کہ یزداں نے
[illegible]ر وقت آیا تو خود اہرمن کا ساتھ دیا

کھلے جو پھول سبھی زیب طرّہ و دستار
غریب کانٹوں نے خاکِ چمن کا ساتھ دیا

سینہ فگار چاک گریباں کفن بدوش
[illegible]ٹھے ہیں گرچہ بزم میں اس بانکپن سے ہم

[illegible] محروم [illegible] دل کی نہ پوچھ
ہاتھ سے جس کے چھلکتا جام گر کر ٹوٹ جائے

[illegible]وں نے مارے تھے مجھے لیکن
[illegible]ل پہ لگا کر اک دوست نے مارا تھا

دیکھا بہت قریب سے جب دشمنوں کا روپ
پھر دوستوں سے کوئی شکایت نہیں رہی

تڑپ تھی دل بھی تھا انداز عاشقانہ تھا
کہ جب جوان تھے ہم وہ بھی کیا زمانہ تھا

سہیل عظیم آبادی

میں اور میرا فن

بچوں کو کہانیاں سنا کر بہلانا ہمارے گھروں کی پرانی ریت ہے شاید ہی کوئی ایسا بدنصیب ہو جسے بچپن میں گھر کی بڑی بوڑھیوں نے دوچار کہانیاں بھی نہ سنائی ہوں۔ مجھے بھی بچپن میں کہانیاں سنائی جاتی تھیں۔ لیکن میرا شوق اتنا بڑھا کہ دوسروں کے لئے مصیبت بن گیا۔ جب بھی موقع ملتا کہانی سننے کی فرمائش کر دیتا۔ دور کے رشتے کی ایک نانی تھیں۔ ان کا زیادہ وقت ہم لوگوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ انہیں جنوں، پریوں، شہزادوں، شہزادیوں اور سوداگروں کی بہت سی کہانیاں یاد تھیں۔ بوڑھی تھیں، آنکھوں سے کم دکھائی دیتا تھا۔ اس لئے شام ہوتے ہی پلنگ پر براجمان ہو جاتیں۔ اور میں ان کے پاس پہونچ کر کہانی کی فرمائش کر دیتا۔ [illegible] کہانی سناتیں کسی دن دو تین اور اس سے زیادہ کی نوبت آ جاتی کبھی بیچ میں سوال پر سوال شروع کر دیتا۔ یا نیند نہیں آتی تو ایک کے بعد دوسری کہانی کی فرمائش کرتا جاتا تو وہ گھبرا جاتیں اور کہتیں۔ بیٹا اب تو کوئی کہانی یاد نہیں۔ اور بات بھی یہی تھی۔ وہی آٹھ دس کہانیاں تھیں جن کو وہ دہرایا کرتی تھیں۔ گھر میں ایک ملازم تھا رجب علی۔ اسے بھی بہت سی الٹی سیدھی کہانیاں یاد تھیں اور وہ بھی سنایا کرتا تھا لیکن سب سے دلچسپ کہانیاں سناتے تھے کریمن خلیفہ۔ گاؤں کے نکاڑ کے خلیفہ تھے اور لکڑی کے ہتھے کچھ پڑھے لکھے تھے۔ شاید جوانی میں انہوں نے الف لیلہ، داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا پڑھا ہو۔ وہ اپنی زبان میں اور خاص ڈھنگ سے ہمیں کہانیاں سناتے تھے۔ بوڑھے آدمی تھے بینائی کم ہو چکی تھی لیکن آواز دلچسپ تھی جب وہ کہانی سنانے پر آمادہ ہوتے تو بہت سی جانے بنتی اور گاؤں کے لوگ اکٹھا ہو جاتے ہمارے مکان کے آگے بڑا سا نیم کا درخت تھا۔ اتنا بڑا کوئی دوسرا ویسا درخت نہیں دیکھا۔ خلاف معمول اس کی شاخیں دور تک پھیلی ہوتی تھیں۔ نہ جانے کتنا پرانا درخت تھا اس کے نیچے ایک چبوترہ تھا۔ کریمن خلیفہ چبوترے کے پاس تن کر کھڑے ہو جاتے اور کہانی شروع کرتے۔ جب لڑائی کا قصہ بیان کرتے تو پینترے بدلتے، وار کرتے اور وار بچاتے۔ جیسے سچ مچ لڑائی ہو رہی ہو۔ کبھی ان کی کہانی تین ساڑھے تین گھنٹے سے کم میں ختم نہ ہوتی۔ جب وہ کہانی کہتے تو میں آدھی رات کے بعد تک بیٹھا سنتا رہتا۔ کیا مجال کہ نیند [illegible] آ [illegible]

ایک [illegible] تھا کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اور میری پرورش ننھیال میں ہوئی جس گاؤں میں ہم لوگ رہتے تھے، اس کا تین چوتھائی حصہ میری ننھیال کی ملکیت میں تھا۔ میرے دو آدمی باہر حصے میں سب کے لئے ہنستے تھے کبھی کبھی ان کے پاس بیٹھ کر کہانی سن لیتا غرضیکہ کہانی سننے کا شوق برابر بڑھتا ہی گیا۔ جب بڑا ہوا اور مولوی صاحب سے پڑھنے لگا۔ تو کتاب میں کہانیاں پڑھنے کو ملیں۔ پھر گھر میں جو کتاب ملتی اٹھا کر پڑھنے لگتا جو کہانیاں پڑھتا انہیں اپنے دوستوں کو سناتا۔ اس طرح کہانی سے بچپن ہی سے دل کو ایک لگاؤ سا ہو گیا۔

اسکول میں داخل ہوا تو خوش نصیبی سے ایک شفیق استاد مولوی سید خورشید حسن صاحب ملے۔ عالم و فاضل، اور بڑے شاعر۔ طلبا کی بہت بڑی افزائی کرتے تھے۔ میرے اردو بھی

تھی بہت سی کتابیں پڑھی تھیں۔ مولوی صاحب مرحوم خود بہت پڑھتے تھے اور لوگوں سے پڑھنے کو کہا کرتے تھے۔ انہیں کتابیں دیتے تھے چنانچہ پریم چند، سدرشن، کشن پرشاد کول اور کئی دوسرے لکھنے والوں کی کتابیں مولوی صاحب نے عنایت فرمائی۔ رسالوں میں دوسرے لکھنے والوں کو پڑھنے کا موقع ملا۔ بچپن گاؤں میں گذرا تھا۔ زمینداروں اور کسانوں کے فرق سے واقف تھا۔ زمینداروں کی زیادتیاں بھی دیکھی تھی اور کسانوں کی مجبوریاں بھی۔ زمیندار گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود ان کی بہت سی باتیں مجھے پسند نہ تھیں۔ پریم چند کے افسانوں نے جذبات میں نئی بیداری پیدا کی۔

میرے شعور کے آغاز کا زمانہ بھی لگ بھگ وہی ہے، جو ہندوستان میں عام سیاسی بیداری کا تھا۔ کانگریس، اور ترک موالات [illegible] تحریک کو کچھ نہ تھا، لیکن اپنے لوگ شریک تھے۔ اس لئے [illegible] طور پر ساری برادریاں اس کے ساتھ تھیں۔ لیکن مہاتما گاندھی کی نمک تحریک، سائمن کمیشن کا بائیکاٹ، بھگت سنگھ کی پھانسی کا واقعہ آزادی کے لئے نوجوانوں میں تڑپ۔ ان ساری چیزوں سے متاثر ہوا۔ انگریزی حکومت سے نفرت اور کچلے ہوئے عوام سے جذباتی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ پریم چند کے افسانوں نے اور اسے جلا دی۔ اور جذبات کے ساتھ نیم پختہ شعور بھی ہم آہنگ ہو گیا۔ انقلاب آزادی اور ترقی کے خواب دیکھنے لگا۔ رسالے اور اخبار پابندی سے پڑھنے لگا اور کبھی کبھی کہانی لکھنے کا خیال بھی دل میں پیدا ہونے لگا۔ پہلی کہانی ایک ملاقات کی نذر رکھی۔ عنوان تھا [illegible] ظالم صحرا، جو کبھی شائع نہیں ہوئی۔

ابتدا میں شاعری کا شوق پیدا ہوا، اور غزلیں کہنے لگا۔ پہلے مولوی سید خورشید حسن صاحب سے اصلاح لی بعد میں برادر گرامی [illegible] جمیل مظہری سے۔ کلکتہ پہنچا تو ایک کہانی لکھی، اور علامہ [illegible] انہوں نے پڑھنے کے بعد مشورہ دیا کہ شاعری ترک کرکے کہانیاں لکھو شروع میں مولانا شائق احمد عثمانی۔ ڈاکٹر اسد مرحوم نے بڑی ہمت افزائی کی اور میری متعدد کہانیاں شائع کیں۔ بعد میں پنڈت سدرشن کے رسالہ چندن میں لکھنے لگا۔ یہ میری ادبی زندگی کا آغاز تھا۔

میں جن افسانہ نگاروں سے متاثر ہوا، ان میں سب سے پہلا نام منشی پریم چند کا ہے۔ ان کے بعد سدرشن اور دوسرے لکھنے والے۔ غیر ملکی افسانہ نگاروں میں ٹالسٹائی، چیخوف، موپاساں اور بعض دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی متاثر کیا، لیکن دراصل میں سب سے زیادہ پریم چند اور ٹالسٹائی سے متاثر رہا ہوں۔ ان دونوں کے یہاں جو سادگی اور کرداروں کے ساتھ خلوص ملتا ہے وہ کسی دوسرے افسانہ نگار کے یہاں نہیں ملتا۔ آج بھی پریم چند اور ٹالسٹائی کی کوئی کتاب اٹھا لوں تو ختم کئے بغیر نہیں رکھ سکتا۔ یوں پڑھنے کو تو آج بھی پڑھتا رہتا ہوں۔ اور بہت سے نئے اور پرانے لکھنے والوں کی چیزیں پڑھی ہیں۔ لیکن پریم چند اور ٹالسٹائی کے لئے میرے دل میں وہی جذبہ ہے جو پہلی بار پڑھنے کے بعد پیدا ہوا۔ [illegible] میں ترقی پسندی کی تحریک نے ذہن کو اور جلا [illegible] دی۔ سوچنے کا ڈھنگ بھی بدلا۔ لیکن بنیادی طور پر عام انسانی برادری ہی میرا فن کا، اگر وہ کچھ بھی رکھتی ہے [illegible] میں کہہ سکتا ہوں کہ [illegible] ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک مارا مارا پھرا ہوں۔ میری شروع کی کہانیاں پریم چند کی تقلید میں سماجی ہیں۔ کسانوں سے متعلق، مزدوروں سے متعلق، متوسط طبقے سے متعلق۔ لیکن بعد میں ان میں وسعت [illegible] پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اونچے طبقے کے خودغرضانہ [illegible] اور غیر ہمدردانہ ذہنیت کو بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ چھوٹے زمینداروں کی زندگی کی تصویر اتارنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی [illegible] دکھانے کی کوششیں کی ہیں۔ اور ان کی اچھائیوں کو بھی [illegible] لکھے ہیں اور لطیفے بھی۔ میں خود نہیں کہہ سکتا کہ [illegible] کوششوں میں کامیاب رہا ہوں لیکن یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ زندگی کی سچائیوں کا ایمانداری اور خلوص کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کوشش

میں کسی خاص ٹیکنیک کا سہارا نہیں لیا ہے۔ بلکہ ہمیشہ سیدھے سادے انداز میں کہانی کو بیان کر دینے کی کوشش کی ہے۔ میرا یہ انداز بہت چند داستانوں کی دین ہے۔ میں نے کبھی کوئی ایسا موضوع اپنی کہانی کے لئے تلاش نہیں کیا جس کو میں اچھی طرح نہ جانتا ہوں۔ حالانکہ بہتوں نے محض سنی سنائی باتوں کا سہارا لے کر ہوائی قلعے تیار کرنے کی کوشش کی ہیں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ ہمیشہ زندگی کی سچائیوں کو ایمانداری اور خلوص کے ساتھ سیدھے سادے لفظوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور کبھی کسی تکنیک کا سہارا نہیں لیا۔ میری ایک چھوٹی سی کہانی ہے "ہنسی" یہ بوڑھی ساس اور جوان بہو کی کہانی ہے۔ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

"مسعری کی عجیب عادت تھی۔ اس سے کوئی کبھی کچھ بولتا تو جیسے پرلالی دوڑ جاتی، آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی اور ہنسی چھلک پڑتی، کبھی تو نند چھیڑ دیتی یا دیور دل لگی میں کچھ کہہ دیتا۔ پھر تو اس کی ہنسی رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ کھل کھلا کر ہنس پڑتی اور دیر تک ہنستی رہتی، کبھی اکیلی بیٹھی بیٹھی کچھ سوچ کر مسکرانے لگتی۔ کبھی یاد کرکے آپ ہی آپ ہنسنے لگتی۔ اس کی ہنسی سارے گاؤں میں مشہور ہو گئی تھی۔ شروع شروع میں تو اس کی یہ بات گاؤں کی عورتوں کو اچھی نہ لگی، جتنے منہ اتنی باتیں کسی نے کہا چال چلن اچھا نہیں لگتا۔ کسی نے کہہ دیا کہ اس پر بھوت کا سایہ ہے مگر تھوڑی ہی دنوں میں سب کو اندازہ ہو گیا کہ اس میں کوئی برائی نہیں ہے، اس کی طبیعت ہی ایسی ہے۔ اور جب سب نے یہ جان لیا تو دوسری بات مشہور ہو گئی کہ دھاری کی عورت جیسی ہنس مکھ اور سگھڑ بہو آج تک گاؤں میں نہیں آئی۔"

ہمارے سماج کا یہی حال ہے۔ لوگوں کے بارے میں خیال آرائی کا سلسلہ نہیں رکتا۔ اچھا ہو یا برا دوسروں کے بارے میں خیال ظاہر کرنے میں کوئی احتیاط نہیں برتتا۔ میں نے یہی بات سیدھے سادے لفظوں میں کہنے کی کوشش کی ہے۔ میں چاہتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ کہانی اس طرح لکھی جائے کہ اس میں ناوٹ ذرا بھی نہ آنے پائے۔ اور پڑھنے والوں کو کہانی پڑھنے سے زیادہ سننے کا مزہ آئے۔ کرداروں کی متحرک تصویر نظر کے سامنے آ جائے۔ اور واقعات کے تسلسل سے زندگی کا مسئلہ سمجھ میں آ جائے۔ میں کسی ازم یا اصول کی تبلیغ افسانہ نگار کا کام نہیں سمجھتا۔ یہ کام ان لوگوں کا ہے جو ازم اور اصولوں کی تبلیغ کی ذمہ داری لیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کہانی لکھنے والے کی ذمہ داری یہ ہے کہ زندگی کے حقائق کو دلکش انداز میں پیش کر دے۔ اسے الجھائے نہیں کہ پڑھنے والے کا دماغ الجھ کر رہ جائے۔ کہانی لکھنے والے کی فنی ذمہ داری اس سے زیادہ نہیں۔ جو لوگ اس سے زیادہ ذمہ داریاں اپنے سر لیتے ہیں وہ نہ تو اپنے ساتھ انصاف کرتے ہیں نہ فن کے ساتھ اور نہ پڑھنے والوں کے ساتھ۔

بعض ناقدوں نے میری کہانیوں کو سپاٹ اور بے پلاٹ کہا ہے۔ مجھے خود اس کا اقرار ہے اور میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں کہانی کو خواہ مخواہ زیادہ دلچسپ بنانے اور اس میں SUSPENSE پیدا کرنے یا ہیجان پیدا کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ اگر کہانی زندگی کی تصویر ہے۔ تو اسے اسی انداز سے آگے بڑھنا چاہئے جس طرح زندگی بڑھتی ہے۔ خاموشی کے ساتھ کہ پتہ نہیں چلتا۔ ہاں اگر کہانی کی بنیاد کسی غیر معمولی واقعہ کی بنیاد پر ہو، یا کسی غیر معمولی کردار کو نمایاں کرنا ہو۔ یا کوئی الجھا ہوا نفسیاتی نکتہ پیش کرنا ہو تو اور بات ہے۔ ورنہ عام آدمیوں کے درد دکھ، ہنسی خوشی کی کہانیوں کو اسی طرح پیش کرنا چاہئے جس طرح وہ زندگی میں پیش آتی ہیں مبالغہ سے اس میں شاعری کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے اور کہانی حقیقت سے دور ہوتی چلی جاتی ہے۔ میں کسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا یہ میرا اپنا خیال ہے اور اس سے اختلاف کی بڑی گنجائش ہو سکتی ہے۔

(باقی صفحہ ۲۹۴ پر)

سہیل عظیم آبادی

پھوڑا

صبح سویرے اٹھ کر بستر پر اس نے انگڑائی لی تو اسے اپنا سارا بدن ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ کافی دیر تک وہ بالکل خالی الذہن بیٹھی رہی۔ کبھی کوئی بات اس کے دماغ میں آتی اور بھاگتے ہوئے بادل کی طرح تیزی سے نکل جاتی۔ اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ اور یونہی ہتھیلی کو دیر تک تکتی رہی۔ یکایک کسی کے چیخنے کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ اور وہ چونک پڑی مگر سب بس کوئی بھی نہ آیا۔ مسہری پر سے اٹھی اور سنگھار میز کے بڑے سے آئینے میں اپنی شکل دیکھنے لگی۔ اسے اپنا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا نظر آیا اور وہ جھک کر دیکھنے لگی تو آنکھوں کے گرد ہلکی ہلکی کالی ڈوریں بھی نظر آئی۔ نہ جانے کیوں اسے تکلیف سی محسوس ہوئی سا [illegible] وہ ذرا گھبرا سی گئی۔ مگر سنبھل گئی۔ اور پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر آئینہ کو غور سے دیکھنے لگی۔ یکایک اسے ایک بات یاد آگئی۔ اور ایک مرجھائی ہوئی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر دوڑ کر مٹ گئی۔ اس نے اپنے سارے بدن کو خاص نظر سے دیکھا۔ اس وقت اسے محسوس ہوا کہ اس کا سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے اور نڈھال سی ہو کر اس نے اپنی گردن کرسی کے پشتے پر ڈال دی۔ اسے ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے جسم کے ایک حصے کو دوسرے سے کوئی لگاؤ نہیں۔ یکایک کوئی بات اس کے دماغ میں تیزی کے ساتھ آئی اور نکل گئی اسے یاد نہ رہ سکا کہ کیا بات [illegible] اس سے بڑی الجھن ہوئی۔ اس نے پھر غور سے آئینے میں دیکھا جیسے وہاں لکھی ہو۔ لیکن آئینے میں اسے اپنے پیلے چہرے اور آنکھوں

[illegible] کے گرد کالی ڈوری کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آیا [illegible] نے سوچا کہ چند برسوں میں کتنی بدل گئی ہے وہ پہلے کیا [illegible]

[illegible]

"جلدی آ [illegible]"

[illegible] چمپی آگئی اور وہ اس کا چہرہ بڑے غور سے دیکھنے لگی۔ [illegible] چنبیلی کو اس کی [illegible] حیرت ہوئی [illegible]

"[illegible] کیا دیکھتی ہے بی بی [illegible]"

"تو نے رات بہت زیادہ شراب پی لی چنبیلی ــ یہ بری بری بات [illegible]

[illegible] نہیں بی بی جی"

چنبیلی بولی۔ مگر اس نے چنبیلی کی بات ان سنی کر دی۔ اور [illegible] بولی۔

"[illegible] رات بہت زیادہ پی لی [illegible]

[illegible] تو کبھی شراب نہیں پی [illegible]

[illegible] زیادہ نہ پیا کر۔ جا منہ دھونے کو پانی لے آ۔"

چنبیلی گھبرائی ہوئی جانے لگی تو اس کا پاؤں لڑکھڑا گیا۔ جیسے [illegible] وہ نشے میں ہو۔ چنبیلی کو اس قدر گھبرائی ہوئی دیکھ کر اسے ہنسی آگئی اور وہ آپ ہی آپ زور سے ہنس پڑی ہنسنے میں

اس کے ہونٹ جلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس نے پھر آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا وہی پیلا رنگ اور آنکھوں کے گرد کالی گدوری نظر آئی۔ جنبیلی کا زرد رنگ پیلا تھا اور اس کی آنکھوں کے گرد گدوری تھی۔ اسے اپنی حالت پر اکڑھن سی ہوئی۔

مگر فوراً ہی جنبیلی کی اصلی وجہ اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ غریب وہی صرف اس کے گھر پر کام کرتی تھی۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہ تھا۔ حد تو یہ ہے کہ ایک دن ملازم نوکر نے ذرا چھیڑ دیا تھا۔ تو اس نے شکایت کر دی تھی۔ کتنی احمق لڑکی تھی۔ طوائف کے ساتھ رہتی تھی، اور چھیڑ چھاڑ سے ڈرنا چاہتی تھی۔ آج پہلی مرتبہ جنبیلی کی یہ بات اسے بری بھی معلوم ہوئی ساتھ ہی اسے اپنی حالت کا بھی احساس ہوا۔ اور اسے تکلیف ہوئی۔

جنبیلی نے آکر کہا۔

"بی بی جی پانی [illegible]"

"ارے جنبیلی یہ بات بڑی خراب ہے۔ رات تو سوتی نہیں خراب [illegible] اور یہ تو نے کیا [illegible] آنکھیں [illegible] کرایا کرتی ہے؟"

جنبیلی جیسے اچھل پڑی اور بولی۔

"نہیں بی بی جی۔ میں کسی مرد سے نہیں بولتی۔ [illegible] کیوں کسی کے [illegible] کو منہ لگاؤں"

اسے جنبیلی کی بات پر ذرا بھی حیرت نہ ہوئی بلکہ وہ دل کی اٹھتی ہوئی لہروں کو دبا کر رہ گئی۔ اس نے بہت سی باتیں کہنی چاہیں لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اس کے دل میں جنبیلی کے خلاف رشک کا ایک جذبہ پیدا ہوا اور مٹ گیا۔ خود بخود اس کے دل میں کمتری کا احساس پیدا ہوا اور وہ چپ چاپ کرسی سے اٹھی اور غسل خانے میں چلی گئی۔ اسی وقت اس کی ماں کی آواز اس کے کانوں میں آئی جو کسی سے کہہ رہی تھی

"نرگس کو سدھارنے کی ضرورت ہے۔ یہ لڑکی بہکنے لگی ہے۔"

مگر نرگس نے اس کا کچھ خیال نہ کیا وہ دیر تک غسل خانے میں بیٹھی دھوتی رہی۔ اور جب زیادہ دیر ہوئی تو آخر اس کی ماں نے آکر پکارا۔

"ارے لڑکی! آخر تجھے آج کیا ہو گیا ہے؟"

مگر نرگس کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ کافی دیر کے بعد غسل خانے سے نکلی۔ جب بال سنوار کر وہ چائے پینے کو نکلی تو وہ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ جنبیلی سامنے کھڑی تھی۔ اسے جنبیلی سے نہ جانے کیوں نفرت سی ہونے لگی۔ اور اس نے ذرا زور سے کہا۔

"ارے پاگل کی بچی! — یہ ٹھنڈی چائے ہے"

جنبیلی چائے دان لیکر چلی گئی۔ لیکن اس کی آواز سن کر اس کی ماں آگئی۔ اور آتے ہی بولی۔

"بیٹی! یہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ چائے ٹھنڈی ہے اماں۔ اور یہ حرامزادی۔"

"اس کا کیا قصور ہے بیٹی۔ دیر تو تم نے کی۔ چائے ٹھنڈی تمہاری غلطی سے ہوئی ہے"

نرگس چپ ہو گئی۔ مگر اس کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا [illegible] غصے میں ہے اور غصہ ہونے کی کوئی بات نہ تھی۔ اس کی ماں جانتی تھی۔ اور نرگس بھی جانتی تھی کہ غریب جنبیلی نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی۔ جنبیلی پر غصہ تھا اور زندگی کا غصہ تھا۔ اور جب وہ دوبارہ چائے لیکر آئی تو نرگس نے جنبیلی کو ایسی قہر آلود نگاہوں سے دیکھا کہ وہ سچ مچ کانپ گئی۔ اور سہم کر سامنے سے ہٹ گئی۔ نرگس کی ماں سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ بولی۔

"آخر تو اس سے رنج کیوں ہے۔ اس نے کیا کیا ہے؟"

"نہیں تو — کوئی بات نہیں ایسی —"

نرگس نے جواب دیا۔ مگر اس کی تشفی نہیں ہوئی۔ اور اس نے پھر چھیڑ کر پوچھا۔

"نہیں کوئی بات ضرور ہے۔ جو تو اسے ایسی نظروں سے دیکھتی ہے۔ کوئی بات ضرور ہے"

نرگس نے زیادہ دیر تک ماں کو الجھن میں ڈالے رکھنا نہیں چاہا۔ اور اس نے صاف کہہ دیا۔

"ہاں! میں اس کو کتنا مانتی ہوں۔ مگر یہ کمبخت مجھے جب دیکھتی ہے تو حقارت بھری نظروں سے۔"

"چھوڑو بھی۔ وہ ایسا کیوں کرنے لگی۔ تیری سمجھ کا پھیر ہے۔"

اس کی ماں اٹھ کر چلی گئی اور اس نے چائے پینی شروع کی۔ اسے ہنسی آگئی۔ وہ اپنا سارا دکھ چنبیلی کے سر رکھ رہی تھی مگر چنبیلی نے تو کبھی کہا نہ کہ وہ اس سے نفرت ہے۔ چنبیلی میں اتنی تمیز کہاں تھی کہ وہ سمجھ سکتی۔ لوگوں کو اپنے گناہوں کا ذکر کرتے بڑا لطف آتا ہے اور سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ ان گناہوں کو دوسروں کے سر تھوپ کر بیان کیا جائے۔ مگر چنبیلی نے کچھ ایسا جواب دیا کہ نرگس کے دل میں تیر کی طرح لگا۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ یہ حقیر لڑکی جسے بچپن سے اس کی ماں نے پالا تھا اسے ذلیل اور حقیر سمجھتی ہے۔

رات کی بات اسے رہ رہ کر یاد آنے لگی۔ اس نے جمال کے ساتھ بہت زیادہ شراب پی تھی۔ وہ روز آتا تھا اور عشق و محبت جتاتا تھا۔ اور بہت خوش تھا مگر جب سے اور دو چار بڑے آدمی آنے لگے تھے جمال کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ وہ جتنی دیر وہاں رہتا عشق و محبت کے بدلے نصیحتوں میں گزارا کرتا۔ نرگس اسے خوب سمجھتی تھی کہ اس نصیحت کے پردے میں اس کا رشک و حسد کام کر رہا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا اس کے راستے میں آجائے اور وہ بھی ایسا آدمی جو اس کا راستہ بند کر سکتا ہو۔ اب وہ بار بار نرگس کو شادی کر لینے پر اصرار کرتا تھا۔ سمجھاتا کہ یہ حسن و جوانی ختم ہو جانے پر کوئی نہ پوچھے گا۔ اور اگر ضرورتیں اسی شان سے پوری ہوتی رہیں تو پھر شادی کر لینے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ مگر وہ شادی کرنے پر کبھی تیار نہ ہوئی۔

اس کے گھر پر بہت سے لوگ آتے تھے۔ اور ہر کسی نے دام نئی قسم کی باتیں کرتا تھا۔ اور جمال بھی ایک عرصہ تک یہی کرتا رہا تھا۔ ہر ایک کا مطلب وہ سمجھتی تھی۔ اور اسی انداز میں جواب دینے کی عادت اس نے پیدا کر لی تھی۔ مگر جمال کے ساتھ ایسا نہ تھا۔ جمال سے وہ جھگڑ پڑتی، لڑتی اور منہ میں جو کچھ بھی آتا کہہ دیتی۔ اور وہ ہنس لیتا۔ مگر وہ جمال کی رائے پر عمل کرنے کو تیار نہ تھی۔ یہ پیشہ اس کی کئی پیڑھیوں سے آرہا تھا۔ اس کی ماں، نانی اور نہ جانے کون کون یہی پیشہ کرتی آئی تھیں۔

رات اس کے یہاں بہت سے لوگ آئے تھے۔ اور وہ یکے بعد دیگرے ہر ایک کی خاطر داری میں مشغول رہی تھی۔ وہ تو جمال کے ساتھ اس نے بہت کافی شراب پی تھی۔ ورنہ شاید وہ سب کو خوش خوش نہ واپس بھیج سکتی۔ رات تک خمار باقی تھا۔ اور اب محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔ اس نے اپنے مونڈھوں کو دبایا اور خاص قسم کی لذت محسوس کی۔ اس نے چنبیلی کو بلایا اور اس سے کہا کہ ذرا مونڈھا دباتی رہے۔ چنبیلی نے مونڈھا دبانا شروع کیا تو وہ اسے بھول گئی۔ لیکن رات کی باتیں ایک ایک کر کے یاد آتی رہیں [illegible]

جمنا بابو کے ساتھ ان کے ایک دوست بھی آئے تھے۔ اور [illegible] عجیب اکھڑ سے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ معلوم نہیں وہ آئے [illegible] سے تم جو تیں [illegible] کے بدن کا پھوڑا ہو۔ اور وہ مسکرا کر رہ گئی۔ اس وقت کوئی جواب اس کے دماغ میں نہ آیا۔ اس پر اسے خود اپنے اوپر غصہ آیا۔ [illegible] جواب دماغ میں آیا جب وہ آدمی سامنے نہ تھا۔ اس نے سوچا کاش وہ آدمی پھر آجائے اور اپنا جملہ دہرائے تو وہ جواب دے۔

"چھوڑا تو ہے مگر غلاظت جو کیڑوں کی خوراک تھی۔ اگر ہم نہ رہیں تو ان ناپاک کیڑوں کا پیٹ کیسے بھرے؟"

اس نے پلٹ کر پھر چنبیلی کی طرف دیکھا جو بیٹھے اس کا [illegible] دبا رہی تھی۔ اسے پھر چنبیلی کی آنکھ میں وہی حقارت کی چنگاری چمکتی ہوئی نظر پڑی اور وہ تلملا اٹھی۔ اس نے چنبیلی کو ڈانٹ کر کہا۔

"جا دور ہو کمبخت! سامان لے جا۔"

وہ غصے سے دیوانی سی ہو رہی تھی۔ یہ چھوکری!!!

نرگس نڈھال ہو کر پھر مسہری پر لیٹ رہی۔ اور سوچتی رہی

ہوا۔ خرابی اس کی ہاتھ ملنے کی بنا پر اس حقیر چھوکری میں اتنا غرور ہے۔ اُف! اس کے دل میں جیسے کسی نے چھری پیوست کردی۔ اور وہ بےچینی کے ساتھ کروٹ بدلنے لگی۔ چنبیلی نے کتنے غرور کے ساتھ کہا تھا۔

"میں کسی کتے کو منہ نہیں لگاتی۔"

اسے معلوم ہوا کہ جیسے سب آنے والے کتے ہی ہیں۔ جو ایک دوسرے کو دیکھ کر غراتے ہیں۔ بھونکتے اور الجھ جاتے۔ جن کا پیٹ ایک جگہ نہیں بھرتا اور در دروازے دروازے مارے پھرتے ہیں۔ ان کتوں میں سب سے بڑا کتا وہ جمنا بابو کا دوست تھا۔

دیر تک وہ اسی حالت میں بےچینی کے ساتھ کروٹ بدلتی رہی۔ چنبیلی ڈرتی ہوئی آئی اور بولی [illegible]

"بی بی جمنا بابو آئے ہیں۔"

نرگس نے کروٹ بدلی اور بولی [illegible]

"کہہ دو طبیعت خراب ہے۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ تو ضرور گئی۔ لیکن پھر وہاں نہ گئی۔ دونوں ہتھیلیوں پر سر کو دھرے کچھ سوچتی رہی۔ اور برابر سوچتی رہی۔ یہاں تک کہ پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ جمنا بابو مسکراتے ہوئے آرہے تھے نظر ملتے ہی وہ بولے۔

"کیوں، کیا بات ہے آج۔"

نرگس نے عجیب انداز سے ان کو دیکھا اور بولی۔

"آپ کے وہ دوست کہاں ہیں۔ رات والے۔"

"نرگس! اسے وہ عجیب وحشی انسان ہے اس کی باتوں کا خیال نہ کرو۔"

نرگس نے طنز سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"مجھے کوئی خیال نہیں۔ ہاں آپ انہیں خوشخبری سنا دیجئے [illegible]

[illegible] چھوٹا پھر کر چلا گیا۔"

[illegible] جمنا بابو نہ سمجھ سکے اور بولے [illegible]

اتنے میں اس کی ماں بھی آگئی۔ اور بولی [illegible] آپ جائیے۔ ان سے یہی کہہ دیجئے میرا آپ کو بھی

"جاؤ جمنا بابو بیٹھے ہیں۔ تمہیں بازار لیجانے کو آئے [illegible] سلام ہے۔ آئندہ تکلیف نہ کیجئے گا۔"

گر نرگس اسی طرح مسہری پر پڑی رہی۔ نہ اٹھی۔ ماں نے سمجھا کہ سچ مچ طبیعت خراب ہوگی۔ یا پھر رات کو زیادہ شراب پی جانے کا اثر ہوگا۔ تھوڑی دیر میں آجائے گی۔ اور وہ چلی گئی۔

تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد اس نے چنبیلی کو پھر بھیجا۔ تو

[illegible] سامنے چنبیلی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی حقارت کی چنگاری چمک رہی تھی۔ اور ہونٹوں پر سمٹا ہوا طنز۔ تم پھر [illegible] اب تک نہیں گئیں۔ اس نے ذرا تیزی سے کہا۔

"غفور کو کہہ دے کہ جاکر جمال صاحب کو جلدی سے بلا لائے۔" ...

بقیہ:- میں اور میرا فن (ص ۲۹۰ سے آگے)

میں نے کافی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کے موضوع مختلف ہیں۔ لیکن میں نے اس بات کا ہر جگہ خیال رکھا ہے کہ ان کی زندگی کو اپنے کردار دوں کی زندگی کو ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کے ساتھ پیش کروں اور ایسا نہ بننے دوں جسے تلاش کرنے کے لئے چاند کی آبادی میں جانا پڑے۔

میری کہانیاں زندگی کی کشمکش کی تصویریں ضرور ہیں لیکن میں نے خواہ مخواہ اثر پیدا کرنے کے لئے مبالغے سے ہمیشہ بچنے کی کوشش کی ہے۔ میں زندگی کی تمام خوشگوار اور ناگوار حقیقتوں کو ان کی اصلی صورت میں پیش کر دینے کا قائل ہوں اور اسے اسی طرح پیش کر دینے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ میں نے کبھی کسی ازم یا اصول کو اپنی کہانیوں میں پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ اگر کوئی ایسی تصویر نظر آئے تو وہ ہماری سماجی زندگی کی تصویر ہے اور وہ میں نے اتاری ہے۔ پڑھنے والے اس کی تعبیریں اپنے خیال کے مطابق کرلیں تو میں ذمہ دار نہیں ہوں اور نہ اسے میری کوشش سمجھنا چاہئے۔ میرا فن زندگی کو اس کی اصلی شکل میں بےنقاب کرنا ہے اور اس میں حسن پیدا کرنا ہے۔ ...

ریڈیائی ڈرامے

سہیل عظیم آبادی

ہندوستان میں فلم سازی شروع ہونے سے پہلے ہندوستانی ڈرامے کی باگ ڈور پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کے ہاتھ میں تھی۔ کچھ غیر پارسی کمپنیاں بھی بنتی اور ٹوٹتی رہتی تھیں۔ لیکن وہ بھی اپنی بناوٹ اور کام کرنے کے ڈھنگ کے لحاظ سے پارسی تھیٹریکل کمپنیوں سے الگ نہیں تھیں۔ ان پر ہر طرح پارسی کمپنیوں کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ ان کمپنیوں کا مقصد شوقین مزاج لوگوں کی تفریح کا سامان کرنا اور روپیہ کمانا ہوتا تھا۔ تھیٹریکل کمپنیوں سے باہر ڈرامہ لکھنے والوں یا اداکاروں کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ بلکہ تھیٹر میں کام کرنے والوں کو بھی نظر سے دیکھا بھی نہیں جاتا تھا۔ ڈرامہ لکھنے والے عام طور پر کمپنیوں کے ملازم ہوتے تھے، اور منشی کہلاتے تھے۔ اور کمپنی کے مالک کی فرمائش یا ہدایت پر ایسے ڈرامے لکھتے تھے، جو مقبول ہوں اور روپے کمانے کا ذریعہ بنیں۔ اسی لئے عرصے تک مذہبی، یا رواجی قصے، یا پھر عشقیہ قصے ڈراموں کی شکل میں اسٹیج پر آتے رہے۔ یہ کمپنیاں بھی زمانے کی تبدیلی اور رجحانات کو سمجھتی تھیں اور اسی لئے پارسی اسٹیج پر اخلاقی، سماجی اور وطن پرستی کے جذبے کو ابھارنے والے ڈرامے بھی آئے۔ لیکن روایت پسند ہونے ڈرامہ اور اسٹیج کو اہمیت دی ہی نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ڈراموں کو ادب میں بھی جگہ نہیں مل سکی۔ آغا حشر کا یہ کارنامہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ انھوں نے اپنے زور قلم سے ڈرامے کی ادبی حیثیت منوالی۔ اور ڈرامے کو بھی ادب کی ایک صنف سمجھا جانے لگا۔ لیکن ڈرامہ ہمیشہ اسٹیج کا محتاج تھا۔ اور ہندوستان میں اسٹیج بہت کم تھے۔ اسی لئے ڈرامے کی صنف کو وہ فروغ نصیب نہیں ہوا۔ جو دوسری اصناف ادب کو۔ اور ہندوستانی ڈرامہ پہلے قدم بڑھاتا ادبی منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ اسی زمانے میں مغربی ادب سے متاثر ادیبوں نے نئے انداز کے ڈرامے لکھے۔ لیکن ان کو اسٹیج نہیں مل سکا۔ اس طرح ہندوستانی ڈرامہ اسی منزل میں رہا۔ جہاں اسے پارسی اسٹیج نے لاکر چھوڑ دیا تھا۔

فلموں کی مقبولیت، اسٹیج کے حق میں تباہ کرنے والی ثابت ہوئی۔ پھر بھی خاموش فلموں کے دور میں اسٹیج اور اس کے ساتھ زندگی کے دن کسی طرح کاٹتے رہے۔ اس لئے کہ فلم آواز اور رنگ سے محروم تھی۔ اسی کمی نے اسٹیج کو کسی طرح زندہ رہنے کا موقع دیا لیکن جب بولتی فلموں نے اس کمی کو بھی پورا کر دیا۔ بلکہ وہ ایسی چیزیں بھی دیں، جو اسٹیج کے لئے پیش کرنا ممکن نہ تھیں، تو اسٹیج نے دم توڑ دیا۔ اور اس کے ساتھ ڈرامہ نویسی بھی بری طرح مجروح ہو گئی۔ حد تو یہ کہ آغا حشر جیسے ڈرامہ لکھنے والے بھی فلم کمپنی کے لئے لکھنے پر مجبور ہو گئے۔

اس لحاظ سے کہ فن کی ترقی کا خیال نہ کر کے، روپیہ کمانا ان کا بھی مقصد رہا۔ فلم کمپنیاں بھی پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کی پیرو رہیں، بلکہ اس سے بھی پیچھے ہی رہیں۔ زندگی اور سماج کے مسائل کو غیر منافع بخش سمجھ کر کبھی چھیڑنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔

پارسی تھیٹر کمپنیوں کی طرح فلم کے لئے کہانی لکھنے والے کمپنی کے ملازم تو نہیں رہے۔ لیکن لکھنے والوں کا قلم آج بھی آزاد نہیں

اور ضرورتوں کو سمجھ لیا تھا۔ اور کبھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ایک بار جب چارو بابو نے چائے پینے کے بعد سگریٹ ڈھونڈا اور سگریٹ نہ ملا تو ذرا پریشان ہوئے، مگر رحمان نے سگریٹ لاکر سامنے رکھ دیا۔ اس نے تین چار پیکٹ سگریٹ خرید کر پہلے ہی رکھ لئے تھے۔ نہ جانے کس وقت ضرورت پڑ جائے۔ اس نے دو دن میں یہ بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ گگری بل کی بھیڑ اور ہاؤس بوٹوں کی قطار میں رہنا انہیں بہت پسند نہیں ہے۔ مگر انہیں معلوم نہیں کہ ہاؤس بوٹ ہٹا کر دوسری جگہ لے جائے جا سکتے ہیں۔ اس نے خود ہی ان سے کہا تھا کہ یہاں آپ کو لکھنے پڑھنے میں تکلیف ہوتی ہوگی۔ کہئے تو کسی سنسان جگہ میں ہاؤس بوٹ لگا دوں اور چارو بابو کو اس کی بات پسند آئی تھی۔ اس نے شکارے پر چارو بابو کو لے جا کر کئی جگہیں دکھائی تھیں پھر ہاؤس بوٹ چار چنار کے پاس کھڑا کر دیا گیا تھا۔ چارو بابو کو یہ جگہ بہت پسند آئی تھی۔ بڑی پرسکون جگہ تھی اور خوبصورت بھی۔ چار چنار جزیرہ تھی۔ اور اس کے چاروں طرف ڈل۔ اتر کی طرف سامنے شالامار باغ، نشاط باغ، پچھم کی طرف نسیم باغ اور حضرت بل، اتر پورب چشمہ شاہی۔ پورب کی طرف پری محل کا کھنڈر، دکھن پورب شنکر آچاریہ کی چوٹی۔ پچھم دکھن کی طرف ہری پربت پر اکبر اعظم کا بنایا ہوا قلعہ۔ ———

——— ہر چیز کی اپنی تاریخ تھی۔ ہری پربت پر اکبر اعظم نے فتح کشمیر کے بعد ایک مضبوط قلعہ بنوایا تھا۔ شالامار جہانگیر نے اور نشاط باغ نورجہاں کے بھائی نے اپنی بہن کے لئے بنوایا تھا۔ شالامار پر شاہی عظمت کا عکس تھا۔ نشاط باغ میں جمال اور دلکشی، چشمہ شاہی حمام تھا جس میں مغل شہزادیاں نہایا کرتی تھیں اور چشمے کا صحت بخش پانی شاہی گھرانے کے استعمال میں آتا تھا۔ پری محل کے بارے میں دو باتیں مشہور تھیں ایک تو یہ کہ قدیم زمانے میں یہاں بودھوں نے وہار قائم کیا تھا اور دوسری یہ کہ شہزادہ دارا شکوہ نے بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا تھا اور شنکر آچاریہ کی چوٹی پر شیو کا مندر تھا۔ خود چار چنار کی کہانی بڑی دلچسپ تھی اور جہانگیر کی شاعرانہ طبیعت کا ثبوت تھی۔ مشہور تھا کہ ایک دن جہانگیر ڈل کی سیر کر رہا تھا، امراء اور وزراء اس کے ساتھ تھے اس جگہ پہنچنے پر اس نے اپنے شکارے کو رکنے کا حکم دیا۔ سارے امراء اور وزراء اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جہانگیر نے چاروں طرف دیکھا اور کہا:

"یہاں پر چناروں کا ایک چھوٹا سا باغ لگا دیا جائے تو ——— ؟"

اس کی بات سن کر سارے امراء گھبرا گئے۔ پانی کی سطح پر چناروں کا باغ، ایسی فضول بات صرف بادشاہوں کے دماغ میں آسکتی ہے، مگر کون کہتا، سب جانتے تھے کہ بادشاہ کو چناروں سے عشق تھا۔ اس نے ایران سے چنار کے پودے منگا کر لگائے تھے اور اس کی دلچسپی دیوانگی کی حد تک تھی۔ اس نے سارے کشمیر میں چنار کے درخت لگائے تھے۔ سری نگر جامع مسجد میں بھی۔ ایک بار وہ سری نگر میں تھا تو جامع مسجد میں آگ لگ گئی۔ اسے خبر ملی تو اس نے مسجد کے بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا بلکہ پوچھا،

"چنار کے درخت تو نہیں جلے؟ وہ تو بچ رہے ہیں؟"

چنار سے جہانگیر کی دلچسپی کا حال سب کو معلوم تھا۔ کوئی کیا بولتا اور بادشاہ کی رائے سے اختلاف کرنے کی ہمت کس میں تھی۔ سب چپ رہے جہانگیر سمجھ گیا یہ لوگ اسے ناممکن کام سمجھ رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ مشکل کام نہیں ہے۔ اور حکم دیا کہ کشتیوں میں مٹی بھر کر لائی جائے اور اس جگہ ڈبو دی جائے۔ حکم کی دیر تھی۔ ہزاروں کشتیاں مٹی بھر کر لائی اور ڈبو دی گئیں۔ ان پر ڈال دی گئی اور اس طرح دو ہزار مربع گز زمین بیچ ڈل میں نکال لی گئی۔ اس زمین کے چاروں کونوں پر اس نے چنار کا ایک ایک درخت لگایا اور درمیان میں گلاب اور دوسرے پھولوں کی باڑھ لگائی گئی۔ یہی جگہ چار چنار کے نام سے مشہور ہو گئی۔ بعد میں اس میں اور تبدیلیاں آئیں۔

رحمان اپنے ڈھنگ سے چارو بابو کو بہت سے قصے سنایا کرتا تھا، لیکن چارو بابو کو زیادہ دلچسپی اس کے بیٹے جہانگیر سے تھی۔

رحمانا نے اسے بتایا تھا کہ دس سال پہلے اس کا ہاؤس بوٹ چار چنار کے بیچ تھا تو یہ لڑکا پیدا ہوا اور اس نے اس کا نام جہانگیر رکھ دیا۔

جہانگیر بہت خوبصورت تھا۔ ہر وقت سوچ میں رہتا تھا، جیسے پریوں کے دیس کی سیر کر رہا ہو۔ جب بھی چارو بابو اسے کسی کام کے لئے کہتے وہ فوراً کر دیتا اور جب اس سے کوئی بات پوچھتے تو وہ بڑی تفصیل اور سنجیدگی کے ساتھ بتایا کرتا تھا۔ ایک دن چارو بابو نے اس سے سوال کیا۔

"تم پڑھتے کیوں نہیں؟"

جہانگیر کا چہرہ اداس ہو گیا وہ بولا۔

"صاحب، میں تو پڑھنا چاہتا ہوں، مگر باپ نہیں پڑھاتا۔"

چارو بابو کو جہانگیر پر رحم آ گیا۔ اسی رات کھانے کے وقت انہوں نے رحمانا سے پوچھا۔

"جہانگیر کو پڑھاتے کیوں نہیں؟"

رحمانا کا چہرہ اداس پڑ گیا اور وہ بولا۔

"صاحب، میرا باپ مجھے پڑھانا چاہتا تھا اور مولوی صاحب کے پاس پڑھنے کو بھیجا بھی تھا۔ میں چار سال تک پڑھتا رہا۔ مجھے بھی پڑھنے کا بہت شوق تھا، مگر پھر پڑھنا چھوڑ دینا پڑا۔"

رحمانا چپ ہو گیا۔ چارو بابو نے پوچھا۔

"کیوں؟"

رحمانا نے جواب دیا۔

"صاحب ہم لوگ بہت غریب آدمی ہیں۔ میرا باپ بھی بہت غریب آدمی تھا۔ ہاؤس بوٹ ہم لوگوں کا نہیں، لسّہ میر کا تھا۔ میرے باپ نے اس سے ٹھیکے پر لے رکھا تھا۔ لسّہ میر سخت دل اور لالچی آدمی تھا۔ میرا باپ میر کو ہر سال ہاؤس بوٹ کا کرایہ ادا کر دیتا تھا اور جو بچتا تھا اس سے ہم لوگ گزارا کرتے تھے مگر ایک سال بارش اور سیلاب کی وجہ سے سیاح بہت کم آئے کاروبار ٹھپ رہا۔ سارا موسم بے کاری میں گزر گیا، مگر لسّہ میر نے ایک ایک دھیلا سختی کے ساتھ وصول کر لیا۔ میری ماں کے پاس چاندی کے دو چار زیور تھے وہ بھی ختم ہو گئے اور ہم لوگ پیٹ پالنے کے لئے دوسروں کے یہاں نوکری کرنے پر مجبور ہو گئے۔ میرا پڑھنا لکھنا ختم ہو گیا۔ مانجھیوں کی زندگی بہت سخت ہے صاحب۔ ہاؤس بوٹ دوسروں کے ہیں۔ ہم بھی ٹھیکے پر لیتے اور کام کرتے ہیں، نوکروں کی طرح۔ سیاح آتے ہیں تو ان کی زندگی پر بہار آ جاتی ہے اور چلے جانے کے بعد پھر خزاں چھا جاتی ہے ان کی زندگی کا سہارا ہے ہاؤس بوٹ کا کرایہ اور سیاحوں سے انعام۔ اگر کوئی دل والا سیاح آ گیا اور انعام میں کچھ اچھی رقم دے گیا تو جاڑوں میں بھی گزارا ہو جاتا ہے ورنہ پھر کوئی کام کرنا ہی پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں میرا باپ کیسے پڑھاتا؟ پھر باپ مر گیا تو بوڑھی ماں کی ذمہ داری میرے سر آ گئی۔ میرا دل تو بہت چاہتا ہے جہانگیر کو پڑھاؤں یہ پڑھ لکھ کر دوسرا کام کرے مانجھی کا کام اچھا نہیں ہے، لیکن کیسے پڑھاؤں؟ کس طرح پیٹ پل جاتا ہے یہی بہت ہے۔"

رحمانا نے سارا حال اس طرح کہہ سنایا کہ چارو بابو کا دل پگھل گیا۔ کھانا کھاتے اور سوچتے رہے پھر بولے۔

"جہانگیر بڑا ہونہار لڑکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پڑھے گا تو ترقی کرے گا۔ اسے پڑھاؤ اس کے پڑھنے کا خرچ میں دوں گا۔"

رحمانا کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ جہانگیر ہنسنے لگا۔ رحمانا احسان مندی کے جذبے سے مغلوب ہو کر بولا۔

"جی صاحب، آپ کی مہربانی۔"

دوسرے ہی دن جہانگیر کا نام اسکول میں لکھا دیا گیا۔ چارو بابو خوش تھے کہ انہوں نے ایک اچھا کام کیا۔

چارو بابو واپس چلے گئے۔ لیکن جہانگیر کے لئے ہر مہینہ پابندی کے ساتھ پچیس روپے بھیجتے رہے۔ یہ رقم ان کے لئے کچھ بھی نہیں تھی۔ مگر رحمانا اور جہانگیر کی زندگی کا بڑا سہارا تھی۔ جب دوسرے سال وہ آئے تو جہانگیر بڑا بھی ہو گیا تھا اور امتحان میں

اچھے نمبروں سے پاس ہوگیا تھا۔ انہیں خوشی تھی کہ وہ ایک ہونہار لڑکے پر روپے خرچ کر رہے ہیں۔ دوسرے رحمانا کی خدمت گزاری سے بھی بہت خوش تھے۔ جب چارو بابو کو کچھ پڑھنا یا لکھنا نہیں ہوتا تھا تو وہ رحمانا اور جہانگیر کو لے کر شکارے پر سیر کرنے کے لئے چلے جاتے، اور ان سے کشمیر کے بارے میں بہت سی باتیں پوچھتے اور وہ دونوں اپنی عقل کے مطابق انہیں بتاتے۔ اس طرح کئی سال گذر گئے۔ اور چارو بابو نے سری نگر میں کئی ناول لکھ ڈالے، جن کو شہرت بھی ہوئی۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور ہوا "جنت میں جہنم" یہ ناول ہانجیوں کی زندگی سے متعلق تھا۔ انہوں نے اپنے اس ناول میں کشمیریوں کی زندگی پیش کی تھی۔ انہوں نے اپنے ناول میں کشمیریوں کی مجبور اور بدحال زندگی کا نقشہ پیش کیا تھا۔ انہوں نے بڑی خوبیوں سے اپنے ناول میں ثابت کیا تھا کہ کشمیر جنت ہے باہر والوں کے لئے۔ خود کشمیریوں کے لئے جہنم ہی ہے۔ اس ناول کو بنگالی زبان کا بڑا ناول کہا گیا تھا۔

ایک بات وہ بیحد خوش تھے۔ وہ دن ان کے لئے بڑا مبارک دن ثابت ہوا تھا۔ اسی دن انہوں نے اپنا نیا ناول ختم کیا تھا اور گھر سے تار آیا کہ دوسرا لڑکا پیدا ہوا ہے اور یہ بھی کہ کاروبار میں ان لوگوں کو بڑا فائدہ ہوا ہے۔ کرمانا نٹر میں گلاب کا باغ لگانے کے لئے بہت بڑی زمین خریدی گئی ہے انہوں نے کھانا کھاتے وقت کہا۔

" رحمانا میں دو دن میں واپس جاؤں گا۔ تم بہت اچھے آدمی ہو۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔ تم نے مجھے بہت آرام پہنچایا ہے بشاید دوسرے ہاؤس بوٹ میں رہ کر اتنے اطمینان سے میں اپنا ناول ختم نہیں کرسکتا تھا۔ میں تمہارے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں "

رحمانا شکر گزاری کے جذبے سے جھک گیا اور بولا۔

"صاحب، آپ ہم پر بہت مہربان ہیں"

چارو بابو بولے۔

" میں چاہتا ہوں کہ تمہارے پاس اپنا ہاؤس بوٹ ہوجائے اور تم کو زیادہ فائدہ ہو۔"

رحمانا خوشی سے بوکھلا گیا اور بڑی مشکل سے بول سکا۔

" صاحب "

دوسرے ہی دن جاتے وقت چارو بابو نے کہا۔

" دریافت کرو کوئی ہاؤس بوٹ بک رہا ہو تو خرید لو "

" آدھی رات کا چاند "، کا مالک لستہ میر کا بیٹا غلام نبی میر تھا۔ باپ ہی کی طرح چالاک، لالچی اور بے رحم۔ ریزیڈنسی روڈ پر اس کی کپڑوں کی دوکان تھی۔ ہاؤس بوٹ سے اسے اتنی ہی دلچسپی تھی کہ باپ سے ملا تھا اور ہر سال اس سے کچھ رقم مل جاتی تھی۔ ہاؤس بوٹ کافی پرانا تھا۔ اور صرف رحمانا کی خبرگیری کی وجہ سے اب تک چل رہا تھا۔ کوئی دوسرا ہانجی ہوتا تو کب کا بیکار ہو چکا ہوتا۔ جب رحمانا نے اس سے ذکر کیا تو وہ بولا۔

" تم اس کو خرید لو سستا دے دوں گا۔ تھوڑا روپیہ لگا کے مرمت کرالو گے تو بہت اچھا ہو جائے گا "

رحمانا کو بھی اس ہاؤس بوٹ سے انس تھا۔ اس کا بچپن اس پر گذرا تھا اور جوانی بھی اس پر گذر رہی تھی۔ بات طے ہوگئی اور چارو بابو نے ہاؤس بوٹ کو خرید کر رحمانا کو دے دیا۔ اس کی مرمت اور سامان کے لئے روپے بھی دیئے۔

چارو بابو کی مہربانی سے رحمانا ہاؤس بوٹ کا مالک بن گیا۔ جہانگیر پڑھتا رہا۔ رحمانا ان کا احسان مند تھا اور انہیں اپنا دوسرا باپ کہتا تھا۔ حالانکہ چارو بابو کی عمر اس سے کم ہی تھی۔ بہار کا موسم گزر گیا اور چارو بابو کلکتہ چلے گئے۔ وہ پابندی کے ساتھ جہانگیر کے لئے روپے بھیجتے تھے۔ ان کا معمول بن گیا تھا کہ ہر سال موسم بہار میں سری نگر بیوی بچوں کے ساتھ پہنچ جاتے اور " آدھی رات کا چاند " میں رہتے، سیر کرتے اور ایک ناول ختم کر کے چلے جاتے، ان کے آنے سے پہلے کوئی سیاح آتا اور " آدھی رات کا چاند " کو کرایہ پر لینا چاہتا تو رحمانا صاف

منع کردیا۔ ان کے انتظار میں کسی دوسرے سیاح کو ہاؤس بوٹ کرایہ پر نہیں دیتا۔ اب وہ پہلا رحمانا نہیں رہ گیا تھا۔ خوشحال ہانجی تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ چارو بابو کو ڈل اور چنار سے عشق ہے وہ ضرور آئیں گے اور اسی ہاؤس بوٹ میں ٹھہریں گے۔ اب وہ اس کے لئے صرف سیاح نہیں رہ گئے تھے بلکہ اس کے مربی اور سرپرست تھے [illegible] سے پہلے تار بھیج دیا کرتے تھے۔ اور "آدھی رات کا چاند" [illegible] کے پاس لگا دیا جاتا تھا اور چارو بابو آنے کے دوسرے ہی دن [illegible] پڑھنے میں مشغول ہوجاتے تھے

ایک سال موسم بہار آگیا، مگر چارو بابو کا نہ خط آیا نہ تار اور نہ وہ خود ہی آئے۔ وہ پریشان ہوا تو اس نے تحقیق حال جاننے کے لئے تار بھیجا [illegible] چند دنوں کے بعد چارو بابو کا خط آیا۔ اُن کے باپ اور چچا بیمار ہو کر چند ہی دنوں کے اندر مر گئے تھے اور گھر کی الجھنیں پیدا ہوگئی تھیں، اس لئے وہ نہیں آسکتے۔ لیکن انہوں نے تین مہینوں کا کرایہ اور انعام کی رقم بھیج دی۔

رحمانا کو چارو بابو کے نہ آنے [illegible] انہیں خود انگریزی میں خط لکھا۔ اُن کے باپ اور چچا کی موت پر گھر بھر کی طرف سے تعزیت پیش کی۔ چارو بابو کو اس کا یہ خط پڑھ کر خوشی ہوئی۔ جہانگیر نے ان کے خیال کے مطابق ترقی کی تھی۔ انہوں نے [illegible] خط لکھا اور اس کی ہمت بڑھائی۔

پھر دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی، اور چارو بابو تین سال سری نگر نہ پہنچ سکے۔ البتہ رحمانا کو دو مہینے کا کرایہ اور انعام کی رقم بھیج دیا کرتے تھے۔ رحمانا کو ایک دو بار یہ بات بُری طرح کھٹکی بھی، مگر انکار کرنے کی بھی ہمت اس میں نہیں تھی۔ چارو بابو اس کے لئے باپ کے برابر تھے اور باپ کا ہر حکم ماننا ضروری تھا [illegible]

پانچ سال کے بعد چارو بابو سری نگر آئے شاید آتے بھی نہیں، لیکن وہ بدلے ہوئے تھے۔ بہت کمزور ہوگئے تھے۔ تھک تھک گئے تھے اور آرام کرنا بے حد ضروری تھا۔ انہوں نے بڑے افسوس کے ساتھ رحمانا کو بتایا کہ باپ اور چچا کے مرنے کے بعد جائداد بٹ گئی۔

یہ بھی کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن ان کے تینوں بڑے بھائی مرگئے۔ سارا کاروبار بڑے بھائیوں کے لڑکے ہی کرتے ہیں، لیکن پھر بھی ان کا کلکتہ میں رہنا ضروری ہے۔ اس لئے کلکتہ سے باہر رہنا اُن کے لئے مشکل ہے اور وہ ان کا انتظار نہ کرے جب اُن کو آنا ہوگا تو تار سے خبر کر دیں گے۔ ہاؤس بوٹ کو کرایہ پر لگا دے۔ نقصان نہ اٹھائے۔ وہ جہانگیر کی ترقی سے خوش تھے اب وہ کالج میں پڑھتا تھا اور اچھا طالب علم تھا انہوں نے رحمانا سے کہا کہ جب جہانگیر بی اے کرلے تو کلکتہ آجائے، اسے اچھی نوکری دلا دیں گے، لیکن جہانگیر نے کہا [illegible] میں ایم اے کروں گا [illegible]

چارو بابو بہت خوش ہوئے۔ دو تین مہینے چارو بابو [illegible] اور صحت مند ہو کر چلے گئے۔ [illegible]

پھر حالات تیزی کے ساتھ بدلتے گئے۔ چارو بابو کو کشمیر جانے کا موقع ہی نہیں ملا اور نہ انہوں نے رحمانا اور جہانگیر کی کوئی خبر لی۔ نہ رحمانا کو ان کی خبر ملی، مگر کئی برسوں کے بعد چارو بابو اپنی پتنی اور بچوں کے ساتھ اچانک سری نگر پہنچ گئے۔ یہ موسم ان کے سری نگر جانے کا نہیں تھا۔ وہ سیدھے "آدھی رات کا چاند" میں پہنچے۔ بہت کمزور ہوگئے تھے [illegible] سے نظر آتے تھے۔ ان کی صحت گر گئی تھی۔ رحمانا کو ان کی حالت دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ رحمانا خود بھی بدل گیا تھا۔ دُبلا ہوگیا تھا۔ سر کے بال گر گئے تھے جو بچ رہے تھے وہ بھی سفید ہوچکے تھے۔ چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ پچھلی بار جب چارو بابو نے اسے دیکھا تھا تو اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ اب وہ اطمینان بالکل غائب تھا۔ نہا دھو کر چائے پینے بیٹھے تو چارو بابو نے سب سے پہلا سوال کیا:

[illegible] جہانگیر کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے؟

رحمانا کے چہرے پر اداسی چھاگئی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ وہ بولا [illegible]

"صاحب، قسمت کی بات ہے۔ آپ نے اس کو آدمی بنانے کے [illegible]

رحمانا چپ ہو گیا۔ چارو بابو نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

رحمانا دکھ بھری آواز میں بولا۔

"صاحب، اس نے بی۔ اے کرلیا، مگر بالکل آوارہ ہو گیا ہے۔ کوئی کام نہیں کرتا۔ اس نے اپنا نام بھی بدل لیا ہے۔ اب اپنا نام کشمیری لکھتا ہے۔ زیادہ بمبئی یا دلی میں رہتا ہے۔ کہتا ہے افسانے لکھتا ہوں۔ افسانہ نگار بن گیا ہے۔ اس کی کتابیں چھپتی ہیں، مگر گھر پر ایک پیسہ بھی نہیں بھیجتا۔ اس کی بیوی بچے کا خرچ بھی مجھے پورا کرنا پڑتا ہے۔ اب وہ پاؤس بوٹ کے کام کا بھی نہیں رہا۔"

چارو بابو نے رحمانا کو دیکھا اس کا چہرہ غم سے پیلا ہو رہا تھا۔ وہ پریشان ہو گئے۔ رحمانا بابجی کشمیری کو آوارہ کہہ رہا تھا انہوں نے اس کے کئی افسانے انگریزی اور بنگالی ترجمے میں پڑھے تھے۔ وہ بابجی کو نہیں جانتے تھے، مگر اس کو بڑا افسانہ نگار مانتے تھے۔ اس کے فن کے لئے ان کے دل میں قدر تھی کشمیری زندگی کی جو تصویریں بابجی نے اپنے افسانوں میں پیش کی تھیں اس کا جواب مشکل تھا۔ چارو بابو حیرت اور خوشی سے چلّا اٹھے۔

"رحمانا!"

"صاحب۔"

رحمانا نے گھبرا کر جواب دیا۔ چارو بابو کچھ کہنا چاہتے تھے، مگر بول نہ سکے۔ ان کے چہرے پر خوشی ناچ رہی تھی وہ چائے چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ رحمانا گھبرا گیا۔ چارو بابو ہنسنے لگے جیسے پاگل ہو گئے ہوں۔ انہوں نے اپنا ہاتھ رحمانا کے کندھے پر رکھ دیا اور بولے۔

"میں بہت خوش ہوں رحمانا۔"

چارو بابو بڑے غور سے رحمانا کو دیکھ رہے تھے لیکن وہ گھبراتا جا رہا تھا۔ آخر وہ بولے۔

"رحمانا، جہانگیر کو تار دو، جہاں بھی ہو فوراً بلاؤ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

رحمانا سر جھکائے ہوئے ہاؤس بوٹ سے نکلا اور شکارے میں بیٹھ کر جہانگیر کو تار دینے چلا گیا۔

(بشکریہ نگار، دلی)

بقیہ:- ریڈیائی ڈرامے

آج جو ڈرامے ریڈیو سے نشر ہو رہے ہیں۔ ان سے بحث کرنے کا موقع نہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ آج ریڈیو ڈرامہ نگاری کے فن کو آگے بڑھانے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ ہندوستان کی ساری زبانوں میں اوسطاً دس نئے ڈرامے ہر روز نشر ہوتے ہیں پہلے اتنی بڑی تعداد میں ڈرامے لکھنے اور انہیں اسٹیج پر پیش کرنے کا موقع نہیں تھا۔ فن ڈرامہ کو بڑھنے پھیلنے اور مقبول بننے کا یہ موقع ریڈیو نے بخشا ہے۔

البتہ یہ افسوسناک ہے کہ اب تک صاحب نظر تنقید نگاروں نے ریڈیو ڈراموں پر توجہ نہیں دی ہے۔ اور ادب میں اسے جگہ نہیں ملی ہے، جس کا وہ مستحق ہے۔ حالانکہ ریڈیو سے ایسے خوبصورت اور کامیاب ڈرامے نشر ہوتے رہتے ہیں، جن کو ادبی شاہکار کہا جا سکتا ہے۔

یہ حقیقت ہے اور ناقابل تردید کہ ریڈیائی ڈراموں نے فن ڈرامہ نویسی کو نئی زندگی بخشی ہے۔ ●●●

بلاعنوان

(ایک نامکمل طنزیہ مضمون)

سہیل عظیم آبادی

آپ کو معلوم ہے۔ ہم دنیا کی سب سے بڑی اور شریف قوم ہیں۔ ہماری تہذیب، ہمارا تمدن، ہماری سبھیتا اور ہماری سنسکرتی دنیا میں سب سے پرانی ہے۔ جب دوسرے ملک والے ننگے پھرتے تھے۔ اور جنگلی جانوروں کو مار کر کھاتے تھے۔ اور پہاڑوں کی گپھاؤں میں رہتے تھے تو ہماری تہذیب آسمان پر تھی۔ دنیا کی کوئی قوم ہمارے دعووں کو جھٹلانے کی ہمت نہیں کر سکتی۔ ہمارے ملک میں کیا نہیں۔ دنیا کی ساری نعمتیں آسمان سے اسی ہمارے ملک میں پر اتریں۔ اور یہیں سے پھیلیں۔ دنیا ہماری خوشہ چین ہے۔

ہماری روایتیں بے حد شاندار ہیں۔ ہماری مہمان نوازی عربوں کے لئے بھی باعثِ رشک رہی ہے۔ ہماری تلوار کا لوہا دنیا نے مانا ہے۔ صرف دور سے تماشا دیکھ کر ہی۔ اس لئے کہ ہم نے کبھی دوسرے ملک میں جا کر تلوار نہیں چلائی۔ بلکہ صرف اپنوں کی گردن کاٹی ہے۔ دوسروں کے مقابلے میں ہماری تلواریں ہمیشہ مہمان نوازی کی قائل رہیں ـــــ اور سب سے زیادہ یہ کہ جب کسی نے باہر سے حملہ کیا۔ تو اگر ایک نے مقابلہ کیا۔ تو دوسرے نے حملہ آور کی میزبانی کی۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہم نے کبھی باہر سے آنے والوں کے ساتھ برا سلوک نہیں کیا۔ جب سکندر نے حملہ کیا۔ تو پورس نے بداخلاقی برتی۔ کہ فوج لے کر اس کے مقابلے میں کھڑا ہو گیا۔ اسے ذرا خیال نہ آیا کہ بے چارہ سکندر کتنی دور سے آ رہا ہے۔ پورس کی یہ حرکت شانِ مہمان نوازی کے خلاف تھی۔ اس کے سالے کو غیرت آئی۔ اور اس نے سکندر کا خیر مقدم کیا۔ پورس کے مقابلے میں اس کی مدد کی۔ اور آخر پورس کو اس کی بداخلاقی کی سزا ملی۔

یہ دوسری بات ہے کہ سکندر کو پورس کی نہ جانے کیا بات پسند آئی کہ سلطنت کو واپس کر کے اسے دوست بنا کر واپس چلا گیا۔ یہ ایک بار کی بات نہیں۔ جب غوری نے حملہ کیا تو جے چند نے اس کا دل سے خیر مقدم کیا اور پرتھوی راج کو شکست دلائی۔ جے چند کا کوئی قصور نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ غوری نے جے چند کی مہمان نوازیوں کا بدلہ غلط طریقے سے دیا۔ ہر دور میں باہر سے آنے والوں کا خیر مقدم کبھی غیر زندہ وطن نے خیر مقدم کیا۔

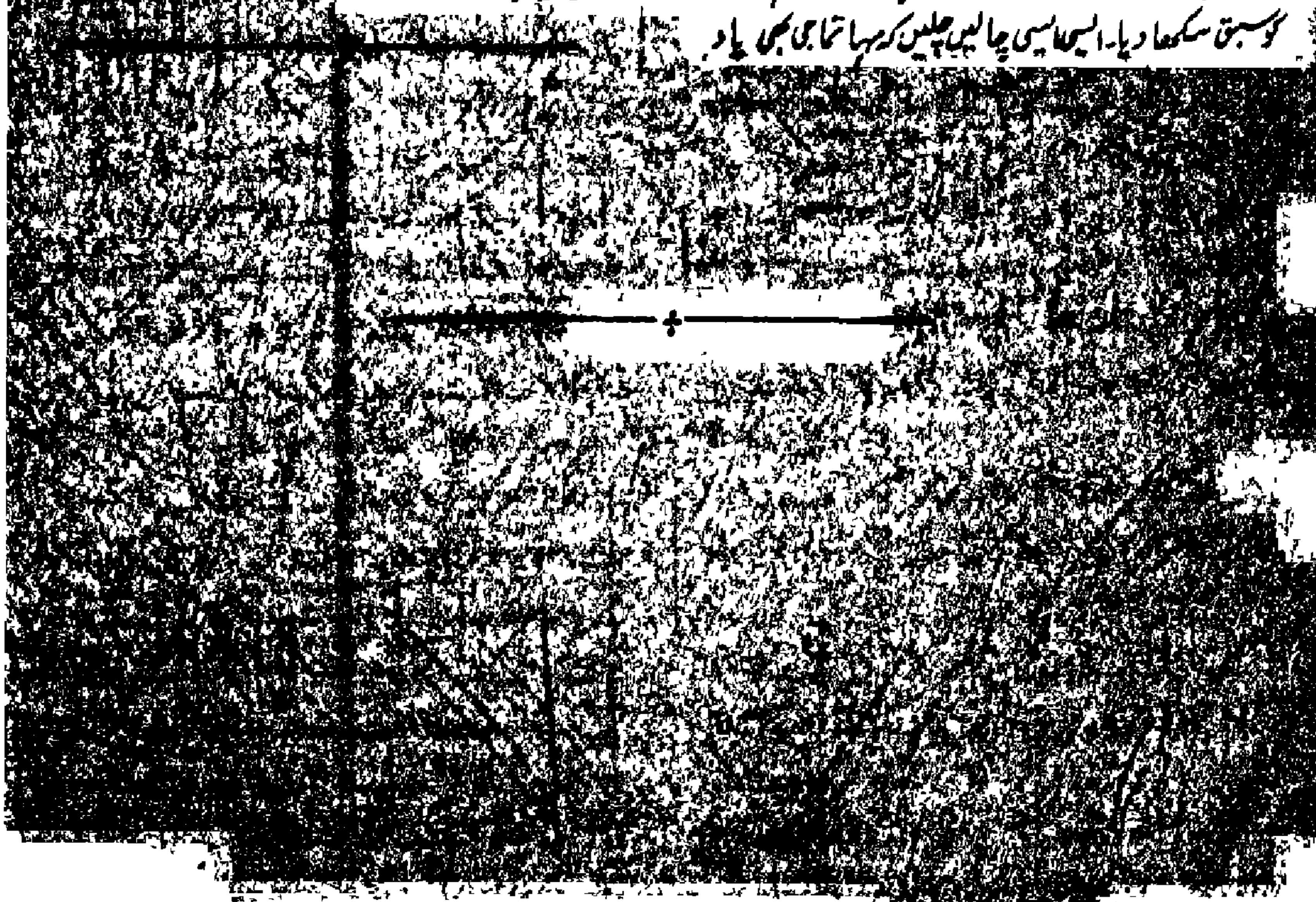
جب انگریز آئے۔ اور انہوں نے ہندوستان پر سکہ جمانا چاہا تو ہم نے ان کی بھی مدد کی۔ چنانچہ غلام حسین، میر صادق، میر جعفر نے مہمان نوازی کی شاندار مثالیں قائم کیں۔ پھر ہم انگریزوں کو اپنا مالک بنا کر بہت دنوں تک رکھے رہے۔ قدم قدم پر ان کا ساتھ دیا۔ ان کی مدد کی۔ جب بھی کسی بدبخت نے انگریزوں کے ساتھ بداخلاقی برتنی چاہی۔ تو ہم نے خود ہی اس کا سر

پھل دیا۔ ہم انگریزوں کے ہاتھ پاؤں بنے رہے۔ صرف دماغ اُن کا رہا۔ اور بس! سب کچھ ہم کرتے رہے۔

ہماری روایت کتنی شاندار ہے کہ چالیس کروڑ ہو کر بھی آٹھ کروڑ آدمیوں کی غلامی کرتے رہے۔ اور اس غلامی پر فخر بھی کرتے رہے۔ اور بہتوں کو اُن کے چلے جانے کا ابتک افسوس ہے۔ اور افسوس کی بات بھی ہے۔ آزادی کیا ملی جیسے ملک پر ویرانی چھا گئی۔ سارے خطابات اور اعزاز ختم ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد ہندوستان کی جھولی میں دو چار خطاب بھی نہیں جو دے۔

انگریزوں کو ہم نے خوشی سے کہیں جانے دیا۔ بلکہ وہ خود بھاگ گئے ــــ مہاتما گاندھی نے خواہ مخواہ اُن کو تنگ کیا۔ لیکن ہمارے مہمان نواز طبقے نے بھی مہاتما جی کو سبق سکھا دیا۔ ایسی ایسی چالیں چلیں کہ مہاتما جی بھی یاد کرتے ہوں گے۔ اور آخر جب کچھ نہ بنا اور انگریز چلے ہی گئے۔ تو وہ کارنامے کئے کہ دنیا اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ ہم نے ایک ملک کا دو ملک بنا ڈالا۔ ایک قوم کو دو قوم بنا ڈالا۔ اور وہ وہ تماشے دکھائے کہ بس تاریخ بھی یاد کرے گی۔ اور مہاتما گاندھی ــــ جب تک زندہ رہے ان کی زندگی تلخ کر دی۔ اور آخر جب وہ ہمیں کمزور کرتے ہی چلے گئے۔ تو گولی مار کر اُنہیں ٹھنڈا کر دیا۔

[illegible] ہندستان آزاد ہے۔ ہم آزاد ہیں۔ ہم آزاد ملک [illegible] رہنے والے ہیں۔ نہرو گاندھی جی کے جانشین ہیں۔ اس لئے اُنہیں تنگ کرنا ہمارا فرض ہے۔ ان لوگوں نے ہماری تہذیب کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ہماری روایتوں کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔ ہم جمہوریت وغیرہ کیا جانیں۔



محبت کے لئے

[illegible] ائی ڈرامہ

سہیل عظیم آبادی

افراد و کردار

بادشاہ
ملکہ
شہزادہ خسرو
افضل الامرا
جلال
ریشماں
[illegible]
پھول

پہلا سین

جنگل میں ایک کھلی جگہ

MUSIC ـــــــــــــــــــــ

[ایک لڑکی کے زور سے قہقہہ لگانے کی آواز]

پھول ـ بڑی شریر ہے تو۔ کب سے تنگ کر رہی ہے تارا کو

تارا ـ جیسے اس کا تو کبھی بیاہ ہوگا ہی نہیں۔

ریشماں ـ ہوگی تو دیکھا جائے گا ـ ابھی تو مجھ سے ہمدردی فرمدی ہے۔ کس سے بیاہ ہوگیا تیرا۔

تارا ـ کیا برائی ہے یوسف میں۔

ریشماں ـ برائی تو اور کچھ نہیں۔ مگر بیلے کی طرح موٹا اور بکرے کی طرح اس کی داڑھی ہے۔

تارا ـ تیرے لیے تو کوئی گلفام شہزادہ آئے گا۔

پھول ـ جس کے نہ کبھی مونچھیں ہوں گی اور نہ داڑھی۔

تارا ـ ننھا بچہ ہوگا { دونوں ہنستی ہیں }

ریشماں ـ اچھا ـ اب مجھ پر چوٹ ـــ

پھول ـ دادی کہتی ہے (نقل کرتا رکر) میری ریشماں تو شہزادی ہے۔ اسے تو کسی بادشاہ کے گھر میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔

تارا ـ اسی لیے تو کسی شہزادے کا انتظار کر رہی ہے۔ بے چاری۔

پھول ـ اور ساری زندگی انتظار کرتی رہ جائے گی کس شہزادے کی قسمت پھوٹی ہے جو اس سے بیاہ کرے گا۔

تارا ـ بیاہ تو ہوگا کسی خانہ بدوش بکروال سے ہی ـ صورت چاہے اس کی شہزادی جیسی ہو یا پری جیسی

پھول ـ اور بکروال کے داڑھی بھی ضرور ہوگی۔

تارا ـ اور اس کی داڑھی بکرے کی داڑھی سے بھی بڑی ہوگی۔

ریشماں ـ میں تو ایسے سے کبھی بیاہ نہیں کروں گی۔

تارا ـ بڑا بول مت بول۔

ریشماں ـ تارا میری بہنا (پیار سے) ارے تو مذاق کا برا مان گئی۔ ارے یوسف تو کتنا نیک اور شریف ہے۔ خوبصورت ہے۔ اس کی داڑھی کتنی اچھی ہے۔

پھول ـ اب نیت مت خراب کر لینا۔

ریشماں ـ اپنی بات دوسرے کے سر منڈھتی ہے (زور سے ہنستی ہے)

(گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دیتی ہے
لڑکیاں چونک جاتی ہیں)

تارا ـ ضرور سپاہی آرہے ہیں۔ جھاڑیوں میں چھپ جاؤ۔

ریشماں ـ واہ کیوں چھپ جائیں۔ کسی کا کچھ لے رکھا ہے کیا؟

پھول ـ بڑی بہادر بنتی ہے۔ گھوڑے پر بٹھا کے لے بھاگے گا۔

تارا ـ خدا کرے کوئی اسے اٹھا لے جائے۔ تب ہی اس کا دماغ ٹھیک ہوگا۔

ریشماں ـ چل ـ میرے سامنے آنے کے لیے بڑا دل چاہیے

پھول ـ اور اٹھا لے جائے تو"

ریشماں ـ بول کر تو دیکھے کوئی۔ ماتھا ٹھنڈا نہ کر دوں۔ گھر کا راستہ بھلا دوں۔

تارا ـ وہ تو میں بھی سمجھتی ہوں۔ جو تجھے دیکھے گا وہ گھر کا راستہ بھول ہی جائے گا۔ (تینوں ہنستی ہیں)

پھول ـ (گھبرا کر) ارے وہ آ گئے۔ ضرور سپاہی ہیں ـ بھاگ چلو۔

ریشماں ـ میں تو نہیں بھاگوں گی۔ دیکھوں کوئی کیا کرتا ہے۔

تارا ـ ارے بھاگ۔ نگوڑے ضرور اٹھا کے لے جائیں گے۔ (تینوں

بھاگتی ہیں) (وقفہ)

خسرو۔ [illegible]۔ ذرا ٹھہرو۔ (وقفہ)

رلشیاں۔ (تن کر) کون ہو تم۔ ہم لوگوں کا پیچھا کیوں کر رہے ہو۔

خسرو۔ جلال! تم بتا دو میں کون ہوں!

جلال۔ یہ ہیں شہزادہ خسرو۔ بادشاہ کے بیٹے۔

رلشیاں۔ تو ہم سے کیا مطلب۔ ہم غریب خانہ بدوش لڑکیاں ہیں بکریاں چرانے آئے رہیں۔ ارے کہاں گئیں سب سے تارا۔ پھول۔

خسرو۔ ڈرو مت ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ شکار کھیلنے آیا تھا۔ پیاس لگ رہی ہے۔ پانی کی تلاش میں ادھر آگیا پانی پلا دو۔ چلا جاؤں گا۔

رلشیاں۔ سیدھے سیدھے کیوں نہیں کہتے کہ پیاسے ہو۔ پانی پیو گے مگر تم تو پہلے بھی ادھر آئے تھے۔ میں نے تم کو دیکھا تھا۔

خسرو۔ ہم نے بھی تم کو دیکھا تھا۔ پھر تم چھلاوے کی طرح غائب ہو گئیں۔

رلشیاں۔ میں ڈر گئی تھی۔ جھاڑی میں چھپ گئی تھی

خسرو۔ مگر ڈرنے کی کیا بات تھی۔

رلشیاں۔ اچھا ٹھہرو۔ میں پانی لے آؤں (چلی جاتی ہے)

خسرو۔ دیکھا تم نے جلال یہی وہ لڑکی ہے۔ کتنی خوبصورت ہے۔

جلال۔ آپ نے درست فرمایا تھا۔ انگ انگ اس کا خوبصورت ہے۔ سرو جیسا قد۔ تازہ کھلے گلاب جیسا چہرہ۔ ہرنی جیسی آنکھیں۔ موتیوں کی لڑی جیسے دانت۔ شربتی ہونٹ اور جوانی۔ چڑھتی ہوئی پہاڑی ندی۔

خسرو۔ ارے! ارے! تم تو شاعر بنے جا رہے ہو۔

جلال۔ آپ مجھ سے پہلے شاعر بن چکے ہیں۔ آپ ہی کے [illegible]

خسرو۔ جلال! تم میرے دوست ہو میں نے یہ بات کسی اور کو نہیں بتائی۔ سچ کہتا ہوں جلال۔ جب سے دیکھا ہے دل کو چین نہیں۔ رات کی نیند حرام ہو چکی ہے۔

جلال۔ آدمی کیا؟ اسے دیکھ کر تو فرشتوں کے بھی ہوش اڑ جائیں۔

خسرو۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اسکے بغیر خوش نہیں رہ سکوں گا۔

جلال۔ اسے تو آپ کے محل کی زینت بننا چاہیئے۔

خسرو۔ چاہتا تو میں بھی ہوں لیکن ابا حضور۔؟

جلال۔ ظاہر ہے وہ اسے پسند نہیں کریں گے۔ ایک معمولی خانہ بدوش بکروال کی لڑکی آپ کے پہلو کی زینت بنے۔

خسرو۔ پھر کیا کروں۔

جلال۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لڑکی ہر طرح محل کی زینت بننے کے لائق ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ بادشاہ اسے کبھی پسند نہیں کریں گے۔ بہتر تو یہی ہے کہ اس کا خیال دل سے نکال دیجئے۔ بہت سی شہزادیاں آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔

خسرو۔ مگر میں اپنے دل سے اس کا خیال نہیں نکال سکتا۔ اپنے بس کی بات نہیں مگر یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کیا سوچتی ہے۔ نہ جانے محبت کا اظہار کر دوں تو کیا جواب دے۔

جلال۔ وہ میں جانتا ہوں۔

خسرو۔ کیا؟

جلال۔ وہ آپ کو پسند کرتی ہے۔

خسرو۔ یہ تم نے کیسے جان لیا۔

جلال۔ اس کی باتوں سے۔ آپ نہیں سمجھے مگر میں سمجھ گیا جاتے جاتے اس نے پلٹ کر آپ کو جس نظر سے دیکھا وہ نظر اس کے دل کا سارا حال کہہ گئی۔

خسرو۔ جلال! تم میرے دوست ہو۔ سچ جانو۔ اس کے [illegible]

پر بھی ظاہر نہ ہو ۔

جلال ۔ راہ بھی نکل آئے گی اور کسی پر ظاہر بھی نہ ہوگا لیکن کبھی تو ظاہر ہوگا ہی ۔

خسرو ۔ جب ظاہر ہوگا تو دیکھا جائے گا ۔ میں اس کے لئے ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہوں ۔ لیکن اس کا خیال دل سے نکال نہیں سکتا ۔

جلال ۔ پھر سب کچھ ہو جائے گا ۔۔۔ وہ آرہی ہے ۔ میں ہٹ جاتا ہوں ۔

رشماں ۔ شہزادے میں پانی لے آئی ۔ (وقفہ)

خسرو ۔ بڑی مہربانی تمہاری ۔ شکریہ ۔

رشماں ۔ مہربانی کیسی ۔ پانی پلانا تو نیک کام

خسرو ۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو ۔

رشماں ۔ تم بہت اچھے شہزادے ہو ۔

خسرو ۔ یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو ۔

رشماں ۔ شہزادہ ہو کر غریب لڑکی سے باتیں کرتے ہو ۔ کوئی دوسرا تو دیکھتا بھی نہیں

خسرو ۔ تمہارا نام کیا ہے ۔

رشماں ۔ رشماں ۔

خسرو ۔ بڑا پیارا نام ہے ۔

رشماں ۔ (ہنستی ہے) دادی نے رکھا ہے ۔

خسرو ۔ تم بہت اچھی باتیں کرتی ہو ۔

رشماں ۔ مجھے تو سب لڑکیاں جھگڑالو کہتی ہیں ۔

خسرو ۔ سب غلط کہتی ہیں ۔ تمہاری باتیں تو بڑی پیاری اور میٹھی ہیں ۔

رشماں ۔ دادی کہتی تھی ، بادشاہ اور شہزادے بڑے ظالم ہوتے ہیں ۔ مگر تم تو ویسے نہیں لگتے ۔

خسرو ۔ جو اچھا ہوتا ہے اس کو سب اچھے لگتے ہیں ۔

رشماں ۔ تم بہت اچھے ہو ۔

(دور سے آواز سنائی دیتی ہے)

آواز ۔ رشماں ۔ رشماں

رشماں ۔ اب میں جاؤں گی ۔ ماں پکار رہی ہے ۔

خسرو ۔ پھر تم ملوگی ۔

رشماں ۔ پھر آؤ گے ؟

خسرو ۔ تم چاہوگی تو ضرور آؤں گا ۔

رشماں ۔ ضرور آنا ۔ تم بہت اچھے شہزادے ہو ۔

خسرو ۔ تم کہتی ہو تو ضرور آؤں گا ۔

رشماں ۔ ضرور آنا ۔ میں انتظار کروں گی ۔ مگر یہاں نہیں ۔ اس پہاڑی کے نیچے دیکھتے ہو نا ۔ میں کل اپنی بکریاں وہاں لے جاؤں گی ۔

وہاں کیوں ؟

یہاں گھاس ختم ہوگئی ہے اور وہاں ہری ہری گھاس ہے ۔

ضرور آؤں گا ۔

راہ دیکھوں گی ۔

[illegible]

شاہی محل کا اندرونی حصہ ۔

[illegible] ۔ یہ جگہ مجھے بچپن سے پسند ہے ۔ دادا حضور کے زمانے میں یہاں پر خوبصورت باغ تھا جس میں دن بھر میں کھیلا کرتا تھا ۔ اور جہلم کا نظارہ کیا کرتا تھا جہلم کی لہروں سے میرے دل کو ایک خاص قسم کا لگاؤ پیدا ہوگیا ہے جوانی میں جہلم کی سیر کے لئے کشتی پہ چلا جاتا تھا ۔ اب سلطنت کے

کاموں سے وقت نکالنا مشکل ہے۔ اسی لئے محل کا یہ
حصہ بنا۔ جب بھی فرصت ملے یہاں آرام کروں اور
جہلم نظروں کے سامنے رہے، کتنا خوبصورت نظارہ
ہے۔ جہلم کی لہریں بے چین ہو رہی ہیں۔ دوسرے کنارے پر
سبز جنگل۔ میں تو یہاں آ کر ساری دنیا کو بھول
جاتا ہوں۔

ملکہ ۔ آپ مجھے تو کبھی نہیں بھولتے۔ جب یہاں تشریف
لاتے ہیں۔ مجھے حاضر رہنا پڑتا ہے۔

بادشاہ ۔ تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں ملکہ۔ تم مجھ سے
الگ تھوڑے ہی ہو۔

ملکہ ۔ میں کچھ عرض کرنا چاہتی تھی۔

بادشاہ ۔ کہو۔ تمہیں اجازت کی ضرورت

ملکہ ۔ جب آپ بول رہے ہوں تو۔

بادشاہ ۔ کوئی بات نہیں۔ کہو!

ملکہ ۔ میں نے پندرہ دنوں سے خسرو کو نہیں دیکھا ہے۔

بادشاہ ۔ (ہنستا ہے) سچ کہا ہے کسی نے عورت کا دل
کمزور ہوتا ہے۔ خدا کا شکر ادا کرو۔ اب نہ
کوئی جنگ ہے اور نہ فتح کی مہم۔ ورنہ مہینوں
گزر جاتے اور تم اپنے بیٹوں کو نہ دیکھ پاتیں۔ میں
ایک بار پورا ایک سال مہم پر رہا اور ماں کی آنکھیں
ترستی رہیں۔

ملکہ ۔ یہ کوئی اچھی بات ہوئی!

بادشاہ ۔ میں کب اچھی بات سمجھتا ہوں۔ اسی لئے تو آس
پاس کے سارے حکمرانوں سے دوستی کر لی ہے۔
سب سے معاہدہ کر لیا ہے۔ آپس میں جنگ
نہیں کریں گے۔ نہ کوئی میری سلطنت پر حملہ
کرے گا اور نہ میں کسی دوسرے کی سلطنت پر حملہ کروں گا

ملکہ ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ جنگ سے بربادی کے
سوا کچھ نہیں ملتا۔ سلطنت کو بڑھانے کی ہوس میں
پریشان رہنے سے اچھا ہے کہ چھوٹی سی سلطنت میں
زندگی امن اور سکون سے گزرے۔

بادشاہ ۔ تم بھی بالکل میری طرح سوچتی ہو۔

ملکہ ۔ (ہنس کر) یا بادشاہ میری طرح سوچتے ہیں۔

بادشاہ ۔ یہ بھی خوب کہی۔

ملکہ ۔ یہ اس لئے کہہ رہی ہوں کہ میرے ابا نے بھی
آپ سے جنگیں لڑی ہیں۔ میں خود آپ کی فتح کی
نشانی ہوں۔ آپ نے میرے باپ کی سلطنت پر
حملہ کیا۔ فتح حاصل کی اور مجھ سے شادی کی۔

بادشاہ ۔ میرے خاندان کی یہی روایت رہی ہے۔ شہزادے
کسی ملک پر حملہ کر کے وہاں کے حکمراں کو شکست
دیتے ہیں۔ اور اس کی بیٹی سے شادی کر کے لے آتے
ہیں۔ میرے باپ دادا اور ان کے باپ دادا نے
بھی یہی کیا تھا۔

ملکہ ۔ لیکن اب تو آپ نے جنگ نہ کرنے کا عہد کر لیا ہے

بادشاہ ۔ کوئی جیتے یا ہارے مگر ملکہ۔ جنگ وحشیانہ فعل ہے
میں اسے ناپسند کرتا ہوں!

ملکہ ۔ میں خسرو کی بات کر رہی تھی۔

بادشاہ ۔ خبر ملی ہے۔ کل خسرو نے بارھواں شیر مارا ہے۔
میں نے طے کر لیا ہے کہ اب آ جائے تو منع کر دوں
چمنستان کی جاگیر اسے بخش دوں۔ اور وہاں بھیج
دوں تاکہ آزادانہ امور سلطنت سے مہارت حاصل کرے۔

ملکہ ۔ لیکن زندگی صرف جنگ اور امور سلطنت تک محدود نہیں

بادشاہ ۔ کیا کہنا چاہتی ہو

ملکہ ۔ بچوں کی چہکار کے بغیر محل سونا سونا معلوم ہوتا ہے

بادشاہ ۔ (ہنستا ہے) ہو ہو ہو ہو۔ یہ کہو دادی اماں بننے
کی خواہش مچل رہی ہے دل میں۔

ملکہ ۔ عورت کی زندگی کی ایک منزل یہ بھی ہے۔ بچوں کے
بچوں سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانا چاہتی ہے۔

بادشاہ ۔ میں نے کب منع کیا۔
ملکہ ۔ مگر جب تک آپ حکم نہ دیں میں کیا کر سکتی ہوں۔
بادشاہ ۔ کوئی امیر زادی یا وزیر زادی نظر میں ہے۔
ملکہ ۔ ایک نہیں، بیسیوں!
بادشاہ ۔ مگر شادی تو ایک سے ہوگی۔ خسرو واپس آجائے تو اس سے بھی باتیں کر لو۔ اس کی خواہش جاننا بھی ضروری ہے۔
ملکہ ۔ میں پوچھ لوں گی۔
بادشاہ ۔ ممکن ہے کوئی لڑکی اس کی نظر میں ہو۔
ملکہ ۔ اس کی خواہش جاننا ضروری ہے۔ یہ اس کی زندگی کا معاملہ ہے۔ ــــ لو وہ آ ہی رہا ہے (وقفہ)
خسرو ۔ غلام کورنش بجالاتا ہے۔
بادشاہ ۔ خوش باش بیٹے۔
ملکہ ۔ خوش باش میری آنکھوں کی روشنی میرے بیٹے صرف سیر و شکار ہی تو کام نہیں۔ تمہیں دیکھنے کو آنکھیں ترس جاتی ہیں۔
خسرو ۔ جب ملک خوشحال ہو۔ رعایا فارغ البال ہو۔ پڑوس کے دوسرے حکمراں دوست ہوں تو پھر اور کیا کروں۔
بادشاہ ۔ مگر بیٹے تم ولی عہد ہو۔ تمہیں ایک دن بادشاہ بننا ہے۔ تمہاری ذمہ داریاں اور بھی ہیں۔
خسرو ۔ آپ حکم فرمائیں۔ میں ذمہ داریوں سے بھاگتا کب ہوں۔
بادشاہ ۔ اچھا تم اپنی ماں سے باتیں کرو۔ وہ تمہیں دیکھنے کو بے چین تھیں۔
ملکہ ۔ ہاں میرے لال۔ پندرہ دنوں سے نہیں دیکھا تھا۔ آنکھیں تمہیں ڈھونڈ رہی تھیں۔ تمہاری ہی بات کر رہی تھی۔
خسرو ۔ ابا حضور کچھ فرما رہے تھے؟
ملکہ ۔ نہیں میں کہہ رہی تھی۔ اب بہو آنی چاہئے۔
خسرو ۔ مگر اتنی جلدی کیا ہے؟
ملکہ ۔ اب کتنی دیر ہوگی۔ تم اللہ کے فضل و کرم سے پچیس سال کے ہوگئے۔ تیس سال کے تو یہ وزیر ہوگئے۔
خسرو ۔ مجھے آپ کے حکم سے سرتابی نہیں لیکن ایک بڑی مشکل ہے۔
ملکہ ۔ وہ کیا؟
خسرو ۔ ہمارے خاندان کی روایت رہی ہے۔ ہر ولی عہد نے کسی سلطنت پر حملہ کرکے اسے فتح کیا ہے۔ اور وہاں کے حکمراں کی بیٹی سے شادی کی ہے۔
ملکہ ۔ میں جانتی ہوں۔
خسرو ۔ ابا حضور نے سارے حکمرانوں سے دوستی کر لی ہے۔ جنگ نہ کرنے کے معاہدے کر لئے ہیں۔ اور ان معاہدوں کو برقرار رکھنا میری بھی ذمہ داری ہے۔ میں کسی پر حملہ نہیں کروں گا۔ کسی کو شکست نہیں دوں گا۔ کوئی شہزادی ......
ملکہ ۔ اگر ایسا ہے! تو کیا شادی نہیں کروگے!
خسرو ۔ اسی لئے تو میں نے عرض کیا کہ جلدی ......
ملکہ ۔ کیا روایت بدل نہیں سکتی ....؟
خسرو ۔ روایتیں روز بدلتی ہیں۔ لیکن شاہی خاندان کی روایتیں روز نہیں بدلتیں۔ ان کو بدلنا مشکل ہے۔
ملکہ ۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ میں چاند سی بہو چاہتی ہوں۔ پھول جیسے بچے چاہتی ہوں۔ تمہارے ابا سلطنت کے کاموں میں وزیروں اور امیروں کے ساتھ وقت گزار لیتے ہیں۔ تم اور یہ وزیر سیر و شکار میں، میں اتنے بڑے محل میں تنہا گھبراتی ہوں۔
خسرو ۔ مگر آپ تنہا کب ہیں۔ مغلانیاں ہیں۔ پیش خدمتیں ہیں۔ لونڈیاں ہیں۔ رقاصائیں ہیں۔ اور طرح طرح کے کھیل تماشے کرنے والیاں ہیں۔

ملکہ۔ (بھٹی ہوئی آواز میں) میرے لال تم ماں کے دل کو نہیں سمجھتے۔ محل کی دلچسپیوں کی ساری چیزیں موجود ہیں لیکن ماں کا دل کچھ اور چاہتا ہے اب میرا دل اس محل میں کچھ اور دیکھنے کو چاہتا ہے۔

خسرو۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پہ لیکن خاندان کی روایتوں کو اگر ولی عہد پامال کرے تو ــــ؟

ملکہ۔ (چیخ پڑتی ہے) تو کیا خاندان کی روایت باقی رکھنے کے لیے تم شادی نہ کروگے؟ روایتیں بدلتی ہیں اور بدلیں گی۔

خسرو۔ ضرور بدلنی چاہیے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں شادی کے لیے جنگ اور غارت گری کوئی عقل کی بات نہیں۔ ممکن ہے پرانے زمانے میں یہ اچھا سمجھا جاتا ہو لیکن اب نہیں سمجھا جا سکتا۔

ملکہ۔ شاباش۔ تم عقلمند ہو۔ باتوں کو سمجھتے ہو۔

خسرو۔ آپ نے ہی مجھے جنم دیا اور پالا ہے۔

ملکہ۔ (خوش ہو کر) خوش رہو میرے لال۔

خسرو۔ ہمارے خاندان کی روایت تھی، ہارے ہوئے حکمراں کی بیٹی سے شادی کرنا۔ دراصل یہ بہادری اور اپنی بالادستی کو ثابت کرنا تھا۔ پرانے زمانے میں جیالے نوجوان اپنی پسند کی لڑکی اٹھا لاتے تھے اور شادی کر لیتے تھے۔ یہ بھی بہادری کی بات تھی۔ لیکن دونوں حالتوں میں لڑکے کی پسند کو دخل تھا۔

ملکہ۔ تمھارا خیال درست ہے۔

خسرو۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی اپنی پسند کی لڑکی لے آؤں۔

ملکہ۔ مگر بادشاہ اسے کبھی پسند نہ کریں گے۔ لڑکیوں کو زبردستی اٹھا لیجانا ملک کے قانون کے مطابق جرم ہے

خسرو۔ میں نے بھگا کر لانے کو کب کہا تھا۔ میں تو چاہتا ہوں

ملکہ۔ بادشاہ اسے منظور کرلیں گے لیکن لڑکی کوئی امیرزادی ہو۔

خسرو۔ لیکن کوئی امیرزادی میرے سامنے آئی نہیں تو میں کسی کو کیسے پسند کر دوں گا۔

ملکہ۔ میں دیکھ کر پسند کر لوں گی۔ اور پیغام بھیج کر شادی طے کر لی جائے گی

خسرو۔ اس میں ایک خطرہ ہے

ملکہ۔ خطرہ کیا ہے؟

خسرو۔ اگر پیغام بھیج کر کسی ایک امیر کے یہاں شادی کی بات طے کر لی تو دوسرے امرا اسے اپنی توہین سمجھیں گے۔ انھیں رنج ہوگا۔ کہ انھیں نظرانداز کیا گیا۔

تمھاری باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے لڑکی پسند کر لی ہے

(جھجکتا ہوا) آپ میری ماں ہیں۔ آپ نے مجھے جنم دیا ہے۔ آپ نے مجھے پالا ہے۔ آپ سے میں اپنے دل کی بات چھپانا نہیں چاہتا۔ میں نے ایک لڑکی پسند کر لی ہے۔ اور بہت زیادہ پسند ہے اور کوئی دوسری لڑکی پسند نہیں آسکتی۔

مگر وہ ہے کون؟

ایک غریب لڑکی۔

ملکہ (گھبرا جاتی ہے) بادشاہ اور سلطنت کے امرا اسے پسند نہیں کریں گے۔ کہ ایک غریب لڑکی ملکہ بنے اور وہ اس کی اطاعت کریں۔ اور ان کے گھروں کی عورتیں اس سے کم تر درجے کی بن جائیں۔

یہ بیکار سی بات ہے۔

ملکہ۔ امرا کا یہی مزاج ہوتا ہے

خسرو۔ آج جتنے امیر لوگ یا بادشاہ بھی ہیں۔ ان کے اوپر والے بھی غریب تھے انھیں غریبوں میں سے

خاندان کی بنیاد ڈال دی۔ غریبوں میں سے ہی لوگ ترقی کر کے شاہی دربار تک پہونچتے ہیں۔ اور امیر یا وزیر بن جاتے ہیں۔ غریبی کوئی گناہ تو نہیں۔

ملکہ۔ لیکن بادشاہ اس کی اجازت نہیں دیں گے اور الٹے اپنی توہین سمجھ کر سازشیں کریں گے۔

خسرو۔ مگر کوئی دوسری لڑکی میری نظر میں جچتی نہیں امی جان۔ میں کسی دوسری عورت کو اپنی شریک زندگی نہیں بنا سکتا

ملکہ۔ خسرو۔ میرے بیٹے۔ انجام سوچو۔

خسرو۔ میں سب کچھ سوچ چکا ہوں ـــ اچھا شکار کی ساری تیاریاں مکمل ہیں میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔

(چلا جاتا ہے)

ملکہ (آپ ہی آپ) برا ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شکار کے شوق میں ادھر ادھر پھرتا رہا ہے اور کوئی لڑکی اس کی نظروں میں سما گئی ہے۔ مگر بادشاہ اس کی اجازت نہیں دیں گے کبھی اجازت نہیں دیں گے۔

تیسرا سین

جنگل

پھول۔ کیا بات ہے رشماں۔ تو بالکل بدل گئی ہے۔ نہ پہلے کی طرح ہنستی ہے نہ بولتی ہے۔ چپ رہتی ہے ہر وقت کسی خیال میں ڈوبی رہتی ہے

رشماں۔ ہوں!

پھول۔ کچھ تو بول

رشماں۔ کچھ جھاڑ سی کیا بولوں پھول۔ کچھ کہا نہیں جاتا۔

پھول۔ تو گھبرا گئی کیا؟ خیر تو ہے؟

[illegible]

شہزادے کا ہر روز ادھر آنا بے وجہ نہیں۔ میں نے بار بار اسے پہاڑی کی طرف جاتے دیکھا ہے جدھر تو اپنی بکریاں چراتی تھی۔

رشماں۔ تو نے ٹھیک سمجھا ہے۔

پھول۔ تو نے آگ سے کھیلنا کیوں سوچا

رشماں۔ دل پر تو اختیار نہیں

پھول۔ ان شہزادوں اور امیرزادوں کی محبت کا کیا ٹھکانہ ہم غریب لوگ تو ان کے لیے کھلونا ہے۔ جب تک جی چاہا کھیلتے رہے۔ جب جی بھر گیا اٹھا کر پھینک دیا۔ نوراں کا حشر تو نے دیکھا ہے نا۔ وہ امیرزادہ تھا اور یہ تو شہزادہ ہے۔

رشماں۔ مگر میں کیا کروں پھول۔ سب کچھ سمجھتی ہوں۔ مگر جتنا دور ہونا چاہتی ہوں۔ دل ادھر اتنا ہی زیادہ جھکتا ہے اب میں شہزادے کی محبت میں اتنی دور نکل گئی ہوں کہ ـــــ

پھول۔ اور شہزادہ۔

رشماں۔ وہ ـ وہ تو دیوانوں کی طرح چاہتے ہیں۔ کیا کہوں پھول۔ شاید انھیں دنیا کی کوئی دوسری چیز یاد ہی نہیں رہ گئی ہے۔ ہر روز میلوں گھوڑے پر سوار ہو کر آتے ہیں۔ میرا سر اپنے سینے پر رکھ کر کہتے ہیں۔ رشماں! دنیا کی ہر چیز کو تیرے لیے ٹھکرا سکتا ہوں۔ تجھ سے الگ نہیں رہ سکتا۔

پھول۔ اری دیوانی وہ امیرزادہ بھی نوراں سے ایسی ہی باتیں کرتا تھا۔ اور اس کی زندگی برباد کر دی پھر لوٹ کر پوچھا بھی نہیں۔ یہ ہوس کے پتلے ہیں۔

رشماں۔ لیکن ہماری محبت میں ہوس کو دخل نہیں۔ میرا دامن حوروں کے دامن کی طرح پاک ہے۔ اور شہزادہ فرشتوں کی طرح پاک باز۔ وہ مجھ سے شادی کرنا

(آواز جوش میں ڈوب جاتی ہے)

پھول۔ اگر بھیا عمران کو خبر ہوگئی تو ذرا بھی پروا نہیں کرے گا کہ تو اس کی اکلوتی بیٹی ہے وہ تیری گردن دبا دیگا اور اگر بادشاہ کو خبر ہوگئی تو وہ تیری کھال کھینچ کر تیری لاش چیل کوؤں کے لیے میدان میں پھنکوا دینگے

ریشماں۔ اب جو بھی قسمت میں ہوگا وہ ہو کر رہے گا۔۔

(لمبا سانس لیتی ہے)

پھول۔ ایک بات پوچھوں ریشماں۔

ریشماں۔ کہو۔

پھول۔ کسی سے کہے گی تو نہیں؟

ریشماں۔ پاگل ہوئی ہے۔

پھول۔ وہ شہزادے کا دوست۔ میں تو زخمی ہوگئی ہوں

ریشماں۔ کون جلال۔

پھول۔ ہاں

ریشماں۔ بڑا پیارا آدمی ہے۔

پھول۔ مگر وہ تو جانتا بھی نہیں کہ میں اپنے دل میں اس کی یاد لیے بیٹھی ہوں۔

ریشماں۔ جلال نے کتنی بار تیرے بارے میں مجھ سے پوچھا ہے

پھول۔ (خوش ہوکر) اچھا

ریشماں۔ میں تو کبھی اس ڈر سے نہ بولی کہ میرا راز کھل جائیگا۔ وہ تو تیری محبت میں دیوانہ ہو رہا ہے۔

پھول۔ (لمبی سانس لیتی ہے) شکریہ (آہستہ سے)

ریشماں۔ تیری راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے پھول جلال شہزادے کا دوست ہے۔ مگر تو بھی خانہ بدوش تیرے بیاہ میں کوئی بات نہیں۔ لیکن میں خانہ بدوش کی بیٹی۔ اور وہ شہزادہ۔ زمین کی پستی آسمان کی بلندی کو چھونا چاہتی ہے۔

پھول۔ سچی محبت ہمیشہ کامیاب ہوتی ہے۔ (گھوڑوں کے ٹاپ کی آواز) شاید دونوں آرہے ہیں ہاں وہی ہیں۔ میں چھپ جاتی ہوں۔

ریشماں۔ ٹھہر جا پھول بھاگ مت۔

پھول۔ نہیں نہیں مجھ میں ان سے باتیں کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ (چھپ جاتی ہے) (دونوں آجاتے ہیں)

ریشماں۔ کب سے راہ دیکھ رہی ہوں۔

خسرو۔ اور میں تیزی کے ساتھ گھوڑا دوڑاتا ہوا آرہا ہوں۔ میں جتنی دیر تم سے دور رہتا ہوں۔ میری حالت اس مچھلی کی ہوتی ہے۔ جو پانی سے دور ہو۔ مجھے تمہارے ساتھ یہ جنگل بہت پیارا معلوم ہوتا ہے۔ اور محل ویران، اداس، اور وہاں کی فضا بےکیف۔ تمہاری محبت نے مجھے ہر چیز سے الگ کر دیا ہے۔ اب تو شکار سے بھی دلچسپی نہیں رہی۔

ریشماں۔ مجھے اپنی قسمت پر ناز ہے شہزادے۔ آپ اس غریب سے اتنی محبت کرتے ہیں۔

خسرو۔ محبت امیر اور غریب کا فرق نہیں جانتی اور نہ مانتی ہے

ریشماں۔ مگر دنیا!

خسرو۔ محبت دنیا کی پرواہ نہیں کرتی۔

ریشماں۔ شہزادے ایک بری خبر ہے۔

خسرو۔ (گھبرا کر) کیا؟

ریشماں۔ رات قبیلے میں باتیں ہو رہی تھیں۔

خسرو۔ کیسی باتیں۔

ریشماں۔ اب گرمی کا موسم آنے والا ہے اور گھاس بھی کم ہو رہی ہے۔ مشورے ہو رہے تھے۔

(تا

خسرو۔ شور ہو رہا تھا کہ سارا قبیلہ شیش پربت پر چلا جائے جہاں گھاس بہت ہے اور پانی بہت اچھا ہے۔

خسرو۔ کب تک۔

ریشماں۔ تیاریوں میں آٹھ دن تو لگ ہی جائیں گے۔

خسرو۔ اس سے پہلے تم جمنستان پہنچ جاؤ گی میں نے سارا انتظام کر لیا ہے۔

ریشماں۔ تو دکھ کے ساتھ ماں باپ سے الگ ہو جاؤں گی

خسرو۔ تمہارے باپ کو بڑی جاگیر دے دوں گا وہ لوگ عزت آبرو کی زندگی گذاریں گے۔

ریشماں۔ وہ کبھی منظور نہیں کرے گا۔

خسرو۔ کیوں! عزت آبرو کی زندگی

ریشماں۔ خانہ بدوشوں کو آپ نہیں جانتے شہزادے وہ زمین کے مالک بننا نہیں چاہتے۔

خسرو۔ عجیب بات ہے۔

ریشماں۔ ہاں شہزادے۔ خانہ بدوش سمجھتے ہیں کہ دنیا میں سارے جھگڑے کی وجہ زمین کا مالک بننے کی خواہش ہے۔ خانہ بدوش سمجھتے ہیں کہ جس بادشاہ نے جتنی زیادہ زمین پر قبضہ کر رکھا، وہ اس کا اتنا ہی بڑا غلام ہو کر رہ گیا ہے۔ خانہ بدوش کسی کی غلامی تسلیم نہیں کرتے۔ اسی لئے کبھی ایک جگہ نہیں رہتے۔ وہ اسی لئے ایک جگہ نہیں رہتے کہ کسی جگہ سے انہیں محبت نہ ہو جائے اور وہ اس کے غلام بن کر رہ جائیں۔

خسرو۔ تو کیا تم!

ریشماں۔ میں تو آپ کی ہو چکی۔ آپ کے کہنے سے چلی جاؤں گی، مگر ایک کام کرنا ہوگا۔

خسرو۔ وہ کیا؟

دھجے ڈال کر پھینک دینا ہوگا۔ تاکہ ماں باپ سمجھ لیں گے کہ مجھے شیر اٹھا کر لے گیا۔ وہ رو پیٹ کر چپ ہو جائیں گے۔ اور کوئی بات نہیں اٹھے گی۔ اگر قبیلے والوں کو یہ معلوم ہوا کہ میں بھاگ گئی تو میرے ماں، باپ کی زندگی حرام ہو جائے گی۔

خسرو۔ میں نے سارا انتظام کر لیا ہے۔ پہاڑی کے اوپر میرے خیمے میں عقد کا سارا سامان ہے چلو عقد ہو جائے۔ ہم دو چار دن پہاڑی پر گذاریں گے۔ پھر تم جمنستان چلی جاؤ گی۔ وہاں قلعہ کے اندر خوبصورت محل ہے۔ تم اسی میں رہو گی۔ پھر میں بھی آ جاؤں گا۔ ابا حضور نے مجھے وہاں کا صوبہ دار مقرر کیا ہے۔

ریشماں۔ لونڈی اپنے آقا کا حکم بجا لاتی ہے سوال نہیں کرتی۔

خسرو۔ سارا انتظام ہو چکا ہے لیکن!

ریشماں۔ لیکن کیا؟

خسرو۔ تم جانتی ہو ریشماں۔ جلال میرا جان نثار دوست ہے، مجھے اس سے بہت زیادہ محبت ہے۔

ریشماں۔ جانتی ہوں۔

خسرو۔ معلوم ہے نا وہ تمہاری سہیلی پھول کی محبت میں گرفتار ہے۔ کسی طرح — (ریشماں ہنسنے لگتی ہے) تم بڑی ... ہو — ہنسنے کی کیا بات ہے۔

ریشماں۔ دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی ہے۔ وہ تو خود جلال کی محبت میں دیوانی ہو رہی ہے۔

خسرو۔ اچھا۔ تو اسے بھی لے چلو۔ مگر وہ ہے کہاں۔

ریشماں۔ اس جھاڑی کے پیچھے چھپی ہے آپ کو دیکھ کر۔

خسرو۔ اسے پکارو۔ سامنے چلو۔

ریشماں۔ آپ پکاریئے۔

خسرو۔ آجاؤ پھول۔ دیر مت کرو۔ وقت زیادہ نہیں۔

شاہی محل کا ایک حصہ

چوتھا سین

ملکہ ۔ گلنار

گلنار ۔ ملکہ عالم

ملکہ ۔ دل بہت گھبرا رہا ہے ۔

گلنار ۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے ۔ خواہ مخواہ دل گھبرانے لگتا ہے

ملکہ ۔ تو نہیں سمجھ سکتی سینکڑوں وسوسے دل میں پیدا ہوتے ہیں
عجیب عجیب خیالات دل میں آتے ہیں ۔

گلنار ۔ کسی وہم میں نہ پڑیں ملکہ عالم ۔ ایک گیت سناؤں ؟

ملکہ ۔ نہیں گلنار جب اپنا دل اداس ہو تو ، گیت سے خوش نہیں ہو سکتا ۔ خسرو دس دنوں سے باہر رہا ہے ۔ اور پرویز چھ دنوں سے ۔ اس نے بھی بڑے بھائی کی طرح شکار کا شوق پیدا کر لیا …

گلنار ۔ شہزادوں کا بہترین مشغلہ شکار ہے ۔ جو شہزادے محلوں میں رہتے ہیں وہ عشرت پسند اور کمزور ہو جاتے ہیں ۔

ملکہ ۔ مگر اتنے دنوں تک باہر رہنا بھی اچھا نہیں ۔ کبھی کوئی غلط قدم اٹھ سکتا ہے ۔

گلنار ۔ آپ فکر مند نہ ہوں دونوں شہزادے آفتاب و مہتاب ہیں ۔ کبھی ان کی کوئی شکایت نہیں سنی گئی ۔ محل کے اندر خوبصورت اور جوان خادمائیں بھری ہیں ۔ کبھی کسی کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھے ۔

ملکہ ۔ تو نہیں سمجھتی گلنار ۔ ماں ، باپ کی نظروں سے جوان لڑکوں کا دور رہنا اچھا نہیں ہے ۔ جب سامنے رہتے ہیں تو ان پر رکاوٹ ہوتی ہے ۔ دور رہنے میں تو وہ آزاد ہو جاتے ہیں ۔

گلنار ۔ یہاں کے دل میں ایسے وسوسے پیدا ہوتے ہیں ۔
جہاں پناہ تشریف لا رہے ہیں ۔

ملکہ ۔ ان کے لیے شربت لا ۔ بروقت آئیں کے ادھر آنے کا نہیں ۔ فکر مند وہ تھک گئے ہیں ۔ ۔ ۔ جہاں پناہ اس وقت … خیر تو ہے ؟

بادشاہ ۔ ہاں ملکہ ۔ کچھ تھکن ہے اور کچھ ذہنی پریشانی

ملکہ ۔ خیر تو ہے ؟ (گھبرا کر)

بادشاہ ۔ ملکہ میرے دل پر آج نیا زخم لگا ہے ۔ اور میں بے چین ہو رہا ہوں ۔

ملکہ ۔ (گھبرائی ۔ گھبرائی) کچھ فرمایئے ۔ میری جان نکلی جا رہی ہے

بادشاہ ۔ ملکہ ۔ تمہیں بھی دکھ ہوگا ؟

ملکہ ۔ فرمائیے کیا بات ہے ۔ میں پاگل ہو جاؤں گی ۔

بادشاہ ۔ صرف میری آرزوؤں اور تمناؤں کا سوال نہیں ۔ شاہی خاندان کا وقار خطرے میں ہے ۔

ملکہ ۔ اللہ رحم !

بادشاہ ۔ … کے سیر و شکار پر میں نے کبھی پابندی نہیں لگائی ۔ مجھے اس پر پورا بھروسہ تھا لیکن آج معتبر ذریعہ سے خبر ملی ہے کہ وہ ایک خانہ بدوش لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے

ملکہ ۔ لیکن جب تک خبر …

بادشاہ ۔ … صرف محبت میں گرفتار نہیں ۔ بلکہ اس لڑکی سے اس نے شادی کر لی ہے ۔ اور اسے جلال کے ساتھ گلستان کے قلعہ میں بھیج دیا ہے ۔

ملکہ ۔ میں سمجھتی ہوں ۔ یہ افواہ ۔

… ولی عہد کے بارے میں ایسی افواہ بھی اچھی بات نہیں شاہی تخت کے چاروں طرف سازشوں کا جال بچھا ہوا ہے ۔ اور امرا موقع کی تلاش میں رہتے ہیں ۔

ملکہ ۔ میرا خسرو ایسا نہیں ۔ محل کے اندر سیکڑوں جوان اور خوبصورت لڑکیاں ہیں ۔ میرے بچوں نے کبھی کسی کو پلٹ کر بھی نہیں دیکھا ۔ وہ خانہ بدوش لڑکی ۔

بادشاہ ۔ تم اسے نہیں سمجھ سکتیں ۔ دل کے آجانے کا اور بھی ڈھنگ ہوتا ہے

کون جانے کب مچل جائے!

ملکہ ۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ خانہ بدوش لڑکی ۔

بادشاہ ۔ ملکہ خانہ بدوشوں میں بلا کا حسن ہوتا ہے۔ اُن کے حسن میں بلا کی کشش ہوتی ہے ۔ میں خود جوانی میں ایک خانہ بدوش لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا اور بڑی مشکل سے اس پھندے سے نکلا تھا —

میں جانتا ہوں ۔ ہر خانہ بدوش لڑکی سراپا جادو ہوتی ہے۔

ملکہ ۔ اس قدر گھبرانے کی کوئی بات نہیں ۔

بادشاہ ۔ بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں ۔ دربار کے امرا اسے کبھی پسند نہیں کر سکتے ۔

ملکہ ۔ میں سمجھتی ہوں ۔

بادشاہ ۔ مجھے سب سے زیادہ خطرہ تمہارے بھائی افضل الامرا کی طرف سے ہے ۔ اس نے ایک دن اشاروں میں کہا تھا ۔ وہ اپنی لڑکی ——

ملکہ ۔ مجھ سے بھی اس نے کہا تھا

بادشاہ ۔ اس کے دماغ میں یہ بات جم کر رہ گئی ہے کہ اس کی بیٹی ایک دن ملکہ ہوگی ۔ اور اب ——

ملکہ ۔ میں جانتی ہوں ۔ وہ دوسری طرح کا آدمی ہے ۔

بادشاہ ۔ دولت، عزت، طاقت ۔ ہر چیز کی اسے ہوس ہے ۔ اور وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے ۔

ملکہ ۔ میں جانتی ہوں ۔ میں اس سے ہمیشہ سے ڈرتی ہوں لیکن آپ شاید زیادہ سوچ رہے ہیں ۔

بادشاہ ۔ ملکہ ۔ شاہی تخت کے مخمل کے نیچے کانٹے ہی کانٹے ہوتے ہیں سینکڑوں ۔ ہزاروں، لاکھوں، ان گنت کانٹے ۔ کون کانٹا کب چبھ جائے ۔ کوئی نہیں جانتا —— یہ بھی معلوم نہیں اس وقت خسرو کہاں ہے ؟

ملکہ ۔ ابھی آپ آرام فرمائیں ۔

بادشاہ ۔ ہاں میں تنہائی چاہتا ہوں ۔

دوسرا منظر

پانچواں سین

افضل الامرا ۔ عالم پناہ ۔ اس میں کوئی شک نہیں خبر بالکل سچ ہے ۔ شادی ہو چکی اور وہ لڑکی چمنستان کے قلعے کے اندر محل میں ہے ۔ ایک دوسری لڑکی سے جلال نے شادی کر لی ہے ۔

بادشاہ ۔ مجھے بھی یقین ہے ۔ خبر غلط نہیں لیکن اب کیا ہوگا ۔

افضل الامرا ۔ عالم پناہ ۔ میں خود پریشان ہوں ۔

بادشاہ ۔ جانتے ہو افضل الامرا مجھے شہزادے بہت پیارے ہیں

افضل ۔ مجھے بھی بہت پیارے ہیں لیکن بات میرے اختیار سے باہر ہے ۔ دربار کے سارے امرا اسے اپنی توہین سمجھتے ہیں ۔ مجھ سے کئی درباری امرا نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ وہ ایک خانہ بدوش لڑکی کے سامنے ادب سے سر نہیں جھکا سکتے ۔

بادشاہ ۔ میں بھی پسند نہیں کرتا ۔ امرا کی عزت میری عزت ہے تخت و تاج کی عزت ہے ۔ لیکن خسرو جتنا نیک ہے اتنا ہی ضدی بھی ۔ مجھے اس کی امید نہیں کہ وہ اس کو جوانی کا ایک کھیل سمجھ کر بھول جائے ۔ اور ——

افضل ۔ میں بھی سمجھتا ہوں لیکن میں کیا کر سکتا ہوں ۔ میں جانتا ہوں کہ امرا کے تیور بدلے ہوئے ہیں ۔ اور وہ اسے کسی حال میں بھی برداشت نہیں کر سکتے ۔

بادشاہ ۔ مگر تمہیں کوئی راہ نکالنی ہے ۔ تم درباری امیر ہی نہیں خسرو کے ماموں بھی ہو ۔

افضل ۔ میں سب کچھ سمجھتا ہوں ۔ سب کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن کچھ بھی نہیں کر سکتا ۔ میں جانتا ہوں سارے امرا نے اسے اپنے وقار کا سوال بنا لیا ہے ۔

چوبدار ۔ شہزادہ خوش بخت حاضری کی اجازت چاہتے ہیں ۔

بادشاہ ۔ اجازت ہے ۔ (دو قدم ......)

خسرو۔ غلام سجدہ تعظیم پیش کرتا ہے۔

بادشاہ۔ خوش باش۔ تمہارا کئی دنوں سے انتظار تھا شہزادے۔

خسرو۔ مصروف شکار میں۔

بادشاہ۔ اباحت کہ تم کچھ میرے بیٹے یہاں کچھ اور خبریں پہنچ رہی ہیں۔

خسرو۔ کیسی خبریں!

بادشاہ۔ یہی کہ تم نے ....

خسرو۔ آپ بادشاہ بھی ہیں اور میرے باپ بھی۔ دونوں کے سامنے جھوٹ بولنا جرم ہے۔ اور مجھے جھوٹ بولنے کی عادت بھی نہیں۔ اس لئے جھوٹ نہیں بولوں گا۔

بادشاہ۔ تو کیا یہ درست ہے کہ تم نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو اپنی رفیقۂ حیات بنا لیا ہے

خسرو۔ صحیح خبر ہے جہاں پناہ۔

بادشاہ۔ تم نے بہت برا کیا۔

خسرو۔ ابا حضور! انسان خوشی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ خوشی پالی ہے۔ اور

بادشاہ۔ مجھے تمہارے جذبات سے ہمدردی ہے لیکن سلطنت کی پیچیدگیوں کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کر سکتے۔

افضل۔ میری حقیر رائے ہے جہاں پناہ۔

بادشاہ۔ کہو تمہاری کیا رائے ہے!

افضل۔ میری رائے ہے کہ اس لڑکی کا دامن زر و جواہر سے بھر دیا جائے۔ اور شہزادے اسے الگ کر دیں۔

خسرو۔ محبت کی قیمت زر و جواہر نہیں۔ محبت کی قیمت کچھ بھی نہیں۔

بادشاہ۔ یعنی تم اسے الگ کرنا نہیں چاہتے۔

خسرو۔ جہاں پناہ اگر کوئی غلطی ہے تو میری ہے۔ اس کی سزا اسے کیوں دی جائے۔ وہ مر جائے گی لیکن اسے برداشت نہیں کر سکے گی۔

بادشاہ۔ اور تم!

خسرو۔ عالم پناہ میں بھی اس سے علیحدگی کو برداشت نہیں کر سکتا

بادشاہ۔ تم نے شاید پیچیدگیوں کو نہیں سمجھا ہے۔

خسرو۔ سب کچھ سمجھ چکا ہوں۔

افضل۔ نہیں شہزادے آپ نے نہیں سمجھا ہے۔

خسرو۔ کیا نہیں سمجھا ہے۔

افضل۔ امرا اسے اپنی توہین سمجھ رہے ہیں۔ وہ ایک خانہ بدوش لڑکی کی اطاعت کیسے قبول کر سکتے ہیں

خسرو۔ لیکن امرا کی خاطر میں اپنی محبت کو قربان نہیں کر سکتا۔ اب وہ خانہ بدوش لڑکی نہیں، میری بیوی ہے

افضل۔ شہزادے آپ نہیں سمجھتے اگر امرا کو اس کی اطاعت پر مجبور کیا گیا تو ملک میں بغاوت ہو سکتی ہے۔

خسرو۔ آپ مجھے ڈرا رہے ہیں۔ مجھے امرا کی بغاوت کا خوف ذرا نہیں ستاتا۔ میں اپنے بازوؤں میں اس بغاوت کو کچلنے کی طاقت رکھتا ہوں۔

بادشاہ۔ لیکن میں اسے پسند نہیں کرتا کہ بغاوت ہو۔ اور جنگ ہزاروں آدمی قتل ہوں۔ تم جانتے ہو میں نے ساری زندگی یہی کوشش کی ہے کہ انسان کا خون نہ بہایا جائے

خسرو۔ میں بھی خون بہانا نہیں چاہتا لیکن خواہ مخواہ کوئی ذمہ بن جائے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

افضل۔ شہزادے۔ بادشاہ کے حضور میں ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں

مجھے بھی ہر روز خبریں ملتی رہتی ہیں۔ اور آج میں بھی آخری فیصلہ کرنے آیا ہوں۔ میں بادشاہ کی اطاعت کروں گا۔ امیروں کی سازش کے آگے سر نہیں جھکاؤں گا

افضل۔ کوئی سازش نہیں شہزادے آپ نہیں سمجھ سکتے یہ ملک کے وقار کا سوال ہے۔

خسرو۔ اور یہ میری محبت کا سوال ہے۔ میرے کردار کا سوال ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ دنیا والے مجھ پر الزام ڈالیں کہ میں نے ایک غریب لڑکی کی زند

برباد کر کے اُسے ٹھکرا دیا۔

بادشاہ ۔ میں بہت پریشان ہوں افضل الامراء۔ ایک طرف بیٹے کی محبت ہے۔ دوسری طرف امرا اپنے امیروں کی عزت اور ان کے وقار کا خیال اور میں کسی کو بھی نہیں چھوڑ سکتا۔

افضل ۔ میں سمجھتا ہوں۔

خسرو ۔ میں بھی سمجھتا ہوں۔

بادشاہ ۔ پھر بھی تم اپنی ضد پر قائم ہو۔

خسرو ۔ مجھے اپنے عہد کا بھی خیال ہے۔ امیروں کو اپنی عزت کا خیال ہے تو میں اپنے عہد کیسے بدل سکتا ہوں۔

افضل الامراء ۔ یہ تو امرا کی غیرت کو للکار رہے ہیں

خسرو ۔ نہیں ۔ میں جانتا ہوں افضل الامراء کسی کو اعتراض نہیں۔ اعتراض تم کو ہے اور اس لیے کہ تم اپنی بیٹی کو ایک دن اس ملک کی ملکہ بنانا چاہتے تھے۔

افضل ۔ بالکل غلط۔ یہ میری عزت پر حملہ ہے۔ میں اس کا جواب دینے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔

خسرو ۔ افضل الامراء تم ہمارے امیر نہیں میرے ماموں بھی ہو ۔ ورنہ

بادشاہ ۔ خسرو

خسرو ۔ اباحضور

افضل ۔ جہاں پناہ میں بھی یہ عرض کر دوں۔ وہ خانہ بدوش لڑکی ملکہ نہیں بن سکتی۔

خسرو ۔ وہ بننا بھی نہیں چاہتی۔ جنگل میں پیدا ہو کر اس نے کبھی ملکہ بننے کے خواب نہیں دیکھے۔

بادشاہ ۔ میں پریشان ہوں۔ میں پریشان ہوں۔ بہت پریشان ہوں۔

خسرو ۔ اباحضور آپ پریشان نہ ہوں۔ میں اپنی محبت کے لیے خود قربانی پیش کرتا ہوں۔

بادشاہ ۔ تم!

خسرو ۔ جی ہاں! میں ولی عہدی سے دست بردار ہوتا ہوں۔ چمنستان کی چھوٹی سی جاگیر پر خوش رہوں گا۔ پرویز کو ولی عہد بنا دیں۔ اس کی شادی افضل الامرا کی بیٹی سے کر دیں۔ کوئی بات نہیں ہوگی۔

۔ میرے بیٹے۔

مجھے چمنستان جانے کی اجازت دیں۔

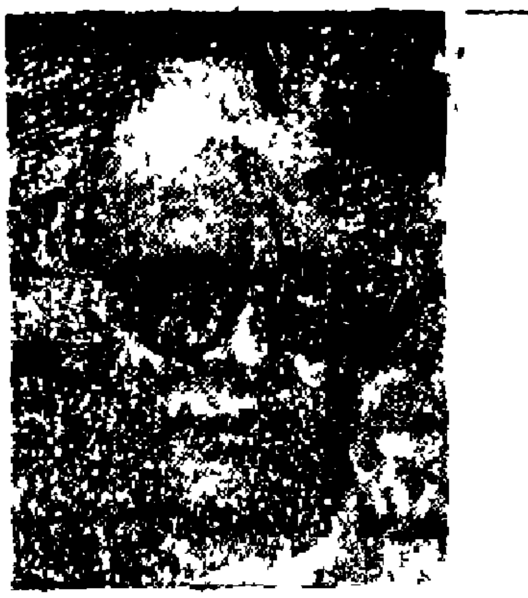
خسرو۔ میرے بیٹے

ہر بڑی کہانی کا مرکزی کردار ایک ہی ہوتا ہے۔ کہانی ایک ہی شخص کے گرد چکر کاٹتی ہے۔ دوسرے کردار دراصل کہانی کی تعمیر کے لیے آتے ہیں۔

ہر واقعہ جو کہانی کی بنیاد بن سکتا ہے اس میں بہت سے کردار ہوتے ہیں مگر افسانہ نگار صرف ان کرداروں کو چن لیتا ہے جو کہانی کی تعمیر اور کردار کو نمایاں کرنے میں مدد دے سکیں۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو ہر مختصر کہانی بھی ایک طویل داستان بن جائے۔

سہیل عظیم آبادی

ڈائری کے چند اوراق



سہیل عظیم آبادی

لوگ نیا سال کیوں مناتے ہیں ؟ آج دن بھر گنگا کے کنارے ہنگامہ سا رہا۔ میرے بہت سے احباب کشتیوں پر دور دور گئے اور خوشی مناتے رہے۔

نئے سال کی آمد پر خوش ہونے کی کوئی بات نہیں لیکن انسان خوشی کو تلاش کرنے کا عادی ہے۔ دنیا کی ساری رونق اسی جد و جہد اور اسی تلاش کے سبب ہے خوشی کی تلاش اور اس کے حصول کی جد و جہد میں انسان اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ دوسروں کے رنج کا سبب بن جاتا ہے اور کبھی خود اپنے لئے بھی عذاب پیدا کر لیتا ہے اور کسی دن خوشی کا کوئی بہانہ ڈھونڈ کر خوشی منا لینا تو [illegible] مجھے کبھی نیا سال منانے کی توفیق نہیں ہوئی۔ در اصل مجھے اس خاص دن میں کوئی خاص بات کبھی نظر نہیں آئی۔ حالانکہ ہر ملک میں اور دنیا کی ہر قوم خوشی کا دن اور خاص کر سال کا پہلا دن مناتی ہے۔ یوں یہ عجیب بات ہے کہ عربوں یا مسلمانوں کا سال محرم کے مہینے سے شروع ہوتا ہے۔ محرم کا چاند ہلال عید کی طرح خوشی کا پیغام نہیں لاتا بلکہ تاریخ اسلام کے ایک المناک واقعہ کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ عام عقیدے کو الگ کر کے بھی اگر واقعہ کربلا پر نظر ڈالی جائے تو ماننا پڑے گا کہ یہ واقعہ تاریخ عالم کا انتہائی المناک واقعہ ہے۔ مذہب اسلام کو اگر بحث سے الگ رکھ کر بھی دیکھا جائے تو کسی کو بھی یہ ماننے سے انکار کی گنجائش نہیں ہوگی کہ حضرت محمدؐ کی ذات دنیا کی چند عظیم ہستیوں میں تھی۔ اور عرب قوم کے تو وہ یقینی محسن اعظم تھے۔ ان کی تعلیمات اور رہنمائی نے ایک وحشی قوم کو

یکم جنوری ۱۹۶۵ء

سال کا پہلا دن بہت اچھا گزرا۔ مونا نے دلی سے مدھو اور کلیما نے حیدرآباد سے کارڈ بھیجے۔ ان کارڈوں کو پڑھ کر طبیعت بے حد خوش ہوئی سب کو جواب دیا۔ مونا لندن میں ہے اور خوش ہے اس غریب نے بہت مصیبتیں اٹھائی ہیں اور اس سے زیادہ سوہان روح برداشت کیا ہے۔ کلیما کو اچھی ملازمت مل گئی ہے اور وہ اپنے طور پر خوش ہے۔ میں نے جن لوگوں کو کارڈ بھیجے تھے ان میں سے کسی نے اخلاقاً بھی جواب نہیں دیا۔ یہ بھی عجیب دستور ہے۔ خاص کر سرکاری ملازموں کی ذہنیت بڑی پست ہوتی ہے۔ اب آئندہ ان لوگوں کو کارڈ نہیں بھیجوں گا۔ یہ لوگ اخلاق سے عاری ہوتے ہیں۔ شام کو گھر واپس آیا اور کچھ پڑھنے لکھنے کے بعد بستر پر چلا گیا۔

یکم جنوری ۱۹۶۶ء

نئے سال کا پہلا دن ختم ہو گیا۔ کوئی خاص بات نہیں۔ دن اسی طرح آتے اور چلے جاتے ہیں۔ آخر

ہوشیار کو فاتح اور حکمران بنا دیا۔ لیکن خود غرضوں نے ان کے خاندان اور ان کے اولاد کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ایسی محسن کشی کی مثال شاید تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی۔ بات کہیں سے کہیں نکل آئی۔ دراصل نئے سال کے پہلے دن کی بات تھی، اور میرے لئے اس میں کوئی کشش اور کوئی دلچسپی نہیں۔ چنانچہ میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جو اور دنوں سے مختلف ہوتا۔ صبح کو چائے پی، غسل کیا، اخبار پڑھا۔ پھر کھانا کھا کر دفتر چلا گیا۔ دفتر کی وہی الجھنیں، مشاہرہ کسی کو نہیں ملا۔ اس گرانی کے زمانے میں سب کو شکوہ کرتے دیکھا۔ خاص کر مدھو کر گنگا دھر کو۔ جن کو بہت زیادہ بولنے کی عادت ہے۔ کہہ رہے تھے کہ سال کا پہلا دن سرکاری ملازموں کے لئے بہت منحوس ہوتا ہے کہ انہیں مشاہرہ نہیں ملتا۔ خیر یہ بات تو زندگی کی تھی۔ مگر اثر سب پر تھا۔ اس گرانی کے زمانے میں ہر ایک کا ہاتھ پاؤں بندھا ہوا ہے۔ دن کو کام ختم کرنے کے بعد واپسی میں فیاض الدین حیدر صاحب سے ملا۔ ان حضرت نے اپنی تقریر لکھی تک نہیں تھی اور نہ ہی سمجھنے کی کوشش کی تھی کہ انہیں لکھنا کیا ہے۔ اور بہن کی علالت کی وجہ سے پریشان بھی تھے۔ میری پریشانی یہ کہ دوسرے ہی دن پروگرام تھا۔ دنیا اپنی جگہ چھوڑ دے لیکن ریڈیو پروگرام کا وقت بدل نہیں سکتا۔ دیر تک فیاض الدین حیدر صاحب کو سمجھاتا رہا کہ انہیں کیا لکھنا ہے۔ جو کچھ انہوں نے لکھا تھا وہ سنایا تو کچھ بھی نہ تھا۔ غرض کہ تھکا ماندہ گھر آیا اور چند خطوط لکھے اور اس کے بعد کھانا کھانے کے بعد کتابیں پڑھنے لگا۔ اب ایک بجنے والا ہے اور میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور اسے ختم کر کے سونا ہے۔

جنوری ۱۹۶۱ء

صبح سویرے ریڈیو نے منحوس خبر سنائی۔ روشں صدیقی کا گذشتہ رات [illegible] انتقال ہو گیا۔ وہ ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ مشاعرے کے دوران ہی ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ان کی لاش میرٹھ بھیج دی گئی۔ روشں بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ مخلص، سنجیدہ، کم گو اور مشرقی تہذیب کے نمائندہ۔ انہیں خود نمائی اور شہرت پسندی کا کچھ شوق نہیں تھا۔ بلکہ وہ بڑی حد تک بے پروا تھے۔ ان کی کوئی ٹولی نہیں تھی۔ انہوں نے نہ اپنی کوئی ٹولی بنائی اور نہ کسی دوسرے کی ٹولی میں شریک ہوئے۔ ان کے تعلقات سینکڑوں آدمیوں سے تھے اور مخفی نہ تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے تعلقات کو شہرت اور منفعت کا ذریعہ نہیں بنایا۔ ان کی شہرت صرف ان کے کلام کی خوبیوں کی وجہ سے تھی۔ غزل گوئی میں ان کا اپنا مخصوص انداز تھا۔

روشں پندرہ سولہ سال کی عمر سے شعر کہتے تھے۔ اور چند ہی برسوں میں انہیں کافی شہرت مل گئی تھی۔ ان کا کلام ملک کے معتبر رسالوں میں شائع ہوتا تھا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کو دیکھنے والے یقین نہیں کرتے تھے کہ اتنے کم عمر آدمی کا یہ کلام ہو سکتا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ اور بھی تھی۔ روشں پستہ قد آدمی تھے۔ اور اپنی عمر سے کم نظر آتے تھے۔ اکسٹھ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ لیکن انہیں دیکھ کر کوئی پینتالیس سال سے زیادہ نہیں کہتا۔ روشں کو کئی بار عجیب حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی بار جب لاہور سے ایک مشاعرے کی دعوت ملی۔ اور وہ وہاں پہونچے تو انتظام کرنے والوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ روشں صدیقی ہیں

روشن خود بڑی دلچسپی کے ساتھ کئی واقعات کا ذکر کرتے تھے۔

روشن جوالاپور ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں فسادات کے بعد میرٹھ میں مقیم ہو گئے تھے۔ ان کی ساری زندگی جد و جہد میں گذری۔ نچلے متوسط گھرانے کے آدمی تھے۔ آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ بھی نہیں تھا۔ شاعری کی آمدنی ہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ ان کی غزلوں کا صرف ایک مجموعہ محرابِ غزل شائع ہوا۔ اس سے کس قدر کلام ان کے بچوں کے پاس ہوگا۔ نہیں کہا جا سکتا اب اس کا انجام کیا ہوگا۔

روشن پانچ سال تک آل انڈیا ریڈیو اردو کے پروڈیوسر بھی رہے۔ لیکن آل انڈیا ریڈیو کا سازشی ماحول انہیں سازگار نہیں آیا۔ عام طور پر آل انڈیا ریڈیو کے افسر سازشی، خوشامدی اور خوشامد پسند ہوتے ہیں۔ بعض سازشی افسروں نے اُن کے خلاف سازش کی۔ میں نے بار بار انہیں اس طرف متوجہ کیا۔ ان سے کہا کہ تم سازش مت کرو لیکن دوسرے کی سازش کو ناکام بنانے کی کوشش کرو۔ لیکن انہوں نے کبھی پروا نہیں کی۔ آخر اس سازشی افسر کی سازش کامیاب ہو گئی۔ اور جب ان کا ایک معاہدہ ختم ہوا۔ تو دوسرا معاہدہ نہیں ہو سکا۔ اس سازشی افسر نے ان پر نا اہلیت کا الزام لگایا تھا۔ لیکن وہ خود ان کے مقابلے میں نا اہل تھا۔ بس اس میں ایک اہلیت تھی اور وہ یہ ہے کہ وہ اپنے سے اوپر کے افسروں کو مکھن لگانا جانتا ہے اور اس فن کا ماہر ہے۔ جگدیش چندر ماتھر ڈائرکٹر جنرل تھے۔ اور پی پی بھٹ ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل۔ دونوں میں شدید اختلاف رہتا تھا لیکن یہ دونوں کے مکھن لگاتا تھا اور دونوں اس سے خوش رہتے تھے۔ روشن اس فن سے بے بہرہ تھے۔

اب روشن اس دنیا میں نہیں رہے۔

<u>یکم جنوری ۱۹۷۷ء</u>

اللہ پاک کا صد ہزار شکر کہ آج سال کا پہلا دن ہے صبح سویرے اٹھا منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا۔ دوا کھائی اور لکھنے بیٹھ گیا۔ ایک زمانہ تھا جب کسی کسی دن تین کہانیاں لکھ ڈالتا تھا۔ لیکن اب جیسے قلم چلنا چاہتا ہے دماغ راستہ روک دیتا ہے سنبھل کر چل اب ایک کہانی لکھنا پہاڑ کاٹنے سے کم نہیں۔ جب قلم اٹھاتا ہوں تو ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دب جاتا ہوں۔ لیکن ایک ایک لفظ بوجھ کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لکھنا چھوڑ کر لیٹ جاتا ہوں۔ لیکن اب طے کر چکا ہوں کہ دماغ میں جو چیزیں اکٹھا ہو گئی ہیں ان کو کاغذ پر اتار دوں اور جو چیزیں شائع ہو چکی ہیں اُن پر نظرِ ثانی کر لوں اور اُن کو ترتیب دے دوں۔ ستارہ میاں بھی یہی چاہتے ہیں۔ اللہ پاک کا ہزار کرم کہ اب بچوں کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ دونوں بچے کام کرنے لگے۔ اور جس طرح دونوں کام کر رہے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے اللہ پاک کی ذات سے توقع ہے کہ دونوں خوش رہیں گے۔ کام کر رہا تھا کہ لطیف شبلی کاٹھمنڈو سے واپس آ گئے۔ ان کے ساتھ ہی نسیم احمد آ گئے۔ انہیں شمالی بہار میں لائبریریوں کو دیکھنے کے لئے بھیجا تھا۔ وہ اپنی رپورٹ لکھ کر دیں گے۔ لیکن جو کچھ انہوں نے زبانی بتایا وہ بے حد افسوسناک ہے۔ بہت سی لائبریریوں کا وجود ہی نہیں ہے۔ یعنی لوگ اب تک بے ایمانی کر کے پیسے وصول کرتے اور اپنی ذات پر خرچ کرتے تھے۔ مسلمانوں کا ذہنی اور اخلاقی زوال ہے۔ اکاڈمی کے قیام کا اثر یہ ہو گیا ہے کہ ہر وہ آدمی جو خط

لکھ سکتا ہے وہ اپنے آپ کو ادیب و شاعر ظاہر کرتا ہے اور طرح طرح سے امداد کا طالب ہوتا ہے۔ میرے خیال میں یہ بھیک مانگنا ہے۔ دوپہر کو نسیم احمد کے ساتھ دفتر کی طرف گیا کوئی خاص خط نہیں تھا۔ ایک خط ایاس احمد گدی کا تھا شکایتی ۔ میں ایسی باتوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ یاد نہیں کہ ایاس کو امداد ملی ہے یا نہیں لیکن یہ ذہن جو اکاڈمی کے قیام سے پیدا ہو گیا ہے وہ اچھا نہیں ہے۔ وہاں سے بہارالدین سے ملنے چلا گیا وہاں چائے پی۔ دیر تک شعر و شاعری کی باتیں ہوتی رہیں۔ بہارالدین نے کچھ اچھے اشعار سنائے لطف آ گیا۔ وہاں سے نکلا تو امین اعجازی سے ملا۔ وہ انجمن ترقی اردو کی بات چھیڑ گئے۔ عبدالمغنی اور کلام حیدری دورہ کر رہے ہیں۔ میں اعجازی سے متفق ہوں۔ عبدالشکور صاحب کو صدارت کے لئے کھڑا نہیں کرنا چاہئے تھا اور وہ کیوں کھڑے ہو گئے۔ زبان کے مسئلے میں انہوں نے کبھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ اعجازی کے یہاں سے نکلا تو سویرے ہی گھر واپس آ گیا۔ آج کس محترم نے راستہ کھچا کھچ بھرا رہے گا۔ گھر پر آ کر اعجاز صدیقی کا خط ملا۔ بے چارہ جس طرح شاعر کو باقی رکھ رہا ہے یہ اس کا کمال ہے۔ لیکن کب تک۔ خود اس کی صحت گر چکی ہے۔ پرکاش پنڈت کا خط آیا نیا سال کی مبارکباد کا۔ ایک کارڈ ایک صاحب نے بھیجا ہے جن کو میں نہیں جانتا۔ ٹھنڈک اور دنوں سے زیادہ ہے۔ اس لئے گھر [illegible] بیٹھ گیا اور شاعر کے لئے ناولٹ لکھنا شروع کر دیا [illegible] وہاب اشرفی آ گئے۔ وہاب اشرفی ہمارے ہونہار نوجوانوں میں ہیں۔ اگر ان کی یہی رفتار باقی رہی تو وہ ایک دن نام پیدا کر [illegible]گے۔ اگر انہوں نے

غور و فکر اور ایمانداری سے اپنا تنقیدی سفر جاری رکھا تو بہت آگے جائیں گے۔ کلیم صاحب بزرگوں میں ہیں۔ اب جو لکچرر ہو رہے ہیں۔ ان کا اللہ حافظ ہے۔ بعض صدر شعبۂ اردو ایسے ہیں جو لفظوں کا صحیح تلفظ بھی نہیں ادا کر سکتے۔ تام لینے کا کیا حاصل۔ لکچرروں میں ایک بات مشترک ہے۔ خواہ لکچرر اردو کا ہو، ہندی کا یا کسی مضمون کا، روپیہ کمانا اپنا ایمان سمجھتا ہے اور وہ اپنے مضمون میں خود کو زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کو گناہ سمجھتا ہے۔ وہاب میں ایسی بات نہیں۔ دوسرے ان کا پس منظر انگریزی ادب کا بھی ہے۔ اسی لئے ان کے مضامین میں خاص قسم کی تازگی ہوتی ہے۔ اب دس [illegible] بجے ہیں۔ [illegible] کھانا کھا کر [illegible] کی تیاری [illegible] کر رہا ہوں [illegible]

افسانوں میں جب تک الجھاؤ نہ ہو پڑھنے والوں کو مزا نہیں آتا۔ لیکن لکھنے والے کے لئے یہ کام صرف یہی نہیں کہ آسان نہیں بلکہ خطرناک بھی ہے۔ سانپ پکڑنے والے کو اسی قدر احتیاط برتنی پڑتی ہے جتنا زہریلا سانپ اسے پکڑنا ہوتا ہے۔ لیکن خطرے کا یہی احساس اس کی مسرت میں اضافے کا سبب بھی ہے۔ یہی حال لکھنے والوں کا ہے لیکن جب وہ کہانی کامیابی کے ساتھ ختم کر لیتا ہے تو اسے خوشی ہوتی ہے۔ وہ اطمینان کا سانس لیتا ہے اور پڑھنے والوں کو لطف آتا ہے۔ مشکل کو آسان بنانا اور الجھی ہوئی کہانی کو سلجھا دینا ہی فنکار کا کام ہے۔

• سہیل عظیم آبادی •

سہیل
ہمارا تھا

از :- محمد [illegible]

رہنمائی کو چمکتا ہوا تارا تھا سہیل
بیچ منجدھار میں کشتی کا سہارا تھا سہیل

مر مٹا خود تو وہ اردو کے لئے جیتے جی
حیف صد حیف کہ اردو ہی کا مارا تھا سہیل

جب گیا روٹھ زمانے سے ہمیشہ کیلئے
چیخ اٹھا یہ زمانہ کہ ہمارا تھا سہیل

اختتامیہ



غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

محکمہ کوآپریٹو کی پیش رفت کے متعلق مختصر نوٹ

۱۔ اوکہعت امداد باہمی کے اداروں کو جمہوری شکل دینے کے لئے حکومت نے تمام اوکرمت اداروں میں انتخاب کرانے کی پرکریا جاری کیا ہے تاکہ حکومت کے اعلان شدہ اصولوں کے مطابق کام ہو سکے۔

۲۔ ریاستی حکومت نے ہر ایک خاندان سے کم سے کم ایک شخص کو امداد باہمی کمیٹی کا ممبر بنانے کے مقصد سے ریاست کے تینتیس ۳۳ لاکھ دیہی خاندانوں کو جو بے زمین ہیں یا جن کے پاس ۲۔۵ ایکڑ یا اس سے کم زمین ہے، انہیں امداد باہمی کے علاقے میں لانے کے مقصد کے تحت ممبری فیس کی رقم دس روپیہ امداد کے طور پر دستیاب کرایا ہے۔ اس منصوبہ کے تحت جب تک قریب ۱۴ لاکھ نئے ممبران امداد باہمی کے علاقے میں بھرتی کئے گئے ہیں۔

۳۔ موجودہ حکومت کا نکتہ نظر یہ ہے کہ اس ریاست کے شیڈیولڈ کاسٹ، شیڈیولڈ ٹرائبس اور سماج کے دیگر پسماندہ اقوام کو امداد باہمی کے توسط سے زیادہ فائدہ پہنچایا جائے تاکہ ان کے اقتصادی ترقی کے مسئلہ کا حل ہو سکے۔ اسی مقصد سے حکومت نے ریاست کے آدیباسی علاقوں میں ۱۴۴ ورہتاکار بہودھندی امداد باہمی کمیٹی (لیمپس) کا قیام کیا ہے اور ان کمیٹیوں میں ایک گودام کی تعمیر کے لئے نیشنل کوآپریٹو ڈیولپمنٹ کارپوریشن سے ۳۸ لاکھ روپے کی مالی امداد بھی دستیاب کرایا ہے۔

۴۔ سرکار نے ہریجنوں اور آدیباسیوں اور سماج کے دیگر کمزور اقوام کے ممبروں کیلئے ہر ایک امداد باہمی کمیٹی کے انتظامی کمیٹی میں جگہ کا ریزرویشن کیا ہے۔

۵۔ سرکار نے شیڈولڈ کاسٹ کے سو تیرس کو امداد باہمی کے توسط سے فائدہ دینے ریاست کے ان ضلعوں میں سو تیرس امداد باہمی کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ایسی ہر ایک کمیٹی کو سرکار کے ذریعہ ۱۰۰۰۰ (دس ہزار) روپے حصہ پونجی دیا جائیگا اور ۴۲۰۰ روپے انتظامی امداد کی شکل میں ملے گا۔

۶۔ امداد باہمی کے توسط سے گاؤں میں لازمی اشیاء کی سپلائی کے لئے ضم بھی صارفین منصوبہ چلا رہے ہیں جس کے تحت گاؤں سے ابتدائی زرعی پیداوار کمیٹی یا لیمپس ایک یا اس سے زیادہ خوردہ دکان کھولنے اور اس دکان کے توسط سے گاؤں میں روزگار کی لازمی اشیاء مناسب قیمت پر دی جاتی گی۔

۷۔ ریاست کے سوکھا سے متاثرہ علاقوں میں زرعی کاموں کے لئے دستیاب قرض امداد باہمی کے توسط سے دستیاب کرائی جا رہی ہے۔ بہار اسٹیٹ لینڈ ڈیولپمنٹ بینک نے کسانوں کو راحت پہونچانے کے مقصد سے سرزمین پر ہی قرض منظور کرنے کی کارروائی کی ہے تاکہ ضرورتوں کو پورا کرنے میں زیادہ وقت نہ لگے۔

۸۔ ریاست کے شہروں اور بلاکوں میں رہائش کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ریاستی حکومت نے بہار اسٹیٹ ہاؤسنگ کنسٹرکشن فنانشیل کارپوریشن کو امداد باہمی کمیٹی کے ممبروں کو قرض دینے کے لئے ہندوستانی جیون بیمہ کارپوریشن سے قرض حاصل کرنے کے لئے ۵ کروڑ روپے کی گارنٹی دینے پر بھی غور کر رہی ہے۔

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کے ذریعہ جاری کیا گیا۔

D-235/79-80

آرام دہ سفر کے لیے

بھاری سامانوں کے ساتھ سفر نہ کریں اس سے سواری ڈبے کے کمپارٹمنٹ میں چلنے پھرنے میں سہولت نہیں ہوگی۔ ٹکٹ لینے کے باوجود آپکے ساتھ سفر کرنے والے دوسرے مسافر آرام سے سفر نہیں کر سکیں گے یا آپ اور آپکے ساتھی بھاری سامانوں کی وجہ سے طرح طرح کے مسائل سے دوچار نہ ہوں گے؟ اگر آپ اپنے بھاری سامانوں کو بریک وان میں رکھوا دیں تو دوران سفر اطمینان اور آرام کے ساتھ کر سکیں گے۔ آپ کے ساتھ ہی آپکا سامان بھی منزل مقصود پر پہونچ جائے گا اپنے ساتھ صرف ضروری سامان ہی رکھیں۔

بھاری سامان کے لئے
بریک وان کی سہولت
کا استعمال کریں



این۔ ایف۔ ریلوے

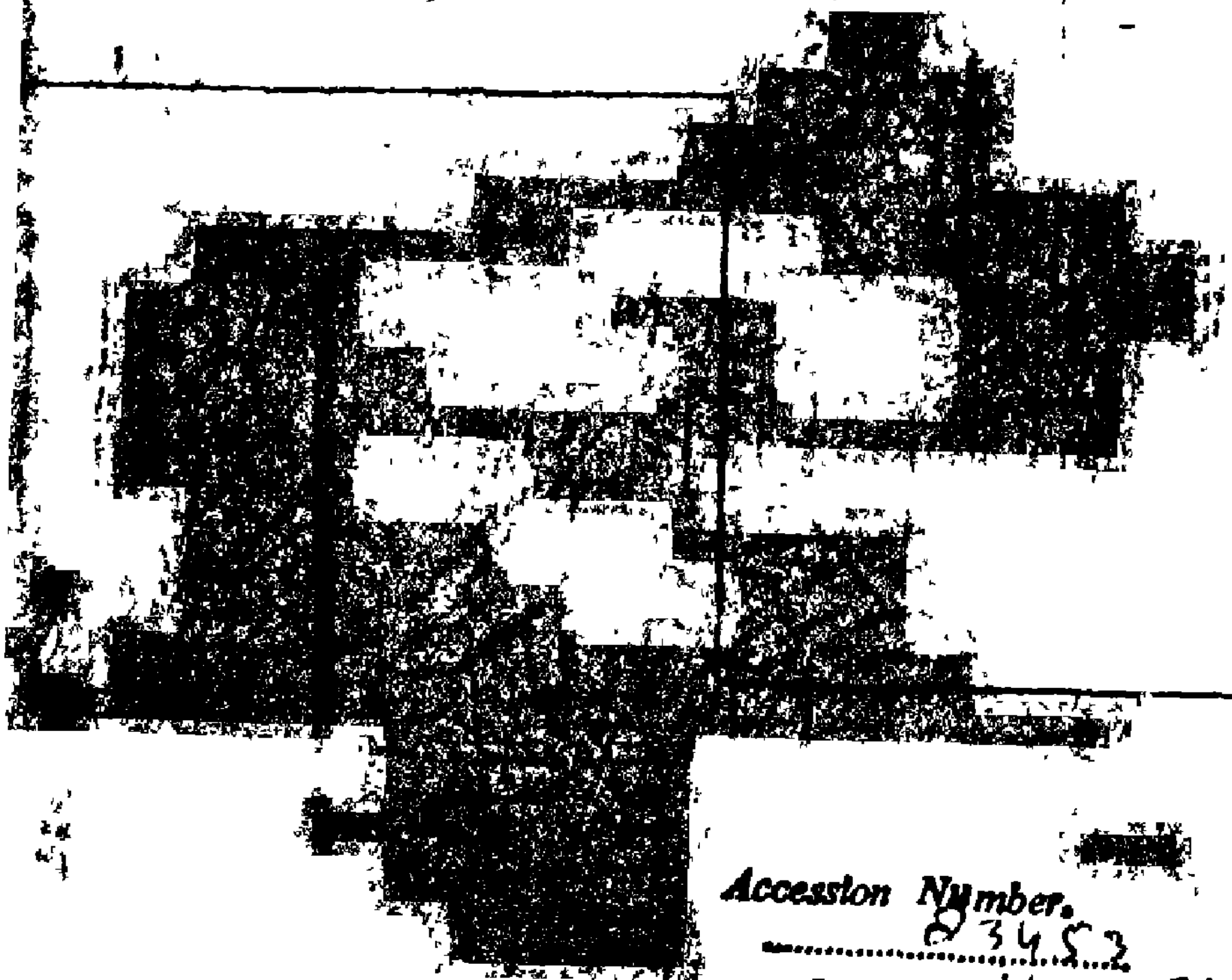
February-
Registered with the Registrar of News Papers at R.N. No. 28439/74

PINDAR'S

Sohail Azimabadi Number

Homage
TO
WELL KNOWN WRITER AND A SYMBOL OF MAN OF SECULARISM

SOHAIL AZIMABADI



From .
GALPHA LABORATORIES
"GOURI SHANKAR"
50-A, Pestam Sagar Scheme
CHEMBUR,
BOMBAY-800089

ONLY COVER PRINTED AT BO